خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ

سسپنس ڈائجسٹ

دسمبر 2017

نگران اعلیٰ

معراج رسول

DECEMBER 2017

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
PDF

نہایت اہم التماس

قارئین انتظار کے لیے معذرت خواہ ہیں لیکن آپ بخوبی واقف ہیں کے دُنیا میں ہر کوئی اپنے کاروبار کے لیے محنت کرتا ہے تاکہ منافع حاصل کر سکے لیکن اگر ہماری وجہ سے کسی کے کاروبار کو نقصان کا اندیشہ ہو تو ہمیں جان بوجھ کر ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ دیکھیں ہر ڈائجسٹ کے پبلشر بہت محنت کے ساتھ ہر مہینے ڈائجسٹ شائع کرتے ہیں تاکہ وہ مارکیٹ میں فروخت ہو سکے اور اُن کو منافع حاصل ہو سکے لیکن آج کے اس انٹرنیٹ دور میں جب وہی ڈائجسٹ یا رسالہ مارکیٹ میں پوری طرح آنے سے قبل ہی آن لائن پی ڈی ایف میں مل جائے تو مارکیٹ سے خریداری بہت کم رہ جاتی ہے جس کی وجہ سے پبلشر کا بہت نقصان ہوتا۔ لہذا اس سارے معاملے کو خاطر میں رکھتے ہوئے urdusoftbooks.com کی انتظامیہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کے آئندہ ماہ سے کوئی بھی ڈائجسٹ رواں مہینہ کی 30 تاریخ سے پہلے Upload نہیں کیا جائے گا تاکہ پبلشرز کا نقصان نہ ہو۔

خوشخبری

انشاالله آئندہ urdusoftbooks.com پر تمام ڈائجسٹ بغیر واٹر مارک کے Upload ہوا کریں گے تاکہ قارعین کو پڑھنے میں دکت کا سامنا نہ کرنا پڑے

قارئین سے مزید درخواست ہے کہ urdusoftbooks.com کے لیے اپنے ویب براوزر سے Adblocker ڈس ایبل کر دیں تاکہ ویب سائٹ پر سپانسر اشتہارات نظر آسکیں اور ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن ہو سکے انہی سپانسر اشتہارات کی آمدن سے ویب سائٹ کے ماہانہ اخراجات پورے کیے جاتے ہیں لہذا آپ کا تھوڑا سا تعاون urdusoftbooks.com کو مستقل آن لائن رکھنے میں بہت مددگار ثابت ہوگا۔ شُکریہ

سسپنس ڈائجسٹ

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

مدیرہ
یمنیٰ احمد
نائب مدیر
اطہر حسین

مینجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن مینجر
سید منیر حسین
0333-3285269

07
انشائیہ
جون ایلیا
خوش امیدی کا مژدہ سنانے والے ایک بھلے انسان کا نظریہ

08
آپ کے خط
مدیرِ اعلیٰ
سسپنس کی مجلس مشاورت و قارئین کی تلخ و شیریں باتیں گلے شکوے اور پرخلوص مشورے

16
نوشت اتحاد
ڈاکٹر ساجد امجد
ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

53
ہوشیاری
محمد یاسر اعوان
مغربی معاشرے میں پنپنے والے جرائم کی پردہ پوشی کا انوکھا انداز

63
مات
ناہید سلطانہ اختر
رشتوں کی خوشبو سے معمور ایک ناکام عاشق کی زندہ دلی

70
رنگ آسماں
اے آر راجپوت
مشرق و مغرب کے عجب امتزاج اور تاریخی خوں ریزیوں کے عبرت اثر اشاروں میں لہراتی دلچسپ داستان

103
جیون دان
وسیم بن اشرف
جیون دان کرنے والے ایک مخلص دوست کا قصہ

107
تیسری کوشش
تنویر ریاض
قاتل سے مقتول بننے والے ایک مجرم کی کارروائی کا ماجرا

116
ناک تلے
ملک صفدر حیات
عشق کے نام پر دیوانگی میں بھٹکنے والوں کی لرزہ خیز روداد

جلد 47 • شمارہ 12 دسمبر 2017 • زرِسالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

145
داستان گو
علی اختر
تنہائی کا شکار ہونے والے چند دن کے مہمان کا انداز بیان

154
محفل شعر و سخن
قارئین
آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ آپ کی پسند، آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

157
نیا موڑ
ثمر عباس
تیزی سے گزرتے حالات کی ڈوری تھامے ایک حسینہ کی ذہانت

165
تلاش
بابر نعیم
ایک مضطرب انسان کے عجیب سفر کی منفرد روداد

168
وقت
حسام بٹ
ایک پرعزم بازی گر کی بازی گری...... سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک دلربا طویل داستان

201
خود کردہ
سلیم انور
تفتیشی اقدامات میں ساتھ ساتھ رہنے والے خطا کاری کی چالاکی

205
تبادلہ
مظہر سلیم ہاشمی
خریداری میں خواری اٹھانے والے ایک سادہ انسان کا قصہ

207
حضرت یوسف علیہ السلام
رضوانہ ساجد
اللہ کے ایک جلیل القدر پیغمبر کی سوانح حیات کے سبق آموز پہلو

221
سلگتے چنار
افتخار اعوان
سلگتی راکھ...... کبھی بھڑکتے شعلوں کے درمیان زندہ رہنے والوں کا حوصلہ

231
تحفہ
شاہ زین رضوان
جرم کو چھپانے کے لیے انوکھا انداز اختیار کرنے والی حسینہ کی مکاری

240
شکست کی فتح
طاہر جاوید مغل
قدم قدم پر شکست کھانے والی دوشیزہ کی حیران کن فتح

000
کترنیں
ادارہ
دنیا بھر سے ادھر ادھر سے لطیفے، چٹکلے اقتباسات، مسکراہٹیں اور قہقہے سب کچھ آپ کے لیے

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

جون ایلیا

مژدہ

ہم جو کھنکھناتی ہوئی مٹی سے بنائے گئے، ہم جو خاک کے خمیر سے اٹھائے گئے اور ہم جو خاک میں ہی ملائے جائیں گے۔ ہم فتنہ و فساد کے زمانے میں زندہ ہیں اور بہشتوں نے ہمارا گھر دیکھ لیا ہے۔ سو ہم پر لازم آیا کہ ہم اپنے اپنے حجروں سے باہر آئیں اور مرنے والوں اور مارنے والوں کو اس المناک حقیقت سے آگاہ کریں کہ زندگی مارنے والوں اور مارے جانے والوں، دونوں ہی سے سوتیلی ماؤں کا سا سلوک کرتی ہے۔ کسی کو ریشم و کمخواب کے بستر پر سلاتی ہے اور کسی کو بچھانے کے لیے گدڑی بھی نصیب نہیں ہوتی لیکن موت سب ہی کو ایک نظر سے دیکھتی ہے، سب کو اپنی چھاتی میں سمیٹ لیتی ہے اور سب کو ایک ہی طور خاک میں ملاتی ہے۔

وہ جو زمین پر بہت اینڈ کر چلتے ہیں، ان کے لیے کسی بھی میدان سے، کسی بھی کھیت یا کھلیان سے ایک مٹھی مٹی اٹھائی جائے اور پھر دل و دماغ کی آنکھوں کے چراغوں کی روشنی میں اسے دیکھا جائے تو اس میں اب سے لاکھوں برس، ہزاروں اور سیکڑوں برس پہلے گزر جانے والے ہمارے اجداد کے بدن کے ریزے نظر آئیں گے۔ کسی ظالم کے سرِ پرغرور کا ایک ذرہ، کسی مظلوم کے چیرے ہوئے جگر کا ایک ریشہ اور کسی مقتول کی کتری جانے والی انگلیاں اس مٹھی بھر مٹی میں گھل گئی ہوں گی۔ اس کے کسی ذرے سے کسی نیک نفس اور برگزیدہ انسان کی خوشبو آ رہی ہوگی اور کسی ذرے سے خبثِ باطن کی سڑاند اٹھ رہی ہوگی۔

لیکن جون ایلیا، تم جو ایک مٹھی مٹی لیے بیٹھے ہو اور اس میں گزشتگاں کی جھلکیاں دیکھ رہے ہو تو تم ان جھلکیوں کو دیکھ کر کیا کہنا چاہتے ہو؟ کیا سیکھنا اور کیا سکھانا چاہتے ہو؟

میرے بھائی، میرے دوست، میں گویائی سے محروم ہوں اس لیے کچھ نہیں کہہ سکتا اور میں نے تو ابھی زندگی کے کتب سے کچھ بھی نہیں سیکھا تو میں تمہیں یا کسی کو بھلا کیا سکھاؤں گا۔ میں یہ مٹھی بھر مٹی اپنے حکمرانوں کی نذر کرنا چاہتا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ انہیں اپنے بارے میں اور اپنے ایسے کروڑوں کے بارے میں بتاؤں، ان بستیوں کی گلیاں دکھاؤں جن کے نصیب ہمیشہ تیرہ و تار رہے، جن کے مقدر میں کبھی سکھ کی گھڑیاں نہیں لکھی گئیں۔

میرے بھائی، انہیں بتایا جائے کہ یہاں حکمرانوں نے محض تجربے کیے، زیادہ مطلق العنانی کے، زیادہ فرعونیت کے تجربے، ہمارے یہاں عوام کے نام پر آنے والوں نے سب سے پہلے عوام کا ہی ٹیٹوا چبایا۔

اس بستی کے معصوم و مظلوم رہنے والوں کے سینے میں امید کے دریا لہراتے ہیں۔ وہ ہر آنے والے کا دامن بہت دردمندی سے، بہت خوش امیدی سے تھامتے ہیں اور ہر مرتبہ دھتکارے جاتے ہیں۔

ایک بار پھر لوگوں کو مژدہ سنایا جا رہا ہے، ایک ایسے بندوبست کی نوید دی جا رہی ہے جہاں پسے ہوئے اور کچلے ہوئے لوگوں کو عزت کی روٹی مل سکے گی، جہاں مظلوموں کو انصاف فراہم ہو سکے گا، جہاں رشوت ستانی اور بدعنوانی کا کوئی گزر نہ ہوگا۔

یہ تمام اچھے جملے، یہ سارے خوب صورت خواب، اس سے پہلے بھی یہاں کے لوگوں کو دکھائے گئے ہیں، اس سے پہلے بھی یہی کہا گیا ہے کہ یہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہیں گی اور یہاں رہنے والوں کی عزتِ نفس کا احترام کیا جائے گا۔

یہاں کے لوگوں نے پہلے بھی ان وعدوں پر اعتبار کیا تھا، یہاں کے لوگ ایک بار پھر نئے وعدوں پر اعتبار کرتے ہیں۔ انہوں نے اس مژدے کو اس امید کے ساتھ سنا ہے کہ یہ وعدے، وعدۂ فردا نہیں ہوں گے۔ وہ اس آس میں ہیں کہ انہیں ایک بار پھر نراس نہیں کیا جائے گا۔

مژدہ سنانے والوں نے بستیوں کو تراشنے کی ذمے داری اپنے سر لی ہے۔ اس دور میں کارِ فرہادی کا دعویٰ یقیناً ایک بڑا دعویٰ ہے۔ یہ دعویٰ جنہوں نے کیا وہ اس پر پورے اتریں اور کروڑوں کے سامنے سرخرو ہوں کہ یہی سب سے بڑی نیکی ہے۔

☆☆☆

عزیزان من!
السلام علیکم!

لیجیے جناب دسمبر 2017ء بھی آن پہنچا.... وہ تو آنا ہی تھا.... وقت بھی کسی کے روکے سے رُکا ہے۔ البتہ کسی کسی مقام پر وقت صرف سالوں کے ہندسوں تک تو بدلتا ہے مگر حالات.... واقعات اور دیگر معاملات میں جوں کا توں ہی رہتا ہے کیونکہ.... بااختیار طبقہ انہیں بدلنا ہی نہیں چاہتا اور عوام کے حصے میں طفلانہ تسلیوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں آتا جیسے کہ بجلی کی لوڈشیڈنگ کے لیے دعوے تھے کہ 2017ء کے آخر تک اس کا خاتمہ ہوجائے گا لیکن کہاں جناب.... اب تو خیر سے 12 سے 22 گھنٹے تک اس کا دورانیہ بڑے دھڑلے سے مقرر کردیا جاتا ہے، دوسری جانب مہنگائی کے جن کو قابو کرنے کا خواب دکھا کر پیٹرول کی قیمتوں میں مختصر مختصر وقفے سے اضافہ کرکے شاید یہ طبقہ طنزیہ ہنسی ہنستا ہوگا کہ ’’کہو کیسی تعبیر رہی۔‘‘ اسی طرح امن و امان کی صورتِ حال کا مجموعی طور پر جائزہ لیا جائے تو وقفے وقفے سے کوئی نہ کوئی نیا شوشہ چھوڑ کر بظاہر پکڑ دھکڑ کا واویلا کرکے خاموشی کی ایک لمبی چادر تان لی جاتی ہے جبکہ سیاسی منظرنامے پر نظر ڈالی جائے تو عجب تماشا یہ بازی گر لگائے رکھتے ہیں۔ جب قومی دولت پر بنی جان سے ہاتھ صاف کیا جارہا ہوتا ہے تو یہی لوگ آنکھوں پر پیار اور مفاد کی پٹی باندھے چین کی بانسری بجا رہے ہوتے ہیں اور جب صفایا ہوچکتا ہے تو اپنی اپنی بین نکال کر بجانا شروع کردیتے ہیں اور سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ بین پر لہرانے والے انسان نہیں ہوتے۔ جب رکھوالے ہی لٹیرے ہوں تو غیروں سے کیا شکوہ.... ایسے میں شاعرِ مشرق علامہ اقبال کا خواب ہو یا قائداعظم محمد علی جناح کی آرزو.... ہم ان کے سامنے شرمندہ نہ ہوں تو کیا کریں۔ 25 دسمبر اپنے محبوب قائد کا یومِ پیدائش اور پھر لازوال قربانیوں اور انتھک کاوشوں کے نتیجے میں ملنے والی اس دھرتی کی دل و جان سے قدر کرنا کیا ہم سب کا اولین فرض نہیں ہے؟ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے فرائض کی ادائیگی میں سرخ روئی عطا فرمائے۔ (آمین)۔ قائداعظم محمد علی جناح کی اکلوتی صاحبزادی دینا واڈیا 2 نومبر 2017ء کو رضائے الٰہی سے وفات پاگئیں۔ اللہ پاک قائد کی اس نشانی کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ (آمین)۔ وقت کا بھی کرشمہ ہے دریا کے مانند بہتا رہتا ہے مگر دریا کی سطح سے لگتا ہے جیسے انسان اسی ایک جگہ ٹھہرے پانی میں پاؤں ڈالے بیٹھا ہے۔ 2017ء اللہ حافظ۔ دسمبر ہمیشہ یادوں کو سمیٹنے اور نئی امیدوں کے چراغ جلانے کا مہینا بن کر آتا ہے اور چپکے سے وقت کی لگام اگلے سال کے ہاتھوں میں تھما کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ اپنی امیدوں کے چراغ لیے ہم بھی چلتے ہیں اپنی بزم کی جانب جہاں بدلتے موسم اور بدلتے خیالات کے رنگ جابجا بکھرے ہیں۔

✠ حکیم سید محمد رضا شاہ نقوی نور نگہ ضلع میانوالی سے شاملِ محفل ہیں۔ ’’سسپنس ڈائجسٹ کا ماہِ نومبر کا شمارہ ہاتھوں میں ہے۔ جون ایلیا کی ’’تحول‘‘ ہوش ربا تحریر ہے۔ آپ کے خطوط میں عبدالجبار رومی کی گزارشات پڑھیں۔ واقعی اس وقت مسلم دنیا کی حالتِ زار پر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ شام میں .... جنگ جاری ہے، عراق تباہ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ہمارا ملک دہشت گردی کی زد میں ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلم دنیا میں سیاسی امن لائے۔ آمین۔ محمد صفدر معاویہ، اشفاق شاہین، ریاض بٹ، ادریس احمد خان، صادق معاویہ، ڈاکٹر نائلہ نصر، رمضان پاشا، محمد قدرت اللہ نیازی، فضا شاہ کے محبت نامے پڑھے، دل کو خوشی ہوئی۔ قدرت اللہ خان نیازی کی خوشگوار آمد۔ جی آیاں نوں نیازی صاحب۔ نئے لکھاریوں کو بھی خوش آمدید علی اختر کی دربان پڑھی۔ پرتھوی راج مہاراجا اور سنجوگتا کی عشق کی داستانِ عبرت پڑھی۔ ہندی مزاج کی خوب صورت تحریر ہے۔ منظر امام کی الٹی طرف میں ایک حساس نکتے کو مصنف نے اٹھایا ہے۔ ارشد اور جویریہ کی شادی ہوجاتی تو کوئی قباحت تھی۔ زندگی ایک سمجھوتے کا نام ہے جو ہر حال میں میاں بیوی کو نبھانا ہوتا ہے۔ رنگ آسماں میں اے آر راجپوت نے مختلف کرداروں کو یکجا کیا ہے۔ آزادی ہندوستان میں انگریز راج فرنگیوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کے مزاج کو اجاگر کیا گیا ہے۔ کہانی آگے ایک نیا موڑ لیتی نظر آتی ہے۔ ٹارگٹ میں مرزا امجد بیگ نے عدالتی بکھیڑوں کی خوب وضاحت کی ہے۔ ان کے دلائل میں وزن ہوتا ہے جب وہ مخصوص انداز میں عدالت میں بحث کرتے ہیں۔ عارف کو بے گناہ ثابت کرنے میں بیگ صاحب کی محنت کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ ظفر اقبال ظفر کی عشقِ ناتمام .... لکھنؤ کے مخصوص ماحول اور طوائف کی زندگی کا احاطہ کرتی تحریر ہے۔ نوابوں کا طوائفوں کی حویلیوں میں جانا اور ان کی اولاد کا ان سے تہذیب و گفتار کا سیکھنا ایک اٹل حقیقت ہے۔ سایہ ایک دلچسپ اور سبق

آموز کہانی ہے۔ محمد الیاس کی عمدہ کاوش بھی۔ جن شادی شدہ مستورات کے شوہر بیرونِ ملک چلے جاتے ہیں لمبے عرصے کے لیے، ان کے ساتھ منزہ جیسا ہوتا نظر آتا ہے اور ان پڑھ لوگ پیروں کے غلط چکر میں پڑ جاتے ہیں جو سادہ لوح عوام کو لوٹنے میں پہلے ہی بدنام ہوتے ہیں جعلی پیر اس بیماری کو جنات سے منسوب کرتے ہیں اور عام آدمی ان کے چکر میں آجاتا ہے۔ حالانکہ یہ علم طب کی ایک بیماری ہسٹریا ہوتی ہے۔ وقت اب نئے موڑ پر ہے۔ اسد علی اور اس کی ماں سلمٰی کا ملاپ ہونے کے بعد کہانی ایک نئی ڈگر میں داخل ہوتی نظر آرہی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اسد علی کو نئے دشمنوں سے برسرپیکار ہونا پڑے گا۔ کہانی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ ڈاکٹر شیر شاہ کی تحریریں جاندار ہوتی ہیں اور وہ طبی دنیا کے مسائل اور الجھنوں پر بحث کرتے نظر آتے ہیں۔ شاہ صاحب کی کہانیوں پر مضبوط گرفت ہوتی ہے۔ زندگی اداس ہے اس کا ثبوت ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام...... رضوانہ ساجد کی تحریر پورے خشوع و خضوع سے پڑھتا ہوں۔ انبیاء پر اللہ تعالیٰ نے آزمائشیں بھیجیں اور پھر انہیں سرخرو بھی فرمایا۔ ان کی اگلی قسطوں کا انتظار رہے گا۔ شاطر میں استاد اور شاگرد دونوں ایک ضعیف عورت سے مات کھا گئے شاکر لطیف کی عمدہ تحریر ہے۔ استاد و شاگرد ایک دوسرے سے بھی مخلص نہ تھے اور پھر دھوکا کھاتے اور دیتے گڑھے میں جا گرے۔ طاہر جاوید مغل کی تحریریں اپنی مثال آپ ہیں۔ تحریر میں منظر کشی مغل صاحب کا طرۂ امتیاز ہے۔ واقعی کھلاڑی منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں اور اناڑی جیت جاتے ہیں۔ مغل صاحب نے جو لکھا ہے کہ جو جتنا بڑا بے ایمان وہ اتنا بڑا فنکار پاکستان میں آج کل ایسی فضا بنی ہوئی ہے اور ہم پاکستانی سیاست اور عدالتوں کی جنگ دیکھ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائے۔“

✠ پچھلے شمارے میں ایک کہانی کے چند فقروں کی طرف ایمانے زارا شاہ، طلعت مسعود اور مرزا نو روز بیگ نے توجہ مبذول کرائی ہے جو سہواً شائع ہوئے۔ اس کے لیے مصنف، مدیرہ اور ادارہ تہِ دل سے معذرت خواہ ہیں۔

✠ زرین خان آفریدی کا تبصرہ حیدرآباد سندھ سے۔ ”نومبر 2017ء کے سسپنس نے اکتوبر کے سسپنس کا شکوہ دور کر دیا۔ ٹائٹل سے لے کر آخری اسٹوری دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ بقول طاہرہ آنٹی میں مکھن نہیں لگا رہی حقیقت بیان کر رہی ہوں۔ کہانیوں کی تعداد اور ڈائجسٹ کے صفحات بھی زیادہ تھے۔ ٹائٹل خوب صورت رنگوں سے مزین تھا۔ شکریہ اسٹاف اعلیٰ مقام۔ انشائیہ میں جون ایلیا صاحب دہرے معیار والے لوگوں کا تخول بیان کر رہے تھے۔ ایسے لوگ مذاق ہی تو ہوتے ہیں۔ اداریہ میں مدیرہ صاحبہ نے بیمار معاشرے کا ذکر کیا ہے۔ مدیرہ جی ہم پاکستانی ماشاء اللہ اتنے حوصلہ مند پُرجرأت و ہمت والے ہیں کہ اس بیمار معاشرے کو تندرست کر کے جیتے ہیں۔ اللہ پاک ہمیں استقلال نصیب کرتا رہے آمین اور اللہ تعالیٰ ہم سب مسلمانوں کو اپنی پناہ میں رکھے۔ آگے اپنی پر بہار محفل پر نظر پڑی تو جناب رومی انصاری صاحب صدارت پر قابض تھے، مبارک باد۔ تبصرہ بھی کمال تھا۔ محمد صفدر، اشفاق شاہین، ادریس احمد اور رمضان پاشا صاحبان کے تبصرے دھمال کمال بے مثال تھے۔ ڈاکٹر نائلہ، ایمانے شاہ اور اشارا ہاشمی صاحبہ زبردست تبصروں کے ساتھ رونق محفل تھیں۔ محمد قدرت اللہ نیازی صاحب بھی سوبر تبصرے کے ساتھ موجود تھے۔ باقی نئے تبصرہ نگار بھی اپنی رائے دینے میں کامیاب رہے۔ دربان، علی اختر صاحب کو خراجِ تحسین کہ تاریخی واقعات کو بہت خوب صورتی سے پیش کرتے ہیں کہ انسان اس دور میں چلا جاتا ہے۔ پرتھوی راج کے حالاتِ زندگی و واقعات پھر سنجگتا کی بے مثال محبت بہت ہی زبردست۔ اپنے دربان پرتھوی راج کے ساتھ ستی ہو جانا عام بات نہیں۔ رنگِ آسماں، اے آر راجپوت مسٹر شوکی اور ریتا میم کے ساتھ پاس ہو گئی ہے۔ کہانی کا ردھم اور الفاظ کا چناؤ بھی بہترین ہے۔ اب بتائیں یہ داستان کتنے عرصے ہمارے ساتھ رہے گی۔ ثمر عباس کی غلط فہمی بھی اچھی رہی۔ کبھی کبھی آنکھوں دیکھی بات بھی غلط ثابت ہوتی ہے جیسے ایلیٹ سے ہوئی۔ عشقِ ناتمام، ظفر اقبال ظفر صاحب کی بہت عمدہ رہی۔ دل کشا اور نواب صباحت تشنہ، تشنہ ہی رہے۔ شاطر شاکر لطیف صاحب کی بہت شاندار رہی۔ نہ استاد نہ ہی شاگرد کچھ پا سکے۔ مارتھا واقعی شاطر تھی۔ اپنی چیز کی حفاظت بھی اچھی بات ہے۔ ٹارگٹ اور مرزا صاحب ویلڈن۔ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے میں بھرپور کوشش مرزا امجد بیگ صاحب کی تھی۔ شاکرا اور انیلا نے عارف سے چھٹکارا پانے کا کیا طریقہ ڈھونڈا لیکن خود ہی گڑھے میں گرے۔ شکست کی فتح، طاہر جاوید مغل صاحب، نام بھی اچھا کام بھی اچھا۔ اس بار تحصیل پھالیہ کے گاؤں موراں والی کی عین النور کے کارنامے لے کر حاضر ہوئے۔ عموماً یہ بات اکثر دیکھنے میں آئی ہے کہ گاؤں گوٹھ کی لڑکیاں شہری لڑکیوں سے زیادہ اونچی اڑان بھرتی ہیں۔ اکثر نقصان بھی اٹھاتی ہیں۔ نور کا جوڑی دار ذوالقرنین تھا۔ اسٹوری بہت جاندار ہے آگے کیا کیا ہوتا ہے اس کا انتظار ہے۔ آج ایک اور بات کی طرف توجہ دلانا چاہوں گی کہ ڈائجسٹ کی تمام اسٹوریز اور داستانوں میں ٹاپک یا نام کے ساتھ جو تصویریں بنی ہوتی ہیں، بیسٹ اینڈ بیسٹ ہوتی ہیں۔ رنگِ آسماں کی ریتا اور وقت کی شارو کی تصاویر بے حد خوب صورت ہیں۔ اس طرح ہر اسٹوری کے متعلق مصوری بہت اچھی ہوتی ہے۔ سوائے مرزا امجد بیگ صاحب کے۔ (آپ کی نشاندہی کا شکریہ)۔ اس بار سلسلہ وار داستان وقت کو ٹائم نہیں دے پائی کہ پشاور سے ہمارے گھر گیسٹ آئے ہوئے ہیں تو ان میں مصروف ہیں۔ باقی کترنیں کافی اچھی ہیں۔ محفل شعر و سخن تو ہمیشہ کی طرح اوسم رہی۔ (اتنی مصروفیات میں بھی

سسپنس سے دوستی نبھانے کا شکریہ)۔

☒ اشفاق شاہین کی لاہور سے آمد۔ ''سسپنس حسب معمول بروقت مل گیا۔ سرورق بھی روایتی سا رہا، مطلب روٹین سا پسند نہیں آیا۔ جون ایلیا انشائیہ تخول میں وقت کی سنگینیاں بیان کرتے نظر آئے۔ اپنی محفل میں پہنچے، عبدالجبار رومی مسکن تبدیل کرنے کے بعد کرسیِ صدارت پر موجود تھے۔ شاندار تبصرے کے ساتھ بہت اچھے۔ صفدر معاویہ، ریاض بٹ، زرین آفریدی، اوشا راشمی، زاہد، قدرت اللہ نیازی، فضا شاہ اور امتیاز احمد کے تبصرے بہت اچھے اور خوبصورت رہے، پسند آئے۔ ایمانے .... شاہ مختصر آمد کے ساتھ پہلی بار آئیں تہِ دل سے جی آیاں نوں۔ باقی احباب کے خطوط بھی اچھے رہے۔ سب سے پہلے وقت کا مطالعہ کیا اس بار منظر نگاری خوب رہی۔ اس کی بالآخر اپنی امی سے ملاقات ہوہی گئی اور کچھ غیر متوقع حالات بھی سامنے آئے جن کا سامنا کرنے کے لیے وہ پلاننگ کر رہا ہے اور سب سے دلچسپ بات متقبول بھٹی نے جس دوسری عورت کی پاکستان میں موجودگی ظاہر کی ہے، وہ کون ہے۔ میرا تو خیال ہے وہ ڈیلفینا ہے اور افسوسناک بات اینڈ پر علی سلطان انکل کی وفات، اس بار قسط بہرحال بہت اچھی رہی۔ نئی سلسلے وار کہانی رنگِ آسماں اے آر راجپوت، آغاز تو بہت اچھا ہے، مخصوص حالات سے کہانی نے اسٹارٹ لیا ہے۔ آگے کیا رخ اختیار کرتی ہے تین چار قسطوں میں واضح ہوجائے گا۔ آخری صفحات کی کہانی شکست کی فتح واہ طاہر جاوید مغل صاحب، شاندار...... نور کی ہمت و حوصلے کی داستان بہت زبردست رہی۔ اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے۔ مرزا امجد بیگ ٹارگٹ کے ساتھ موجود تھے بہترین۔ ناہید تو ایک طرف اس کی بیٹی اپنی ماں سے بڑھ کر نکلی ایسے کردار اب بھی جا بجا موجود ہیں۔ مختصر کہانیاں بھی خوب رہیں۔ خصوصاً اعلیٰ ظرف اور عشقِ ناتمام نے خوب مزہ دیا بہترین رہیں۔ سایہ محمد الیاس نے خوب لکھی قابلِ غور اور پراثر تحریر حضرت یوسفؑ کے واقعات پڑھ کر بہت ہی اچھا لگا اور محفل شعر و سخن میں انتخاب لاجواب رہا۔ خصوصاً عاصمہ سعید، اسامہ جنید اور ناہید یوسف کے انتخاب کیا کہنے۔''

☒ عبدالجبار رومی انصاری تصور کَ ٹی سے خط لکھ رہے ہیں۔ ''میڈم سسپنس تو محبت کی دیوی لگتی ہیں جس کی ادھ کھلی آنکھیں سونے والوں کی طرح جاگنے والوں جیسی کی بھرپور عکاسی کر رہی ہیں۔ سیاہ گیسو، ہونٹوں پر لالی خوب صورت چہرہ بس سرسوں کے پھولوں کے کندھے پر رکھ دیا ہے ہاں جی موسم بدل رہا ہے رت پہلے پھولوں کی آرہی ہے تو پیار و محبت کے رنگ تو ہر سو نظر آئیں گے نا! یہ حقیقت ہے کہ موسموں کے خوب صورت رنگ تخول نہیں کرتے۔ یہ انسان کو احساس دلاتے ہیں اپنی خوشبو سے، اپنے رنگوں سے، اپنی ہواؤں سے تبھی حساس دل انسان میں خوب صورت جذبے موجزن ہوتے ہیں کیونکہ یہ سب سچائی پر مبنی ہوتا ہے لیکن اگر انسان کو دیکھا جائے تو یہ موقع پرست ہے اور تخول سے باز نہیں آتا اور جون ایلیا کے مطابق جب وقت اس کے ساتھ تخول کرتا ہے تو پھر پاگل پن کی ہنسی سے رونے پر ہی اختتام ہوتا ہے، پس سبق سیکھنے کی ضرورت ہے۔ پُر بہار محفل میں خود کو پہلے نمبر پر دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ شکریہ سسپنس ہمارا شاملِ حال رہنا ہی تیری محبتوں سے ہے۔ حضرت یوسفؑ بھائی بنیامین کو بچانے کے لیے اللہ کے حکم سے خوب راہ نکالتے ہیں اور دوسرے بھائیوں کے ساتھ ان کی تکرار بھی سبق آموز ہوتی ہے اور پھر حضرت یوسفؑ کا قصہ تو قصص الاحسنین میں سے ہے پھر پیارا کیوں نہ لگے۔ بہت اچھا لگ رہا ہے۔ اگلے حصے کا شدت سے انتظار ہے۔ محبت و شفقت سے لبریز خوب صورت کہانی سایہ اچھی لگی۔ منزہ کا شوہر واپس آیا تو اس پر آیا ہوا جن بھی کوہ قاف اڑن چھو ہوا جو صرف عامل کا لایا ہوا تھا۔ پھول کا منزہ کی اوک سے پانی پینا بہت اچھا لگا۔ یہ ہوتی ہیں گاؤں کی معصوم محبتیں اور بھرپور شفقتیں جو کبھی نہیں بھولتیں۔ دربان پرتھوی راج نے اپنے وعدے کی لاج بھی خوب نبھائی، بہادر کرنا کی نے اس محبت کی راہ ہموار کی جس کی سنجگتا دیوی تھی اور پھر یہ دیوی اپنے پتی پرتھوی راج کے ساتھ ہی جل مری۔ پرتھوی راج کی جنگی بہادری اور محبت دونوں ہی زبردست تھیں۔ ایڈونچر سے بھرپور اور سرد گرم جذبات سے معمور رنگِ آسماں کا پہلا حصہ زبردست رہا۔ سادہ مزاج شوکت کے لیے گھوڑوں کو سنبھالنا تو مشکل نہیں مگر نیلی آنکھوں والی فرنگی لڑکیوں نے ضرور اسے مخمصے میں ڈال دیا ہے۔ اب دیکھو وہ کس کو سنبھالتا ہے، ریتا کو یا کارشا کو۔ رنگِ آسماں کیا کیا رنگ دکھائے گا اگلے حصے میں دیکھیں گے۔ نورالعین ہے تو مضبوط قسم کی لڑکی ہر لحاظ سے ہی مگر لڑکی ہونے کے ناتے کہیں نہ کہیں جذبات کی رو میں بہہ جاتی ہے اور پھر اپنے باپ کی وجہ سے اور بھی سہم جاتی ہے جس کی وجہ سے اس کے شاندار کیریئر میں اسپیڈ بریکر کی طرح سست روی آجاتی ہے اور رہی سہی کسر فرہاد نے اس کا دل توڑ کر پوری کردی۔ وہ تو اس کے تایا ابا اس کی بھرپور حوصلہ افزائی کر رہے ہیں تبھی شکست در شکست کھانے کے باوجود ثابت قدم ہے۔ شکست کی فتح عمدہ کہانی ہے۔ زندگی قدم قدم پر انسان کا امتحان لیتی ہے۔ علی کو ایک طرف اس کی ماں ملی تو دوسری طرف اس کے شفیق انکل علی سلطان وفات پاگئے۔ وقت انسان کو آزمائشوں سے گزارتا ہے اور علی جیسا مستقل مزاج اور ثابت قدم شخص ان آزمائشوں سے بھی گزر جائے گا۔ وقت اپنی رفتار سے اچھی جارہی ہے۔ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ شاکر اور انیلا عارف پر چوری کا الزام لگا کر بھول گئے کہ عدالت میں جا کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوجاتا ہے۔ سو وہ خود ہی ٹارگٹ بن گئے۔ وکیل صاحب کی کہانی بھی عمدہ رہی۔ محفل شعر و سخن سے وزیر محمد خان، شیزا کاشان اور سعدیہ ریحان ٹاپ پر رہے۔''

☒ رابعہ آفرین، شوکر نیاز بیگ لاہور سے شریکِ محفل ہیں۔ ’’بہت دیر سے دل ہاتھ باندھے ہمارے سامنے کھڑا تھا کہ خدارا اپنے جذبات شیئر کردو۔ سیانے کہتے ہیں کہ دل کی بات دل میں رکھنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ تو آج ہم بھی قفلِ لب کھول دیتے ہیں۔ (مہربانی جناب کی...... محفل میں خوش آمدید)۔ جون ایلیا کا انشائیہ ہمیشہ میری نظروں کے سامنے اک نئے سبق کے ساتھ آیا اور ہمیشہ مجھے دعوت دیتا آؤ مجھے پڑھ کر سمجھو اور قیمتی جوہر تلاش کرلو۔ ذاکر انکل! میں آپ کو کیوٹ کیوٹ سرورق تخلیق کرنے پر مبارک باد بالکل بھی نہیں دوں گی کیونکہ مبارک باد تو غیروں کو دی جاتی ہے اور آپ تو ہمارے اپنے ہیں نا؟ کیوں عذرا آپی، صحیح کہا نا؟ (جی بالکل صحیح کہا)۔ لوگوں کی زندگی میں سسپنس نے بہت اچھا کردار ادا کیا، یہاں تک کہ بہت سے لوگوں کو میں نے زندگی کی تلخ حقیقتوں سے نظریں ملاتے دیکھا ہے ان ڈائجسٹ کی وجہ سے۔ اس کی زندہ مثال میری دوست کے دادا ابو ہیں، جن کو پیار اور عزت سے میں خود دادا ابو جی کہتی ہوں۔ وہ بہت باہمت ہیں، ان کا جگر، پھیپھڑے اور بہت سی اندرونی چیزیں انفیکٹڈ ہو کر ختم ہونے کے قریب ہو چکی ہیں مگر پھر بھی وہ ہمہ وقت مسکراتے رہتے ہیں اور کام پر بھی جاتے ہیں وہ صرف اور صرف آپ کے میگزین پڑھتے ہیں اس کے علاوہ کوئی بھی رسالہ نہیں پڑھتے۔ سسپنس اور پاکیزہ نے بہت سے لوگوں کی صلاحیتوں کو نہ صرف ابھارا بلکہ انہیں ایک نام، ایک مقام بھی دیا۔ محی الدین نواب کی جتنی بھی تحاریر پڑھیں، وہ لاجواب تھیں کیا ہم دوبارہ ان کے علم و ذوق سے مستفید ہو سکیں گے؟ (جی جناب بالکل محظوظ ہو سکیں گے...... ’’سسپنس کلاسک‘‘ کے عنوان تلے ہم گاہے گاہے خوب صورت کہانیاں دوبارہ شائع کرتے رہیں گے ۔ آپ کے خیالات کی ہم قدر کرتے ہیں لیکن کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ سسپنس کی کہانیوں پر بھی کچھ تبصرہ فرمائیں۔ آپ کو اگر لکھنے کا شوق ہے تو ضرور ہمیں تحریر بھیجیے اگر کہانی میں دم ہوا اور انداز بھی دلچسپ ہوا تو رسالے میں ضرور جگہ ملے گی ورنہ دوسری صورت میں ہم معذرت کریں گے لیکن...... آپ سے ناتا ہرگز نہیں توڑیں گے)۔‘‘

☒ عبدالغفور خان ساغری فتنک کی ضلع اٹک سے آمد۔ ’’کچھ معروفیات کی وجہ سے خط ارسال نہیں کر سکا لیکن جاسوسی سسپنس کے ساتھ رابطہ بحال تھا۔ اب بھی کچھ ٹائم نکال کر خط ارسال کر رہا ہوں۔ اس ماہ کی کہانی شکست کی فتح بہت زیادہ پسند آئی۔ لکھاری بھی تو جاوید مغل صاحب تھے، ویلڈن۔ اب کچھ ذکر خطوط کی محفل کا۔ عبدالجبار رومی کو صدارت کی کرسی پر دیکھا مبارک ہو۔ خطوط میں نوک جھونک اچھی رہی۔ اشعار کی محفل اچھی تھی۔ ایم نصیر سکھر، ملائکہ حریم کے اشعار اچھے تھے۔ باقی بھی بہتر تھے۔ باقی کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں۔ اس ماہ کا سسپنس میو اسپتال کے نزدیک ایجنسی سے لیا۔ ٹائٹل میں محبت کے رنگ بھر دیے تھے، بہت ہی عمدہ۔ باقی میں اپنی شادی میں بھی مصروف تھا۔ (ارے واہ بھئی مبارکاں جی...... منہ تو میٹھا کرادیں ہمارا)۔‘‘

☒ محمد خواجہ کورنگی، کراچی سے شاملِ محفل ہیں۔ ’’نومبر کا شمارہ آب و تاب کے ساتھ ہاتھ میں ہے۔ سرورق لڑکی کی آنکھیں خوب صورت لیکن یاس اور امید کا برملا اظہار، اردگرد دو دلوں کا عکس، یقیناً یہ محبت کی ہی فسوں کاری کا اداس پن۔ جون ایلیا کا ایک صفحہ بہت سے رموز و اسرار لیے ہوئے ہے ذرا غور سے پڑھنا ہے۔ آنکھوں میں آنسو ہیں دل میں اضطراب ہے، بر عکس ملک کے اندرونی خلفشار میں مبتلا ہے۔ کوئی اپنا جرم قبول کرنے کو تیار نہیں۔ ملک بد سے بدترین حالات، مہنگائی، آمدنی میں کمی کا ہر حربہ استعمال۔ قومی بچت جو لوگوں کی دال روٹی چلا رہا ہے اس پر حملہ، بے پناہ قرض کہاں جا رہا ہے۔ کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کچھ کر نہیں سکتے۔ لیڈر اتنا کیچڑ اچھال رہے ہیں کہ صورت تک صاف نظر نہیں آرہی ہے۔ بیرونی دشمن دیکھ رہے ہیں کہ ہم اپنی موت کا خود ہی سامان کر رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ہم اپنے ملک خداداد کے خود ہی دشمن بن بیٹھے ہیں۔ کورنگی میں لوڈشیڈنگ کا دورانیہ 12 گھنٹے سے 18 تک پہنچ گیا ہے۔ بجلی کے بلوں میں ہزاروں روپے کا غیر ضروری اضافہ لگا رہے ہیں میرے بل میں خرچ کے علاوہ 32 ہزار روپے علیحدہ سے لگا کر 260 یونٹ کا بل 36 ہزار سے زیادہ کا بھیجا گیا۔ کے الیکٹرک کوئی وجہ بتانے سے قاصر۔ اتنی زبردست لوڈشیڈنگ کے بعد کیا میٹر خود بخود چلتا رہے گا؟ آخر مجھے وفاقی محتسب کی مدد لینی پڑی اتنے پاپڑ بیلنے کے بعد کے الیکٹرک کے خلاف فیصلہ آیا۔ اتنا ظلم اتنی ناانصافی۔ پچھلے دو ماہ سے دوستوں کی محفل سے دور رہا لکھنے کا وقت نہیں اور ڈپریشن کی انتہا رہی۔ دوستوں میں عبدالجبار رومی انصاری کو کرسیِ صدارت مبارک ہو۔ باقی خطوط بھی کم نہ تھے۔ دربان، تاریخ کی ولولہ انگیز داستان سے بہت سی معلومات ملیں۔ اعلیٰ ظرف، واقعی یہ کہانی ایک اعلیٰ ظرف نوجوان کی ہے جس کی سچ بیانی نے ہوتا ہوا رشتہ ختم کروا دیا ورنہ آج کل رشتوں کے لیے ایک جھوٹ کا طوفان نظر آتا ہے جو آخر دو خاندانوں کو جہنم رسید کر دیتا ہے۔ اس کہانی میں لڑکی کے والد کا فیصلہ مجھے غیر موزوں لگا۔ باقی ان کی سوچ۔ رنگِ آسماں، بڑی تجسس آمیز اور سنسنی خیز سیریل، آگے اور بھی دلچسپی کا یقین ہے۔ محبت رنگ نسل غلامی آزادی نہیں دیکھتی۔ بس محبت کا انجام اچھا لگے۔ غلط فہمی، بڑی منفرد کہانی۔ دو علیحدہ ہونے والے لوگ ایک عجیب حادثے سے دوچار ہو کر پھر ایک ہونے پر راضی، کہانی کا تسلسل بہت اچھا لگا۔ ٹارگٹ۔ وکیل صاحب کا ایک اور عظیم کارنامہ۔ ایک بددیانتی پر شروع ہونے والا الجھاؤ صرف بیگ صاحب نے ہی اس کو احسن طریقے سے سلجھا دیا۔ معاشرے کی

ناہمواری، اداروں کی خرابی اور جعلی آستانوں کا احوال کھل کر سامنے آتا ہے۔ ایسی ہی خرابیاں ہمارے معاشرے میں ہزاروں کی تعداد میں ہیں اور ہم مہذب معاشرے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔ عشقِ ناتمام، لکھنؤ کی تہذیب پر اچھا لکھا ہوا قصہ۔ انجام بہت دردمندانہ مگر بڑا ہی دلگداز انجام اور فیصلہ۔ بہت عمدہ تحریر۔ وقت، یہ کہانی بہت عمدگی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اس قسط میں بہت چونکا دینے والی حقیقتیں مگر کہیں کہیں بے جا طوالت بھی نظر آئی۔ اب اگلی قسط کے دلچسپ اور سنگین ہونے کا اشارہ ملتا ہے۔ کچھ پیچ و خم میں اضافے کی بھی امید ہے۔ زندگی اداس ہے۔ ایک آسودہ اور مطمئن خاندان کی کہانی لیکن اچانک خاتون پر اداسی کا خطرناک دورہ اور ایسا کہ اس نے زندگی ختم کر ڈالی۔ یہ معما اس کہانی میں حل نہ ہوا کہ اصل وجہ کیا تھی جس کا علاج تک نہ ہو سکا۔ دیدہ دلیر، مختصر جرم و سزا کی کہانی۔ ایک ریٹائرڈ اسکول ٹیچر کا ذہنی طاقت کا مظاہرہ جس نے بڑوں کو پیچھے چھوڑ کر جرم کو سمجھا اور مجرم کی نشاندہی کر ڈالی۔ کہتے ہیں اولڈ از گولڈ۔ حضرت یوسف علیہ السلام ان پیغمبر کی اولاد جو حسن و جمال کا مرقع تھے بہت سا پڑھا لیکن جو تفصیل اس کہانی میں بیان کی گئی، بہت معلوماتی ہے آفرین۔ شاطر، دو بدکردار ڈاکو ایک دوسرے پر سبقت لے جانے والے بدنیت مگر ایک بوڑھی کی اداکاری نے دونوں کو چاروں خانے چت کر دیا۔ معمولی مگر مزیدار کہانی۔ شکست کی فتح۔ پہلی قسط ہمارے معاشرے کی الٹ پھیر کی داستان ہے۔ ایک پُرعزم لڑکی کی داستان حیات جو خاندانی رسم و ریت میں رہ کر بھی ایک جستجو کے لیے تکلیف برداشت کرتی ہے۔ اس قسط میں وہ ہارتی نظر آ رہی ہے شاید اگلی قسط میں وہ شکست پر قابو پا لے اور تقدیر اس کے لیے بہتر فیصلہ لکھ دے۔ کترنیں ہمیشہ کی طرح لاجواب۔ کچھ حکایتیں تو ڈائری میں نوٹ کر لینے والی ہیں۔"

✠ ایم سخاوت کرناہی کا آزاد کشمیر سے گزشتہ شمارے پر تبصرہ۔ "اکتوبر کا خوب صورت شمارہ سسپنس پُرسوز و دلفریب کہانیوں کے ساتھ موصول ہوا۔ اگر میں یہ کہوں کہ جہانِ ہوس و نفس میں یہ شمارہ لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ لانے میں بڑا کردار ادا کر رہا ہے تو یہ مبالغہ آرائی نہیں ہوگی۔ ابتدا میں عظیم شاعر جون ایلیا کا انشائیہ شاملِ تحریر کر کے اس شمارے کو مزید موثر بنا دیا جو کہ اس عالم دولت و ثروت کا آئینہ دار ثبوت ہے۔ تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک نئی فکر و آہنگ کی ترجمان تھیں۔ بالخصوص باغی میں محترم محمد طاہر عمیر نے زندگی کے تین کرداروں کی بھرپور وضاحت کی ہے جس سے ایک تعمیری سوچ کی راہ نکلتی ہے۔ کامران کا ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا۔ وہ بھی اپنے والد کے خلاف اس طرف ہماری سوچ کو مبذول کرواتے ہیں کہ انسان کا وجود سچائی کا پیکر ہے۔ علاوہ ازیں آشتی کے کردار نے بھی اس طرف ہماری فکر کو سمت بخشی ہے کہ ہوس بھی انسانی فطرت کے سامنے سرنگوں ہو جاتی ہے۔ آشتی کا آخر میں اپنی ہوس کو شکست دینا اور وہ ہیرے بطور تحفہ ماہی کو دینا اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ محبت سے بڑی کوئی دولت نہیں۔ ماہی کا کردار شروع سے آخر تک ایک ایسے لازوال جذبے کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے جو کہ ہمیشہ امر رہنے والا ہوتا ہے۔ وقت میں حسام بٹ نے ایک عظیم رشتہ ماں کی فضیلت سے بھی ہماری توجہ کو ایک نکتے پر لائے ہیں کہ ماں کی محبت کے بغیر دنیا کی ہر محبت کچھ نہیں۔ ایک تجویز بھی ہے اگر آپ کی توجہ کا محور بن سکے وہ یہ کہ آپ کے سلسلے شعر و سخن میں اگر اشعار کے بجائے مکمل غزلیات کا انتخاب کیا جائے تو کافی سود مند ہوگا۔ آپ کے شمارے کے لیے میں بھی اپنی غزلیات کو آپ کی طرف بھیج رہا ہوں۔ یقیناً آپ انہیں شامل کر کے میری حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔"

✠ ادریس احمد خان ناظم آباد کراچی سے خط لکھ رہے ہیں۔ "سسپنس ڈائجسٹ موصول ہوتے ہی اب انتظار نہیں ہوتا۔ بے تابیٔ دل بڑھ جاتی ہے۔ سارے ضروری غیر ضروری کام برطرف صرف اور صرف ڈائجسٹ کا ہی مطالعہ شروع ہو جاتا ہے۔ گویا کہ چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ نومبر کا ڈائجسٹ خوش رنگ سرورق کے ساتھ ذاکر صاحب کے ہنر کو واضح کیے ہوئے تھا۔ انشائیہ بھی بے مثال تھا پھر ناموں پر نظر پڑی تو سرِفہرست عبدالجبار رومی انصاری نظر آ رہے تھے۔ مبارک باد۔ دیگر نئے پرانے دوست بھی بھرپور حاضری لگا رہے تھے۔ تبصرے کی پسندیدگی پر دوستوں کا شکریہ۔ اس کے بعد تاریخی کہانی دربان پڑھی تاریخ سے آگاہی حاصل کی پھر منظر امام کی اعلیٰ ظرف پڑھی۔ منظر امام صاحب کی ہر کہانی دل پر اثر کرتی ہے اور دیر تک اثرات رہتے ہیں۔ اس کے بعد سلسلے اور کہانی رنگ آسماں پڑھی۔ کہانی جدوجہد آزادی کے پس منظر میں لکھی گئی خوب صورت کہانی ہے۔ امید ہے اپنے اختتام تک دلچسپی برقرار رہے گی۔ بدلہ بھی اچھے انداز میں لکھی گئی کہانی تھی۔ عشقِ ناتمام پرانی قدروں اور وضع داری کو نبھانے کی روایات پر بڑی اچھی کہانی تھی۔ شعر و سخن کی محفل میں بھی اچھے اور منتخب اشعار نے بہت محظوظ کیا۔ محمد الیاس کی سایہ بھی اچھی لگی۔ اس کے بعد حسام بٹ صاحب کی وقت سلسلے وار کہانی بڑی کامیابی سے جاری ہے اور دلچسپی کا عنصر ہے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی کہانی زندگی اداس ہے ہمیشہ کی طرح پیغام دیتی کہانی تھی۔ دیدہ دلیر بہتر تھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی داستانِ حیات بھی جاری ہے جس نے دل کو روشنی سے منور کر دیا ہے۔ بہت تفصیل سے حالات لکھے گئے ہیں۔ شاطر بھی دلچسپ کہانی تھی جس میں مارتھا نے چوروں کو بھی مات دے دی اور استادوں کے استاد کو بھی چاروں خانے چت کر دیا۔ راجر بھی منہ دیکھتا رہ گیا۔ آخری صفحات کی کہانی شکست کی فتح طاہر جاوید مغل صاحب کی کہانی حاصلِ مطالعہ رہی، بہت خوب صورت کہانی ہے۔ امید ہے آگے بھی دلچسپی جاری رہے گی۔ کترنیں بھی اچھی لگیں۔ (سسپنس سے پیار بھرا ناتا برقرار رکھنے کا شکریہ)۔"

☒ محمد صفدر معاویہ کی خانیوال سے شرکت ۔ ’’اللہ پاک آپ سب ادارے والوں کو خوش و خرم رکھے کہ اتنی دی آئی پی چیز ہمیں پڑھنے کو میسر کرتے ہیں۔ سسپنس صدر بازار پشاور سے جا کر خریدا۔ سرورق کو بہت ہی پیاری اور خوب صورت دلربا ماڈل سے آویزاں کیا گیا۔ آگے بڑھے محترم ایلیا صاحب کا کول پڑھا۔ جون ایلیا کی گریہ وزاری اب سامنے آرہی ہے کہ ہم وقت سے کھیل رہے تھے۔ اب وقت پلٹ کر ہم سے پوچھنے کو تیار ہیں۔ آپ کا اداریہ پڑھا اگر کہیں کوئی قانون نظر آئے ورنہ کبھی ہیرا گروپ کبھی اسموزا گروپ تو کبھی کوئی گروپ ایسی ظالمانہ کارروائیاں کرتا رہے گا۔ باقی رہی اطمینان کی بات تو وہ صرف رب کی طرف پلٹ کر جانے میں ہی ہے کہ ہم اپنے رب کے فرمانبردار بندے بن جائیں اور دلی سکون کی زندگی گزاریں۔ اب تو علامہ اقبال ڈے یا قائداعظم ڈے بس خانہ پُری کے لیے ہیں۔ دوستوں کی محفل میں آئے تو روحی بھائی کو کرسیٔ صدارت پر پایا۔ بہت ہی عمدہ تبصرہ۔ اب کسی صلاح الدین ایوبی یا محمد بن قاسم کا انتظار نہیں کرنا بلکہ خود کو ان کے کردار میں ڈھالنا ہے اور امتِ مسلمہ کو اکٹھا کرنا ہے پھر ہر باطل سے ٹکرانا ہے۔ صادق معاویہ بھائی آپ کے بارے میں جان کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ پاک آپ کو صحت کاملہ عطا کرے۔ آپ کو جلد مکمل صحت یاب فرمائے آمین۔ زاہد احمد اللہ پاک آپ کو صبر دے اور آپ کو اس کا اچھا نعم البدل عطا کرے۔ محمد قدرت اللہ بھائی اپنی طرح کے خوب صورت تبصرے کے ساتھ محفل رونق بنے۔ فضا شاہ اور امتیاز احمد بھی اچھا تبصرہ کر رہے تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے وقت پڑھی۔ اس دفعہ کے واقعات پڑھنے پر دل کو ایک ٹھیس سی لگی۔ بہت مشکل وقت ایک بیٹے کے لیے لیکن اس نے منہ پھیرنے کے بجائے ماں کی محبت کو فوقیت دی۔ آخر میں علی سلطان کی موت کے بارے میں سن کر بہت دکھ ہوا۔ اس کردار کو اتنا جلدی نہیں جانا چاہیے تھا۔ کہیں انکل سلطان کو قتل تو نہیں کیا گیا۔ آگے جا کر واضح ہو جائے گا۔ علی اختر کی دربان پڑھی۔ بہت ہی عمدہ تاریخی کہانی۔ سکینا نے پرتھوی راج کے لیے محبت کو امر کر دیا اور اس کے ساتھ ہی زندگی کی بازی ہار دی۔ منظر امام کی اعلیٰ ظرف بہت ہی مختصر مگر پیاری اور سبق آموز داستان تھی۔ تنویر ریاض کی سازش میں ایونی ٹیلر نے پرانے بدلے چکانے کے لیے سیرینا کو جیل میں پہنچوا دیا۔ اے آر راجپوت کی رنگِ آسماں بہت ہی دلچسپ سی داستان ہے۔ مشرق و مغرب پر گھومتی پیار و محبت کے بیچ بوتی نفرت کے مینار کھڑے کرتی یہ تحریر بہترین ثابت ہوگی۔ اگر یہ لمبی چلی تو اس کو پڑھنے کا بڑا مزہ آئے گا۔ ثمر عباس کی غلط فہمی بھی اچھی رہی جس کا آخری نتیجہ بہت اچھا رہا۔ مرزا امجد بیگ ٹارگٹ لے کر آئے۔ یہ مقدمہ بیگ صاحب نے عدالت کے باہر سے خود ہی پکڑا اور پھر مخالفوں کو ناکوں چنے چبوا دیے۔ شاہ زین رضوان کی بدلہ بھی خوب رہی۔ ظفر اقبال ظفر کی عشقِ ناتمام کو... مکمل کر دیا۔ دل کشا بیگم نے اپنا اور صباحت کا ناتمام عشق فراست اور اپنی بیٹی کی شادی کے ذریعے مکمل کر دیا۔ محفل شعر و سخن بھی عمدہ رہی۔ محمد الیاس کی سایہ بہت ہی بہترین تحریر تھی۔ اس کی آخری پانچ سطروں نے کہانی کو بامِ عروج تک پہنچا دیا۔ ویلڈن۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی زندگی اداس ہے واقعی دل کو اداس سی کر گئی۔ ڈر اور خوف بری چیز ہیں انسان کو بزدل بنا دیتے ہیں۔ سلیم انور کی دیدہ دلیر بھی اچھی رہی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں مزید واقعات پڑھے۔ بڑا لطف آیا کئی دفعہ یہ واقعہ پڑھ چکا ہوں مگر ہر دفعہ ایک نیا سکون ملتا ہے، اگر اس کو بذریعہ قرآن کی صورت پڑھا جائے۔ شاکر لطیف کی شاطر بھی اچھی رہی۔ بروک نے راجر کے ساتھ بدنیتی کی تو راجر نے بھی اس کے ساتھ فراڈ کیا مگر ان دونوں کے ساتھ بڑا فراڈ ماڈل صاحب نے کیا۔ محمد یاسر اعوان کی دیو قامت بھی اچھی تحریر تھی۔ آخری صفحات پر طاہر جاوید مغل صاحب کی شکست کی فتح پڑھی۔ بہت ہی پیاری سی تحریر ہے۔ تحریر کا ایک ایک کردار اپنی جگہ پر بہترین ہے۔ سب سے نمایاں کردار نور ہے جو ایسے وقت سے گزر رہی ہے جو فی الحال اس کے لیے اچھا نہیں ہے پہلے اچھی ٹائمنگ کے باوجود ہارنا فرہاد درازی کی بے وفائی اور آخر میں انجری دیکھیے آگے کیا ہوتا ہے، نور کے ساتھ۔ کترنیں بھی بہت عمدہ رہیں۔ اس دفعہ ہر کہانی اپنی مثال آپ تھی خدا کرے آپ کا ادارہ اسی طرح پھلتا پھولتا رہے۔ آمین۔ (آپ کی دعاؤں اور پسندیدگی کے لیے بے حد شکریہ)۔‘‘

☒ محمد رفاقت واہ کینٹ سے شاملِ محفل ہیں۔ ’’سسپنس ڈائجسٹ ایک معیاری رسالہ ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس سے ہماری معلومات میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ کہانیوں میں دربان محترم علی اختر صاحب کی اور ایک تاریخی کہانی ہے جو کہ بہت ہی محنت سے لکھی گئی ہے۔ اسی طرح اعلیٰ ظرف منظر امام کی، سازش تنویر ریاض صاحب کی رنگِ آسماں اے آر راجپوت صاحب کی سلسلے وار کہانی بہت اچھی ہے اور اس کی اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ غلط فہمی ثمر عباس، ٹارگٹ مرزا امجد بیگ، بدلہ شاہ زین رضوان، سایہ محمد الیاس، وقت حسام بٹ، زندگی اداس ہے ڈاکٹر شیر شاہ سید، دیدہ دلیر سلیم انور، شاطر شاکر لطیف، دیو قامت محمد یاسر اعوان، شکست کی فتح طاہر جاوید مغل صاحب کی تحریریں بھی خوب ہیں۔ ان سب لکھنے والوں کو بہت بہت مبارک باد قبول ہو۔ خطوط میں بھی عبدالجبار رومی انصاری، محمد صفدر معاویہ، اشفاق شاہین... ایمانے شاہ، ادریس احمد خان، ام عبداللہ، صادق معاویہ، ڈاکٹر نائلہ نصر ملک، رمضان پاشا، زرین آفریدی، زاہد احمد، فضا شاہ، امتیاز احمد اور اوشا راشمی، محمد قدرت اللہ نیازی ریاض بٹ.............. نے جو تبصرہ رسالے کے متعلق کیا ہے وہ حقیقت ہے اور رسالے کی جان ہے۔ باقی تبصرے بھی بہت اچھے تھے۔ (محفل میں حاضری کا بہت شکریہ۔ لگتا ہے بہت جلدی میں تھے آپ)۔‘‘

✠ انجم فاروق ساحلی کی لاہور سے شرکت۔ ”سسپنس آج بھی کنگ ڈائجسٹ ہے۔ ٹائٹل خوش رنگ اور رومانوی تاثر پر مشتمل ہے لیکن اس بار ذاکر صاحب نے نزاکت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ سسپنس نے اپنے اجرا سے لے کر آج تک بہترین معاشرتی کہانیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ رکھا ہے۔ ماضی کے آئینے سے جھانکتا دربان کا عکس خوب ہے۔ فہرست میں ہاشمی مذرا رسول کے نام کے نیچے آپ کا نام شائع کر کے آپ کے اور پرچے کے وقار میں اضافہ کیا گیا۔ (شکریہ)۔ اعلیٰ ظرف اچھی کاوش ہے۔ اختتام خوب تھا۔ خطوط کی محفل بھرپور اور دلچسپ تھی۔ ریاض بٹ صاحب کا خط خوب ہے۔ صادق معاویہ کا جذبہ قابل قدر ہے۔ رنگ آسمان اچھی تحریر ہے۔ شاطر، دیوقامت، گھیراؤ اچھی تحریریں ہیں۔ ٹارگٹ اپنے مخصوص انداز میں خوب تھی۔ عدالتی کارروائی دلچسپی سے بھرپور تھی۔ شکست کی فتح خوب صورت تحریر ہے۔ سازش اور غلط فہمی متاثر نہ کر سکیں۔ سایہ، عشق ناتمام، بدلہ اور زندگی اداس ہے ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام ایمان افروز کاوش ہے۔ محفل شعروسخن میں بھی قارئین نے دلچسپی اور اشتیاق سے اپنی ذوق مندی کا ثبوت دیا۔ وقت تیزی سے اپنے نقوش ثبت کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جارہی ہے۔ (پسندیدگی کا شکریہ۔ آپ کی تحریر ابھی زیرِ غور ہے)۔"

✠ ریاض بٹ حسن ابدال سے شاملِ محفل ہیں۔ ”سرورق کی حسینہ کی مسکراہٹ مالٹے کی خشک پھانک جیسی لگی۔ (یہ کیا بات ہوئی جناب)۔ خیر آگے بڑھے۔ جون ایلیا کے انشائیے قول پر نظر پڑی ہمیشہ کی طرح سیدھا دل میں اتر گیا۔ چھوٹے لفظ بہت کچھ سمجھا دیتے ہیں۔ اس کے بعد پہنچے اپنے خطوں کی محفل میں۔ اپنا خط دیکھ کر خوشی اور طمانیت کا احساس ہوا۔ کرسیِ صدارت پر عبدالجبار رومی انصاری بیٹھے ہیں۔ مبارک ہو۔ آپ کا تبصرہ سیر حاصل اور خوب صورت لفظوں کا مرقع ہے۔ جو کچھ کہنا چاہتے تھے خوب کہا ہے۔ میرا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ محمد صفدر معاویہ کا تبصرہ بھی ان کے کہنہ مشق قلم کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ رمضان پاشا کافی پرانے تبصرہ نگار ہیں۔ ان کے تبصرے بھی محفل کی جان ہوتے ہیں۔ یہی بات زرین آفریدی بہن کے لیے بھی ہے۔ اوشا راٹھی میرے مشورے پر عمل کرنے کا شکریہ۔ باقی لوگوں کے تبصرے بھی قابلِ غور اور قابلِ تعریف ہیں۔ علی اختر کی تاریخ کے اوراق سے کشید کردہ کہانی دربان ایک خوب صورت کہانی ہے۔ محبت، محبت ہوتی ہے جو اپنا آپ منواتی ہے۔ سجکتا نے محبت کی۔ اس کو تباہ کردکھادیا اور آخر میں ان کی راکھ بھی ایک ہوگئی اور ان کی کہانی تاریخ کے اوراق میں امر ہوگئی۔ منظر امام کی چھوٹی سی کہانی اعلیٰ ظرف بہت کچھ کہہ گئی۔ محبت کی جس عمارت میں اعتماد کا سیمنٹ نہ ہو وہ حالات کے ایک ہی جھٹکے سے کسی وقت بھی دھڑام سے زمین بوس ہوسکتی ہے۔ تنویر ریاض کی سازش اس بار گزارے لائق تھی جیسا کہ کسی سیانے کا قول ہے کہ آپ اپنے بچوں کی خاطر دنیا کو ٹکڑے ٹکڑے کرسکتے ہیں۔ اسی طرح والدین کے درمیان غلط فہمی کو دور کر کے بچہ اپنے والدین کو ملا بھی سکتا ہے۔ ثمر عباس کی کہانی غلط فہمی میں یہی ہوا۔ پرچے میں حقیقت کے رنگ اچھے لگتے ہیں۔ مرزا امجد بیگ صاحب کی ٹارگٹ بھی ہمارے معاشرے کی عکاس کہانی ہے۔ مرزا صاحب نے اپنے روایتی داؤ پیچ سے جعلی اور ڈباپیر کو چاروں خانے چت کردیا۔ جو بندہ بھی جرم کرتا ہے وہ بے شک نیک نیتی سے یہ کام کرے لیکن جس بندے کو قربانی کا بکرا بنایا جاتا ہے اس کا تو کوئی قصور نہیں ہوتا پھر قانون جب حرکت میں آتا ہے تو مرزا امجد بیگ صاحب جیسے وکیل دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کردیتے ہیں۔ شاکر لطیف کی کہانی شاطر بھی ایک چونکا دینے والے انجام کی کہانی ہے۔ کچھ کام حفظِ ماتقدم کے طور پر کیے جاتے ہیں پھر سیر کو سوا سیر اور نہلے کو دہلا ضرور ملتا ہے۔ ماتھا نے ایک ایسے انسان کو مات بلکہ شہ مات دے دی جو اپنے آپ کو بہت کایاں اور عقلمند سمجھتا تھا، ویلڈن...... رضوانہ ساجد کی حضرت یوسف علیہ السلام کی چھوٹی قسط بھی ایمان کو تازہ کررہی ہے۔ یہ قصہ جتنی بار پڑھیں اپنا تاثر ضرور چھوڑتا ہے۔ محفل شعروسخن کی محفل خوب جمی ہوئی ہے۔"

✠ پرویز احمد لانگاہ حیدرآباد، جامشورو سے خط لکھ رہے ہیں۔ ”آج کل چھٹیوں پر پاکستان آیا ہوا ہوں تو بس ہر طرف دیس کی خوشبو ہی محسوس ہورہی ہے۔ گھروالوں اور دوستوں سے ملاقاتیں تو ہو ہی رہی ہیں لیکن میری اصل خوشی کا سبب بنی ہے کراچی یاترا۔ پچھلے دنوں میں نے جے ڈی پی کے معروف رائٹر حضرات سے ملاقات کی۔ یقین کریں آپ کے توسط سے پیدا ہونے والی یہ محبتیں اور ملاقاتیں اتنی خوشی سے سرشار کرچکی ہیں کہ یادوں کا جیسے خزانہ اکٹھا ہوگیا ہو۔ سسپنس کے تازہ شمارے کا خصوصی انتظار تھا کیونکہ مُغل صاحب کی آمد کی اطلاع پاکیزہ میں آئے اشتہار سے مل چکی تھی۔ ہمیشہ کی طرح وہ آئے، انہوں نے دیکھا اور ہمارے دلوں کو فتح کرگئے۔ جاری ہے دیکھ کر بڑا غصہ آیا لیکن پی گئے کہ شکست کی فتح کا اگلا حصہ بھی تو پڑھنا ہے۔ وقت واقعی ایک یادگار ترین سلسلہ ہے۔ حسام بٹ صاحب اپنی صلاحیتیں وکیل بابو اور پولیس بابو پر ضائع کررہے تھے۔ (صلاحیتیں کبھی ضائع نہیں جاتیں وہ بھی اپنی ایک الگ کاوش ہے)۔ یہ قسط تھوڑی سلو لگی لیکن امید ہے کہ اگلی بار بٹ صاحب ایکشن اور ہنگاموں کو کراچی کی سڑکوں پر لے ہی آئیں گے۔ مقبول بھٹی کا کردار حیرت کا باعث ہے اور دیکھتے ہیں کہ اس کی پیش گوئی پر اب ڈیلفینا یا شاروم میں سے کون سامنے آتا ہے؟ ناصر ملک بھی طویل عرصے سے غائب ہیں۔ ان کو بھی تلاش کرکے لے آئیں۔ چھوٹی کہانیوں میں منظر امام چھاگئے۔ سازش، دیوقامت اور دیدہ دلیر بھی بہترین تراجم تھے۔ ایم الیاس کی سایہ دل پر گہرا اثر چھوڑ گئی اور مزہ ہی آگیا۔"

✠ محمد زریان سلطان اردو بازار کراچی سے چلے آرہے ہیں۔ ”عرصہ ہوا سسپنس سے ناتا جوڑے مگر اب کبھی کبھی شریکِ محفل

بھی ہو جاتے ہیں۔ بہت اچھا لگتا ہے اپنا خط دیکھ کر۔ نومبر کا شمارہ بھی ہمیشہ کی طرح لاجواب رہا۔ دربان تاریخی کہانی نے دل جیت لیا۔ بہت اچھی رہی۔ وقت کی رفتار اگرچہ سست رہی مگر وقت جیسا بھی ہو گزر ہی جاتا ہے۔ لہٰذا اسے بھی پڑھ لیتے ہیں ویسے حسام بٹ صاحب برائے مہربانی وقت کی رفتار تھوڑی تیز کر دیں تو کہانی کا مزہ دوبالا ہو جائے۔ نیا سلسلہ رنگِ آسماں پڑھا ذرا مختلف انداز میں شروع ہونے والی یہ نئی داستان دیکھیے آگے چل کر کیا رخ اختیار کرتی ہے۔ لہٰذا اپنی رائے محفوظ رکھتے ہوئے ہم مرزا امجد بیگ کی جانب بڑھ گئے جنہوں نے اپنے مطلوبہ ٹارگٹ کو حاصل کرنے کے لیے دلائل اور ثبوتوں کا انبار لگا دیا اور عدالت کے کٹہرے میں دشمن کے چھکے چھڑا دیے۔ ویلڈن۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کے تو کیا ہی کہنے...... ہمیشہ کہانی ختم کرنے کے بعد بھی کافی دیر تک ایک سحر سا طاری رہتا ہے اور دل و دماغ کہانی کے پیچ و خم میں ہی الجھا رہتا ہے۔ زندگی اداس ہے اس بار بھی ایسی کہانی ثابت ہوئی۔ ظفر اقبال ظفر کی کہانی عشق ناتمام نے تو اس بار چونکا دیا۔ بہت خوب صورت تحریر۔ احساسات و جذبات کی دلنشین عکاسی۔ محمد الیاس کی سایہ نے بھی ایک اچھا تاثر چھوڑا۔ انسان جب بھی قدرت اور فطرت سے دور بھاگتا ہے کسی نہ کسی مصیبت میں ضرور گرفتار ہو جاتا ہے۔ یہی حال منزہ کا بھی ہوا مگر بے چاری جعلی پیر فقیری کے ظلم و ستم کا شکار ہوئی جبکہ اصل خطاوار اس کا شوہر تھا جس کی وجہ سے منزہ کو اتنی اذیت سہنی پڑی۔ تنویر ریاض کی سازش اور شاہ زین رضوان کی بدلہ نے بھی بہت متاثر کیا۔ ویلڈن۔ آخری صفحات کی کہانی شکست کی فتح کے تو کیا ہی کہنے۔ طاہر جاوید مغل کا انداز ہی اتنا سحر انگیز ہوتا ہے کہ موضوع کوئی بھی ہو۔ دل پر ضرور اثر کرتا ہے۔ اس بار بھی خواتین کی اہمیت عزت اور صلاحیتوں پر بہت شاندار تحریر ہے۔ اب دیکھیے اگلے حصے میں کیا ہوتا ہے کیونکہ آخر میں جاری ہے نے ہمیں منہ چڑا دیا تھا۔ بہرحال۔ شاکر لطیف کی شاطر کہانی بھی اپنا رنگ جمانے میں کامیاب ہوگئی۔ اب پرانے مصنف کے ساتھ ساتھ نئے رائٹرز کو بھی جگہ ملتی جا رہی ہے یہ بھی ایک اچھا قدم ہے۔ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی۔ بے حد ضروری ہے کیونکہ آنے والے کل میں جانے کون بڑے قلمکار کی حیثیت سے اپنا لوہا منوالے۔ ویلڈن۔ (بہت شکریہ جناب آپ کے زریں خیالات کی ہم قدر کرتے ہیں۔ سسپنس کی تحریروں سے آپ محظوظ ہوئے یہ جان کر ہمیں بھی اچھا لگتا ہے اور یہی بات ہمیں مزید اچھا کام کرنے پر اکساتی ہے)۔"

✠ اوشا راٹھی مٹھی سندھ سے۔ "18 اکتوبر کو سسپنس ڈائجسٹ کے درشن ہو گئے تھے مگر تہوار کی تیاری اور گہما گہمی کی وجہ سے پڑھ نہ پائے۔ 19 اور 20 اکتوبر کو ہمارا دیوالی کا تہوار بہت زبردست اور خوشگوار گزرا (مبارکاں بھئی)۔ ہماری اس خوشی میں ہماری کافی مسلم فرینڈز بھی شامل ہوئیں اور خوشیوں کو دوبالا کیا۔ اس طرح سسپنس ڈائجسٹ کی ٹائٹل گرل بھی بہت خوش رنگ کپڑوں میں ہمارے تہوار میں شرکت کرنے آئی تھی۔ تبصرے سب کے بہترین تھے سرسری طور پر پڑھ پائی ہوں تمام تبصرہ نگار شاہینوں کی پرواز پر تھے۔ ویلڈن۔ طاہر جاوید مغل کی شکست کی فتح، دل کو بہت بھائی۔ عین النور اور ذوالقرنین کی داستان محبت آگے پتا نہیں کیا موڑ لے گی۔ انتظار رہے گا۔ رنگِ آسماں اے آر راجپوت کی داستان کافی اچھی لگ رہی ہے۔ داستان کا ماحول اور تھیم بھی متاثر کن ہے۔ ریتا اور شوکت سے شروع یہ کہانی اب کس پر ختم ہوگی۔ دوسری طرف ریحان اور شاہ زمان کا ٹولہ بھی اپنے مشن پر پہنچ کر پتا نہیں کیا کارنامہ انجام دے گا۔ رات کو انگریزوں کے خیمے کے باہر گریزلی (Grizzly) کی موجودگی...... سب خیر ہو۔ دوسری قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ علی اختر جی کی دربان تو اے ون رہی بہت ہی دلچسپ اور لاجواب داستان رہی۔ پرتھوی راج میرا فیورٹ کردار ہے۔ کم تو سمجھتا بھی نہیں تھی' اپنے دربان ہستی کے ساتھ ستی ہوئی یہ تھی ان کی لازوال محبت۔ خالد عباسی کی مصوری بھی بیسٹ ہے۔ مراسلے سپرہٹ رہے اور محفل شعر و سخن کا تو جواب نہیں ویلڈن اشعار کے سلیکشن کے لیے۔ تینوں اعزازی اشعار کے علاوہ، وزیر محمد خان، ریاض بٹ، محمد قدرت نیازی، ناہید یوسف، سعدیہ ریحان اور اسد خان کے انتخاب بہت اعلیٰ و آفریں تھے۔"

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے

صبا سحر، کراچی۔ وسیم احمد، ملتان۔ عاصم خان، کوئٹہ۔ اقبال احمد، کراچی۔ نازنین بشیر، سکھر۔ فرحانہ عاصم، سرگودھا۔ شاہین شکیل، ٹنڈو الہ یار۔ ریحانہ کریم، لالہ موسیٰ۔

نوشتۂ اتحاد

ڈاکٹر ساجد امجد

انفرادی طور پر ہر گزرا لمحہ اپنے دامن میں کوئی نہ کوئی یاد سمیٹ لیتا ہے مگر جب یہ لمحات کچھ خاص ادوار میں ڈھل جاتے ہیں تو اس پورے عہد کے بے شمار واقعات کسی داستان کی صورت آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ جیسے کہ برہان نظام شاہ اور دیگر اہم کرداروں پر مشتمل زیر نظر تحریر اپنی مکمل جزیات کے ساتھ کئی رازوں اور گمشدہ گوشوں پر بھرپور روشنی ڈالتے ہوئے اپنی دلچسپی برقرار رکھے ہوئے ہے۔ جنگی حالات ہوں یا محلاتی سازشیں صاحب اقتدار کی تدبیروں اور کاوشوں کا حال اور جستجو کا رنگ ایک جیسا ہے۔ اسے بھی کم عمری میں جب تخت شاہی ملا تو اس کے مصاحبین کی ہوس اور طمع نے اپنے پنجے کچھ طرح پھیلائے کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے... کہ یہی انجام بالآخر ہر بادشاہ اور صاحب اقتدار کا ہوتا ہے۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

حرم سرا کے کمروں میں لگے قد آدم آئینے سنسان پڑے تھے۔ کنگھی، چوٹی، مسّی کچھ بھی تو نہیں تھا۔ ٹیکا، جھومر، کنگن کچھ بھی تو نہیں تھا۔ ہوتا بھی کیوں۔ تخت ابھی نابالغ تھا۔ سات سال کا بچہ برہان نظام شاہ احمد نگر کے تخت پر جلوہ گر ہوا تھا۔ وہ گود میں بیٹھنے کے لائق تھا، بٹھانے کے لائق نہ تھا۔ حرم سرا عورتوں سے بھرا ہوا تھا مگر عورتوں کی یہ تعداد برہان نظام شاہ کے باپ کے زمانے میں جمع ہوئی تھی۔ برہان نظام شاہ کی عمر کا تقاضا تھا کہ وہ اس تعداد سے بے خبر رہے۔ حرم سرا میں موجود عورتوں کے لیے یہ صورتِ حال مایوس کن بھی تھی اور تکلیف دہ بھی۔ مسلسل سکوت تھا جو حرم سرا کی دیواروں پر طاری تھا۔ دل بہلانے کے لیے کچھ نوجوان شوخ عورتوں کی آپس میں چھیڑ چھاڑ تھی جس میں دن گزر رہے تھے۔

اس افسردہ ماحول میں عائشہ تھی جس کے قدم پچھلے دو دنوں سے زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ اس کے کپڑوں کا صندوق مسلسل کھلا ہوا تھا۔ ایک کے بعد ایک جوڑا بدل کر دیکھ رہی تھی۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر زاویے بدل بدل کر ہنسی کا زیور ہونٹوں پر سجا رہی تھی۔ یہ احتیاط بھی کر رہی تھی کہ کوئی دیکھ نہ رہا ہو۔

انداز اپنا آئینے میں دیکھتے ہیں وہ
اور یہ بھی دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو

کوئی دیکھے نہ دیکھے۔ اس کی عزیز ترین سہیلی گلنار اس کی اس تبدیلی کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ آخر گلنار سے رہا نہیں گیا۔ عائشہ فوارے کے نزدیک اپنے خیالوں میں گم بیٹھی تھی کہ گلنار بھی وہاں پہنچ گئی۔

''عائشہ...... یہاں اکیلی بیٹھی کیا کر رہی ہو؟''

''اب کہاں اکیلی ہوں۔ تم جو یہاں بیٹھی ہو۔''

''میں تو اب یہاں آئی ہوں۔ تم تو کئی دن سے مجھ سے کترا رہی ہو۔''

''میں تم سے کیوں کتراؤں گی۔ ایک تم ہی تو میری سہیلی ہو۔ ورنہ میں تو یہاں کے سازشی ماحول سے تنگ ہی ہوں۔''

''تم کئی دن سے بننے سنورنے میں مشغول ہو۔ خیریت تو ہے...... کہیں ایسا تو نہیں کہ برہان نظام شاہ وقت سے پہلے بالغ ہو گئے ہوں؟'' گلنار نے ایک آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

''گلنار! تو بڑی حرافہ ہے۔ ایسی باتیں کرتے ہوئے تجھے شرم نہیں آتی۔''

''لو، اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ مجھے تو یہ دکھ ہے کہ ہم بے چارے برہان نظام شاہ کے کسی کام نہیں آ سکتے۔ کیا تجھے افسوس نہیں ہوتا کہ ہم پنجرے میں بند قیدی کی سی زندگی گزار رہے ہیں۔ نہ کہیں آنا نہ جانا۔ برہان نظام شاہ آتا بھی ہے تو اپنی ماں سے لگا بیٹھا رہتا ہے۔''

''کیا کیا جائے نظام شاہ بحری کی کوئی جوان اولاد تھی ہی نہیں۔ وصیت کرتا تو کس کے لیے۔ اس نے برہان نظام شاہ کو ولی عہد مقرر کر کے تمام امراء سے اطاعت و وفاداری کے وعدے لیے۔''

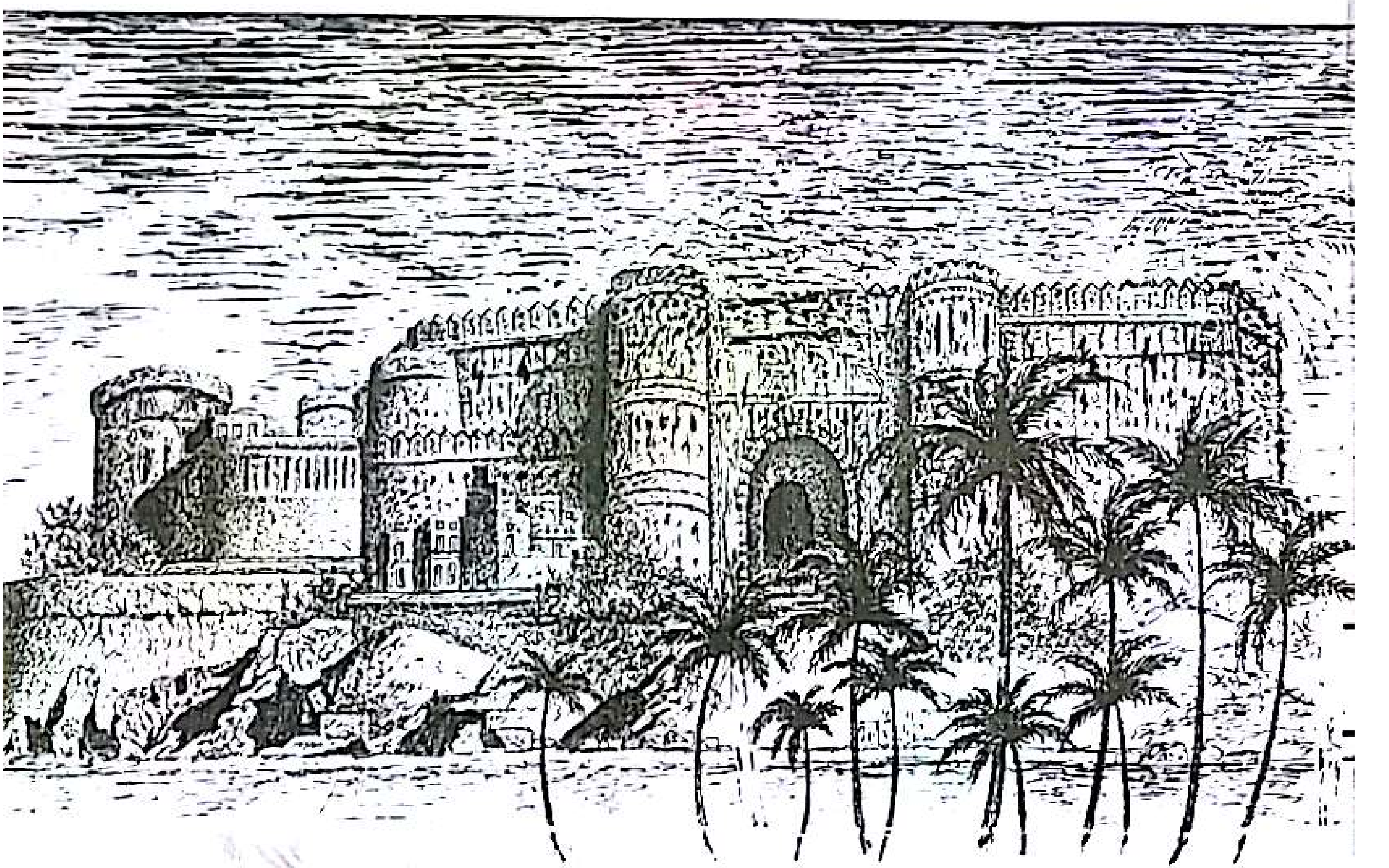

''تیرے خیال میں یہ امراء اپنے وعدے پر قائم ہیں۔ ملکی معاملات صحیح طور پر چلا رہے ہیں۔''

''ہمیں ان معاملات سے کیا سروکار۔ امراء جانیں اور ان کا کام۔''

''اب اتنی بھولی بھی مت بنو۔ میں نے تو سنا ہے رومی خاں، کرم خاں وغیرہ اس بندوبست سے خوش نہیں ہیں اور کمل خاں دکنی سے حسد رکھتے ہیں جو برہان نظام شاہ کے نام سے سلطنت چلا رہا ہے اور ملکی و مالی معاملات پر قبضہ کیے بیٹھا ہے۔''

رومی خاں کا نام آتے ہی عائشہ کا دل حلق میں آ کر اٹک گیا۔ وہ بھی راز کھل گیا۔ گلنار کو کہیں سے سن گن مل گئی ہے لیکن اس نے اپنی کسی کمزوری سے اسے تقویت نہیں دینے دی اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''تو یہ کیا باتیں لے کر بیٹھ گئی۔ مجھے تو چڑ ہوتی ہے ایسی باتوں سے۔''

''اچھا بیٹھو تو سہی۔ کچھ اور باتیں کر لیتے ہیں۔''

''نہیں، اب میں چلوں گی۔ شہزادہ راجا جیو سو رہا تھا تو مجھے اتنی فرصت مل گئی۔ اب وہ اٹھ گیا ہوگا ذرا جا کر اسے دیکھوں۔''

عائشہ نے زیادہ بات کرنا مناسب نہ سمجھا اور وہاں سے اٹھ گئی۔

وہ فوارے کے نزدیک سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آئی تو سر سے پاؤں تک کانپ اٹھی۔ شہزادہ راجا جیو کی والدہ کمرے میں موجود تھیں اور کافی پریشان نظر آ رہی تھیں۔

''عائشہ! کہاں چلی گئی تھیں۔ شہزادہ سو کر اٹھ گیا ہے۔ اگر اپنے آپ کو کوئی نقصان پہنچا لیتا تو جانتی ہے کیا ہو جاتا۔''

''میں ابھی گئی تھی، ابھی آ گئی۔''

''یہی تو پوچھ رہی ہوں گئی کیوں تھی۔ اگر گئی تھی تو شہزادے کو ساتھ لے کر جاتی۔''

عائشہ کی یہ حیثیت نہیں تھی کہ وہ ہر بات کا جواز پیش کرتی۔ اس نے خاموش رہنے ہی میں عافیت سمجھی اور آگے بڑھ کر راجا جیو کو گود میں اٹھا لیا۔

راجا جیو، برہان نظام شاہ کا چھوٹا بھائی تھا جس کی عمر ابھی صرف چار سال تھی۔ عائشہ شہزادے کی دایہ تھی یعنی شہزادے کی دیکھ بھال اس کی ذمے داری تھی۔

''آئندہ مجھے شکایت نہ ملے۔'' راجا جیو کی والدہ نے کہا اور کمرے سے نکل گئیں۔

ان کے چلے جانے کے بعد عائشہ نے شہزادے کو گود سے نیچے اتار دیا اور آنے والی رات کے بارے میں سوچنے لگی۔ وہ یہاں سے کیسے نکل سکے گی؟ راجا جیو کو اکیلے چھوڑ کر کیسے جائے گی؟ بات ایسی بھی نہیں کہ کسی کو ہمراز بنا سکے کسی سے مدد لے سکے پھر ایک حل اس کی سمجھ میں آ گیا۔ اپنی جگہ اگر گلنار کو سلا جائے۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے خوش ہو گئی لیکن فوراً ہی اپنے خیال کی تردید بھی کر دی۔ گلنار یہ ضرور پوچھے گی کہ میں کس سے ملنے اور کہاں جا رہی ہوں۔ اگر میں اس وقت چھپا بھی لوں تو کسی وقت یہ راز کھل ہی جائے گا۔ میری کمزوری اس کے ہاتھ آ جائے گی۔ وہ اس کمزوری کو کسی وقت بھی استعمال کر سکتی ہے۔ پھر میں کیا کروں؟ اسے اب ایسی الجھن تھی کہ اس کے ہاتھ پاؤں پھول رہے۔ تھم۔ ایک لمحے کو اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ جانا ہی ملتوی کر دے لیکن اس پر لالچ غالب آ گیا۔ پھر میں کیا کروں؟ ایک خیال نے اس کے بدن میں تازہ روح پھونک دی۔ میں بیمار بھی تو ہو سکتی ہوں۔ اس نے اپنا دوپٹا اپنے سر پر باندھ لیا اور لیٹ گئی۔ راجا جیو اس کی اس ہیئت کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

''کیا آپ کے سر میں درد ہو رہا ہے؟''

''ہاں۔ شاید آپ کو آج رات اپنی والدہ کے ساتھ سونا پڑے۔''

''نہیں۔ میں وہاں نہیں سو سکتا۔''

''آپ کو اپنی بوا کی تکلیف کا خیال نہیں؟''

''آپ حکیم فتح اللہ خاں کو بلوا کر ان سے دوا کیوں نہیں لیتیں؟''

''تھوڑی سی تکلیف کے لیے انہیں کیا زحمت دوں۔''

''جب تھوڑی سی تکلیف ہے تو امی حضور کو کیوں زحمت دے رہی ہیں؟''

''ایک تو آپ باتیں بہت کرتے ہیں۔ جو ہوگا تھوڑی دیر میں فیصلہ کروں گی۔''

''جی بہتر۔''

معصوم راجا جیو کی بات عائشہ کی سمجھ میں آ گئی۔ اسے حکیم فتح اللہ خاں کو بھی گواہ بنا لینا چاہیے۔ اس نے اپنی ملازمہ چمپا کلی کو بلایا۔

''ذرا دوڑ کر حکیم صاحب کو تو بلا کر لے آ۔''

''ان سے کیا کہوں؟''

''کہنا سر میں درد ہے۔ وہ اگر دوا دیں تو مت لینا۔

انہیں بلا کر لانا اور اگر ہو سکے تو راجا جیو کی والدہ کو بتاتی ہوئی حکیم صاحب کی طرف جانا۔''

چمپا کلی دوڑتی ہوئی گئی اور تھوڑی دیر میں حکیم فتح اللہ خاں تشریف لے آئے۔ عائشہ سر پر پٹی باندھے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ حکیم صاحب نے نبض دیکھی۔

''کیا آپ کے سر میں واقعی درد ہے؟''

''میں آپ سے غلط بیانی کیوں کروں گی۔''

''ہاں، یہ بھی ہے۔ بہر حال میں دوا دے رہا ہوں۔ اسے کھالیں، صبح تک درد چلا جائے گا۔'' حکیم فتح اللہ خاں رخصت ہوئے تھے کہ چمپا کلی آگئی۔

''اماں حضور فرما رہی ہیں کہ شہزادہ حضور کو ان کے پاس بھیج دیا جائے۔ ان کا آج آپ کے پاس سونا ٹھیک نہیں۔ آپ کی طبیعت ناساز ہے۔''

تیر نشانے پر لگا تھا۔ شہزادے کو خود اس کی والدہ نے طلب کر لیا تھا۔ یہی وہ چاہتی بھی تھی۔ اس نے اسی وقت شہزادے کو اس کی ماں کے پاس بھیج دیا۔ اب اسے رات کے وقت یہاں سے نکلنے کا بندوبست کرنا تھا جس کا انتظام وہ پہلے ہی کر چکی تھی۔ اسے اسی وقت زر باز خاں سے ملاقات کرنی تھی جو حرم سرا کا انچارج تھا۔ اس سے ملنا مشکل بھی نہیں تھا کیونکہ بات ہو چکی تھی۔

بات ہی ایسی تھی کہ وہ زر باز خاں کے سوا کسی کو نہیں بتا سکتی تھی۔ زر باز خاں اس کا رشتے دار تھا۔ اس کے باوجود اس نے زر باز خاں کو پوری بات نہیں بتائی تھی۔

اسے چند روز پہلے رومی خاں کا پیغام ملا تھا کہ وہ کسی روز موقع دیکھ کر اس سے ملاقات کرے۔ عائشہ نے اس پیغام کا نہ جانے کیا مطلب لیا۔ اس نے اپنی دانست میں یہ سمجھا کہ رومی خاں جیسے دولت مند امیر کی نگاہِ التفات اس کی طرف ہو گئی ہے اور اب اس کے دن پھرنے والے ہیں۔ وہ یہ سمجھنے میں حق بہ جانب تھی کہ جب تخت پر سات سالہ بچہ جلوہ افروز ہو تو حرم سرا کا امراء کی گرفت میں آجانا لازمی ہے۔ اس کی مثال گلنار کی شکل میں اس کے سامنے تھی جسے ایک امیر میاں جمال الدین نے اپنی خلوت میں طلب کیا تھا۔ رومی خاں نے اسے طلب کیا تھا اس کے لیے یہی بہت تھا۔

اس نے سر کی پٹی اتاری، حکیم صاحب کی دی ہوئی دوا ایک کونے میں پھینکی اور زر باز خاں سے ملاقات کے لیے پہنچ گئی۔

حرم سرا کی خواتین زر باز خاں سے اپنے مسائل کے سلسلے میں اکثر ملاقاتیں کیا کرتی تھیں اس لیے خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ زر باز خاں اس کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی اس کے چہرے پر اطمینان آگیا۔

''میں نے رومی خاں تک آپ کا پیغام پہنچا دیا تھا۔ اس کے آدمی اب تک اس مقام پر پہنچ گئے ہوں گے جہاں تک آپ کو پہنچا کر میرا کام ختم ہو چکا ہوگا۔ واپسی میں آپ کو خود ہی حرم سرا تک پہنچنا ہوگا۔''

''میں خود کیسے آؤں گی؟''

''جس خفیہ راستے سے میں آپ کو لے جاؤں گا، آپ اسی خفیہ راستے سے واپس آجائیے گا۔''

''میں چلنے کے لیے تیار ہوں۔ ایک چکر اپنے کمرے کا لگا لوں۔ پھر واپس آتی ہوں۔''

عائشہ اپنے کمرے میں آگئی۔ کچھ دیر بناؤ سنگھار میں مصروف رہی پھر بستر کو اس حالت میں تبدیل کر دیا جیسے کوئی سو رہا ہے۔ چند تکیے رکھ کر اوپر سے ایک موٹی چادر ڈال دی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا کر دیا اور باہر نکل آئی۔

زر باز خاں تیار کھڑا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو کچھ ہدایات دیں اور عائشہ کو لے کر حرم سرا سے باہر جانے کے لیے آگے بڑھا۔ آخری دروازے کے قریب ایک بوڑھی عورت سامنے آگئی۔ وہ بڑی بے ہودگی سے ہنس رہی تھی۔ عائشہ نے اپنے کپڑوں میں چھپائی ہوئی چاندی کی چند اشرفیاں اس عورت کے ہاتھ پر رکھ دیں۔ عورت کی ہنسی ہونٹوں میں رہ گئی اور اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

اس حرکت سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس قسم کے واقعات یہاں اکثر پیش آتے رہتے ہیں۔ حرم سرا کی عورتیں امراء کے پاس اکثر جاتی رہتی ہیں۔

زر باز خاں عائشہ کو لے کر آگے بڑھ گیا۔ کچھ دور چلنے کے بعد وہ درختوں کے ایک جھنڈ میں داخل ہو گئے۔ یہاں اندھیرا ضرور تھا لیکن ایسا راستہ بھی تھا کہ تیزی سے چلا جا سکتا تھا۔ چلتے چلتے وہ ایک گھنے درخت کے نیچے

اصل دلیری

ایک بادشاہ نے میدانِ جنگ میں سپاہی کی دلیری پر خوش ہو کر انعام و اکرام دیا اور پوچھا۔ ''عمر میں سب سے دلیری کی بات تم نے کون سی کی ہے؟''

''عالی جاہ۔'' سپاہی نے دست بستہ عرض کیا۔ ''میں نے بارہ سال اپنی بیوی کے ساتھ گزارہ کیا ہے۔''

پہنچ گئے۔ یہ درخت یہاں اکیلا کھڑا تھا۔ شاید یہی پہچان تھی کہ منزل آ گئی۔ اس درخت سے ایک زنجیر بندھی ہوئی تھی۔ زرباز خاں نے اندھیرے میں زنجیر ٹٹولی اور اسے کھینچا۔ خودکار نظام حرکت میں آیا اور زمین کا کچھ حصہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ زرباز خاں نے کچھ دیر آنکھوں کو اندھیرے کا عادی کیا اور پھر اس سرنگ میں بنی سیڑھی پر قدم رکھ دیا۔ اندھیرے میں ٹٹول کر مشعل تلاش کی۔ وہ چقماق اپنے ساتھ لایا تھا۔ مشعل روشن کی اور عائشہ کو اندر بلالیا۔ یہاں بھی ایک زنجیر لگی ہوئی تھی جسے کھینچنے پر زمین اپنی جگہ آ گئی۔

''جب تم واپس آؤ تو اس مشعل کو بجھا دینا اور باہر نکل آنا۔ درخت سے بندھی زنجیر کو کھینچنا تو زمین اپنی جگہ آ جائے گی۔''

''زرباز خاں! ایک بات پوچھوں؟''

''پوچھو۔''

''حرم سرا سے جتنی عورتیں باہر جاتی ہیں، وہ اسی وقت اور پریشانی اٹھانے کے بعد جاتی ہوں گی۔''

''ضروری تو نہیں لیکن تمہارا معاملہ دوسرا ہے۔ تم شہزادے کی دایہ ہو اور پھر تمہیں رات کے وقت نکلنا تھا اس لیے میں نے یہ احتیاط برتی۔''

''اگر میں دن کے وقت کہیں جانا چاہوں؟''

''دن کے وقت اتنی دیکھ بھال نہیں ہوتی۔ اکثر عورتیں اپنے رشتے داروں سے ملنے قلعے سے باہر چلی جاتی ہیں۔''

اندھیری سرنگ میں قدرتی روشنی ہوگئی تو دونوں نے آگے چلنا شروع کیا۔ سرنگ زیادہ لمبی نہیں تھی۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد سرنگ کا دوسرا کنارہ آ گیا۔ یہاں بھی زنجیر ہلائی تو راستہ بن گیا۔ دونوں باہر آ گئے۔

اندھیرے میں کسی کے وجود کا احساس تک نہیں ہو رہا تھا۔ اچانک ایک گھڑسوار ایک درخت کی اوٹ سے باہر آیا۔

''مجھے رومی خاں نے بھیجا ہے۔''

''کیا سواری لائے ہو؟''

''اس درخت کے پیچھے پالکی تیار کھڑی ہے۔ تشریف رکھیے۔''

پالکی واقعی موجود تھی۔ عائشہ پالکی میں بیٹھ گئی۔ پالکی کے ساتھ آئے ہوئے دو آدمی آگے بڑھے اور پالکی کو اٹھالیا۔ گھڑسوار آگے بڑھ گیا اور دو آدمی پالکی اٹھا کر چل دیے۔

چند درختوں سے گزرنے کے بعد پالکی پکی سڑک پر آ گئی۔ یہ پالکی ایک محل کے صدر دروازے سے گزرنے کے بعد رک گئی۔

پالکی سے اتار کر اسے ایک وسیع کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ اسے جس عزت کے ساتھ یہاں تک پہنچایا گیا تھا، اس پر اسے اپنی ذات پر فخر ہو رہا تھا، اپنے حسن پر ناز ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ رومی خاں جیسے امیر کی نظروں میں میری کتنی وقعت ہے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ رومی خاں ابھی اسے خلوت میں طلب کرے گا اور وہ صبح ہونے سے پہلے پہلے امیر ترین عائشہ بن کر قلعے میں لوٹے گی۔ اس کے بعد شاید نوکری کی ضرورت بھی نہ رہے۔ وہ نوکری چھوڑ کر اپنی بہن کے گھر چلی جائے گی اور آرام سے زندگی گزارے گی۔ اس کی سوچیں اس وقت ٹوٹ گئیں جب ایک ملازمہ کمرے میں داخل ہوئی۔ نہایت ادب سے سلام کیا اور اسے ایک دوسرے کمرے تک پہنچا دیا۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ یہ تصور لے کر آئی تھی کہ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کا سامنا رومی خاں سے ہوگا لیکن کمرے میں داخل ہوتے ہی اسے دھچکا سا لگا تھا۔ اس نے کمرے میں رومی خاں، کرم خاں اور امیر خاں کو بیٹھے دیکھا۔ یہ کیسی خلوت ہے؟ یہ تینوں یہاں کیوں موجود ہیں؟

''عائشہ! تمہیں شاید معلوم نہ ہو کہ ہم نے تمہیں یہاں کیوں بلایا ہے۔''

''میں تو کچھ نہیں جانتی۔ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ آپ نے مجھے بلایا اور میں چلی آئی۔''

''بات یہ ہے کہ ہمیں تم سے ایک اہم کام لینا ہے اور وہ کام تم ہی کر سکتی ہو۔''

''میں کب سے اتنی اہم ہوگئی؟''

''تم اہم اس لیے ہو کہ شہزادہ راجا جیو تمہاری نگرانی میں ہے۔''

''میرے آنے سے راجا جیو کا کیا تعلق؟''

''تمہیں شاید معلوم نہ ہو کہ احمد نگر کی بھلائی کے لیے راجا جیو کی کیا اہمیت ہے۔''

''میں اب بھی کچھ نہیں سمجھی۔''

''بات صاف ہے۔ تخت پر برہان نظام شاہ بیٹھا ہے۔ مکمل خاں دکنی اور اس کا بیٹا شہزادے کی کم سنی سے فائدہ اٹھا کر خوب فائدہ اٹھا رہا ہے۔ ایسے کام کر رہا ہے جو احمد نگر کے مستقبل کے لیے قطعی فائدہ مند نہیں، ہم سے

کوئی مشورہ ہی نہیں لیا جارہا ہے۔ یہ دونوں باپ بیٹے غرور و تکبر کا نمونہ بنے ہوئے ہیں۔ ان کا یہ غرور ان کے ساتھ ساتھ احمد نگر کو بھی ڈبو دے گا۔ پڑوس میں اسمٰعیل عادل شاہ بیٹھا ہوا ہے۔ ہماری ذرا سی غفلت ہوئی تو وہ احمد نگر کی اینٹ سے اینٹ بجادے گا۔ احمد نگر کو بچانے کے لیے ضروری ہے کہ برہان نظام شاہ کو تخت سے اتار کر راجا جیو کو بٹھایا جائے۔''

''میں پھر بھی نہیں سمجھی کہ اس میں، میں کیا کرسکتی ہوں؟''

''ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

''میری کیا حقیقت کہ میں آپ کی مدد کرسکوں۔''

''تم ہماری مدد اس طرح کرسکتی ہو کہ راجا جیو کو کسی طرح ہم تک پہنچادو۔''

''یہ کام میرے بس کا نہیں۔ میں یہ نہیں کرسکتی۔''

''احمد نگر کو بچانے کے لیے بھی نہیں؟''

''احمد نگر سے مجھے محبت ہے۔ اسے بچانا بھی چاہتی ہوں لیکن یہ کام میرے بس کا نہیں۔''

''سوچ لو۔ اس چھوٹے سے کام کے لیے ہم تمہیں اتنی دولت دیں گے کہ تمہاری نسلیں کھائیں گی۔''

''کھائیں گی تو جب، جب میں زندہ رہوں گی۔ اس جرم کی پاداش میں مجھے زندہ کون چھوڑے گا۔''

''تمہاری جان کی ضمانت ہم لیتے ہیں۔''

''آپ حرم سرا میں آکر مجھے نہیں بچاسکتے اور مجھے تو وہیں رہنا ہے۔''

''تم راجا جیو کو لے کر یہاں آجاؤ پھر تم یہیں رہو گی یا جہاں جانا چاہو چلی جانا۔''

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔''

اتنی دیر میں دو ملازمائیں دو چھوٹے تھال اٹھائے کمرے میں داخل ہوئیں اور تھال رکھ کر چلی گئیں۔ کرم خاں آگے بڑھے اور دونوں تھالوں کے خوان پوش ہٹادیے۔ ایک تھال میں زیورات تھے، دوسرے میں سونے چاندی کے سکے۔

''اس کے علاوہ بھی تمہارے لیے بہت کچھ ہے۔'' رومی خاں نے کہا۔

دونوں تھالوں کو دیکھ کر عائشہ کا ایمان ڈگمگا گیا۔ اس کے لہجے میں نرمی آگئی۔

''راجا جیو کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچے گا؟''

''نہ صرف یہ کہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا بلکہ وہ تخت پر بیٹھے گا اور تم راج کروگی۔ اس کے پردے میں تم حکومت

دو فائدے

مقدمہ نگاری کی پہلی شرط یہ ہے کہ آدمی پڑھا لکھا ہو۔ اسی لیے بڑے بڑے مصنف بھاری رقمیں دے کر اپنی کتابوں پر پروفیسروں اور پولیس سے مقدمے لکھواتے اور چلواتے ہیں اور حسب منشا بدنامی کے ساتھ بری ہوتے ہیں۔ فاضل مقدمہ نگار کا ایک پیغمبرانہ فرض یہ بھی ہے کہ وہ دلائل ونظائر سے ثابت کردے کہ اس کتاب مستطاب کے طلوع ہونے سے قبل، ادب کا نقشہ مسدس حالی کے عرب جیسا تھا:

''ادب'' جس کا چرچا ہے یہ کچھ وہ کیا تھا
جہاں سے الگ اک جزیرہ نما تھا

اس میں شک نہیں کہ کوئی کتاب بغیر مقدمہ کے شہرت عام اور بقائے دوام حاصل نہیں کرسکتی بلکہ بعض معرکتہ الآرا کتابیں تو سراسر مقدمے ہی کی چاٹ میں لکھی گئی ہیں۔ برنارڈ شا کے ڈرامے (جو درحقیقت اس کے مقدموں کے ضمیمے ہیں) اسی ذیل میں آتے ہیں اور دور کیوں جائیں، خود ہمارے ہاں ایسے بزرگوں کی کمی نہیں جو محض آخر میں دعا مانگنے کے لالچ میں نہ صرف یہ کہ پوری نماز پڑھ لیتے ہیں بلکہ عبادت میں خشوع وخضوع اور گلے میں رندھی رندھی کیفیت پیدا کرنے کے لیے اپنی مالی مشکلات کو حاضر وناظر جانتے ہیں لیکن چند کتابیں ایسی بھی ہیں جو مقدمہ کو جنم دے کر خود دم توڑ دیتی ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر جانسن کی ڈکشنری، جس کا صرف مقدمہ باقی رہ گیا ہے اور کچھ ایسے مصنف بھی گزرے ہیں جو مقدمہ لکھ کر قلم توڑ دیتے ہیں اور اصل کتاب کی ہوا تک نہیں دیتے...... جیسے شعروشاعری پر مولانا حالی کا بھرپور مقدمہ جس کے بعد کسی کو شعروشاعری کی تاب وتمنا ہی نہ رہی۔ بقول مرزا عبدالودود بیگ، اس کتاب میں سے مقدمہ نکال دیا جائے تو صرف سرورق باقی رہ جاتا ہے۔

تاہم اپنا مقدمہ بقلم خود لکھنا کار ثواب ہے کہ اس طرح دوسرے جھوٹ بولنے سے بچ جاتے ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ کہ آدمی کتاب پڑھ کر قلم اٹھاتا ہے۔ ورنہ ہمارے نقاد عام طور سے کسی تحریر کو اس وقت تک غور سے نہیں پڑھتے جب تک انہیں اس پر سرقہ کا شبہ نہ ہو۔

مشتاق احمد یوسفی کی کتاب ''چراغ تلے'' سے اقتباس

کروگی اور تمام امرا تمہارے حکم کے پابند ہوں گے۔''

''راجا جیو کو کہاں پہنچانا ہوگا؟''

''اس وقت تم جہاں بیٹھی ہو...... اس کے بعد تمہارا کام ختم۔''

رات پچھلے پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ اس نے وعدہ کرلیا کہ وہ کسی دن بھی موقع دیکھ کر راجا جیو کو رومی خاں کے گھر پہنچادے گی۔

اسے جس پالکی میں لایا گیا تھا اسی پالکی میں سوار کر کے خفیہ سرنگ تک پہنچادیا گیا۔ اس نے زرباز خاں کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے سرنگ میں قدم رکھ دیا اور پھر سرنگ سے باہر نکل آئی اور بہ آسانی حرم سرا تک پہنچ گئی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر گہری سانس لی اور بستر پر دراز ہوگئی۔ وہ رات بھر جاگتی رہی تھی لیکن نیند اب بھی اس کی آنکھوں میں نہیں تھی۔ وہ کچھ دیر پہلے جن حالات سے گزری تھی، اس کا ذہن ان واقعات کو دہرا رہا تھا۔ خطرات اس کے سامنے کھڑے تھے لیکن زیورات سے بھرے تھال اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔

یہی خواب دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھوں میں نیند بھر گئی۔ صبح سو کر اٹھی تو اس کا بدن بخار سے جل رہا تھا۔ حکیم صاحب پھر آگئے۔ دوا پھر دے دی گئی۔

دن نکلتے ہی حرم سرا کی رونق پھر لوٹ آئی تھی۔ کہیں کہیں سے قہقہوں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ عائشہ رات کو کہاں گئی تھی اور کیا وعدے کر کے لوٹی ہے۔

اس کا بخار اترتے اترتے شام ہوگئی۔ وہ راجا جیو کی والدہ کے پاس گئی اور راجا جیو کو اپنے ساتھ لے آئی۔ اب اسے زیادہ سے زیادہ راجا جیو کے ساتھ رہنا تھا تاکہ جلد از جلد اپنے وعدے کی تکمیل کر سکے۔ وہ راجا جیو کی دیکھ بھال میں مشغول تھی۔ اس کے ساتھ ہی موقعے کی تاک میں بھی تھی کہ ایک موقع ملے اور وہ راجا جیو کو لے کر یہاں سے نکل جائے۔

ایک دن اسے موقع مل گیا۔ اس نے راجا جیو کو لڑکیوں کے کپڑے پہنائے تاکہ کسی کی نظر پڑ بھی جائے تو یہی سمجھے کہ کوئی لڑکی ہے جسے وہ اپنے ساتھ لے جارہی ہے۔ ایک دن پہلے اس نے یہ بھی مشہور کردیا تھا کہ وہ اپنی بہن سے ملنے اس کے گھر جائے گی۔ حرم سرا کے دروازے پر پالکی آکر رک گئی۔ کسی نے دیکھا بھی تو یہ دیکھا کہ وہ کسی لڑکی کے ساتھ پالکی میں بیٹھی ہے۔

یہ محض اتفاق تھا کہ اسی وقت برہان نظام شاہ کی والدہ نے اپنے چھوٹے بیٹے راجا جیو کو یاد کیا۔ حرم سرا میں شہزادے کو ڈھونڈا گیا لیکن وہ ہوتا تو ملتا۔ چاروں طرف ہنگامہ سا مچ گیا۔ محل کے تمام اندرونی اور بیرونی ملازم ایک جگہ جمع ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے کہا ہوسکتا ہے شہزادہ محل کے کسی حوض میں گر پڑا ہو۔ کچھ ملازم حوضوں میں اترنے کی تیاری کررہے تھے کہ کسی نے عائشہ کے فرار ہونے کی مخبری کردی۔ اسے تلاش کیا گیا۔ وہ حرم سرا میں موجود نہیں تھی۔ برہان نظام شاہ کی والدہ نے ملازموں کو عائشہ کے تعاقب میں روانہ کردیا۔ کچھ لوگ احتیاط کے طور پر حوضوں میں بھی اتر گئے۔

وہ ابھی رومی خاں کے گھر تک پہنچی بھی نہیں تھی کہ ملازموں نے پالکی کو گھیر لیا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے۔ میری پالکی کو کیوں روکا گیا ہے؟''

''آپ اپنے ساتھ کسے لے جارہی ہیں؟''

''میری بھانجی ہے۔ میرے پاس آئی ہوئی تھی۔ میں اسے لے کر اپنی بہن کے گھر جارہی ہوں۔ یقین نہیں تو اسے دیکھ لو۔''

اس نے راجا جیو کی ایک جھلک ملازموں کو دکھادی۔ ملازموں نے واقعی ایک لڑکی کو دیکھا۔ وہ راجا جیو کو پہچان ہی نہ سکے لیکن پھر بھی انہوں نے ضروری سمجھا کہ پالکی کو حرم سرا کی طرف لوٹا دیں۔

عائشہ چیختی رہ گئی اور پالکی کو حرم سرا پہنچادیا گیا۔ اس نے راجا جیو کی والدہ سے بھی یہی کہا کہ وہ اپنی بہن کے گھر جارہی تھی لیکن اس کے پاس اس کے اس سوال کا جواب نہیں تھا کہ راجا جیو کو زنانہ لباس کیوں پہنایا۔

''میں اگر یہ مان بھی لوں کہ تو اسے اپنی بہن کے گھر لے جارہی تھی تو میں تجھ سے یہ پوچھوں گی کہ زنانہ کپڑے پہنانے کی کیا ضرورت تھی؟''

''کوئی خاص بات نہیں۔ بس مجھے شوق ہورہا تھا۔''

یہ بہانہ قابلِ قبول نہیں تھا۔ وہ اپنی صفائی پیش نہ کرسکی اور اسے گرفتار کرلیا گیا۔ اس معاملے میں مزید تفتیش کی ضرورت تھی کہ دراصل وہ کہاں جارہی تھی اور اس کے عزائم کیا تھے۔

یہ کوئی معمولی معاملہ نہیں تھا۔ حرم سرا میں پالکی پہنچنے کی دیر تھی کہ بات اس حلقے تک پہنچ گئی جو برہان نظام شاہ کے پردے میں احمد نگر کی حکومت چلارہے تھے۔

مخالفین تک بھی یہ خبر پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔ خاص طور پر رومی خاں یہ خبر سن کر دہل کر رہ گیا۔ اب اسے وہ کرنا تھا

جس کا ارادہ قطعی نہیں تھا۔
تکمل خاں دکنی نے فوراً برہان نظام شاہ سے ملاقات کی۔ فیصلے تو اسی کے چلتے تھے لیکن دوسرے امراء کو یہ دکھانا مقصود تھا کہ جو فیصلہ کیا جا رہا ہے، اس میں برہان نظام شاہ کی مرضی شامل ہے۔ وہ ایک تحریر پہلے ہی لکھ کر لایا تھا جس پر برہان نظام شاہ کے دستخط کرانے تھے۔
اس تحریر کے جواب میں عائشہ کو ایک قریبی قلعے کے قید خانے میں قید کر دیا گیا۔
جس وقت عائشہ کو قید خانے میں منتقل کیا جا رہا تھا، اسی وقت رومی خاں کے محل میں کرم خاں اور امیر خاں نہایت فکرمندی سے جمع تھے۔
''رومی خاں! اس گرفتاری کے بعد مزید گرفتاریاں بھی ہو سکتی ہیں۔ یہ اندازہ بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے کہ تفتیش کس مرحلے پر پہنچے گی۔ ہمیں تکمل خاں دکنی اور اس کے بیٹے کی طرف سے کسی رعایت کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ اگر کسی نے ہمارا نام نہیں بھی لیا تو تکمل خاں دکنی اسے بہانہ بنا کر ہماری طرف بڑھے گا۔'' کرم خاں نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔
''ہم نے بھی چوڑیاں نہیں پہنی ہوئیں۔ میرا لشکر مقابلے کے لیے تیار ہے۔ ہم تکمل خاں دکنی کو یہ اجازت ہرگز نہیں دیں گے کہ وہ برہان نظام شاہ کو یرغمال بنا کر اپنی من مانی کرتا پھرے۔''
''کیا ہم اس کا مقابلہ کر سکیں گے؟''
''فرار کا دوسرا راستہ بھی تو موجود نہیں۔''
''ایک راستہ ہے۔ اگر ہم کسی طرح عائشہ کا منہ بند کر دیں تا کہ وہ راز نہ کھول سکے۔''
''کیا یہ اتنا آسان ہوگا؟''
''میرے ایسے آدمی قلعے میں موجود ہیں جو یہ کام انجام دے سکتے ہیں۔''
''کیا اس طرح تکمل خاں کو ہم پر شک نہیں ہوگا؟''
''شک ہو سکتا ہے، ثبوت تو نہیں ہوگا۔ عائشہ زندہ رہی تو اہم گواہ بن جائے گی۔''
یہ باتیں ہوتی رہیں اور یہ مجلس اس فیصلے پر ختم ہوئی کہ عائشہ کو موت سے ہمکنار کر دینا چاہیے۔ اس فیصلے پر عملدرآمد کے لیے رومی خاں بھرپور حصہ لے سکتا تھا کیونکہ شاید اسی دن کے لیے اس نے اپنے بہت سے آدمی قلعے میں اہم عہدوں پر متعین کیے تھے۔ برہان نظام شاہ کا اتالیق تکمل خاں دکنی اس سے ناواقف نہیں تھا لیکن وہ اردگرد کے مخصوص حالات اور رومی خاں کی طاقت سے خوف زدہ بھی تھا البتہ اس کا بیٹا جمال الدین عزیز الملک جو سرلوبتی کے عہدے پر فائز تھا، نوجوان ہونے کی وجہ سے زیادہ جذباتی تھا۔ رومی خاں کے کئی لوگوں کو ان کے عہدے سے ہٹا چکا تھا۔ وہ رومی خاں کی طرف سے چوکنا ضرور تھا لیکن یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ عائشہ سے اس کا کوئی تعلق ہوگا۔ اس کی آنکھیں تو اس وقت کھلیں جب عائشہ قید خانے میں مردہ پائی گئی۔
تکمل خاں دکنی کو پورا یقین تھا کہ عائشہ کی موت میں رومی خاں کا ہاتھ ہے لیکن ایک اہم گواہ اس کے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ اب وہ کس بنیاد پر کہہ سکتا تھا کہ عائشہ سے اس کا تعلق تھا اور راجا جیو کو اغوا کرنے میں اسی کا ہاتھ تھا اور اس کی موت کا ذمے دار بھی وہی ہے۔
ممکن ہے یہ معاملہ دبا دیا جاتا کہ جلد ہی زرباز خاں نے تکمل خاں دکنی سے ملاقات کی درخواست کر دی۔ یہ درخواست فوراً قبول بھی کر لی گئی۔
عائشہ اس دنیا میں نہیں رہی تھی۔ اب اس پر گزرنے والی داستان کو کسی بھی انداز میں سنایا جا سکتا تھا۔ زرباز خاں نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔ اس نے اپنا دامن بچا کر عائشہ کے اس فرار کی کہانی سنا دی جب وہ رومی خاں سے ملنے جا رہی تھی۔
''مجھے یہ شک ہوا تھا کہ وہ رات کے وقت کسی سے ملنے جا رہی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا تھا۔ اس نے مجھے ہمراز بنانے کے لیے بھاری رشوت دینے کا وعدہ کر کے بتایا کہ وہ رومی خاں سے ملنے جا رہی ہے۔ میں ڈر گیا اور رشوت لینے سے انکار کر دیا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کسی نہ کسی طرح رومی خاں تک پہنچ گئی تھی۔''
وہ... بیان دیتے ہوئے یہ بھول گیا تھا کہ عائشہ کے فرار کا گواہ ایک اور بھی ہے۔ یہ تھی وہ بوڑھی عورت جس کو رشوت دے کر عائشہ حرم سرا سے باہر نکلی تھی۔
وہ بوڑھی عورت راجا جیو کی والدہ کے پاس گئی اور اپنا جرم قبول کر لیا۔
''میں تو اس وقت کو رو رہی ہوں جب عائشہ میرے پاس آئی تھی۔ میں نے لالچ میں آ کر اس کے لیے رات کے وقت دروازہ کھول دیا۔ زرباز خاں بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس نے بھی سفارش کی۔ میں باتوں میں آ گئی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ رومی کے گھر جا رہی ہے۔''
''تو نے کیا کہا، ذرا پھر سے تو کہہ۔ زرباز خاں

عائشہ کو تیرے پاس لے کر آیا تھا؟ وہ اس کے ساتھ تھا؟''
''ہاں، میں سچ کہہ رہی ہوں۔ وہی اسے خفیہ راستے سے حرم سرا سے باہر لے کر گیا تھا۔ آپ مجھ سے قسم لے لو۔''
''تو یہ بات تمکل خاں کے سامنے کہہ سکتی ہے؟''
''میں سب کے سامنے کہنے کو تیار ہوں۔ بس مجھے رشوت لینے کے الزام میں سزا نہ دی جائے۔''
''میں ضمانت لیتی ہوں کہ تجھے سزا نہیں ملے گی۔''
برہان شاہ کی والدہ اس بوڑھی عورت کو لے کر تمکل خاں کے پاس چلی گئیں۔ اس نے وہ سب کچھ بتا دیا جو وہ بتا چکی تھی۔ ایک مرتبہ پھر زرباز خاں کو طلب کیا گیا۔ اس مرتبہ وہ باتیں چھپانے کے لائق نہیں رہا تھا۔ اس نے قبول کیا کہ اس نے عائشہ کو فرار ہونے میں مدد دی تھی البتہ اس نے یہ ضرور بتایا کہ فرار ہونے کے بعد وہ کس سے ملی تھی، اس سے وہ ناواقف ہے۔ تمکل خاں نے بوڑھی عورت کو سرزنش کے بعد چھوڑ دیا لیکن زرباز خاں کو باقی عمر قید خانے میں گزارنی پڑی۔

اب ہر بات کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ سازش پکڑی گئی تھی۔ رومی خاں اور اس کے ساتھی قصوروار پائے گئے تھے۔ الزام یہ تھا کہ انہوں نے عائشہ سے روابط بڑھائے اور راجا جیو کو اغوا کرنے کا منصوبہ بنایا تاکہ برہان نظام شاہ کی جگہ اسے تخت پر بٹھا دیا جائے البتہ عائشہ کی موت کا ذمے دار زرباز خاں کو قرار دیا گیا تاکہ یہ راز نہ کھل جائے کہ فرار اس نے کرایا تھا۔ اس لیے اسے ہمیشہ کے لیے قید خانے کے سپرد کر دیا گیا۔

تمکل خاں دکنی نے اپنے ہم خیال امراء کو جمع کیا اور آئندہ کا لائحہ عمل مرتب کیا۔ طے یہ ہوا کہ راجا جیو کو شاہی نگرانی میں لے کر اس کی حفاظت کی جائے اور مخالف امراء کو شاہی فیصلوں سے دور رکھا جائے۔

یہ فیصلے رومی خاں کے کانوں تک بھی پہنچے۔ اسے یہ اطمینان تھا کہ فی الحال یہ معاملہ دب گیا ہے۔ موقع دیکھ کر کوئی سازش پھر تیار کی جائے گی۔

اس واقعے کے بعد تمکل خاں نے برہان نظام شاہ اور راجا جیو کی طرف بہت توجہ کی اور ان کی نگرانی بڑی کڑی نظر سے کرنے لگا۔

برہان نظام شاہ کی تعلیم کا ایسا عمدہ انتظام کیا کہ وہ صرف دس سال کی عمر میں عمدگی سے خط نسخ لکھنے کے قابل ہو گیا اور فارسی کتب نہایت روانی سے پڑھنے لگا۔
وقت کے ساتھ ساتھ رومی خاں اور تمکل خاں کے باہمی اختلاف پہلے سے کہیں زیادہ بڑھتے چلے گئے۔ رومی خاں کوشش میں لگا ہوا تھا کہ کسی طرح یہ دوری کم ہو جائے۔ اس قربت ہی کی وجہ سے وہ اس قابل ہو سکتا تھا کہ کوئی سازش تیار کر سکے لیکن تمکل خاں اب اتنا چوکنا ہو گیا تھا کہ کوئی موقع دینے کو تیار نہیں تھا بلکہ رومی خاں کے آدمی تو اسے یہ بتا رہے تھے کہ تمکل خاں اسے راستے سے ہٹانے کی تدبیریں کر رہا ہے۔

رومی خاں نے جب یہ دیکھا کہ موافقت کی کوئی صورت نہیں اور وہ اکیلا اس قابل نہیں کہ تمکل خاں کا زور توڑ سکے تو اس نے اپنی مدد کے لیے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ اس کی نظر علاؤ الدین عماد الملک پر گئی جو دکنی علاقے ''کاویل'' پر حکمرانی کر رہا تھا۔ برہان نظام شاہ کے باپ نظام شاہ سے اس کی پرانی دشمنی تھی۔ کئی معرکے ہوئے تھے جن میں عماد الملک کو شکست ہوئی تھی۔ وہ اب بھی احمد نگر کی طرف لالچی نظروں سے دیکھ رہا تھا لیکن تمکل خاں دکنی کی طاقت کے سامنے بے بس تھا۔ اب جو رومی خاں نے اس سے خط کتابت کی اور اسے یقین دلایا کہ احمد نگر کو فتح کرنے میں وہ اس کی مدد کرے گا تو اس کے خواب تعبیر کی طرف گامزن ہو گئے۔ یہ خط کتابت کئی ماہ تک جاری رہی اور بالآخر اس نے رومی خاں کو خط لکھ دیا کہ وہ فرار ہو کر اس کے پاس ''کاویل'' پہنچ جائے۔

رومی خاں نے اپنے دو بقیہ ساتھیوں کرم خاں اور امیر خاں سے مشورہ کیا۔ انہوں نے بھی اس مشورے کو پسند کیا۔ ان کی کوششوں سے پانچ اور امیر بھی اس مشورے میں شامل ہو گئے۔ آٹھ ہزار کا لشکر بھی مرتب ہو گیا اور یہ سب ایک رات احمد نگر سے فرار ہو کر ''کاویل'' پہنچ گئے۔
رومی خاں نے عماد الملک سے بالمشافہ گفتگو کی اور اسے باور کرا دیا کہ احمد نگر کو فتح کرنا اس وقت نہایت آسان ہے۔
''احمد نگر پر اس وقت دس سالہ برہان نظام شاہ حکمرانی کر رہا ہے۔ تمکل خاں دکنی اور اس کا بیٹا اسے دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔ نظام مملکت افراتفری کا شکار ہے۔ احمد نگر کے لوگ حکومت کے خلاف ہو گئے ہیں۔ سازشوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ اب ہمیں ہی دیکھ لو۔ اگر ہم اس صورتِ حال سے بدظن نہ ہوتے تو اپنا وطن کیوں چھوڑتے۔ اس وقت اگر احمد نگر پر حملہ کر دیا جائے اور ہم بھی تمہارے ساتھ ہوں تو قلعہ بہ آسانی فتح کیا جا سکتا ہے۔ یہ اچھا موقع ہے، اس سے فائدہ اٹھا لیجیے۔''
عماد الملک، رومی خاں کی باتوں میں آ گیا۔ اس نے

لشکر جمع کیا اور ''کاویل'' سے روانہ ہو کر نظام شاہی سرحد میں داخل ہو گیا۔ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے پرگنوں پر قبضہ کر لیا۔

عماد الملک کی یہ حرکت ایسی نہیں تھی جسے نظر انداز کیا جا سکتا۔ تکمل خاں نے پہلے تو عماد الملک کی جانب ایک ایلچی روانہ کیا جس میں اس نے عماد الملک کو اس کے ارادوں سے باز رہنے کی تلقین کی تھی اور جب اس کا جواب نفی میں آ گیا اور اس کے آگے بڑھنے کی اطلاعات برابر آتی رہیں تو تکمل خاں نے بھی لشکر جمع کیا اور حاکم پرندہ خواجہ جہاں کے ہمراہ بڑی شان و شوکت سے عماد الملک کی سرزنش کے لیے روانہ ہوا۔ دوسری طرف سے عماد الملک نے اپنی فوجوں کو آگے بڑھایا۔ ایک مقام قصبہ رانوری کے قریب دونوں فوجیں آمنے سامنے آ گئیں۔ فریقین نے اپنی اپنی صفیں درست کیں۔ تکمل خاں نے برہان نظام شاہ کو کم سنی کی وجہ سے قلب لشکر میں رکھا اور ایک ترکی غلام آذر خاں کو اس کی حفاظت کے لیے اس کا ردیف مقرر کر کے اس کے ساتھ رکھا۔

دونوں فوجیں پہل کرنے میں ایک دوسرے کا انتظار کر رہی تھیں۔ اسی میں پورا دن گزر گیا۔ رات ہوئی تو دونوں فوجیں اپنے ٹھکانوں پر پہنچ گئیں۔ دونوں کو دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کوئی فریق شب خون نہ مار دے لہٰذا دونوں طرف مسلسل رت جگا ہوتا رہا۔

سحر نزدیک تھی کہ تکمل خاں نے اپنے لشکر سے خطاب کیا اور انہیں ہدایت کی کہ جب صبح کے وقت صفیں درست کر چکو تو پہل کرنے میں دیر نہ کرنا۔ عماد الملک نے بھی غالباً یہی ہدایت کر دی تھی چنانچہ جب صبح ہوئی اور فوجوں نے صفیں درست کر لیں تو دونوں فوجیں ایک ساتھ ایک دوسرے پر حملہ آور ہو گئیں۔ طرفین کے سپاہیوں نے فتح کے لیے جی توڑ کوششیں کیں۔ نہایت گھمسان کا رن پڑا۔ ابتدا میں عماد الملک کی فوجوں کا پلڑا بھاری تھا۔ عماد الملک برابر اس تاک میں لگا ہوا تھا کہ جس طرح بھی ہو برہان نظام شاہ تک پہنچ کر اسے گرفتار کر لیا جائے یا اسے نقصان پہنچایا جائے لیکن تکمل خاں نے اسے قلب لشکر میں رکھا تھا اور اس کی حفاظت کا خاطر خواہ بندوبست کیا تھا لہٰذا عماد الملک اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہو سکا بلکہ الٹا نقصان اٹھا بیٹھا۔ برہان نظام شاہ کے تعاقب میں وہ اپنی فوج کی طرف سے غافل ہو گیا۔ اچھی خاصی فتح، شکست میں بدل گئی۔ برہان نظام شاہ کی فوج غالب آنے لگی۔

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

موسمِ سرما کا دمیدار میما
آغازِ دسمبر کے شمارہ
کا خوب صورت انداز

دوسری موت
باطن کی اچھائی اور ظاہر کی برائی میں
لتھڑے کرداروں کے مصائب کی سنسنی خیز
داستان... پروین زبیر کے قلم سے

انگارے
دشمنوں کے شکنجے میں آہنی اعصاب کے مالک چیمپئن
کا امتحان۔ محبت اور جنگ کی فضا میں آگے بڑھتا
طاہر جاوید مغل کے یادگار سلسلے کی ایک اور کڑی

آوارہ گرد
چلچلاتی دھوپ میں ہر دم ایک نئی مصیبت
سے برسرِ پیکار نوجوان کی سرگزشت......
عبدالرب بھٹی کی سلسلے وار کہانی

سرورق کے رنگ
دسمبر کی شاموں میں بھیگے
سرورق کہانی کی رعنائی و دلکشی

ان کے علاوہ
منظر امام، تنویر ریاض، سلیم انور،
ارشد بیگ، جمال دستی، تمکین رضا
اور عکسیں فاطمہ کی طبع زاد و ترجمہ کہانیاں

چیلی نکتہ چینی
آپ کے تبصرے... مشورے... تنقیدیں...
شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتھائیں

حالات ایسے بگڑے کہ پھر سنبھل نہ سکے۔ عمادالملک کی فوج میدان سے بھاگ کھڑی ہوئی اور کاویل تک راستے میں کہیں نہ ٹھہری۔

تمکل خاں نے برہان نظام شاہ کو ساتھ لے کر مفرور دلا ور کا تعاقب کیا۔ عمادالملک گھبرا کر برار میں داخل ہو گیا۔

تمکل خاں نے وہاں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ عمادالملک نے نہایت ہوشیاری سے اپنی فوج کو پیچھے کیا اور برار کے علما و مشائخ کو تمکل خاں کے پاس بھیجا۔ ان لوگوں نے فریقین میں اس شرط پر صلح کرادی کہ ہر فریق اپنے اپنے ملک کو واپس چلا جائے۔

تمکل خاں نے بادل ناخواستہ علما کی بات مان لی۔ اسے یہ خیال بھی تھا کہ اسمٰعیل عادل شاہ کہیں احمد نگر کو اکیلا دیکھ کر چڑھ نہ دوڑے۔ وہ تیزی سے سفر کرتا ہوا احمد نگر واپس آ گیا۔

☆☆☆

بےجاپور کے حاکم یوسف عادل کے انتقال کے وقت اس کا بیٹا اسمٰعیل عادل شاہ کم سن تھا اس لیے عنانِ حکومت اس کے ایک امیر کمال خاں نے سنبھال لی تھی۔ احمد نگر میں بھی یہی ہوا تھا کہ برہان نظام شاہ بوجہ کمسنی تخت پر بیٹھا ضرور تھا لیکن حکومتِ نظام تمکل خاں دکنی اور اس کے بیٹے کے ہاتھ میں تھا۔ وہی سیاہ سفید کے مالک تھے۔ فرق صرف اتنا ہوا تھا کہ اسمٰعیل عادل شاہ کی والدہ پونجی خاتون کی تدبیروں سے کمال خاں کو قتل کرا دیا گیا تھا اور نظامِ حکومت اسمٰعیل عادل شاہ کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔

اسمٰعیل عادل شاہ کے کئی سال کمال خاں کے طرف داروں سے لڑائیاں کرتے ہوئے گزر گئے تھے اور اب اس کی نظریں احمد نگر پر جمی ہوئی تھیں کیونکہ برہان نظام شاہ جوانی کی عمر کو پہنچنے کے باوجود تمکل خاں دکنی کا محتاج تھا یا تمکل خاں نے اسے اپنا محتاج بنایا ہوا تھا۔

تمکل خاں بھی اس کے ان ارادوں سے غافل نہیں تھا اور اس تاک میں لگا ہوا تھا کہ اسمٰعیل عادل شاہ کی طاقت بڑھنے سے پہلے ہی اپنی طاقت میں بے پناہ اضافہ کر لے۔ اسی دوران اسے یہ معلوم ہوا تھا کہ اسمٰعیل عادل شاہ، عماد الملک کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہا ہے اور اس کے ساتھ مل کر احمد نگر کی طرف بڑھے گا۔ اس نے اس سواری کی ٹانگیں تراشنے کا ارادہ کر لیا جس پر اسمٰعیل عادل شاہ سواری کرنے کا خواہاں تھا۔ عمادالملک سے کشیدگی برقرار تھی۔ چھوٹی چھوٹی جھڑپیں بھی چلتی رہتی تھیں۔ اسے یہ پُرخاش بھی تھی کہ اس کے مخالف امیروں کو عمادالملک نے پناہ دے رکھی ہے۔ اس نے عمادالملک کو مصروف رکھنے کے لیے اس سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے کوئی ایسی وجہ بھی تلاش کرنی شروع کر دی جو کسی بڑے معرکے کا سبب بن سکے۔ جلد ہی ایک سبب اس کے ہاتھ آ گیا۔ اس نے برہان نظام شاہ سے ملاقات کی اور اسے حقائق سے آگاہ کیا۔

”کیا آپ جانتے ہیں کہ قصبہ پاتری جو اس وقت عمادالملک کے قبضے میں ہے، آپ کے اجداد کا علاقہ ہے۔“

”وہ کیسے؟“

”ہم نے سنا ہے کہ نظام شاہیوں کے اسلاف میں ٹلکرنی نام کا ایک شخص تھا جو پرگنہ پاتری کا رہنے والا تھا۔ وہ کسی سبب سے غریب الوطن ہو کر بیجانگر چلا گیا تھا۔ جب نظام شاہی خاندان کے ہاتھ میں حکومت آئی اور ان کی علیحدہ سلطنت (احمد نگر) قائم ہوئی تو وہ تمام برہمن جو بادشاہ احمد نظام شاہ سے قرابت رکھتے تھے، قصبہ پاتری چھوڑ کر احمد نگر آ گئے۔ وہ پاتری سے بہت محبت رکھتے ہیں اور پاتری پر عمادالملک کا قبضہ ہے۔ ہم اس سے تقاضا کر سکتے ہیں کہ وہ پاتری واپس کر دے۔“

”وہ تو سب ٹھیک ہے مگر میرے والد سے برہمنوں کی قرابت داری سمجھ میں نہیں آئی۔“

”میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ حقیقت آپ پر آشکار ہو لیکن اب بتانا پڑے گا۔ احمد نظام شاہ کے اجداد برہمن تھے۔ ان میں سے ایک احمد شاہ بہمنی کے عہد حکومت میں مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوا۔ اس نے مشرف بہ اسلام ہو کر اپنا نام ملک حسن رکھ لیا اور اپنی ذاتی صلاحیتوں کی وجہ سے شاہی غلاموں کے گروہ میں شامل ہو گیا۔ احمد شاہ بہمنی نے یہ غلام اپنے بیٹے محمد شاہ کو عطا کر دیا۔ سلطان محمد شاہ کے انتقال کے بعد اس کی وصیت کے مطابق ملک حسن کو وکیلِ سلطنت کے عہدے پر فائز کر دیا گیا۔ اس نے کئی علاقے فتح کر کے اپنے بیٹے ملک احمد کو عطا کیے۔

”اس نے مرہٹوں کے کئی قلعے فتح کر لیے اور اپنے لیے احمد نظام الملک بحری کا لقب اختیار کیا۔ دکن میں اس کا نام احمد نظام شاہ مشہور ہو گیا۔ اسی احمد نظام نے احمد نگر کی بنیاد رکھی۔ اس نے اس شہر کی تعمیر میں بہت دلچسپی لی۔ دو تین سال کی مدت میں یہ شہر مصر اور بغداد کی طرح آباد ہو گیا۔ آج اسی احمد نگر کے آپ حکمران ہیں۔“

برہان نظام شاہ نے یہ داستان پوری دلچسپی سے سنی

اور ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''یہ سب کچھ آپ نے مجھے تو بتا دیا ہے، عماد الملک کو اس کی ہوا نہ لگے۔''

''آپ کیا سمجھتے ہیں، عماد الملک کو یہ سب کچھ معلوم نہیں ہوگا؟''

''اسے معلوم ہو لیکن آپ اپنی تحریر میں اس پر کچھ ظاہر نہ ہونے دیں۔''

''میں اسے کچھ نہیں لکھوں گا۔ صرف یہ لکھوں گا کہ قصبہ پاتری آپ کے اجداد کا ہے اسے آپ کے حوالے کردے۔'' برہان نظام شاہ نے منظوری دے دی اور کمل خاں دکنی نے عماد الملک کے نام خط لکھ دیا۔

''ہمارا قصبہ پاتری سے جو تمہارے ملک میں داخل ہے اور سرحد پر واقع ہے، بہت پرانا تعلق ہے۔ ہمارے تمہارے درمیان جو صلح ہوئی تھی، اس کا تقاضا ہے کہ تم اس قصبے کو ہمارے حوالے کردو۔ اس کے عوض تم ہمارے ملک کا جو قصبہ چاہو ہم سے لے لو۔''

برہان نظام شاہ نے اس خط پر اپنی مہر ثبت کی اور یہ خط عماد الملک کی طرف روانہ کردیا گیا۔ عماد الملک نے یہ پیشکش اور مطالبہ ماننے سے انکار کردیا۔

عماد الملک اب چوکنا ہوگیا تھا۔ اسے یقین ہوگیا تھا کہ برہان نظام شاہ نچلا بیٹھنے والا نہیں۔ اس مسئلے پر وہ کبھی نہ کبھی ایک بڑی جنگ ضرور لڑے گا۔ اس کی تیاری ابھی سے کرلینی چاہیے۔ اس نے اس مقام پر ایک زبردست قلعہ تعمیر کروانا شروع کردیا۔

یہ تعمیر نہ تو پوشیدہ رہ سکتی تھی اور نہ عماد الملک نے اسے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی۔ برہان نظام شاہ نے اس وقت کمل خاں کو اپنے حضور طلب کیا تھا۔ وہ اس کے پاس پہنچا تو اس نے دربار کو آراستہ دیکھا۔ اس کا بیٹا جمال الدین بھی وہاں موجود تھا۔ کمل خاں نے اسے برہان نظام شاہ کی... خودسری سے تعبیر کیا لیکن جلد ہی اس کی غلط فہمی دور ہوگئی۔ برہان نظام شاہ کو اطلاع پہنچی تھی اور اس کے ازالے کے لیے اس نے درباریوں کو جمع کیا تھا۔

''میں نے آپ سب لوگوں کو اس لیے زحمت دی کہ عماد الملک نے ایک مرتبہ پھر سر اٹھایا ہے۔''

''کیا وہ پچھلی جنگ کا انجام بھول گیا؟'' ایک امیر نے تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''پچھلی جنگ کے انجام ہی نے اسے یہ راہ دکھائی ہے۔''

''کیسی راہ؟''

''وہ صوبہ پاتری کے مقام پر قلعے کی تعمیر میں

فرق

ایک شخص سمندر کے کنارے کھڑا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس سے کچھ فاصلے پر ایک آدمی نیچے جھکتا ہے، کوئی چیز اٹھاتا ہے اور سمندر میں پھینک دیتا ہے۔ وہ اس شخص کے قریب جاتا ہے اور دیکھتا ہے کہ سمندر کے کنارے ریت پر بے شمار مچھلیاں تڑپ رہی ہیں۔ شاید کسی بڑی موج نے ان کو ساحلِ سمندر پر پھینک دیا تھا اور وہ شخص ان کو واپس سمندر میں پھینک رہا تھا کہ ان کی جان بچ جائے اسے اس شخص کی بے وقوفی پر ہنسی آگئی اور وہ کہنے لگا۔ ''ارے بھائی صاحب! اس سے کیا فرق پڑے گا۔ تم کتنی مچھلیوں کو بچا لوگے؟'' یہ سن کر وہ شخص مسکرایا۔ اس نے ایک مچھلی کو اٹھایا اور سمندر میں پھینک دیا۔ وہ مچھلی تیزی سے پانی پر تیرتی ہوئی دور نکل گئی۔ اس پر اس شخص نے دوسرے شخص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تم نے دیکھا اسے فرق پڑا ہے۔'' اور پھر مچھلیاں اٹھا کر سمندر میں پھینکنے لگا۔

موازنہ

لقمان حکیم کو ان کے آقا نے حکم دیا کہ ایک بکری ذبح کرو اور اس کے گوشت کے دو بہترین ٹکڑے میرے پاس لاؤ۔ انہوں نے بکری ذبح کی اور اس کا دل اور زبان لے جا کر آقا کے سامنے رکھ دی۔ پھر آقا نے حکم دیا کہ ایک اور بکری ذبح کرو اور اس کے گوشت کے دو بدترین ٹکڑے میرے پاس لاؤ۔ انہوں نے دوسری بکری ذبح کی اور اس کا بھی دل اور زبان آقا کی خدمت میں پیش کردی۔ مالک بڑا حیران ہوا اور کہنے لگا۔ ''اے لقمان! یہ کیا...... تم دو بہترین ٹکڑے دل اور زبان لے کر آئے اور دو بدترین ٹکڑے بھی دل اور زبان ہی لے کر آئے؟''

لقمان حکیم نے فرمایا۔ ''اگر دل اور زبان اچھے رہیں تو ان سے بہتر جسم کا کوئی دوسرا حصہ نہیں ہوسکتا اور اگر یہ دونوں بگڑ جائیں تو ان سے بدتر جسم کا کوئی عضو نہیں ہوسکتا۔ یہ بہتر ہیں تو بہترین ہیں اور بگڑ جائیں تو بدترین ہیں۔''

مرسلہ: جاوید اختر رانا۔ پاکپتن شریف

مصروف ہے۔ اس قلعے کی تعمیر سے اس کے دو مقاصد پورے ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ سرحدی مقام ہونے کی وجہ سے وہ اپنے ممالک کی حفاظت کرسکے گا۔ دوسرے یہ کہ وہ بہ وقتِ ضرورت اسمٰعیل عادل شاہ کی فوجوں کو وہاں ٹھہرا سکتا ہے جو ہمارے لیے ہمیشہ خطرہ بنی رہیں گی۔''

''وہ یہ قلعہ اپنی سرحد میں بنوا رہا ہے۔ ہم اسے کس طرح روک سکتے ہیں؟'' امراء نے بہ یک آواز کہا۔ کمل خاں اب تک خاموش بیٹھا تھا لیکن اب وہ خاموش نہ رہ سکا۔

''ہم اسے ٹوک بھی سکتے ہیں اور روک بھی سکتے ہیں۔ ایسا کرنا ہمارے لیے اس لیے ضروری ہے کہ اگر قلعہ تعمیر ہوگیا تو ہم ہمیشہ خوف میں مبتلا رہیں گے۔ کسی سرحدی مقام پر قلعہ تعمیر کرنا یوں بھی جنگی توانین کے خلاف ہے۔''

''پھر جو کرنا ہے آپ ہی کریں۔ ہم تو آپ کا ساتھ دے سکتے ہیں۔''

کمل خاں نے اجازت ملتے ہی عماد الملک کو لکھا۔

''سرحدی مقام پر تمہیں قلعہ تعمیر نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اس طرح تمہارے سپاہی ہمیشہ ہم سے جنگ کرتے رہیں گے اور اس طرح ہمیں تکلیف پہنچتی رہے گی۔ بہتر ہے کہ تم قلعے کی تعمیر کا کام فوراً روک دو۔''

عماد الملک تک یہ خط پہنچا ضرور لیکن اس نے اس خط کا جواب دینا بھی ضروری نہ سمجھا۔ اس کی یہ بے توجہی دیکھ کر کمل خاں کے سامنے جنگ کے سوا دوسرا راستہ نہیں تھا۔ اس نے یہ مشہور کیا کہ وہ بالا گھاٹ اور دولت آباد کی سیر کے لیے نکلنا چاہتا ہے۔ اس بہانے اس نے فوج جمع کرنا شروع کردی۔ ہر طرف سے مطمئن ہونے کے بعد وہ دولت آباد کی طرف روانہ ہوگیا۔ برہان نظام شاہ اس کے ہمراہ بھی تھا اور حقیقتِ حال سے واقف بھی۔

عماد الملک اس کارروائی سے بے خبر تھا۔ قلعہ تعمیر ہوچکا تھا اور عماد الملک اس کی حفاظت کا انتظام کر کے اپنے ممالک کی طرف لوٹ گیا تھا کہ کمل خاں بلائے ناگہانی کی طرح قلعے کے سامنے پہنچ گیا اور پاتری پر حملہ کردیا۔ قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ جو اندر تھا وہ اندر رہ گیا۔ قلعہ نو تعمیر شدہ تھا۔ ابھی یہاں اتنا لشکر اور اناج نہیں تھا کہ محصورین زیادہ دن تک محاصرے میں رہ سکتے جبکہ رسد پہنچنے کا بھی کوئی ذریعہ نہیں رہ گیا تھا۔ کمل خاں زیادہ دیر انتظار نہیں کرسکتا تھا کیونکہ اس کا یہ اندیشہ بجا تھا کہ عماد الملک اپنے لوگوں کی مدد کو ضرور پہنچے گا اور ممکن ہے اسمٰعیل عادل شاہ کو بھی مدد کے لیے بلالے۔

کمل خاں کے بہادر سپاہیوں نے کمندوں اور زینوں کے ذریعے قلعے کے میناروں پر چڑھ کر حصار کو تسخیر کرلیا۔ قصبہ پاتری نظام شاہیوں کے قبضے میں آگیا۔

برہان نظام شاہ نے اپنے ایک امیر میاں محمد غوری کو کامل خاں کے خطاب سے نوازا اور قلعے کا حاکم مقرر کر کے واپسی کا نقارہ بجادیا۔

لشکر اور بھاری سازوسامان پیچھے آ رہا تھا اور برہان نظام شاہ ہراول کے ساتھ آگے روانہ ہوگیا۔ دولت آباد کے مقام پر ایک گاؤں کے قریب موسیقی کی مدھر تانوں نے اس کے قدم روک لیے۔ جوانی کے قدم بے خوفی کے سائے میں پلتے ہیں۔ اس نے اپنے مختصر سے لشکر کو باہر چھوڑا اور خود گاؤں میں داخل ہوگیا۔ بڑے بڑے گیس کے ہنڈے جل رہے تھے۔ بہت سے لوگ دائرہ بنائے بیٹھے تھے۔ ان کے درمیان ایک قتالہ عالم رقاصہ محوِ رقص تھی۔ کسی نے توجہ بھی نہیں دی اور وہ ایک کونے میں کھڑے ہو کر اس کے حسن کا نظارہ کرنے لگا۔

برہان نظام شاہ حکمران تھا۔ دربار میں رقاصاؤں اور موسیقی دانوں کی کمی نہیں تھی لیکن اس رقاصہ میں کوئی ایسی بات تھی کہ وہ دل ہار بیٹھا۔

''بھائی یہ رقاصہ کون ہے اور کہاں سے آئی ہے۔''

''تم کیا اس گاؤں کے نہیں ہو یا جان بوجھ کر انجان بن رہے ہو؟'' اس آدمی نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا اور پھر غیر ارادی طور پر اس کی طرف دیکھا اور پھر اس کا شاہی لباس دیکھ کر جیسے سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔

''اگر میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا رہی ہیں تو آپ برہان نظام شاہ ہیں یا کوئی اور حکومتی عہدیدار۔''

''میں کوئی بھی ہوں جو پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو۔''

''اس کا نام بھان متی ہے۔ قصبہ پاتری سے آئی ہے۔ گاؤں کے کھیا کے بیٹے کی شادی ہے۔'' اس آدمی نے کہا اور بھاگ کر کھیا کو بلا لایا۔ مجمعے میں کھلبلی مچ گئی۔ کھیا ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا۔

''حضور! مجھے خدمت کا موقع دیجیے۔''

برہان کو اس کھیا سے کوئی غرض نہیں تھی لیکن بھان متی کے رقص میں دلچسپی نے اسے وہاں بیٹھنے پر مجبور کردیا۔ جانے کہاں سے ایک کرسی منگوائی گئی اور برہان نظام شاہ وہاں بیٹھ گیا۔ اس کی موجودگی کا احساس ہوتے ہی وہ تارے سے مہتاب بن گئی۔ بھونرے نے پھول کو دیکھا پھر تو جیسے باغ میں کچھ نہیں تھا۔ ایک بھونرا تھا اک پھول۔

بھونرے نے چاہا پھول کا سارا رس پی جائے لیکن فی الوقت تو صرف اتنا کرسکا کہ گلے میں پڑا ہوا مروارید کا ہار اس کی طرف اچھال دیا۔ پھول اپنی شاخ سمیت جھک گیا۔ مسجد سے اذان بلند ہوئی اور محفل برخاست ہوگئی۔ بھان متی نے اس کے قدموں میں سجدہ کیا۔

''آج رات گاؤں سے باہر ہمارے خیمے میں آ کر ہم سے ملو۔''

''جو حکم سرکار کا۔''

برہان نظام شاہ اس گفتگو کے بعد اٹھ گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد کھیا آگے بڑھا اور بھان متی سے تحکمانہ لہجے میں مخاطب ہوا۔

''تم میرے بیٹے کی فکر چھوڑو اور فوراً برہان نظام شاہ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ ہم پر کوئی مصیبت ٹوٹے۔''

''آپ سے زیادہ مجھے فکر ہے۔ میرے وطن قصبہ پاتری پر برہان نظام کا قبضہ ہو چکا ہے۔ اسے خوش کر کے ہی میں اپنے وطن میں خوش رہ سکتی ہوں۔''

کمل خاں دکنی رات بھر اس کا انتظار کرتا رہا تھا۔ اسے جیسے ہی معلوم ہوا کہ وہ اپنے خیمے میں پہنچ گیا، اس نے باریابی کی اجازت مانگی اور حضور میں پہنچ گیا۔

''ہوسکتا ہے عماد الملک ہمارے تعاقب میں نکل چکا ہو۔ ہمیں تو فوراً احمد نگر پہنچنا چاہیے تھا۔ آپ نے ایک رات ضائع کردی۔ اب بھی وقت ہے، آپ فوراً روانگی کا حکم جاری فرمائیے۔''

''ہم آج کی رات بھی یہیں گزاریں گے۔''

''یہاں......اس ویرانے میں؟ دشمن سے بے خوف ہو کر؟''

''ہمیں کسی کی پروا نہیں۔ ہم نے جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔''

''لیکن معلوم تو ہو، آپ آج کی رات رکنے پر کیوں بضد ہیں؟''

''ہم آپ کو کچھ بتانے کے پابند نہیں۔''

اس قطعی جواب کے بعد کمل خاں کا وہاں بیٹھنا فضول تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھ آیا لیکن حیران ضرور تھا کہ برہان شاہ کو ایسا کیا ضروری کام ہے جس کے لیے وہ ہم سب کو خطرے میں ڈال رہا ہے۔ اب ایک ہی راستہ تھا۔ اس نے فوراً سپہ سالار کو طلب کیا اور اسے مکمل تیار رہنے کا حکم دیا۔

رات ہوتے ہی برہان شاہ نے اپنے آدمی بھیج کر بھان متی کو بلوالیا۔ اب کمل خاں پر عقدہ کھلا کہ وہ رات کو یہاں کیوں رکا تھا۔ برہان شاہ کو سمجھانا بے کار تھا۔ اس کی نئی جوانی نے یہ گل کھلائے تھے۔ اب اس کا علاج کوئی نہیں تھا۔

رات بھر پورا لشکر شب خون کے خوف سے جاگتا رہا اور برہان شاہ دادِ عیش دیتا رہا۔

صبح ہوئی اور برہان شاہ کے حکم سے لشکر نے کوچ کیا تو کمل خاں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ بھان متی نامی رقاصہ برہان شاہ کے ساتھ تھی۔

احمد نگر پہنچتے ہی برہان شاہ نے تو جیسے کمل خاں کی طرف سے آنکھیں ہی پھیرلیں۔ اس نے کسی بھی امیر کو اپنے پاس طلب کرنا چھوڑ دیا۔ وہ سلطنت کے کاموں سے غافل ہو کر بھان متی کے پہلو سے لگا بیٹھا تھا۔

کمل خاں یہ سوچ کر مطمئن تھا کہ چند دنوں کا نشہ ہے اتر جائے گا لیکن جب اس نے یہ سنا کہ برہان شاہ نے اس بازاری عورت سے شادی کرلی اور حرم کی دوسری عورتوں پر اسے فوقیت دینے لگا ہے تو اسے انجام صاف نظر آنے لگا۔ اس نے اپنا پہلو بچانا ہی مناسب سمجھا۔ ایک روز موقع دیکھ کر برہان شاہ کے حضور پہنچ گیا اور وزارت کی انگوٹھی اتار کر اس کے آگے رکھ دی۔

''حضور! وکالت و وزارت کی انگوٹھی حاضر ہے۔ جب تک آپ کم عمر تھے، میں نے اپنی ضعیف العمری کے باوجود آپ کی خدمت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اب جبکہ حضور خود مہماتِ سلطنت انجام دینے کے قابل ہوگئے ہیں، مجھے معاف فرمائیں۔''

برہان شاہ تو خود یہی چاہتا تھا کہ اسے کوئی سمجھانے والا نہ رہے۔ اس نے تھوڑی سی بناوٹی حیل وحجت کے بعد درخواست قبول کرلی۔

کمل خاں نے تمام سیاسی وملکی معاملات سے علیحدگی اختیار کرلی اور اپنے مکان میں خلوت نشیں ہوگیا۔ اس کے بعد اپنے انتقال تک خلوت نشیں ہی رہا۔ کبھی عید بقرعید حاضرِ دربار ہو جاتا تھا اور بس۔

☆☆☆

اسمٰعیل عادل شاہ دشمنوں کے درمیان گھرا ہوا تھا۔ عماد الملک نے کئی مرتبہ اسے احمد نگر پر حملے کے لیے اکسایا تھا لیکن اسے اپنے علاقے سے نکلنے کی فرصت نہیں مل رہی تھی بلکہ اب تو اسے یہ خوف ہونے لگا تھا کہ برہان شاہ صورتِ حال سے تنگ آ کر اس کے علاقے کی طرف نہ چڑھ دوڑے۔ اس کے وزیر اسد خاں لاری نے اسے مشورہ دیا کہ برہان نظام شاہ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا جائے۔

''اس کی صورت کیا ہوگی اور ضرورت کیوں ہے؟''
اسمٰعیل عادل شاہ نے کہا۔
''صورت تو یہ ہوگی کہ شادی وغیرہ کا سلسلہ استوار کیا جائے۔ ضرورت اس لیے ہے کہ اس مشترکہ طاقت کے ساتھ اپنے ازلی دشمن قاسم برید سے باز پرس کی جائے اور اس کو خوب مزہ چکھایا جائے۔ اسی طرح دوسرے حریفوں سے بھی نمٹا جاسکتا ہے۔''

اسمٰعیل عادل شاہ نے اسد لاری کا مشورہ مان لیا اور اس کوشش میں لگ گیا کہ عماد الملک کے علم میں لائے بغیر برہان نظام شاہ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا جائے۔ بہر حال دونوں طرف کے امراء کی کوششوں سے برہان شاہ اور اسمٰعیل عادل شاہ نے قلعہ شولاپور کے نواح میں ملاقات کی۔ اس ملاقات کے نتیجے میں اسمٰعیل عادل شاہ نے اپنی بہن مریم سلطانہ کی شادی برہان نظام شاہ سے کردی۔

اسمٰعیل عادل شاہ کے کسی امیر نے برہان نظام شاہ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ قلعہ شولاپور بی بی مریم کے جہیز میں دے دیا جائے گا لہٰذا شادی ہوجانے کے بعد برہان نظام شاہ نے اس قلعے کا مطالبہ کیا۔ اب خدا جانے اسمٰعیل عادل شاہ کے علم میں تھا یا بعد میں اس کی نیت بدل گئی۔ اس نے صاف انکار کردیا۔

''میں نے کوئی ایسا وعدہ نہیں کیا تھا۔ اگر ملازموں میں سے کسی نے ایسی کوئی بات کی تھی تو انہیں کوئی حق نہیں پہنچتا تھا۔ مجھ پر یہ لازم نہیں کہ ان کے کہے ہوئے وعدے کا پابند رہوں۔''

برہان نظام شاہ اس وقت تو خاموش رہا اور احمد نگر واپس آ گیا لیکن واپس آتے ہی قلعہ شولاپور فتح کرنے کی تیاریاں شروع کردیں۔

اس کڑے وقت میں اسے علاؤ الدین عماد الملک کی یاد آئی۔ اسے معلوم تھا کہ اسمٰعیل عادل شاہ اور عماد الملک کے تعلقات کشیدہ ہوگئے ہیں۔ اس نے اس کشیدگی کا فائدہ اٹھایا اور ایک سفارت عماد الملک کی طرف روانہ کی اور اس سے مدد کی درخواست کی۔ نتیجہ اس کی مرضی کے مطابق نکلا۔ عماد الملک، اسمٰعیل عادل شاہ سے جلا بیٹھا تھا، فوراً اس درخواست کو قبول کرلیا۔

برہان نظام شاہ تیس ہزار سواروں اور ایک بڑے توپ خانے کے ساتھ قلعہ شولاپور کی فتح کے لیے روانہ ہوا۔ عماد الملک کی فوجیں بھی اس کے ساتھ مل گئیں۔

اسمٰعیل عادل شاہ بھی تجربہ کار تیر اندازوں کے ساتھ مقابلے کے لیے نکلا۔ برہان نظام شاہ کے ساتھ ایک بڑا لشکر تھا لیکن ایک زبردست لڑائی کے بعد نظام شاہیوں کو شکست ہوگئی۔ عماد الملک ''کاویل'' کی طرف بھاگ گیا اور برہان نظام شاہ احمد نگر واپس آ گیا۔

یہ شکست ایسی تھی کہ برہان نظام شاہ کے ہوش جاتے رہے۔ وہ ایسا مایوس ہوا کہ بھان متی کے ناز نخرے بھی اسے نہیں بہلا سکتے تھے۔ اس وقت اس کی مایوسی میں مزید اضافہ ہوگیا جب اس نے سنا کہ اسمٰعیل عادل شاہ نے قصبہ پاتری پر قبضہ کرلیا ہے۔ اس کا غصہ مایوسی پر غالب آ گیا۔ وہ ایک زبردست لشکر لے کر پاتری کی طرف روانہ ہوا اور دو ماہ کی مسلسل کوششوں کے بعد اسے دوبارہ اپنے قبضے میں لے آیا۔

برہان نظام شاہ اس مقام سے قلعہ ماہور کی طرف روانہ ہوا۔ اس قلعے کو بھی اس نے فتح کرلیا۔ عماد الملک مقابلے کی تاب نہ لاکر پہلے کی طرح برہان پور کی طرف بھاگ گیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے پہلے کی طرح صلح کے لیے ہاتھ نہیں بڑھائے بلکہ اردگرد کے کئی حکمرانوں سے مدد لے کر برہان نظام شاہ اور اس کے اتحادی احمد آباد بیدر کے حکمراں قاسم برید سے جنگ کرنے کے لیے روانہ ہوگیا۔

بدقسمتی سے اس لڑائی میں بھی عماد الملک اور اس کے اتحادیوں کو شکست ہوگئی۔ عماد الملک گھبرا کر برہان پور کی طرف بھاگا۔

اس جنگ میں برہان نظام شاہ کے ہاتھ دشمن کا بہت سامان و اسباب لگا۔

اب عماد الملک کے لیے دکن میں کوئی سہارا نہیں رہ گیا تھا۔ اسمٰعیل عادل شاہ سے اسے امید نہیں رہ گئی تھی کیونکہ اس کی بہن برہان نظام شاہ کے گھر میں تھی۔

☆☆☆

دو سوار کاویل ایلچی پور سے گجرات جانے والی سڑک پر دوڑے چلے جارہے تھے۔ ادھر ادھر کھیتوں میں کام کرنے والے ان سواروں کی برق رفتاری دیکھ کر کسی سوچ میں گم ہوگئے تھے۔

''یہ کوئی عام سوار نہیں ہیں۔ شاہی سوار معلوم ہوتے ہیں۔ عماد الملک کی طرف سے آرہے ہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ اتنی جلدی میں کہاں جارہے ہیں؟''

''دیکھتے نہیں، یہ سڑک گجرات کی طرف جاتی ہے۔''

''وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں لیکن کیا گجرات میں بھی جنگ چھڑ گئی؟''

''گجرات کی جنگ سے ہمارا کیا تعلق۔''

''احمد نگر کا بادشاہ مارا ماری پر تلا ہوا ہے۔ عمادالملک کمزور پڑ رہا ہے۔ ہوسکتا ہے حاکم گجرات سلطان بہادر گجراتی کو مدد کے لیے پکار رہا ہو۔''

''مشکل ہے مگر کیا خبر۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ مدد ہی مانگنی تھی تو اسمٰعیل عادل شاہ کو بھی پکار سکتا تھا۔''

''اب وہ زمانے گئے۔ اسمٰعیل عادل شاہ کی بہن برہان نظام شاہ کے گھر میں ہے۔ اب وہ اس کے خلاف نہیں لڑ سکتا۔''

یہ سوار دیہاتیوں کی باتوں کو چھوڑ کر کب کے آگے بڑھ چکے تھے۔ اب وہ پکی سڑک پر رواں دواں تھے۔ دن کی دھوپ ان کے سروں سے گزری اور شام کے اندھیرے پھیلنے لگے۔ وہ شہر میں داخل ہوئے تو دکانیں بند ہونے لگی تھیں۔ سلطان بہادر سے ملاقات کا یہ کوئی وقت نہیں تھا۔ رات کسی سرائے میں ہی گزاری جاسکتی تھی۔ مسئلہ زبان کا بھی تھا۔ وہ یہاں کی زبان سے ناواقف تھے۔ کسی نہ کسی طرح مقامی افراد سے سرائے کا پتا پوچھ لیا۔

''یاد رکھو، ہمارے پاس بہت قیمتی تحائف ہیں۔ نیا ملک ہے نئے لوگ ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ سرائے میں ہم اس مال سے ہی محروم ہوجائیں۔''

''ہاں، ہمیں بہت ہوشیار رہنا پڑے گا۔''

وہ ایک سرائے میں پہنچ گئے۔ مال کی فکر میں نیند کہاں آتی۔ رات باتوں میں کاٹ دی۔ صبح ہوتے ہی انہوں نے سرائے چھوڑی اور قلعے کے دروازے پر پہنچ گئے۔ پہرے داروں کو عمادالملک کی طرف سے دیا ہوا خط دکھایا اور اپنی شناخت کرائی۔

ان پہرے داروں نے انہیں دروازے کے قریب ایک وسیع کمرے میں بٹھا دیا۔

صبح سے دوپہر ہوگئی۔ پہرے دار تو انہیں بٹھا کر بھول گئے تھے۔ دوپہر کے قریب انہیں سلطان بہادر کے حضور پیش کر دیا گیا۔ انہوں نے وہ تحائف اس کی خدمت میں پیش کیے جو عمادالملک نے اس کے لیے بھیجے تھے اور خط اس کے ملاحظہ کے لیے پیش کیا۔

''عمادالملک سے کہنا وہ تیاری کرے، ہم اس کی مدد کے لیے تیار ہیں۔ حاکم احمد نگر سے ہمیں بھی بہت سے حساب چکانے ہیں۔''

دونوں سوار اس کا پیغام پہنچانے کے لیے عمادالملک کی طرف روانہ ہوگئے۔

دونوں قاصدوں کے روانہ ہوتے ہی سلطان بہادر نے تیاری شروع کر دی اور اپنے لشکر اور خزانے کو لے کر دکن کی طرف روانہ ہوگیا۔

برہان نظام شاہ کو جب اس تیاری کا علم ہوا تو اس نے اسمٰعیل عادل شاہ اور قلی قطب شاہ کے نام خطوط روانہ کیے۔ قلی قطب شاہ اس وقت کسی اور مہم میں مصروف تھا اس لیے اس نے صاف انکار کر دیا البتہ اسمٰعیل عادل شاہ نے برہان کی مدد کی اور اپنے لشکر سے چند ہزار سوار منتخب کر کے ان کو امیر برید کے ساتھ مع خزانہ و سامانِ جنگ امیر برید کے ہمراہ روانہ کر دیے۔

سلطان بہادر ماہور اور پاتری کو نظام شاہیوں کے قبضے سے نکالنے کے لیے برار میں داخل ہوا۔ یہاں پہنچتے ہی اس کی نیت بدل گئی۔ وہ یہاں مقیم ہوگیا۔ اس کی یہ حرکت دیکھ کر عمادالملک کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اسے اپنا انجام صاف نظر آنے لگا۔ اس نے سلطان بہادر کی خدمت میں عرض کیا۔ ''یہ میرا ملک ہے۔ آپ کو چاہیے کہ پیش قدمی کریں۔ برہان نظام شاہ کو تباہ و برباد کر کے اگر آپ اس کے ملک کا کچھ حصہ مجھے بھی عنایت فرمائیں تو میں اپنے بیوی بچوں کو بھیج کر مذکورہ علاقہ سارے کا سارا آپ کی نذر کر دوں گا اور ملازموں کی طرح آپ کے ساتھ رہوں گا۔''

سلطان بہادر نے یہ درخواست قبول کر لی اور نظام شاہی فوج کی طرف پیش قدمی شروع کر دی جو پہاڑی علاقے میں مقیم تھی۔

پہلے حملے میں اسے شکست ہوگئی لیکن سلطان بہادر نے عمادالملک کی نگرانی میں بیس ہزار سواروں کا ایک دوسرا لشکر روانہ کیا۔ برہان نظام شاہ اور امیر برید میں اس لشکر سے مقابلہ کرنے کی تاب نہ تھی۔ برہان نظام شاہ خواجہ جہاں کے علاقے ''پرندہ'' کی طرف فرار ہوگیا۔

گجراتیوں نے تعاقب ضرور کیا لیکن برہان نظام شاہ ''پرندہ'' تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔

برہان نظام شاہ ''پرندہ'' میں تھے۔ واپسی کے دروازے اس پر بند ہوچکے تھے۔ سلطان بہادر بے خوف و خطر احمد نگر پہنچ گیا اور باغ نظام میں قیام پذیر ہوا۔ یہاں ایک وسیع چبوترا بنا ہوا تھا اور دور تک وسیع میدان تھا۔ وہ اس وسیع چبوترے پر بیٹھ گیا۔ اہلِ شہر کو حکم ہوا کہ اس کے

سلام کو حاضر ہوں۔ وہ چالیس روز تک متواتر اس چبوترے پر بیٹھا رہا۔ ہر خاص و عام کا سلام لیتا۔ ہاتھی، اونٹ اور ہرن میدان میں چھوڑے جاتے اور بادشاہ ان کی لڑائی کا تماشا دیکھتا۔

وہ ان کھیل تماشوں میں مگن تھا۔ اسے خبر ہی نہیں تھی کہ اس کے لشکر پر کیا بیت رہی ہے۔ نظام شاہی امراء بڑی چالاکی سے گجراتیوں کے لشکر کی بے چینی بڑھا رہے تھے۔ یہ لوگ غلہ اور ضرورت کی دوسری چیزوں کو بہ آسانی گجراتیوں تک نہ پہنچنے دیتے تھے۔ حالت یہ ہوئی کہ گجراتیوں کے لشکر میں سخت قحط پڑ گیا۔ بے شمار ہاتھی اور گھوڑے ہلاک ہو گئے۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر گجراتی امیروں میں کھلبلی مچ گئی۔ یہ سب کے سب سلطان بہادر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس مشکل سے آگاہ کیا۔

طویل ترین اجلاسوں کے بعد ان امراء نے مشورہ دیا کہ اگر اس ملک کو فتح کرنا ہے تو سب سے پہلے قلعہ دولت آباد کو تسخیر کرنا چاہیے جو کہ سرحد پر واقع ہے۔

سلطان بہادر کو یہ تجویز پسند آئی لیکن احمد نگر کی رونق دیکھ کر اس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس چبوترے سے اتر کر کہیں اور جائے۔ وہ یہاں سے کوچ کرنے میں حیلے بہانے کرنے لگا۔ صاف جواب بھی نہیں دیتا تھا اور کوچ بھی نہیں کرتا تھا۔

ایک روز وہ اپنے پلنگ پر لیٹا نیند کے مزے لے رہا تھا کہ عفریتوں کا ایک گروہ اس کی طرف بڑھتا دکھائی دیا۔ یہ عفریت نہایت بھیانک شکلوں کے تھے۔ ان میں سے کسی کے ہاتھ میں آگ تھی اور کسی نے اپنے ہاتھوں میں پہاڑ اٹھایا ہوا تھا۔ قریب تھا کہ وہ یہ سب چیزیں سلطان بہادر پر ڈال دیں کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ بری طرح کانپ رہا تھا اور اس کا پورا بدن پسینے میں شرابور تھا لیکن شکر بھیج رہا تھا کہ یہ محض خواب تھا۔ ذرا ہوش ٹھکانے آئے تو خوف اس پر ایک مرتبہ پھر غالب آ گیا۔ یہ خوف بلا وجہ نہیں تھا۔ کوئی طاقت ہے جو اسے یہاں سے بھگانا چاہتی ہے...... وہ سوچ رہا تھا۔ اس نے خواب کی تعبیر بتانے والوں کو بلایا۔ کسی نے کچھ تعبیر بتائی کسی نے کچھ۔ ایک بوڑھا اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور اس نے بتایا۔

''نظام شاہ (برہان نظام شاہ کا باپ) کے زمانے میں اس مقام پر بہت بڑی لڑائی ہوئی تھی۔ ہندو مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد قتل کر دی گئی تھی۔ ان مقتولوں کی روحیں اسی مقام پر رہنے لگی ہیں اور شیطانوں کے روپ میں سامنے آتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ خواب انہی روحوں کے زیرِ اثر آپ کو نظر آیا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے یہ روحیں نہیں چاہتیں کہ میں یہاں رہوں؟''

''مطلب آپ خود اخذ کر سکتے ہیں۔ آپ اگر یہاں قیام کیے رہے تو آپ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔'' سلطان بہادر پر کپکپی طاری ہو گئی۔ اس نے اسی دن اس مقام سے کوچ کر کے ایک اور مقام پر پڑاؤ ڈالا اور پھر دو تین روز کے بعد وہاں سے بھی روانہ ہو گیا۔ عماد الملک کو بھی طلب کر لیا اور دولت آباد کے مقام پر قیام پذیر ہو گیا تاکہ قلعہ دولت آباد کی تسخیر کے لیے کوشاں ہو۔

برہان شاہ بے گھر ہو کر ابھی تک ''پرندہ'' میں مقیم تھا۔ اسے دولت آباد کی تسخیر کا اندیشہ ہوا تو اس نے گھبرا کر اسمٰعیل عادل شاہ کو خط لکھا۔

''آپ نے جس برادرانہ محبت سے میری مدد کی میں اس کے لیے آپ کا ممنون ہوں لیکن جب تک آپ بذاتِ خود اس طرف توجہ نہیں کریں گے مجھے مصیبت سے چھٹکارا نہیں ملے گا۔ سلطان بہادر دولت آباد تک آ گیا ہے۔ مجھے اس سے چھٹکارا دلایئے۔''

ایک قاصد بجلی کی سی تیزی سے روانہ ہوا اور اسی برق رفتاری سے واپس پلٹا۔ اسمٰعیل عادل شاہ نے پیغام بھیجا تھا۔

''بیجانگر کے ہندو اس وقت موقع کی تلاش میں ہیں۔ اگر میں بیجانگر سے نکلوں گا تو یہ لوگ دریائے کرشنا عبور کر کے سارے شہر کو برباد کر دیں گے۔''

برہان نظام شاہ اس جواب سے سخت مایوس ہوا۔ اپنا انجام صاف نظر آ رہا تھا۔ کوئی امیر ساتھ نہ تھا، صرف سپاہی تھے۔ حرم کی کچھ خواتین تھیں۔ ان میں بھان متی بھی تھی۔ یہ بھان متی ہی تھی جس کی وجہ سے اس کا دل لگا ہوا تھا۔ وہ یہ بھی جان چکا تھا کہ بھان متی صرف رقاصہ نہیں بلکہ نہایت عقل مند عورت ہے۔ اس کے مشورے اکثر اوقات اس کے کام آتے رہے تھے۔ اس نے بھان متی کو طلب کیا۔

''خیر تو ہے، کیا آج دن کے وقت مجھے ساقی گری کرنی ہوگی؟ میں نے آپ سے درخواست کی تھی کہ دن کے وقت شراب نہ پیا کریں۔''

''میں نے اس وقت تمہیں کسی اور کام سے بلایا ہے۔''

''بندی حاضر ہے۔''

برہان شاہ نے اسے تمام حالات سے آگاہ کیا اور اس کا مشورہ چاہا۔

''آپ احمد نگر واپس جائیں، وہاں لشکر جمع کریں اور مردانہ وار دولت آباد روانہ ہوں۔ سلطان بہادر سے مقابلہ کریں۔''

کسی کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی لیکن بھان متی کی بات اس کے دل کو لگی۔ وہ احمد نگر کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے حسب استطاعت لشکر جمع کیا اور پوری تیاری کے ساتھ دولت آباد کی راہ لی جہاں سلطان بہادر کا لشکر تھا جسے مار رہا تھا اس سے چار کوس کے فاصلے پر برہان شاہ نے قیام کیا۔ اس جگہ وہ بڑی احتیاط اور چوکسی کے ساتھ پورے تین مہینے مقیم رہا۔ اس عرصے میں اس کا لشکر گجراتیوں سے برابر چھیڑ چھاڑ کرتا رہا۔ گجراتیوں کو اتنا تنگ کیا کہ وہ جنگ کے لیے آمادہ ہو گئے۔

امیر برید نے برہان نظام شاہ کی اجازت کے بغیر ہی صف آرائی شروع کر دی۔ برہان نظام شاہ امیر برید کی جرأت سے واقف تھا۔ اسی وقت میدان میں آیا اور لڑائی شروع ہو گئی۔ طرفین نے خوب خوب داد شجاعت دی۔ آخر کار ..... عادل شاہی لشکر کا پلہ بھاری رہا۔ گجراتیوں کو شکست فاش ہوئی۔

برہان نظام شاہ نے اس فتح کو اتفاقی قرار دیا۔ وہ اپنے آپ میں اتنی سکت نہیں سمجھتا تھا کہ بہادر شاہ سے مقابلہ کر سکے۔ اب ایک ہی ترکیب تھی کہ کسی طرح سلطان بہادر اور عماد الملک میں دوری پیدا کر دی جائے۔ اس نے عماد الملک کے پاس اپنا قاصد بھیجا اور اسے سلطان بہادر کی نیت سے آشنا کیا۔ قاصد بھی ایسا چرب زبان تھا کہ عماد الملک کو شیشے میں اتار لیا۔

''آپ نے سلطان بہادر کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے بیش بہا تحائف اس کی نذر کیے۔ وہ تمہاری مدد کے بہانے دکن میں داخل ہوا۔ اس سے مل کر پاتری اور ماہور کے قلعے نظام شاہی قبضے سے نکالے۔ برار اور احمد نگر میں اس کے نام کا خطبہ جاری کیا۔ ہر سال اسے قیمتی اور کم یاب تحفے بھیجے لیکن اب وہ یہاں جم کر بیٹھ گیا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے سلطان بہادر ہم سے ہمارا ملک چھیننا چاہتا ہے۔ وہ آپ سے مخلص نہیں۔ اس سے دوستی رکھ کر آپ اپنا ملک بھی گنوا دیں گے۔ یہی وقت ہے کہ دشمنی چھوڑ کر برہان شاہ سے دوستی کا ہاتھ بڑھایئے۔''

سلطان بہادر نے ہوا کا رخ بدلتے دیکھا تو اسے واپسی کی فکر ہوئی لیکن ان دنوں دریاؤں میں پانی بہت چڑھا ہوا تھا۔ برہان نظام شاہ نے ایک مرتبہ پھر ایک چال چلی۔ اس نے سلطان بہادر کے نام کا خطبہ پڑھوایا اور اپنے آدمیوں کو تحفوں اور نذرانوں کے ساتھ اس کی خدمت میں بھیجا۔ جب اس نے دیکھا کہ دکنی اس کے مطیع ہو گئے ہیں تو اس نے دکنیوں کی مخالفت ترک کر دی اور گجرات واپس چلا گیا۔

☆☆☆

بھان متی کی کثرت شراب نوشی نے اسے موت کے دہانے پر لا کھڑا کیا تھا۔ شاہی حکیموں کی کوششیں رائگاں چلی گئی تھیں۔ اس کا آخری وقت تھا۔ برہان نظام شاہ اپنے جھمیلوں میں پڑ کر بھان متی کی طرف سے بالکل ہی غافل ہو چکا تھا۔ بھان متی نے طبیبوں کی منت سماجت کر کے برہان نظام شاہ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ کسی طرح اس کا پیغام برہان تک پہنچایا گیا۔ اسی وقت عماد الملک کی طرف سے آئی ہوئی سفارت رخصت ہوئی تھی۔ برہان کا مزاج خوشگوار تھا۔ وہ ملاقات کے لیے تیار ہو گیا۔ پچھلی یادیں ذہن میں گردش کرنے لگیں۔ وہ بھان متی کو دیکھنے اس کے محل میں چلا آیا۔

بھان متی ہڈیوں کا ڈھانچا بنی بستر پر لیٹی تھی۔ برہان شاہ کو دیکھتے ہی اٹھنے کی کوشش کی لیکن اٹھ نہ سکی۔ بڑی حسرت سے برہان شاہ کی طرف دیکھا۔

''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' بھان متی نے کمزور آواز میں کہا۔ ''ایک اعتراف ہے جو اس وقت کرنا چاہتی ہوں۔ اس امید پر کہ آپ مجھے معاف کر دیں گے۔''

''کہو بھان متی۔ میں سن رہا ہوں۔''

''میں عماد الملک کے حرم کی ایک معمولی سی کنیز تھی۔ اسی نے مجھے دولت آباد کے قریب اس گاؤں میں بھیجا تھا جہاں میری آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔ گاؤں کا چودھری بھی اس سے ملا ہوا تھا۔ مجھے بھیجنے کا مقصد یہ تھا کہ میں آپ کو اپنے دام میں پھانس لوں اور آپ کے خلاف ان سازشوں میں شریک ہو جاؤں جو وہ آپ کے خلاف کر رہا تھا۔ مجھے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔ آپ خود ہی وہاں چلے آئے۔ مجھے اس لیے بھیجا گیا تھا کہ میں آپ کو شراب نوشی کی راہ پر لے آؤں اور پھر شراب میں زہر ملا کر آپ کی ہلاکت کا سامان کروں۔ میں نے آپ کو شراب نوشی کی راہ پر ڈال تو دیا لیکن مجھے آپ سے محبت ہو گئی تھی۔ میں آپ کو قتل نہ کر سکی۔ ایک مرنے والی کی یہ نصیحت یاد رکھیے گا

کہ عماد الملک آپ کا دوست نہیں ہوسکتا۔ اسے دوست نہ سمجھیے گا جیسا کہ آپ ان دنوں کررہے ہیں۔ اس کے برعکس سلطان بہادر کی فرماں برداری سے اپنی سلطنت بچا لیجیے ورنہ عماد الملک سلطان بہادر سے مل کر احمد نگر کی اینٹ سے اینٹ بجادے گا۔''

وہ کچھ اور کہنے والی تھی کہ اس کی آواز نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس کی زندگی اس سے روٹھ گئی۔ برہان شاہ نے اس کی طرف تاسف سے دیکھا اور اس کے قریب سے اٹھ گیا۔

وہ بھان متی کی باتوں سے ایسا متاثر ہوا تھا کہ اس کے پاس سے اٹھ کر سیدھا اپنی خواب گاہ میں چلا گیا اور حکم دے دیا کہ جب تک وہ باہر نہ آئے، کوئی اس سے ملاقات کی درخواست نہ کرے۔ یہ جسارت صرف اس کی زوجہ مریم بی بی کرسکتی تھی جو اسمٰعیل عادل شاہ کی بہن ہونے کی وجہ سے خاص مرتبہ رکھتی تھی۔ برہان شاہ نے اس سے بھی کہلوادیا کہ وہ بھی ملاقات کی جسارت نہ کرے۔

خواب گاہ کی تنہائی میں وہ چند سال پہلے کے واقعات دہراتا رہا۔ ان شکستوں کے بارے میں سوچتا رہا جو عماد الملک کے ساتھ مل کر لڑائیوں میں اسے ہوئی تھیں۔ اسے ایک جنگ ایسی بھی یاد آئی جب عماد الملک اسے چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ عماد الملک نے اسے سلطان بہادر کے نام کا خطبہ پڑھوانے سے روک دیا تھا۔ اسے بھان متی کی باتوں میں صداقت نظر آنے لگی۔ وہ خلافِ توقع خلوت گاہ سے باہر آیا اور فوری اجلاس طلب کیا۔ اس کے وفادار امراء حکم ملتے ہی حاضر ہوگئے۔ اس نے بھان متی کا نام لیے بغیر عماد الملک کی سازشیں ان کے سامنے رکھیں اور عماد الملک کے بجائے سلطان بہادر کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے کے لیے مشورہ طلب کیا۔

''اس طرح تو اسے دکن میں داخل ہونے کا موقع مل جائے گا۔''

''ہم اسے یہ موقع نہیں دیں گے۔ اس کے مطیع ہونے کا دم بھرتے رہیں گے۔ ضروری ہوا تو اسے خراج بھی دیتے رہیں گے۔ وہ ہمارا اتحادی بن گیا تو عماد الملک کو ہماری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں ہوسکے گی۔''

ایک طویل بحث کے بعد برہان شاہ کو مشورہ دیا گیا کہ وہ کسی کو سلطان بہادر کے پاس بھیجے اور دوستی کے لیے راہ ہموار کرے۔

برہان شاہ نے اپنے ایک امیر میران شاہ کو اعلیٰ تحفوں اور چند مشہور ہاتھیوں کے ساتھ سلطان بہادر کی خدمت میں گجرات روانہ کیا۔

میران شاہ وہاں پہنچا ضرور لیکن سلطان بہادر نے اس سے ملنے سے انکار تو نہیں کیا لیکن قدرے تاخیر کرتا رہا۔ کئی دن بعد وہ ملا ضرور لیکن نہایت خفا تھا۔

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ برہان شاہ نے میرے نام کا خطبہ صرف ایک بار پڑھوایا۔ یہ ہے اس کی وفاداری۔''

''برہان شاہ آپ کا مطیع و فرمانبردار ہے۔ اگر اس سے کوئی امر آپ کی مرضی کے خلاف سرزد ہوا ہو تو آپ معاف فرمائیں۔''

میران شاہ نے نہایت خوش اسلوبی سے برہان شاہ کے خلوص و محبت کا یقین دلایا اور کہا۔ ''یہ میری حقیر رائے ہے کہ آپ برہان نظام شاہ پر لطف و کرم کرکے اپنا بھی خواہ بنالیں۔''

سلطان بہادر شاہ نے اس کی بات مان لی اور اسے احمد نگر کی طرف روانہ کردیا تاکہ برہان شاہ کو یہاں لایا جائے اور اس کی ملاقات سلطان بہادر سے کرائی جائے۔

برہان نظام شاہ سات ہزار پیادوں اور سواروں کے ساتھ برہان پور روانہ ہوگیا۔

برہان نظام شاہ نے خواجہ ابراہیم کو اپنا قاصد بنا کر اپنی روانگی سے پہلے ہی میران محمد شاہ کے پاس روانہ کردیا تھا تاکہ ملاقات کے لیے ضروری امور پہلے ہی طے کرلیے جائیں۔

برہان نظام شاہ دریائے تاپتی کے کنارے ایک موضع میں جا کر اترا اور خواجہ ابراہیم سے ملاقات کی جسے وہ اپنی روانگی سے قبل روانہ کرچکا تھا۔

خواجہ ابراہیم نے اسے بتایا۔ ''یہ قرار پایا ہے کہ سلطان بہادر تخت پر بیٹھا رہے گا اور برہان شاہ اس سے کھڑے کھڑے ملاقات کرے گا۔''

برہان شاہ یہ سنتے ہی بھڑک اٹھا۔ ''یہ مجھ سے کبھی نہ ہوسکے گا کہ سلطان بہادر تخت پر بیٹھا رہے اور میں اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا رہوں۔ اس سے تو بہتر ہے ملاقات کا ارادہ ترک کردیا جائے اور میں یہیں سے واپس لوٹ جاؤں۔''

''حضور، مصلحت کا تقاضا ہے کہ اس وقت سر نیچا کرلیا جائے اور اپنا مطلب نکالا جائے۔'' خواجہ ابراہیم نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا۔

"میں مصلحت کے لیے بھی یہ ذلت گوارا نہیں کرسکتا۔"

"اب ایک ہی ترکیب ہے۔ اگر حضور فرمائیں تو عرض کروں۔"

"مجھے ملاقات پر مزید مجبور نہ کیجیے گا۔"

"میرے پاس قرآن مجید کا ایک نادر نسخہ ہے جو حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب کے مبارک ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ ملاقات کے روز اسے اپنے ساتھ لیتے چلیں تاکہ سلطان بہادر اس مصحف مقدس کے استقبال کے لیے تخت کے نیچے قدم رکھے۔ اسے تخت سے نیچے اتارنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔"

برہان شاہ یہ تدبیر سن کر بہت خوش ہوا اور ملاقات کے لیے تیار ہوگیا۔ دوسرے دن سورج نکلنے کے بعد برہان شاہ، خواجہ ابراہیم کے ساتھ اس مقام کی طرف روانہ ہوا جو ملاقات کے لیے مقرر ہوا تھا۔ مقام پر پہنچ کر خواجہ ابراہیم نے مصحف مقدس کو اپنے سر پر رکھ لیا۔ جب شاہی پردہ سرا کے اندر داخل ہوئے تو سلطان بہادر نے انہیں دیکھ کر اپنے ایک مصاحب سے پوچھا۔ "خواجہ ابراہیم کے سر پر کیا ہے؟" اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا، خواجہ ابراہیم نے قریب پہنچ کر کہا۔

"یہ قرآن مجید کا ایک نسخہ ہے جو حضرت علیؓ کے دستِ مبارک کا لکھا ہوا ہے۔" یہ سننا تھا کہ سلطان بہادر بے اختیار اپنے تخت سے نیچے اترا اور استقبال کے لیے آگے بڑھا اور مصحف شریف کو اپنے ہاتھوں میں لے کر آنکھوں سے لگایا اور اسی طرح کھڑے کھڑے برہان نظام شاہ سے سلام لیا۔ سلطان بہادر نے خیریت پوچھی۔ برہان نظام شاہ نے اپنی خیریت سے آگاہ کیا۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ اس نے خواجہ ابراہیم سے بیٹھنے کے لیے کہا کیونکہ وہ مصحف مقدس اس کے لیے لے کر آیا تھا اور برہان نظام شاہ کو نظر انداز کیا۔ خواجہ ابراہیم نے حکم سنا ضرور لیکن وہ بیٹھا نہیں۔ سلطان بہادر نے پھر بیٹھنے کو کہا اس نے پھر نظر انداز کر دیا۔ جب تیسری بار حکم جاری ہوا تو خواجہ ابراہیم نے معذرت خواہانہ جواب دیا۔

"حضور کا حکم میرے سر آنکھوں پر لیکن میں تعمیل سے مجبور ہوں۔ برہان نظام میرا آقا ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ کھڑا رہے اور میں بیٹھ جاؤں۔"

"وہ بھی بیٹھیں۔ میں نے منع تھوڑی کیا ہے۔"

سلطان بہادر نے کہا اور برہان شاہ کا ہاتھ پکڑ کر ایک مناسب جگہ پر بٹھادیا اور خود ذرا فاصلے پر بیٹھ گیا۔

گفتگو شروع ہوئی۔ آغاز سلطان بہادر نے کیا۔

"موجودہ زمانہ بڑا ہنگامہ خیز ہے۔ چاروں طرف شورشیں برپا ہیں۔ بتاؤ تو سہی ایسے عالم میں تم نے کیسے زندگی بسر کی؟"

برہان شاہ نے نہایت عالمانہ انداز میں جواب دیا۔

"جس پستی کا انجام بلندی ہو اور جس ہجر کی انتہا وصل ہو، اس کے آخری لطف ہی کو یاد رکھنا چاہیے۔ خداوند تعالیٰ کا لاکھ شکر ہے کہ میں نے جس قدر پریشانی اٹھائی، آج تھوڑی سی دیر میں آپ سے مل کر اس کی تلافی ہوگئی۔"

اس جواب میں سلطان بہادر کی تعریف بھی پوشیدہ تھی، اس لیے نہایت خوش ہوا اور خواجہ ابراہیم کے سامنے اس جواب کو تعریفی انداز میں دہرایا۔

"آپ نے سنا...... کیا فاضلانہ جواب دیا ہے۔"

"یہ سب کچھ حضور کی نوازشات کا نتیجہ ہے۔"

سلطان بہادر اس جواب سے بھی بے حد خوش ہوا، اسی وقت اٹھا۔ کمربند، خنجر اور مرصع تلوار جو خود زیب تن کیے ہوئے تھا، اپنے جسم سے علیحدہ کیے اور برہان نظام شاہ کی کمر میں باندھ دیے۔

کچھ دیر بعد سلطان بہادر نے اپنا خاص گھوڑا منگوا کر برہان شاہ کے سپرد کیا۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم فنِ شہ سواری میں بڑی مہارت رکھتے ہو۔ یہ عربی گھوڑا حاضر ہے۔ ذرا سرا پردہ کے گرد چکر تو لگاؤ۔"

برہان شاہ سوار ہوا اور دکن کے دستور کے مطابق گھوڑے پر سوار ہوکر اسے پھرایا۔ اس نے اس خوبصورتی سے گھوڑا پھرایا کہ سلطان بہادر تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ خوش ہوکر فرمایا۔ "یہ سواری چتر کے بغیر کچھ اچھی معلوم نہیں ہوتی۔ ایک چتر برہان کے سر پر سایہ فگن کی جائے۔"

برہان نظام شاہ نے فنِ شہ سواری کا ایسا شاندار مظاہرہ کیا کہ سلطان بہادر کا دل جیت لیا۔ اس کی پذیرائی میں اس نے دوسرے روز ایک بہت بڑا جشن منعقد کیا۔ اپنے تخت کے اطراف میں چار طلائی کرسیاں بچھوائیں۔ برہان شاہ اور اس کے ساتھ آئے ہوئے لوگ ان پر بٹھائے گئے۔

سلطان بہادر نے دل کھول کر تواضع کی۔ برہان نظام شاہ کو پانچ گھوڑے، دو ہاتھی اور بارہ سو ہون عنایت کیے۔

سلطان بہادر کو معلوم تھا کہ چوگان بازی میں برہان

نظام اپنی مثال آپ ہے۔ اس نے برہان کے ساتھ سراپردہ کے اندر ہی یہ کھیل کھیلا۔

جب سلطان بہادر سراپردہ سے باہر آیا تو خواجہ ابراہیم اور برہان کے دیگر امراء باہر کھڑے انتظار کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے بہت سا سامان سلطان بہادر کی خدمت میں بطور نذرانہ پیش کیا۔

دو مہینے سے زیادہ مہمان داری کا لطف اٹھانے کے بعد برہان نظام شاہ نے واپسی کا ارادہ کیا۔۔۔ واپسی کے دوران کچھ دیر بالا گھاٹ دولت آباد میں قیام کیا۔

برہان شاہ احمد نگر واپس آیا تو نہایت طاقتور تھا۔ سلطان بہادر سے اس کے تعلقات بہتر کیا دوستانہ ہو گئے تھے۔ اب وہ اس حالت میں تھا کہ اپنے علاقوں میں اضافہ کرسکتا تھا۔ سب سے پہلے اس نے اس علاقے کے راجاؤں کی طرف توجہ کی۔ مرہٹواری کے بہت سے راجا جو اب تک خودمختار چلے آرہے تھے، برہان نظام کے مطیع ہو گئے۔ برہان نے بغیر کسی قسم کی معرکہ آرائی کے بیس قلعے اپنی حکومت میں شامل کرلیے۔

کہتے ہیں طاقت بہت سے غلط راستے دکھا دیتی ہے۔ مصلحت تو کمزور دیکھتے ہیں طاقتور نہیں۔ برہان شاہ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ سلطان بہادر سے دوستی کے بعد برہان شاہ کے لیے اسمٰعیل عادل کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی لہٰذا جب اسمٰعیل عادل شاہ نے قلعہ کلیان پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا تو برہان نظام شاہ سے مدد کی درخواست کی۔ برہان شاہ نے نہ صرف مدد کرنے سے معذرت کی بلکہ اسمٰعیل عادل شاہ کو منع کیا کہ وہ اس قلعے کو فتح نہ کرے۔

اس حرکت پر اسمٰعیل عادل شاہ کا چراغ پا ہونا فطری تھا۔ اس نے ایک نہایت سخت خط برہان شاہ کے نام لکھا۔

''آج تک تم نے کبھی ایسا سلوک نہیں کیا تھا۔ کیا تم نے احمد نگر کے گزشتہ واقعات کو فراموش کر دیا ہے جو ایسی نازیبا اور ناشائستہ تحریر مجھے بھیجی ہے۔ اگر سلطان بہادر کی طرف سے دیا جانے والا چتر سر پر رکھ کر تم مغرور ہو گئے ہو تو سمجھ لو یہ نشہ بالکل بے کیف ہے۔ یہ سب کچھ وہم و گمان ہے۔

''تم اپنی حرکتوں سے باز آجاؤ، بہتری اسی میں ہے ورنہ نتائج کی تمام ذمے داری تم پر ہوگی۔ میں ننگی تلوار لے کر میدانِ جنگ میں موجود ہوں۔ ذرا باغ نظام سے باہر نکلو، میرے مقابلے پر آؤ پھر تمہیں عادل شاہی بہادروں کی جرأت و جواں مردی سے باخبر کیا جائے۔''

یہ خط پڑھتے ہی برہان نظام شاہ کی غیرت نے جوش مارا۔ فوراً حکم دیا کہ سراپردہ شاہی باہر نکالا جائے۔ دوسرے روز وہ سفر کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس نے اپنے بسائے ہوئے موضع امند پور پہنچ کر چند روز قیام کیا اور لشکر فراہم کرتا رہا۔ جب تمام سامان مکمل ہو گیا تو برہان نظام بڑی شان و شوکت سے عادل شاہی سرحد کی طرف روانہ ہوا۔

ادھر اسمٰعیل عادل شاہ بارہ ہزار سپاہیوں کے ہمراہ برہان نظام کی فوج کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے صفیں مقرر ہو گئیں۔ اس کے بعد میدانِ جنگ فریقین کی آزمائش گاہ بن گیا۔

جب تک سپاہیوں کے پاس سامانِ جنگ اور دلوں میں عزم رہا، لڑائی برابر جاری رہی اور کشت و خون کا بازار گرم رہا۔ آخر ایک حکمراں جیتا اور ایک ہارا۔

اس جنگ کا انجام نظام شاہیوں کے حق میں برا ہوا۔ انہیں شکست ہوئی۔ برہان شاہ کے وفاداروں نے برہان نظام کو صحیح سلامت میدانِ جنگ سے نکال لیا۔

احمد نگر کے دو تین ہزار باشندے اس معرکے میں کام آئے۔ برہان نظام شاہ کا سارا غرور خاک میں مل گیا۔

وہ کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح احمد نگر واپس آیا۔ اس روز وہ بھان متی کی کمی بری طرح محسوس کر رہا تھا۔ اس نے تو اب یہ تک سوچ لیا تھا کہ اگر وہ زندہ ہوتی تو اسے عماد الملک کے پاس بھیجتا اور اس کے ساتھ مل کر اسمٰعیل عادل شاہ سے بدلہ لینے کے لیے اس پر حملہ کرتا لیکن اب وہ دھوپ میں اکیلا کھڑا تھا۔ اسمٰعیل عادل شاہ اس کا دشمن بن چکا تھا۔ عماد الملک کا ساتھ اس نے خود چھوڑ دیا تھا اور سلطان بہادر اس کی مدد کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔

یہ صورتِ حال صرف اس کے لیے تکلیف دہ نہیں تھی بلکہ دونوں جانب کے امراء اسے تشویش کی نظر سے دیکھ رہے تھے اور اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ کسی طرح یہ دشمنی دوستی میں تبدیل ہو جائے۔ دونوں طرف کے امیروں نے پے در پے کئی ملاقاتیں کیں اور دونوں بادشاہوں کو ملاقات پر آمادہ کرلیا۔ دونوں بادشاہ سرحد پر آپس میں بغل گیر ہوئے۔ بات چیت کے دوران یہ طے کیا کہ برہان نظام شاہ برار کو فتح کرے اور اسمٰعیل عادل تلنگانہ کو اور پھر ملک دکن کو آپس میں مساوی تقسیم کرلیں۔

اس بات چیت کے ایک سال بعد اسمٰعیل عادل شاہ اور امیر قاسم برید نے باہم مل کر تلنگانہ کا رخ کیا۔ تلنگانہ کا مشہور قلعہ جس کا نام گلکنڈہ تھا، سب سے پہلے اسمٰعیل عادل

شاہ کی حراست میں آیا۔ ادھر سلطان قلی قطب شاہ نے نزاکت وقت کے پیش نظر گولکنڈہ کو نہیں چھوڑا۔ وہ اگرچہ جنگ کے میدان میں نہیں آیا لیکن قلعہ کے لوگوں کی حفاظت اور ان کی مدد کے لیے سواروں اور پیادوں کی ایک اچھی تعداد روانہ کردی۔

اسمٰعیل عادل شاہ قلعے کے محافظوں سے جنگ کرتا رہا۔ ممکن تھا کہ یہ جنگ نتیجہ خیز ثابت ہوتی مگر حکم الٰہی سے اسمٰعیل عادل شاہ کی طبیعت ناساز ہوگئی۔ یہاں تک کہ وہ چلنے پھرنے کے قابل بھی نہ رہا۔ اس نے اپنے امیر اسد خاں لاری کو طلب کیا اور حکم دیا۔

”مجھے یہاں کی آب و ہوا راس نہیں آرہی ہے۔ تم تلنگانہ کی جنگ جاری رکھو اور مجھے حسن آباد گلبرگہ روانہ کردو۔ طبیعت ٹھیک ہوتے ہی میں تم سے آملوں گا۔“

ابھی اسے گلبرگہ بھیجنے کی تیاری کی جارہی تھی کہ اس کا انتقال ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی لڑائی کا سلسلہ بھی ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا۔

اسمٰعیل عادل شاہ کے انتقال کی خبر اسد خاں لاری نے کسی کو نہ ہونے دی۔ وقت کا تقاضا یہی تھا کہ اس کی موت کو صیغۂ راز میں رکھا جائے۔ بادشاہ کے مردہ جسم کو پالکی میں رکھ کر اس پر نقاب ڈال دی۔ جب دن کا اجالا ختم ہوا اور چاروں طرف تاریکی چھا گئی تو اسد خاں لاری نے اس کی لاش کو قصبہ کوکی بھیج دیا جہاں وہ اپنے والد مرحوم کی قبر کے برابر جگہ پاسکا۔

اس کی موت کے ساتھ ہی وہ تمام شرائط دم توڑ گئیں جو دونوں بادشاہوں کے درمیان طے پائی تھیں۔ اسمٰعیل عادل شاہ کو تلنگانہ کی طرف جانا تھا اور برہان نظام کو برار کی جانب۔

اسمٰعیل عادل شاہ کی وصیت کے مطابق اس کے بیٹے ملوخاں کو تخت نشیں کردیا گیا۔

برہان نظام شاہ اب اس خاندان کا ایک فرد بن چکا تھا۔ ملوخاں سے اسے بڑی امیدیں تھیں۔ اسے یقین تھا کہ وہ اسمٰعیل عادل شاہ کے عزائم کو پورا کرے گا۔ تلنگانہ فتح ہوگا اور پھر برار اور پھر دکن کو آپس میں مساوی تقسیم کرلیا جائے گا۔

اس کی ان امیدوں پر اس وقت پانی پھر گیا جب ملو خاں نے تخت نشیں ہوتے ہی عیش پرستی کا راستہ اختیار کیا اور خود کو مے نوشی اور رقص کی محفلوں میں گم کرلیا۔ رنگ رلیوں میں ایسا محو ہوا کہ پھر کبھی نہ ابھر سکا۔

ملوخاں کی دادی اس صورت حال سے سخت نالاں تھی۔ آخر چھ ماہ بعد ہی چند امیروں کی مدد سے اسے گرفتار کرلیا گیا اور شہزادہ ابراہیم کو تخت پر بٹھادیا گیا۔

ابراہیم عادل شاہ تخت نشیں ہوا تو برہان نظام شاہ ایک مرتبہ پھر پُرامید ہوگیا کہ اسمٰعیل عادل شاہ سے جو شرائط طے ہوئی تھیں، وہ ضرور پوری ہوں گی۔ اس نے اس سلسلے میں کئی سفارتیں ابراہیم کی طرف روانہ کیں لیکن وہ ٹال مٹول سے کام لیتا رہا۔ اس کے خوشامدی امیروں نے اس کے ذہن میں یہ بات بٹھادی تھی کہ دکن کے علاقوں کی مساوی تقسیم فضول سی بات ہے بلکہ دانش مندی کا تقاضا تو یہ ہے کہ خود برہان نظام کے علاقے بھی فتح کرلیے جائیں۔ لطف تو یہ ہوا کہ اسمٰعیل عادل شاہ کا اتحادی اسد خاں لاری بھی اپنے وعدے سے پھر گیا اور ابراہیم عادل شاہ کے ساتھ مل کر برہان نظام شاہ اور اس کے ہمدرد امیر قاسم برید پر چڑھائی کردی۔ ان دونوں نے عادل شاہی لشکر سے جان بچا کر ایک قصبے میں پناہ لی۔ ابراہیم عادل شاہ کو اس سے نہیں اس کے علاقوں سے غرض تھی لہٰذا بالا گھاٹ دولت آباد کا رخ کیا اور اس علاقے کو ہر طرح سے تباہ و برباد کیا۔

یہ وقت برہان نظام کے لیے بہت مشکل تھا۔ وہ قصبہ بٹیر میں تھا اور امیر برید سخت بیمار تھا۔ یہ مشکل اس وقت اور کڑی ہوگئی جب اسی بیماری کے عالم میں امیر برید کا انتقال ہوگیا۔ برہان نظام کا ایک بازو کٹ گیا۔

اب برہان نظام کے لیے صلح کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس نے دکن کی معزز ہستیوں کو درمیان میں ڈالا۔ ان معزز لوگوں نے دونوں خاندانوں کے درمیان مشروط طور پر صلح کروادی۔ شرط یہ تھی کہ ابراہیم عادل شاہ کو شولاپور کے پانچ پرگنے واپس ملیں گے اور مستقبل میں آپس میں کوئی جنگ نہ ہوگی۔

اس فتح کے بعد دونوں فریقوں نے اپنے اپنے ملکوں کی راہ لی۔

اس صلح کو ایک سال گزر گیا۔ یہ تمام عرصہ برہان نظام نے کانٹوں کی سیج پر گزارا۔ اسے شولاپور کے پانچ پرگنوں کے نکل جانے کا بے حد دکھ تھا۔ وہ ہر حال میں ان پرگنوں کو حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن اپنی کمزوری سے خوفزدہ بھی تھا۔ اپنی کمزوری کو طاقت میں بدلنے کا موقع جلد ہی مل گیا۔ ابراہیم عادل شاہ اور علاؤ الدین عما الملک کے درمیان تعلقات کشیدہ ہوگئے۔ یہی موقع تھا جب برہان نظام شاہ کو

ابراہیم عادل شاہ کے حریفوں کو اکسانے کا موقع مل گیا۔ اس نے جمشید قلی قطب شاہ اور بیجانگر کے حکمراں رام راج کو اپنا رازدار بنایا۔ حاکم پرندہ خواجہ جہاں دکنی کی حمایت بھی حاصل کرلی اور سب نے مل کر ابراہیم عادل شاہ کے علاقے پر چڑھائی کرنے کے خیال سے روانہ ہوا۔

برہان نظام شاہ قلعہ شولاپور کی طرف بڑھا اور اسے حراست میں لے لیا۔ اس نے وہ پانچ پرگنے قبضے میں لے لیے جو اس کے ہاتھ سے چلے گئے تھے۔ سرحدی علاقوں کو جی بھر کے لوٹا۔ ابراہیم عادل شاہ کی فوج نے مقابلہ کیا لیکن شکست پر شکست کھائی۔ ادھر قلی قطب شاہ بیجاپور پر چڑھ آیا اور گلبرگہ پر قابض ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ برہان نظام شاہ کے اشارے پر رام راج بھی آگے بڑھا اور قلعہ ہنکر کو گھیر لیا۔

برہان نظام شاہ کی ترکیب کامیاب ہوئی تھی۔ اس کے اکسانے پر ابراہیم عادل شاہ کے حریفوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ وہ اس خطرناک صورت حال سے سخت متفکر تھا۔ اس نے گھبرا کر اسد خاں لاری کو طلب کیا۔ اسد خاں لاری بھی مطمئن کم اور متفکر زیادہ تھا۔ ابراہیم عادل شاہ کے تمام حالات اس کے سامنے رکھ کر اس سے مشورے کا طالب ہوا۔

''تمام حالات تمہارے سامنے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ تمام حکمران ہمارے خلاف ہو گئے ہیں۔ ہم بہ یک وقت تمام لوگوں سے نہیں لڑ سکتے۔ اب تلوار سے زیادہ تدبیر کی ضرورت ہے۔ میں نے تمہیں اسی مشورے کے لیے طلب کیا ہے۔''

''تدبیر کا تقاضا تو یہی ہے کہ جس طرح برہان نظام نے ہمیں اکیلا کیا ہے، اسی طرح ہم اسے اکیلا کردیں۔''

''یہ کس طرح ہوگا؟''

''بادشاہ مبارک! کوئی ہمارے خلاف نہیں ہے۔ یہ سب کچھ برہان نظام کے اشارے پر ہو رہا ہے۔ دراصل عادل شاہی خاندان کا سب سے بڑا حریف رہی ہے۔ بقیہ امراء تو اس کے اشارے پر ناچتے ہیں۔ ان کی علیحدہ کوئی حیثیت نہیں۔ اگر برہان نظام کا خاتمہ کردیا جائے تو تمام ذیلی امراء سے چھٹکارا مل جائے گا۔''

''کیا ہم برہان نظام شاہ کا کام تمام کرنے کی طاقت رکھتے ہیں؟''

''اس کے لیے جنگ کی ضرورت نہیں۔''

''پھر کیا ہوسکتا ہے؟''

''اس کے لیے ضروری ہے کہ شولاپور کے ان پانچ پرگنوں کو نظام شاہ کے حوالے کردیا جائے جن کی وجہ سے لڑائی جھگڑا رہتا ہے۔ بعدازاں رام راج کو ایک ہمدردی بھرا خط تحریر کیا جائے۔ اس کے علاوہ قرب و جوار کے راجاؤں کو شاہانہ تحائف پیش کیے جائیں۔ رام راج نہایت بااثر ہے۔ وہ اگر مٹھی میں آ گیا تو دوسرے راجا تھوڑی سی پیشکش پر عادل شاہی حکومت کے طرف دار ہوجائیں گے۔ ان لوگوں سے اطمینان ہوجانے پر جمشید قلی قطب شاہ سے نمٹنا آسان ہے۔''

ابراہیم عادل شاہ نے اس کی باتوں سے اتفاق کیا اور رام راج کی خدمت میں خط روانہ کرنے کے بعد قریبی راجاؤں کو قیمتی تحائف بھیجنے شروع کردیے۔ اس کے ساتھ ہی اسد خاں لاری کے سپرد ایک جانباز لشکر کیا اور حکم دیا کہ قلی قطب شاہ پر حملہ کردے۔ اسد خاں لاری نے قلعہ کاکنی کو گھیر لیا۔

عجیب بات یہ ہوئی کہ اس کی مدد کو کوئی نہیں آیا۔ قلعہ کے محافظین نے روایتی بہادری کا مظاہرہ کیا اور کئی ماہ کی کوشش کے بعد قلعہ فتح کرلیا۔ اس کے بعد وہ ایک اور مقام انکر کی طرف بڑھا۔ قلی قطب شاہ شکست کے خوف سے تلنگانہ کی طرف بھاگ گیا۔ اسد خاں نے اس کے پیچھے گھوڑے دوڑائے۔ قلی قطب شاہ نے قلعہ گولکنڈہ کے قرب وجوار میں پہنچ کر اپنی فوج کی ترتیب و تنظیم کی۔ اسد خاں بھی پہنچ گیا۔ دونوں فوجوں میں مڈبھیڑ ہوئی۔ بدقسمتی سے قطب شاہیوں کو شکست ہوگئی۔

یہ اتنی بڑی فتح تھی کہ ابراہیم عادل شاہ مطمئن ہوگیا اور خود کو محفوظ پا کر امراء کو ان کی جائداد کی دیکھ بھال کے لیے واپس کردیا۔

برہان نظام شاہ تمام حالات پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر ابراہیم عادل شاہ کو اکیلا دیکھ کر حسن آباد گلبرگہ پر حملہ کردیا۔ شہر کے حصار کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ابراہیم بھی اپنی فوج کے ہمراہ جوابی کارروائی کے لیے بیورہ نہر کے کنارے خیمہ زن ہوا۔ دریا کے دوسرے کنارے کا علاقہ برہان نظام کے قبضے میں تھا۔ نہر پار کرنا ابراہیم عادل شاہ کے لیے ناممکن ہو رہا تھا۔ اس کے سپاہی جب آگے بڑھتے تیروں کی بوچھاڑ ان کا راستہ روک لیتی اور وہ واپس لوٹ آتے۔ اس کوشش میں دو تین ماہ لگ گئے۔ بالآخر سیکڑوں سپاہیوں کی قربانی کے بعد ابراہیم عادل شاہ نے دریا پار کرلیا۔

دونوں طرف کے سپاہیوں کی ترتیب و تنظیم ہونے لگی۔ پیچھے دریا تھا، سامنے نظام شاہی فوج۔ لڑنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ ابراہیم عادل شاہ نے پہل کی۔ قطب شاہی بھی آگے بڑھے۔ نہایت گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ چند گھنٹوں کی لڑائی نے فیصلہ ابراہیم عادل شاہ کے حق میں کر دیا۔

اس فتح نے ابراہیم عادل شاہ کو غرور میں مبتلا کر دیا۔ اس کا سر آسمان کو چھو رہا تھا، قدم زمین پر نہیں تھے۔ اس نے لوگوں سے بدسلوکی شروع کر دی۔ خلقِ خدا اس کے مظالم سے تنگ آ گئی۔ لوگوں نے تنگ آ کر اس کے برادر شہزادہ عبداللہ کو بادشاہ بنانے کا ارادہ کیا۔ یہ سازش بڑی رازداری سے تیار کی گئی تھی لیکن کسی طرح یہ راز ابراہیم عادل شاہ پر فاش ہو گیا۔ اس کے بعد اس کے مظالم کا دائرہ مزید وسیع ہو گیا۔ شہزادہ عبداللہ جان بچا کر بیجاپور سے فرار ہو گیا۔

ابراہیم عادل شاہ کے خوشامدیوں نے اسے باور کرایا کہ اس سازش میں اسد خاں لاری کا ہاتھ ہے۔ بادشاہ اس کی طرف سے مشکوک ہو گیا۔ اس نے اسد خاں سے خط کتابت بند کر دی اور جو موسمی پھل اور تحائف وغیرہ بھیجا کرتا تھا، وہ بھی بند کر دیے۔ اسد خاں جو اپنی جاگیر ''تلگوان'' میں تھا بڑی کوشش کی کسی طرح وہ اپنی نیک نیتی اور نمک خواری ثابت کر سکے۔ پھر اس نے ایک وضاحتی خط بڑی تفصیل سے لکھا۔

''چند مکار، عیار اور فریب خوردہ اور خود غرض لوگوں نے میری جانب سے جو حضور کو بدگمان کیا ہے، اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ اگر ان کی خطائیں شمار میں لائی جائیں تو کئی گنا ہوں گی مگر جو قصور مجھ سے وابستہ کیے گئے ہیں، وہ قطعاً بے بنیاد ہیں۔ ان سے میرا دور کا بھی تعلق نہیں۔ تلگوان میں کافی عرصہ قیام کرنے اور حضور کی ریاست میں قدم نہ رکھنے کا مقصد حریفوں، مکاروں اور خود غرض انسانوں کی یورش سے بچنا تھا۔ میرا یہ اقدام عیاروں کو پسند نہیں آیا۔ انہوں نے اس کو طرح طرح کے معنی پہنائے اور میری دور اندیشی کو نمک حرامی کے مترادف ٹھہرایا۔ اگر حضور کی رضا ہو تو ابھی قدم بوسی کے لیے حاضر ہو جاؤں۔''

ابراہیم عادل شاہ کے دل کا کانٹا نہ نکل سکا۔

برہان نظام شاہ نے اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے کی بھرپور کوشش کی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ موقع اچھا ہے اگر اسد خاں لاری ساتھ دے تو ابراہیم عادل شاہ کو ہٹا کر شہزادہ عبداللہ کو تخت نشیں کرایا جا سکتا ہے۔ اس نے اپنے قاصدوں کو تلگوان روانہ کیا تاکہ وہ اسد خاں لاری کو اس کے ارادے سے آگاہ کریں۔

جب یہ قاصد تلگوان پہنچے تو اسد خاں نے اس خیال سے ان کا پرتپاک استقبال کیا کہ وہ صلح کا پیغام لے کر آئے ہوں گے لیکن جب انہوں نے آنے کا مقصد بیان کیا تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ قاصد بیان کر رہے تھے۔

''شہزادہ عبداللہ اپنے بھائی کے عتاب سے خوفزدہ ہو کر ''بندر گوہ'' پہنچ گیا ہے وہاں کے عیسائی اس کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ اس نے برہان نظام اور قلی قطب شاہ سے مدد چاہی ہے۔ آپ کو بھی ابراہیم عادل شاہ کی معزولی اور شہزاد عبداللہ کی تخت نشینی سے اتفاق کرنا چاہیے۔ اس صورت میں آپ کو نئے بادشاہ کا اتالیق مقرر کر دیا جائے گا۔''

اسد خاں قاصدوں کی زبانی حالات سے آگاہ ہوا تو اسے سخت غصہ آیا۔ اس نے ان قاصدوں کی خلافِ توقع سخت توہین کی۔

''اگر بادشاہوں کی شریعت میں قاصدوں کا قتل جائز ہوتا تو میں آپ لوگوں کی گردن اڑا دیتا۔ خیریت اسی میں ہے کہ آپ لوگ فوراً یہاں سے روانہ ہو جائیں اور اپنے آقا سے جا کر کہو کہ اسد خاں ابھی تک اپنے آقا کا نمک خوار ہے۔''

یہ دوٹوک جواب سن کر برہان نظام نے اپنے دشمنوں میں ایک اور دشمن کا اضافہ کر لیا۔ اس کا نام تھا اسد خاں لاری۔ دشمن سے کیا امید۔ اس نے یہ امید چھوڑی اور قطب شاہ کو اپنے ساتھ ملا کر عادل شاہی سلطنت کی طرف روانہ ہونے کی تیاری کرنے لگا۔

کئی ماہ کی تیاری کے بعد اسے خبر ملی کہ اسد خاں شدید علیل ہے۔ یہ اور بھی اچھا تھا۔ اب وہ ابراہیم عادل شاہ کی مدد کو نہیں آ سکتا تھا۔ وہ موقع غنیمت دیکھ کر عادل شاہی سلطنت کی طرف روانہ ہوا۔ اسد خاں کی بیماری نے شدت اختیار کر لی تھی۔ اسی دوران یہ اطلاع آ گئی کہ اسد خاں کا انتقال ہو گیا۔ برہان نظام نے یہ اطلاع ملتے ہی اصل مقصد کو پس پشت ڈالا اور پہلے قلعہ تلگوان کو ختم کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے وہاں پہنچنے سے پہلے تلگوان پر ابراہیم عادل نے قبضہ کر لیا۔

برہان شاہ احمد نگر واپس آ گیا۔

غصہ کہیں نہ کہیں تو اترنا تھا۔ اس نے سفر کی منزلیں طے کیں اور قلعہ کلیان پر حملہ کر دیا۔ ابراہیم عادل شاہ بھی

سفر کی منزلیں طے کرتا ہوا قلعہ کلیان کے قریب آ گیا اور برہان نظام شاہ کے لشکر کے پاس ہی قیام پذیر ہوا۔ وقت گزرتا رہا یہاں تک کہ رمضان کا مہینا آ گیا۔ غلہ اور دیگر سامانِ ضرورت نہ پہنچنے کی وجہ سے نظام شاہی امراء کی حالت خراب ہوگئی۔ وہ دو دو تین تین دن کا فاقہ کر کے روزے رکھنے لگے۔ ان تمام واقعات نے برہان نظام کو حواس باختہ کر دیا۔ اس نے تمام امراء کا اجلاس طلب کیا اور ان سے مشورہ چاہا۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔

''اب اسی میں عافیت ہے کہ ہم واپس چلے جائیں۔''

''یہ کیا بات ہوئی۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ دیوار کے اندر سے داخل ہو کر دشمن سے لڑا جائے۔''

''اگر ہمیں فتح حاصل ہو تو ہم دوبارہ قلعے کا محاصرہ کر لیں اور اگر شکست ہو تو واپس احمد نگر چلے جائیں۔''

برہان نظام شاہ نے یہ سب باتیں سن کر اپنی رائے دی۔ ''ہمارے گھوڑوں کی حالت اس وقت خراب ہوگئی ہے۔ وہ اس قابل نہیں رہے کہ جنگ میں حصہ لے سکیں۔ بہتر یہی ہے کہ ہم جنگ کے ارادے کو ملتوی کر کے احمد نگر کا راستہ لیں۔ آئندہ پھر کبھی موقع ملے تو خوب اچھی طرح تیاری کر کے اس طرف آنا چاہیے۔''

برہان نظام شاہ سب باتیں سن کر خاموش ہو گیا۔ اٹھا اور اکیلا ہی گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے سب سے بڑے امیر عین الملک کے پاس پہنچا۔

''عین الملک! تمام حالات سے تم بخوبی آگاہ ہو۔ اگر ہم نے دشمن سے لڑائی کیے بغیر محاصرہ اٹھا لیا اور اپنے ملک کو واپس چلے گئے تو اس کا انجام بہت برا ہوگا۔ جنگ کی جاتی ہے تو اس کا انجام بھی بہت برا ہوگا کیونکہ ہماری فوج کی حالت بری ہے۔''

''ہم لوگ تو تلوار کے دھنی ہیں، تلوار ہی سے فیصلہ کرتے ہیں۔'' عین الملک نے کہا۔ ''آگے آپ کی مرضی۔''

''جنگ کے حق میں تو میں بھی ہوں لیکن فوج کی حالت بہت بری ہے۔ اسی مشورے کے لیے تمہارے پاس آیا ہوں کہ جنگ کی جائے تو کس طرح؟''

''اس کی ایک ہی صورت ہے۔'' عین الملک نے کہا۔ ''عید کی صبح ہم دشمن پر حملہ کر دیں۔ اس وقت حریف کے لشکر کا ہر سپاہی عید کی تیاریوں میں مشغول ہوگا۔ اس وقت کسی کے خیال میں بھی یہ بات نہیں ہوگی کہ ہم حملہ کریں گے۔ ہمیں ان کی غفلت سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔''

''تدبیر تو اچھی ہے لیکن خدشہ یہ ہے کہ شاید یہ خبر چھپی نہ رہ سکے اور حریف تک پہنچ جائے۔''

''ہم اس خبر کو خفیہ رکھیں گے۔''

''کیا لشکر والوں کو نہیں بتایا جائے گا کہ ہم کیا کرنے جا رہے ہیں؟''

''یہ سب آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ اس بابت بھی میں نے سوچ رکھا ہے۔ آپ صرف اتنا کریں کہ اپنے خزانچی کو یہ حکم فرما دیں کہ میں اس سے جتنی رقم طلب کروں، وہ بغیر کسی حیل و حجت کے میرے حوالے کر دے اور بالکل پس و پیش نہ کرے۔''

''میں ابھی تمہارے سامنے حکم نامہ تحریر کیے دیتا ہوں۔''

برہان نظام شاہ نے اسی وقت یہ حکم نامہ تحریر کر دیا۔

''عین الملک تم سے جس وقت جو کچھ مانگے، فوراً اس کو دے دو اور اس سے کسی قسم کی باز پرس نہ کرو۔'' عین الملک نے اس حکم نامے کے مطابق شاہی خزانے سے ایک لاکھ ہون نکلوا لیے۔ خزانچی سے یہ بھی کہہ دیا کہ مزید رقم درکار ہوگی تو وہ بھی طلب کی جائے گی۔

عید میں ابھی چند روز باقی تھے اس لیے اس کی ترکیب آسانی سے کامیابی سے ہمکنار ہو سکتی تھی۔ وہ ایک ایک کر کے تمام عسکری سرداروں کے پاس گیا اور انہیں اپنے منصوبے سے آگاہ کرتے ہوئے اس رقم کو لشکریوں میں تقسیم کرنے کے لیے کہا۔

''یہ رقم سپاہیوں میں تقسیم کر دو اور یہ ظاہر کرو کہ یہ رقم عید کے اخراجات کے لیے ہے۔''

عسکری سرداروں نے یہ رقم سپاہیوں میں تقسیم کر دی۔

جب عید میں ایک دن باقی رہ گیا تو عین الملک نے ان سرداروں سے کہا کہ وہ عید کی صبح سپاہیوں کو مسلح ہونے کا حکم دیں اور خود بادشاہ کی خدمت میں سلام و مبارک کے لیے حاضر ہوں۔

عید کی صبح تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ سپاہیوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ انہیں مسلح ہونے کا حکم کیوں دیا گیا ہے لیکن وہ حکم کی تعمیل کے لیے مجبور تھے۔ خاصی رقمیں مل چکی تھیں اس لیے خوش بھی تھے۔

عین الملک نے لشکر گاہ کے گرد کھنچی ہوئی دیوار کو ایک جگہ سے توڑنے کا حکم دیا اور سپاہیوں کو لے کر دشمن کی طرف بڑھا۔

نظام شاہی ہاتھیوں کے ذریعے عادل شاہی لشکر

کے حصار کو توڑ دیا گیا۔ عین الملک اسی راستے لشکر سمیت اندر داخل ہوگیا۔ عادل شاہی لشکر کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ ہوجائے گا۔ سب کے سب غیر مسلح تھے۔ اس حملے نے ان کے حوصلے پست کردیے اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ بادشاہ عید کا غسل کر رہا تھا۔ اسے حملے کی اطلاع ملی تو وہ سراپردہ سے باہر آیا اور ایک گوشے میں چھپ گیا۔

اسی روز برہان نظام نے سپاہیوں کی ترتیب و تنظیم کی اور کلیان کے حصار کی جانب بڑھا۔ اس مرتبہ اس نے مصمم ارادہ کیا کہ اگر حصار والوں نے اپنے آپ کو اس کے حوالے نہ کیا تو وہ تمام لوگوں کو قتل کردے گا۔ قلعے کے لوگ پہلے ہی سے ابراہیم عادل شاہ کی شکست سے دل شکستہ ہوگئے تھے۔ انہوں نے قلعے کو نظام شاہ کے حوالے کردیا۔

ابراہیم عادل شاہ نے اس وقت مقابلہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ قلعہ کلیان کو جانے دیا اور خود برہان نظام کو یہاں مصروف دیکھ کر باقی ماندہ فوج کے ہمراہ نظام شاہی ممالک کی طرف چل پڑا۔ برہان نظام کے کئی پرگنوں کو تباہ و برباد کرنے کے بعد قلعہ پرندہ پر حملہ کردیا۔ اہلِ قلعہ بالکل غافل تھے۔ قلعے کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ عادل شاہ کے لشکر بلا روک ٹوک تلواریں ہاتھ میں لیے قلعے میں داخل ہوگئے۔ چند سپاہی ہمت کر کے سامنے آئے اور قتل ہوگئے، باقی فرار ہوگئے۔ قلعے پر عادل شاہ کا قبضہ ہوگیا۔ قلعہ کلیان کے ہاتھ سے جانے کا دکھ کسی قدر کم ہوا۔

ابراہیم عادل شاہ نے اس قلعے کو ایک دکنی امیر کے حوالے کیا اور خود بیجاپور آ گیا۔

حاکم پرندہ خواجہ جہاں دکنی کو جس وقت اس واقعے کا علم ہوا وہ برہان نظام شاہ کے ساتھ قلعہ کلیان میں تھا۔ اس کے جاسوسوں نے اطلاع دی پھر قلعہ پرندہ کے مفرور سپاہی بھی اپنی شکست کی داستان لے کر اس کے پاس حاضر ہوگئے۔ اس نے برہان نظام سے اس کا ذکر کیا۔ خواجہ جہاں نے چونکہ برہان نظام کی مدد کی تھی، لہٰذا اب برہان نظام کا بھی فرض تھا کہ وہ اس کی مدد کرے۔

برہان نظام اور خواجہ جہاں دکنی ایک بھاری لشکر لے کر قلعہ پرندہ کی طرف روانہ ہوئے۔ ابھی یہ قلعہ بیس کوس دور تھا کہ عادل شاہ کا مقرر کردہ دکنی امیر اتنا خوفزدہ ہوا کہ قلعہ چھوڑ کر فرار ہوگیا اور سیدھا بیجاپور پہنچا۔

بیس کوس کا فاصلہ دو دن میں طے کرنے کے بعد جب برہان نظام شاہ قلعہ پرندہ پہنچا تو قلعے کو بالکل خالی پایا۔ اس نے قلعہ خواجہ جہاں دکنی کے حوالے کیا اور خود احمد نگر چلا گیا۔

ابراہیم عادل شاہ ابھی قلعہ کلیان کی فتح کا جشن پوری طرح منانے بھی نہ پایا تھا کہ قلعہ کلیان کا دکنی محافظ حاضر دربار ہوگیا اور یہ بدخبر سنائی کہ قلعہ دوبارہ نظام شاہی دسترس میں چلا گیا۔

''دشمن ابھی بیس کوس کے فاصلے پر تھا اور تُو نے قلعہ خالی کردیا؟'' ابراہیم عادل شاہ نے استفسار کیا۔

''حضور! میں سویا ہوا تھا کہ مچھروں کی آواز کو نفیری کی آواز سمجھا۔ میں سمجھا دشمن سر پر آ گیا ہے۔ اس وقت مقابلہ بے سود ہے۔ میں نے فرار میں عافیت جانی۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ دشمن فاصلے پر ہے۔ یہ بھی اس وقت معلوم ہوا جب بیجاپور کی طرف آتے ہوئے نظام شاہی لشکر کو راستے میں دیکھا۔ اس وقت میرے ساتھ ایک سپاہی بھی نہیں تھا۔ سب حواس باختہ ہوکر بھاگ چکے تھے۔ میرے پاس اب ایک ہی راستہ تھا کہ میں حضور کو اطلاع دوں۔''

''بدبخت! میں نے تیری بہادری کو مدنظر رکھتے ہوئے تجھے محافظ قلعہ بنایا تھا اور تو مچھروں کی آواز کو نفیری کی آواز سمجھ کر قلعہ دشمن کے حوالے کر آیا۔ کیا اب بھی تجھے جینے کا حق ہے؟''

''حضور! مجھ پر رحم فرمائیں۔''

وہ چیختا رہ گیا اور بادشاہ نے اسے موت کے گھاٹ اتروادیا۔

عادل شاہ کے سامنے اب ایک ہی خیال تھا کہ کسی طرح قلعہ پرندہ پر دوبارہ قبضہ کرلیا جائے۔

برہان نظام شاہ کا تجربہ کار ذہن اچھی طرح سوچ سکتا تھا کہ ابراہیم عادل شاہ کیا سوچ رہا ہوگا۔ بعض ذرائع سے یہ بات اسے معلوم بھی ہوگئی تھی کہ ابراہیم عادل شاہ قلعہ پرندہ پر دوبارہ تسلط کے لیے تدبیریں کر رہا ہے۔ اس نے ضروری سمجھا کہ رام راج حکمراں بیجانگر کو اس راز سے آگاہ کردے۔ اس نے اپنے ایک وفادار امیر کا انتخاب کیا اور اسے رام راج کے پاس بھیج دیا۔

دونوں میں بات چیت کے بعد طے ہوا کہ برہان نظام شاہ ضلع رائچور میں آ کر اس سے ملے تاکہ آئندہ فتوحات کی منصوبہ سازی کی جائے۔

نظام شاہ اپنے سپاہیوں، بہی خواہوں اور مال و اسباب کے ساتھ رائچور پہنچ گیا۔ رام راج بھی بہادر

سپاہیوں کا ایک گروہ لے کر وہاں پہنچ گیا۔ دونوں نے فیصلہ کیا کہ مدگل اور رائچور کو فتح کر کے شولاپور کو حراست میں لے لیا جائے۔

رام راج اور نظام شاہ دونوں نے قلعہ رائچور کے اطراف گھیرا ڈال دیا اور بڑی آسانی سے قبضہ کرلیا۔ مدگل کے لوگوں نے خوفزدہ ہوکر چابی رام راج کے حوالے کردی۔ بعدازاں اس قلعے کو رام راج نے چند معتمد اشخاص کے حوالے کیا اور اپنے بھائی کو سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد دے کر حکم دیا کہ وہ برہان نظام شاہ کا ہاتھ قلعہ شولاپور کی فتح میں بٹائے اور خود اپنے علاقے کی سمت روانہ ہوگیا۔

برہان نظام شاہ نے رام راج کے سپاہیوں کی معاونت سے قلعے کو گھیرے میں لے لیا۔ چند روز کے محاصرے کے بعد اس کی بے صبری نے کام دکھایا۔ اس نے جنگی توپوں کے دہانے کھول دیے اور قلعے کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ دوبارہ قلعے کی چار دیواری کھنچوائی اور ضروری مرمت کرا کے اسے معتمد امیر کے تصرف میں دے کر خود احمد نگر چلا گیا۔

برہان نظام اس کے بعد گلبرگہ جانے کا ارادہ کررہا تھا تاکہ وہاں کا قلعہ بھی فتح کرلے لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ رام راج رائچور اور مدگل کے قلعوں کو فتح کر کے بیجانگر واپس آ گیا ہے تو اس سال گلبرگہ کے قلعے کو فتح کرنے کا ارادہ ترک کردیا۔ وہ مزید ایک سال تک پیچ و تاب کھاتا رہا اور بالآخر دوبارہ عادل شاہی ممالک کو فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر رام راج سے ملاقات کی اور یہ معاہدہ کیا کہ رام راج قلعہ ساغر اور آہنکر کو فتح کرے اور بیجاپور اور گلبرگہ پر نظام کا قبضہ ہو۔

برہان نظام نے اپنے اتحادی رام راج کو ساتھ لیا اور بیجاپور کی طرف روانہ ہوا۔ عادل شاہ برہان نظام کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہ کرسکا اور ایک مقام ''پنالہ'' چلا گیا۔ برہان نظام نے بیجاپور کے قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ قریب تھا کہ وہ اس قلعے کو فتح کرلیتا مگر قسمت کوئی دوسری ہی چال چلنے کے انتظار میں تھی۔ نظام شاہ پر بیماری کا حملہ ہوا اور اسے محاصرہ اٹھا کر احمد نگر واپس آنا پڑا۔ اس کی یہ بیماری جان لیوا ثابت ہوئی۔ بہت علاج معالجہ کرایا لیکن کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور اس نے سفر آخرت اختیار کیا۔

اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا حسین نظام تخت نشیں ہوا۔ اس کے بھائی شہزادہ عبدالقادر نے حسین نظام کی بادشاہت کو تسلیم نہیں کیا اور تخت نشینی کے روز اپنے بھائیوں کو ساتھ لے کر قلعے سے باہر نکل آیا۔ امراء بھی دو جماعتوں میں تقسیم ہوگئے۔ اس سے پہلے کہ خون خرابا ہوتا، حسین نظام شاہ نے خزانے کا منہ کھول دیا۔ ان سب امیروں کو خرید لیا جو شہزادہ عبدالقادر کے ساتھ تھے۔ عبدالقادر مایوس ہوکر ملک برار چلا گیا۔ اس کے دیگر بھائی بھی ادھر ادھر فرار ہوگئے۔ حسین نظام شاہ کے وہ تمام رقیب جو سلطنت کے دعویدار ہوسکتے تھے ایک ایک کر کے ملک سے باہر چلے گئے۔ یہاں تک کہ عین الملک جو برہان نظام کا اہم ترین امیر تھا، حسین نظام سے خوفزدہ ہوکر برار کی طرف بھاگا اور پھر بیجاپور پہنچ کر ابراہیم عادل شاہ کے دائرۂ ملازمت میں چلا گیا۔ حسین نظام شاہ کے دیگر بھائی بھی اس کے ظلم وستم سے تنگ آ کر بیجاپور چلے گئے تھے۔

یہ سب دیکھ کر ابراہیم عادل شاہ کے منہ میں پانی آ گیا۔ اس نے ارادہ کرلیا کہ وہ حسین نظام شاہ کو تخت سے اتار کر اپنے کسی بھائی بھتیجے کو تخت پر بٹھادے۔ اس نے اپنے پھوپی زاد بھائی میراں شاہ علی کو چتر و آفتاب گیر سے سرفراز کیا اور یہ طے کیا کہ ان تمام لوگوں کو جو حسین نظام کے ظلم و ستم سے پریشان ہیں، میراں شاہ علی کے گرد جمع کرے اور پھر شاہ علی کو احمد نگر کے تخت پر بٹھائے۔

حسین نظام بھی ان کارروائیوں سے بے خبر نہیں تھا لیکن اکیلے مقابلہ کرنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ اس نے عماد الملک کو اپنا ہمراز بنانے کی کوشش کی اور ایک قاصد عماد الملک کے پاس بھیجا تاکہ دونوں فرماں روا باہمی اتحاد سے ابراہیم عادل شاہ پر حملہ کریں۔ عماد الملک نے اس کی درخواست قبول کی اور سات ہزار سوار روانہ کیے۔

عماد الملک کے سواروں کو ہمراہ لے کر حسین نظام شاہ قلعہ شولاپور کی طرف روانہ ہوا جس کا محاصرہ ابراہیم عادل شاہ نے کیا ہوا تھا۔ ابراہیم عادل شاہ بھی اس کا منتظر تھا تاکہ اس کا مقابلہ کرکے گزشتہ شکست کا بدلہ لے سکے۔

دونوں طرف سے لشکر آراستہ ہوئے اور ایک دوسرے کے مقابلے پر آ گئے۔ فریقین میں زبردست خون ریزی ہوئی۔ اس معرکے میں عین الملک نے بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا اور نظام شاہی لشکر کے چھکے چھڑا دیے۔ نظام شاہی لشکر نے بھی زبردست دفاع کا مظاہرہ کیا۔ عین الملک نے جب دیکھا کہ نظام شاہی لشکر کسی صورت پسپا ہونے کا نام نہیں لے رہا ہے تو عین الملک گھوڑے سے اتر پڑا اور اپنے سپاہیوں کا دل بڑھانے لگا۔ اس کی مستعدی سے اس کے لشکر میں بھی نئی جان پڑگئی۔ اس زور کا حملہ کیا کہ

نظام شاہی لشکر حواس باختہ ہوکر میدان سے بھاگ نکلا۔

نظام شاہی سپاہیوں کے فرار کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان کے ''علم'' کے پاس صرف ایک ہزار سوار اور ایک سو ہاتھی رہ گئے۔ قریب تھا کہ شکست مکمل ہوجاتی۔ نظام شاہیوں کا پوری طرح صفایا ہوجاتا کہ ایک جھوٹی خبر نے ابراہیم عادل شاہ کو بدگمان کردیا۔ کسی بدخواہ نے یہ خبر اڑادی کہ عین الملک یونہی اپنے گھوڑے سے نہیں اترا بلکہ اس میں ایک چال ہے۔ اس نے گھوڑے سے اتر کر دشمن کے ہاتھ سے پان کھایا اور دشمن سے وعدہ کیا کہ ابراہیم عادل شاہ کو قید کرکے اس کے حوالے کردے گا۔

عین الملک چونکہ نظام شاہیوں کا پرانا نمک خوار تھا اس لیے اسے یقین آگیا کہ خبر سچی ہے۔ اس نے کسی تصدیق کی ضرورت محسوس نہیں کی اور میدانِ جنگ چھوڑ کر بیجاپور کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

عین الملک تنہا دشمن کے لشکر سے لڑ رہا تھا۔ قریب تھا کہ فتح حاصل کرلیتا کہ اسے ابراہیم عادل شاہ کے فرار کی اطلاع ملی۔ وہ کیا کرتا اس نے بھی میدانِ جنگ کو یونہی چھوڑ دیا اور ابراہیم عادل شاہ کو روکنے کے لیے اس کا تعاقب کرنے لگا۔ ابراہیم عادل شاہ کا گھوڑا سرپٹ دوڑ رہا تھا، اسے احساس ہوا کہ کوئی اس کے پیچھے ہے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ عین الملک اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ اس نے بھاگتے بھاگتے یہی سوچا کہ عین الملک اسے قید کرنے کے لیے تعاقب کر رہا ہے۔ اس نے اپنے گھوڑے کی رفتار مزید بڑھادی اور بیجاپور پہنچ کر دم لیا۔ اس کے پیچھے پیچھے عین الملک بھی شہر میں داخل ہوگیا۔

اب عین الملک کو بھی احساس ہونے لگا تھا کہ بادشاہ اس کی طرف سے بدگمان ہے مگر کیوں؟ اس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ اس نے بادشاہ سے ملاقات کی کوشش کی لیکن اسے ملنے نہیں دیا گیا۔ اس ناکامی کے بعد اس نے ایک معتمد شخص کو اپنا قاصد بنا کر ابراہیم عادل شاہ کے پاس بھیجا اور اپنی وفاداری کا یقین دلاتے ہوئے بادشاہ کی برہمی کا سبب پوچھا۔

قاصد لوٹ کر آیا اور جس جواب کے ساتھ آیا، اس نے عین الملک کو حیرت زدہ کردیا۔

بادشاہ نے جواب دیا تھا کہ مجھے عین الملک جیسے ناکارہ ملازم کی ضرورت نہیں۔ وہ کہیں اور چلا جائے۔ میں اسے مزید برداشت نہیں کرسکتا۔

عین الملک اس جواب پر حیران تھا۔ اس کا جرم اگر تھا تو صرف یہ کہ اس نے میدانِ جنگ میں عادل شاہی فوج کی کمان سنبھالی اور آخر دم تک وفادار رہا۔ اس کی بہادری نے جنگ کی کایا پلٹ کر رکھ دی اور فتح کے قریب لے آیا مگر بادشاہ کی بزدلی نے سارا کھیل بگاڑ کر رکھ دیا۔ مجرم وہ نہیں بادشاہ تھا اور اب اسی کو بے عزت کیا جا رہا تھا۔

اس نے قاصد کو دوبارہ بھیجا اور اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ یہ دھمکی بھی دے دی کہ اگر بادشاہ نے ملاقات کا موقع نہیں دیا تو وہ کسی اور کے دامنِ دولت سے وابستہ ہوجائے گا۔

ابراہیم عادل شاہ نے اسے بھی عین الملک کی کوئی چال قرار دیا اور قاصد کو بے عزت کرکے نکال دیا۔

اب کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی۔ عین الملک عادل شاہی حدود سے باہر نکل گیا۔ ایک ہی منزل اس کے سامنے تھی۔ وہ نظام شاہی حدود میں آپہنچا۔

حسین نظام شاہ اس سے خوش نہیں تھا لیکن اس وقت مصلحت کا تقاضا تھا کہ اسے خوش آمدید کہا جائے کیونکہ اس طرح ابراہیم عادل شاہ کا کمزور ہوجانا لازمی تھا۔ اس نے خوشی کا اظہار کیا اور کہلوا بھیجا۔

''یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ عین الملک دوبارہ ہمارے پاس آگیا۔''

حسین نظام شاہ نے امیر قاسم بیگ کو اس کے استقبال کے لیے روانہ کیا اور اس مضمون کا ایک خط اس کے نام تحریر کیا۔

''ایک مدت سے میں اس امر کا خواہاں تھا کہ تم یہاں آؤ۔ خدا کا شکر ہے میری یہ خواہش پوری ہوئی۔ تم کچھ عرصے کے لیے ہماری ملازمت سے محروم رہے ہو، یہ محض ایک اتفاقی امر ہے۔ اس سلسلے میں تمہیں کسی قسم کا غم یا خوف نہ ہونا چاہیے۔ میری توجہ تم پر پہلے سے دس گنا زیادہ رہے گی۔ تم بالکل بے فکر ہوکر میرے حضور آجاؤ۔''

حکیم قاسم بیگ اس خط کو لے کر عین الملک سے ملا اور اسے بادشاہ کا خط دیا۔

''میری دو شرطیں مان لی جائیں تو مجھے انکار نہیں ہے۔'' عین الملک نے کہا۔ ''اول یہ کہ حسین نظام خود میرے استقبال کے لیے آئے اور دوسرے یہ کہ جب میں بادشاہ سے ملنے جاؤں تو میری واپسی تک قاسم بیگ میرے لشکر میں رہے۔''

''اب تم مجھے جانے دو۔'' قاسم بیگ نے کہا۔ ''اور تم مجھے اجازت دو تاکہ میں بادشاہ کے پاس جاؤں اور

ان شرائط کو ان کے سامنے رکھوں اور واپس آ کر اس وقت تک تمہارے لشکر میں رہوں جب تک تم بادشاہ سے مل کر واپس نہ آ جاؤ۔''

عین الملک نے اجازت دے دی اور وہ وہاں سے رخصت ہو کر بادشاہ کے پاس چلا آیا۔

حکیم قاسم بیگ وہاں سے تو چلا آیا لیکن پیغام دینے کے بعد اپنے گھر گیا اور بیماری کا بہانہ کر کے صاحبِ فراش ہو گیا۔

حسین نظام نے اپنے مصاحبین کی ایک جماعت کو اعلیٰ درجے کے کھانے اور شربت دے کر عین الملک کے پاس بھیجا اور اسے کہلوایا کہ تم فلاں وقت فلاں مقام پر مجھ سے ملاقات کرو۔ مجھے افسوس ہے کہ قاسم بیگ بیمار ہو گیا ہے اس لیے وہ تمہارے پاس آنے سے قاصر ہے۔ تم اپنی جگہ سے چل پڑو۔ میں تمہارے استقبال کو روانہ ہو رہا ہوں۔

عین الملک کو پیغام مل چکا تھا کہ بادشاہ اس کے استقبال کے لیے روانہ ہو چکا ہے اس لیے وہ مجبوراً ایک مختصری جماعت کے ساتھ بادشاہ سے ملاقات کے لیے چل پڑا۔ عین الملک کے غلام قبول خاں نے روانگی کی مخالفت کی اور کہا کہ قاسم بیگ کی بیماری خود ساختہ اور مکاری ہے۔ اس میں ضرور کوئی چال ہے لیکن عین الملک نے اس کی بات نہ مانی اور اپنے ارادے پر قائم رہا۔

قبول خاں نے عین الملک کو چھوڑا اور بھاگم بھاگ لشکر میں پہنچا۔ اس نے لشکریوں سے کہا سب لوگ شہر میں چلے جائیں اور جس جگہ بادشاہ نے ملاقات کا کہا ہے، وہاں جا کر قیام کریں۔

''کیوں؟ یہ حکم نامہ کس کا ہے؟'' ایک سردار نے پوچھا۔

''آقا کی جان خطرے میں ہے۔ قاسم بیگ جان بوجھ کر بیمار پڑ گیا ہے اور بادشاہ نے میرے اور تمہارے آقا کو دھوکے سے بلایا ہے۔ یہ میرا وہم بھی ہو سکتا ہے اور حقیقت بھی۔ میں نے آقا کے سامنے اس کا اظہار کیا تھا لیکن وہ نہیں مانے۔ اب ہم سب کا فرض ہے کہ اپنے آقا کی جان کی حفاظت کے لیے یہاں سے کوچ کریں۔''

عین الملک بہت جلدی میں تھا۔ ادھر لشکر میں تکرار ہو رہی تھی۔ جب تک لشکر آمادہ ہوتا عین الملک ''نبہ پور'' پہنچا۔ یہی وہ مقام تھا جہاں حسین نظام شاہ نے ملاقات کا وعدہ کیا تھا۔

عین الملک نے دیکھا کہ حسین نظام ایک میدان میں گھوڑے پر سوار ہے۔ اس کے سامنے دونوں اطراف ہاتھیوں کی قطاریں ہیں۔ ان قطاروں کی وجہ سے وہ مقام جہاں حسین نظام کھڑا تھا ایک تنگ گلی کا منظر پیش کر رہا تھا۔

جب حسین نظام کے مصاحبوں نے عین الملک کو آتے ہوئے دیکھا تو وہ آگے بڑھے اور اس کے گھوڑے کو اس گلی یعنی ہاتھیوں کی قطاروں کی طرف لے آئے اور اسے گھوڑے سے اترنے کے لیے کہا۔ عین الملک چاہتا تو یہی تھا کہ جس طرح حسین نظام گھوڑے پر سوار ہے وہ بھی سواری کے ساتھ ملاقات کرے لیکن مصاحبوں کے اصرار پر مجبوراً اسے گھوڑے سے اترنا پڑا۔ ابھی اس کے قدم زمین پر ٹکے بھی نہیں تھے کہ حسین نظام نے اس کی گرفتاری کا حکم دیا۔ حکم کی تعمیل کی گئی اور اسے گرفتار کر کے ہاتھی پر بٹھا دیا گیا۔

عین الملک کی بہادری ضرب المثل تھی لیکن اس وقت وہ غیر مسلح کر دیا گیا تھا۔

حسین نظام اسے گرفتار کرنے کے بعد اپنے لشکر کے ساتھ روانہ ہوا۔ راستے میں اس فیل بان کو جس کے ہاتھی پر عین الملک سوار تھا نہ جانے کیا سوجھی کہ اس نے کسی حکم کے بغیر اپنا فیصلہ کیا اور عین الملک کا گلا گھونٹ دیا اور اس کے مردہ جسم کو زمین پر پھینک دیا۔

حسین نظام کو اطلاع دی گئی کہ عین الملک خوف کی وجہ سے مر گیا۔

قبول خاں کو وہاں پہنچتے ہی عین الملک کی گرفتاری کا علم ہو گیا تھا۔ اس کا اندیشہ درست نکلا تھا۔ وہ ابھی گومگو کے عالم میں تھا کہ حسین نظام کا حکم نامہ اس کے پاس پہنچ گیا۔

''عین الملک کی عورتیں اور اس کا سامان شاہی بارگاہ میں ملاحظے کے لیے پیش کیا جائے۔''

قبول خاں نے اسی وقت ان عورتوں کو سوار کرایا اور تقریباً پانچ سو افراد کے ساتھ ابراہیم قطب شاہ کے علاقے کی طرف روانہ کر دیا۔

حسین نظام شاہ کے آدمیوں نے قبول خاں کا تعاقب کیا۔ راستے میں کئی جگہ معرکہ آرائی بھی ہوئی۔ قبول خاں نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا اور سفر کی منزلیں طے کرتا ہوا قصبہ اندور کے قریب پہنچا۔ یہاں نظام شاہی امراء موجود تھے جنہیں قبول خاں کی آمد کی اطلاع ہو چکی تھی لیکن اس کی بہادری سے خائف بھی تھے۔ سامنے آ کر لڑنے کی ہمت نہیں تھی حالانکہ قبول خاں کے ساتھ پانچ سو سے زیادہ آدمی نہیں تھے۔ یہ ان کا خوف ہی تھا جس نے دن کے وقت انہیں سامنے نہیں آنے دیا۔ وہ ان پانچ سو آدمیوں

کے ساتھ ساتھ رینگتے رہے اور جب ایک جگہ رات کے اندھیرے نے راستوں کو چھپا دیا، ان امیروں کے آدمی شب خون کے انداز میں ان پر ٹوٹ پڑے۔ اندھیرے کی چادر میں کچھ نہیں سوجھ رہا تھا کہ دشمن کون ہے دوست کون۔ ایسے میں کوئی اور ہوتا تو میدان چھوڑ کر بھاگ جاتا لیکن یہ قبول خاں تھا۔ اس کے آقا کی عزتیں اس کے ساتھ تھیں۔ وہ ڈٹا رہا اور ان امراء کو بھاگنے پر مجبور کر دیا لیکن اس کوشش میں اس کی آدھی نفری کٹ چکی تھی۔ اس نے وفاداروں کی لاشیں میدان میں چھوڑیں اور عورتوں کو لے کر ابراہیم قطب شاہ کے علاقے کی طرف چلا گیا۔

ابراہیم قطب شاہ نے قبول خاں کو خوش آمدید کہا۔ اس نے جس طرح اپنے مالک عین الملک سے وفاداری کی تھی اور اس کے وارثوں کی حفاظت کی تھی، قطب شاہ اس سے بہت متاثر ہوا اور قبول خاں کو انعام میں جاگیر عطا کی۔

☆☆☆

ابھی ابراہیم عادل شاہ کوئی نیا گل کھلانے نہیں پایا تھا کہ اسے مختلف بیماریوں نے گھیر لیا۔ حسین نظام نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حسن آباد گلبرگہ کو فتح کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اس نے امیر قاسم بیگ کو گولکنڈہ بھیج کر ابراہیم قطب شاہ کو پیغام بھیجا۔

''اب حالات ہمارے موافق ہیں۔ ہمیں اس وقت سے فائدہ اٹھا کر قلعہ گلبرگہ پر قبضہ کر لینا چاہیے۔''

ابراہیم قطب شاہ نے موقع غنیمت جان کر اپنا مطالبہ بھی درمیان میں ڈال دیا۔

''میں قلعہ گلبرگہ کی فتح میں آپ کی مدد کروں گا لیکن اس شرط پر کہ قلعہ آہنگر پر آپ میرے ساتھ مل کر حملہ کریں گے اور اس قلعے کو میرے حوالے کریں گے۔''

حسین نظام نے اس کی یہ شرط منظور کر لی اور دونوں گلبرگہ پہنچ گئے۔

دونوں لشکروں نے مل کر قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ توپوں کے دہانے کھلے تو برجوں کی بنیادیں ہل کر رہ گئیں۔ اس سے پہلے کہ قلعہ فتح ہوتا.... قطب شاہ کے امرائے کبار میں سے کسی نے اپنے بادشاہ کے کان بھرے۔

''حسین نظام شاہ وعدے کا کچا ہے۔ وہ قلعہ گلبرگہ پر قابض ہو جائے گا لیکن آپ کو قلعہ آہنگر پر قبضہ نہ کرنے دے گا۔ میری رائے یہ ہے کہ آپ اس کی مدد نہ کریں۔''

''بادشاہ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتے۔''

''یہی وہ بادشاہ ہے جس نے امیر عین الملک کو پناہ دینے کا عہد کیا اور پھر اسے گرفتار کر کے ہلاک کرا دیا۔ وہ آپ کے ساتھ بھی چال چل سکتا ہے۔''

ابراہیم قطب شاہ کو قبول خاں یاد آ گیا جو حسین نظام کے خوف سے اس کی پناہ میں آ گیا تھا۔ اس نے یہی بہتر سمجھا کہ کسی دھوکے میں نہ آئے۔ اس نے اپنا تمام سامان وہیں چھوڑا اور خود آدھی رات کے وقت اپنے ملک کی طرف چلا گیا اور اہلِ قلعہ کو یہ کہہ گیا کہ وہ نظام شاہیوں کی بھرپور مداخلت کریں اور کسی صورت قلعہ حوالے نہ کریں۔

ابراہیم قطب شاہ نے حسین نظام کا ساتھ چھوڑا اور علی عادل جانشیں ابراہیم عادل شاہ سے آملا۔

جب صبح ہوئی تو حسین نظام کو اپنے لشکر میں نہ پا کر پریشان ہوا۔ اب اس نے اس مقام پر زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور جلد از جلد اپنے وطن احمد نگر کی طرف روانہ ہو گیا۔

علی عادل شاہ کے لیے یہ موقع غنیمت تھا جبکہ قطب شاہ بھی اس سے آملا تھا۔ اس نے بیجانگر کے راجا رام راج سے تعلقات استوار کیے اور اسے اپنے ساتھ ملا کر احمد نگر کی طرف روانہ ہوا۔

حسین نظام نے یہ اطلاع ملتے ہی اپنے امیروں سے مشورہ کیا۔ ان سب نے ایک ہی مشورہ دیا کہ ہم میں اتنی قوت نہیں کہ ان تین بادشاہوں سے مقابلہ کریں۔ سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ ہم کلیان کا قلعہ علی عادل شاہ کے حوالے کر کے اس سے صلح کر لیں۔

حسین نظام اس مشورے پر بھڑک اٹھا۔

''جس قلعے کو میرے باپ نے اتنی محنت سے فتح کیا ہے، اسے کسی مداخلت کے بغیر دشمن کے حوالے کر دوں۔ یہ میری غیرت کے منافی ہے۔''

''ہر زمانے کے تقاضے جدا جدا ہوتے ہیں۔'' امراء نے کہا۔ ''آپ کے والد کے لیے یہی مناسب تھا کہ وہ قلعہ کلیان پر قبضہ کرتے اور آپ کے لیے یہی مناسب ہے کہ دست بردار ہو جائیں۔ یہ قلعہ کسی مناسب وقت پر دوبارہ فتح کیا جا سکتا ہے۔''

''جو کچھ تم لوگ کہتے ہو، مجھ سے یہ کبھی نہیں ہوگا۔''

حسین نظام نے امیروں کی رائے سے اتفاق نہیں کیا اور اپنی بات پر اڑا رہا۔ اسی اثنا میں علی عادل ایک لاکھ سواروں اور دو لاکھ پیادوں کا لشکر لے کر احمد نگر کے نواح میں پہنچ گیا۔

حسین نظام شاہ نے فوراً احمد نگر کے کچے قلعے میں

جس کے سامنے خندق بھی نہ تھی، سامانِ جنگ، غلہ اور دیگر اشیا جمع کیں اور قلعے کو چند قابلِ اعتماد امیروں کے سپرد کر کے اپنے بال بچوں اور خزانوں کے ساتھ احمد نگر سے نکل کر اپنے علاقے ''جیر'' کی طرف چلا گیا۔ یہاں جانے کا مقصد یہ تھا کہ امیر برید اور عماد الملک کو اپنے ساتھ ملائے اور پھر دشمن کے ساتھ جنگ کرے لیکن امیر برید کے بھائی خان جہاں نے یہ منصوبہ پورا نہیں ہونے دیا۔ خان جہاں عماد الملک کا مدار الہام تھا۔ اس نے جب سنا کہ احمد نگر خالی ہو گیا ہے اور حسین نظام عماد الملک سے ساز باز کرنے کے لیے جیر میں ہے تو اس نے عماد الملک کو ورغلایا کہ اس وقت احمد نگر پر حملہ کر دیا جائے۔ اس سے پہلے کہ حسین نظام، عماد الملک کی طرف قاصدوں کو دوڑاتا، خان جہاں لشکر لے کر احمد نگر پہنچ گیا۔ حسین نظام شاہ نے ایک سردار کی سربراہی میں خان جہاں کی گوشمالی کے لیے تین ہزار سوار بھیج دیے۔ اس لشکر نے پہلے ہی حملے میں خان جہاں کو شکست دے دی۔ اس قضیے سے نجات ملی لیکن ایک اور مصیبت سامنے کھڑی تھی۔ علی عادل شاہ اپنے دو اتحادیوں رام راج اور قطب شاہ کے ہمراہ احمد نگر میں داخل ہو گیا۔ رام راج کے ساتھ آئے ہوئے ہندوؤں نے ظلم کی انتہا کر دی۔ آبادی کو قتل کیا، عمارتوں کو آگ لگائی۔ مسجدوں کی بے حرمتی کی اور انہیں اصطبلوں میں تبدیل کر دیا اور پھر قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ اس محاصرے کی وجہ سے اہلِ قلعہ کو بے حد تکلیف ہوئی۔

...... قطب شاہ علی عادل کے ساتھ آیا تھا۔ اس کا حلیف تھا لیکن اس کی یہ خواہش بھی تھی کہ کسی طرح بھی عادل شاہ کو حسین نظام پر فوقیت حاصل نہ ہو۔ اس نے قلعے کے ایک طرف کا راستہ جدھر وہ خود مقیم تھا، اہلِ قلعہ کے لیے کھول دیا۔ قلعے والے بے خوف و خطر آنے جانے لگے اور ضرورت کی تمام اشیا ان تک پہنچنے لگیں۔

یہ راز زیادہ دنوں تک راز نہ رہ سکا۔ عادل شاہ اور رام راج کو جب قطب شاہ کے اقدام کی خبر ہوئی تو وہ اس سے ناراض ہو گئے اور اسے دبانے کی کوشش کرنے لگے۔

..... قطب شاہ اس صورتِ حال کو زیادہ زیر برداشت نہ کر سکا۔ اس نے ایک رات تمام سامان وہیں چھوڑا اور گولکنڈہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

عماد الملک نے اس عرصے میں حسین نظام کی مدد کا فیصلہ کر لیا اور جہانگیر خاں دکنی کو پیشوا مقرر کر کے اسے ایک معقول لشکر کے ساتھ نظام شاہ کی مدد کے لیے روانہ کیا۔

غلطی

مالک نوکر سے۔ ''اس قدر مہنگائی میں پراٹھے میں اس قدر گھی...... کیا ہو گیا ہے تمہیں فضلو۔''

نوکر۔ ''جناب معاف کر دیں۔ دراصل میرا والا پراٹھا آپ کی طرف چلا گیا ہے۔''

جواب حاضر ہے

ایک شاعر کی شادی ہوئی، دوسرے دن بیوی نے اپنے شوہر سے کہا۔ ''یاد رکھیے گا مجھے کھانا پکانا نہیں آتا۔''

شاعر بولا۔ ''فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تمہیں بتا دیتا ہوں کہ یہاں پکانے کے لیے کچھ ہے بھی نہیں۔''

سو روپے کا نوٹ

ایک آدمی مشہور شاعر احمد فراز کے مجموعۂ کلام کی کتاب خرید رہا تھا۔ دکاندار نے پوچھا۔ ''فراز آپ کے پسندیدہ شاعر ہیں۔''

وہ شخص بولا۔ ''میں تو ان کی کتابیں اس لیے خریدتا ہوں کہ ایک دفعہ ان کی کتاب سے مجھے سو کا نوٹ ملا تھا۔''

مرسلہ: ریاض بٹ۔ حسن ابدال

یقین

یقین جانو تمام انسان آزاد اور بااختیار پیدا ہوتے ہیں۔

مگر...... ان میں سے کچھ شادی کر لیتے ہیں اور پھر بے چارے بے اختیار ہو جاتے ہیں۔

☆☆☆

جادوگرنی

بیوی۔ ''آپ کو چکن بنا دوں؟''

شوہر۔ ''نہیں...... میں انسان ہی ٹھیک ہوں...... وڈی آئی جادوگرنی۔''

☆☆☆

ایک سکھ کا سر پھٹ گیا۔

ڈاکٹر۔ ''سردار جی کیا ہوا؟''

سردار۔ ''میں چپل سے دیوار میں کیل ٹھونک رہا تھا کہ ایک آدمی بولا...... سردار جی کھوپڑی استعمال کرو۔''

مرسلہ: محمد جاوید خان۔ تحصیل علی پور

جہانگیر خاں دکنی نے عادل شاہی سرحد پر قیام کیا اور دشمن کی نقل و حرکت کا سلسلہ ختم کر دیا۔ اس کارروائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ رام راج اور عادل شاہی لشکر میں غلے کی رسد بند ہو گئی اور جلد ہی قحط کے آثار پیدا ہونے لگے۔

جب صورت حال دگرگوں ہو گئی تو رام راج اور عادل شاہ نے پڑاؤ ختم کیا اور آشتی نامی قصبے میں آ گئے۔ یہاں آ کر انہوں نے فیصلہ کیا کہ ایک فوج قلعہ پرندہ پر حملہ کرنے کے لیے بھیجی جائے اور واپس آ کر احمد نگر کو حسین نظام کے قبضے سے نکالا جائے۔

جب اس منصوبے کی اطلاع حسین نظام کو ہوئی تو اس کا پریشان ہونا لازمی تھا۔ اس نے قاسم بیگ کو رام راج کے پاس بھیجا کہ وہ اسے صلح اور دوستانہ مراسم کے لیے آمادہ کرے۔ قاسم بیگ کی کوششوں سے صلح کی بات چیت شروع ہوئی۔

رام راج نے صلح کے لیے تین شرطیں پیش کیں۔ کلیان کا قلعہ علی عادل کے سپرد کر دیا جائے۔ جہانگیر خاں دکنی کو قتل کر دیا جائے کیونکہ اس نے ہماری رسد بند کر دی تھی۔ حسین نظام ہمارے پاس آئے۔

یہ تینوں شرائط نہایت کڑی تھیں، خاص طور پر جہانگیر خاں دکنی کے قتل کی شرط لیکن اس نے اپنی اور اپنے ملک کی خیر اسی میں دیکھی کہ انہیں مان لیا جائے۔ اس نے اپنے چند خاص آدمیوں کو جہانگیر خاں دکنی کے گھر روانہ کیا۔ یہ بھی خیال نہ کیا کہ وہ مہمان ہے اور مدد کو آیا ہے۔ ایک کافر کے کہنے پر اسے قتل کرا دیا۔ اس کے بعد وہ رام راج سے ملاقات کے لیے روانہ ہوا۔

ملاقات کے وقت رام راج کا غرور دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ اپنی جگہ بیٹھا رہا اور بیٹھے بیٹھے حسین نظام کی دست بوسی کی۔ حسین نظام سمجھ رہا تھا کہ وہ شرط پوری کرنے پر مبارک باد دے گا لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹا تھا۔ رام راج استقبال کے لیے کھڑا تک نہیں ہوا۔ حسین نظام کو یہ ناشائستہ حرکت نہایت ناگوار گزری۔ اس نے اسی وقت بھری محفل میں پانی منگوایا اور اپنے ہاتھ دھوئے۔ رام راج سمجھ گیا کہ وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ اس کے ہاتھ گندے ہو گئے ہیں۔ جواب میں اس نے بھی پانی منگوایا اور اپنے ہاتھ دھوئے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا۔ ”اگر یہ شخص میرا مہمان نہ ہوتا تو ابھی تلوار سے اس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا۔“

بدمزگی ایسی ہو گئی تھی کہ حسین نظام کو واپسی کا راستہ دیکھنا چاہیے تھا لیکن رام راج کے بھائیوں نے قاسم بیگ کو واسطہ بنا کر معاملے کو رفع دفع کرایا اور صلح کی کوشش کرنے لگے۔

اس گفت و شنید کے نتیجے میں رام راج اپنی جگہ سے اٹھا اور حسین نظام کے استقبال کی تجدید کی۔ پھر اپنی نشست کے برابر بٹھایا۔

حسین نظام نے قلعہ کلیان کی چابی رام راج کے سپرد کی۔ رام راج نے یہ چابی اسی وقت علی عادل کے پاس بھجوا دی۔

حسین نظام نے یہ سمجھا تھا کہ رام راج کے غرور کا سبب علی عادل ہے۔ اسی کے کہنے پر اس نے یہ ناشائستہ حرکت کی تھی کہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا نہیں ہوا تھا لہٰذا اس نے علی عادل سے ملاقات نہیں کی اور اپنی قیام گاہ پر چلا گیا۔ بعدازاں وہ احمد نگر روانہ ہو گیا۔

وہ رام راج سے تو صلح کر چکا تھا لیکن علی عادل کی طرف سے اب بھی کھٹکا تھا۔ اس کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ اپنے لیے حفاظتی بندوبست کر لے۔ اس نے احمد نگر کے قلعے کی ازسرِنو تعمیر شروع کروائی اور اس کی وسعت میں اضافہ کیا۔ قلعے کے گرد اس نے ایک چوڑی اور گہری خندق کھدوائی۔

انہی دنوں عماد الملک کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا برہان عماد الملک تخت نشیں ہوا۔

حسین نظام شاہ قطب شاہ سے دوستانہ مراسم پیدا کرنا چاہتا تھا کیونکہ قلعہ احمد نگر کے محاصرے کے ایام میں قطب شاہ نے اس سے بہت اچھا برتاؤ کیا تھا۔

حسین نظام کے مقرب خاص ملّا عنایت نے اسے مشورہ دیا کہ وہ ایک قاصد قطب شاہ کے پاس بھیجے۔

ملّا عنایت کی کوششوں سے حسین نظام اور قطب شاہ میں اچھے تعلقات پیدا ہو گئے۔ ان دونوں نے یہ بھی طے کیا کہ قلعہ کلیان کو فتح کیا جائے۔ مزید طے ہوا کہ اگر رام راج اور علی عادل مزاحمت کریں تو حسین نظام رام راج سے لڑائی کرے اور قطب شاہ علی عادل کو سمجھے۔

اس معاہدے کے بعد حسین نظام اور ...... قطب شاہ نے قلعہ کلیان کا محاصرہ کر لیا۔ قریب تھا کہ اہلِ قلعہ پہلے کی طرح عاجز آ کر حسین نظام سے امان کے طالب ہوتے کہ اچانک یہ اطلاع ملی کہ رام راج اور علی عادل ایک زبردست لشکر لے کر اس طرف آ رہے ہیں۔

برہان عماد الملک ابھی جہانگیر خاں دکنی کے قتل کا واقعہ بھولا نہیں تھا۔ اس نے بھی حسین نظام سے بدلہ لینے کا

سنہری موقع دیکھ کر علی عادل شاہ سے اتحاد کرلیا۔
حسین نظام اتنی طاقتوں کا ایک ساتھ مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ وہ تھک ہار کر قلعہ کلیان کے محاصرے سے دستبردار ہوگیا۔ اپنے بال بچوں کو قلعہ اوسا کی طرف روانہ کردیا اور خود قطب شاہ کے ہمراہ دشمن سے مقابلے کے لیے روانہ ہوا اور دشمن سے چھ کوس کے فاصلے پر مقیم ہوا۔ دوسرے روز دونوں نے لشکر مرتب کیے اور دشمن سے مقابلے کے لیے روانہ ہوئے۔
یہ دونوں دشمن کے بہت قریب پہنچ چکے تھے کہ اچانک بارش شروع ہوگئی حالانکہ یہ بارش کا موسم نہیں تھا۔ بارش اتنی خوفناک تھی کہ میدان میں کیچڑ اور دلدل کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اس کا توپ خانہ نہ صرف بےکار ہوکر رہ گیا بلکہ دشمن کے ہاتھ لگ گیا۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے کسی کے ہاتھ کاٹ دیے جائیں اور اس سے کہا جائے تلوار چلاؤ۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ جنگ سے ہاتھ اٹھا لیا جائے۔
''میں ان توپ خانوں کی وجہ سے رام راج سے جنگ کرنا چاہتا تھا، اب صورتِ حال بدل گئی ہے۔ توپ خانے دشمن کے ہاتھ میں آگئے ہیں۔ کیا ایسی حالت میں دشمن سے جنگ کرنا مناسب ہے؟''
مشیروں نے بھی یہی مشورہ دیا۔
''موجودہ حالت میں دشمن سے معرکہ آرا ہونا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ اگر اس وقت لڑائی کی گئی تو اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ ہماری رائے یہ ہے کہ فی الحال آپ لڑائی کا ارادہ ترک فرمائیں اور اپنے ملک کو واپس چلیں۔ آئندہ پھر کبھی موقع ملے تو دشمن سے سمجھ لیا جائے گا۔''
حسین نظام اس مشورے پر عمل پیرا ہوتے ہوئے احمد نگر کی طرف روانہ ہوگیا۔ دشمن نے ان دونوں کا تعاقب کیا۔ روانہ ہوتے ہوئے نظام شاہی لشکر میں سخت انتشار پھیل گیا۔ جس کا جس طرف منہ اٹھا بھاگ گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ حسین نظام کے ساتھ ایک ہزار سے زیادہ سوار نہ رہے۔ اس کے باوجود حسین نظام سفر کی منزلیں طے کرتا رہا۔ دشمن کے پانچ چھ ہزار سواروں نے اسے گھیر رکھا تھا لیکن کسی کی ہمت نہ تھی کہ وہ حسین نظام شاہ کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا بالآخر تعاقب کرنے والے واپس ہوگئے۔
حسین نظام احمد نگر پہنچا ہی تھا کہ اسے اطلاع ملی کہ رام راج، علی عادل، علی برید اور برہان عمادالملک احمد نگر پہنچنے والے ہیں۔ اس وقت قطب شاہ بھی واپس جاچکا تھا۔

حسین نظام اکیلا اتنے حکمرانوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے لشکر کو غلے اور آتش بازی کے آلات سے مضبوط کیا اور خود ''جنیر'' کی طرف روانہ ہوگیا۔
علی عادل اور رام راج احمد نگر پہنچے۔ رام راج کے ساتھ آئے ہوئے ہندوؤں نے مسجدوں اور مکانوں کو مسمار کرنا شروع کردیا۔ علی عادل کے لیے مسجدوں کی بےحرمتی تکلیف دہ تھی لیکن وہ منع بھی نہیں کرسکتا تھا۔ بس یہی کرسکتا تھا کہ رام راج کو یہاں سے نکال لے جائے۔ اس نے رام راج کو مشورہ دیا۔
''یہاں کے قلعے کا محاصرہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ ہم لوگ حسین نظام شاہ کا تعاقب کریں۔''
رام راج کو یہ مشورہ پسند آیا اور وہ علی عادل کو لے کر حسین نظام شاہ کے تعاقب میں روانہ ہوگیا۔
حسین نظام کو جب خبر ہوئی کہ اس کا تعاقب کیا جارہا ہے تو اس نے ''جنیر'' سے کوچ کیا اور قریبی کوہستانی علاقے میں چلا گیا۔
علی عادل کے ہاتھ سے شکار نکل گیا تھا۔ حسین نظام اب جنیر میں نہیں کوہستانی علاقے میں تھا۔ رام راج اور علی عادل دونوں واپس ہوئے اور احمد نگر پہنچ گئے۔ رام راج نے نہر سین کے کنارے اپنے خیمے لگائے اور علی عادل اس سے کچھ فاصلے پر قیام پذیر ہوا۔
اسی دوران شدید بارشیں شروع ہوگئی تھیں۔ ایک روز رات کے وقت نہر سین میں زبردست سیلاب آگیا۔ اس سیلاب کی وجہ سے رام راج کے لشکر میں بڑی تباہی آئی۔ اس کے بیس امیر، بارہ ہزار سوار اور سیکڑوں ہاتھی اس سیلاب کی نذر ہوگئے۔
یہ نقصان اپنی جگہ لیکن رام راج نے اسے اپنے حق میں بدشگونی سمجھا اور کسی کو کچھ بتائے بغیر اپنے ملک کی طرف روانہ ہوگیا۔ ابھی وہ قطب شاہی سرحد کے قریب واقع قصبہ برکی تک پہنچا تھا کہ اس کی ہوس نے پاؤں پھیلائے۔ اس نے قطب شاہی اور عادل شاہی علاقوں پر قبضہ کرنے کا ارادہ کیا۔ اسے معلوم تھا کہ دونوں حکمران اپنے اپنے پایۂ تخت سے دور ہیں۔
برسات کا بہانہ کرکے برکی میں قیام کیا اور چند پرگنوں پر قبضہ کرکے بیجانگر روانہ ہوگیا۔
علی عادل نے جب رام راج کو روانہ ہوتے ہوئے دیکھا تو اس نے بھی واپسی کے لیے کمر باندھی اور جاتے جاتے ملدرگ کا علاقہ اپنے ایک امیر مرتضیٰ خاں انجو کے

حوالے کر گیا۔ یہ علاقہ شولاپور کے نزدیک تھا۔

مرتضیٰ خاں نچلا بیٹھنے والا نہیں تھا۔ گاہے بگاہے شولاپور کی طرف جاتا اور تباہی و بربادی پھیلا کر لوٹ آتا۔ یہ قلعہ چونکہ حسین نظام کے قبضے میں تھا، اس کی حفاظت اس کی ذمے داری تھی۔ اس نے غلے کی بارہ ہزار بوریاں قلعہ شولاپور میں بھیجیں کہ اگر کسی وقت مرتضیٰ خاں قلعے کا محاصرہ کرلے تو اہلِ قلعہ کو غذائی قلت کا سامنا کرنا نہ پڑے۔ مرتضیٰ خاں کو اس کی اطلاع ملی تو اس نے حملہ کردیا۔ نظام شاہی امراء اس حملے کی تاب نہ لاسکے اور میدانِ جنگ سے بھاگ نکلے۔ مرتضیٰ خان نے غلے کی بہت سی بوریوں کو آگ لگادی اور سیکڑوں بوریاں ہاتھیوں پر لاد کر بیجاپور بھیج دیں۔ یہ ہاتھی بھی وہ تھے جو نظام شاہی امراء میدان میں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔

جس وقت نظام شاہی امراء میدان سے بھاگے تھے، امیر شاہ محمد کا ایک غلام مرتضیٰ خاں کے ہاتھ لگ گیا تھا جسے کچھ دیر بعد مرتضیٰ خاں نے بے ضرر سمجھ کر چھوڑ دیا۔ وہ اپنے مالک کے پاس پہنچا اور اسے خبر دی۔

''عادل شاہی امراء اس وقت لوٹ مار میں مصروف ہیں اور مرتضیٰ خاں کچھ فاصلے پر ایک مقام پر ٹھہرا ہوا ہے جو مجھے معلوم ہے۔ اس وقت اسے بہ آسانی گرفتار کیا جاسکتا ہے۔''

ان امراء نے اسی وقت دو تین ہزار سپاہیوں کو ساتھ لیا اور اس مقام پر پہنچ گئے جہاں مرتضیٰ خاں ٹھہرا ہوا تھا۔ مرتضیٰ خاں کو سنبھلنے کا موقع بھی نہ مل سکا اور اسے گرفتار کرلیا گیا۔

یہ امراء اسے لے کر احمد نگر کی طرف روانہ ہوگئے۔

عادل شاہ کا امیر مرتضیٰ خاں گرفتار ہوچکا تھا۔ دوسری جانب سے نظام شاہی امیر شاہ تقی عادل شاہ کے ہاتھ لگ گیا تھا لہٰذا دونوں جانب سے کوشش کی گئی کہ قیدیوں کا تبادلہ ہو۔ فریقین بیچ میں پڑے۔ شاہ تقی احمد نگر آگیا اور مرتضیٰ خاں کو بیجاپور بھیج دیا گیا۔

☆☆☆

پہلی مرتبہ جب علی عادل شاہ، حسین نظام شاہ کی ہنگامہ آرائیوں سے پریشان ہوا تھا تو اس نے رام راج سے مدد طلب کی تھی اور یہ معاہدہ طے ہوا تھا کہ بیجانگر کے ہندو، مسلمانوں کو محض اس لیے نقصان نہیں پہنچائیں گے کہ ایک فریق ہندو ہے دوسرا مسلمان۔ مسلمانوں کی عبادت گاہوں کو بھی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ مسلمانوں کے جان و مال اور عزت و آبرو پر ہندو دست درازی نہیں کریں گے لیکن رام راج نے اس وعدے کو فراموش کرکے احمد نگر میں مسلمانوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے۔ نہ قتل سے اپنے ہاتھ روکے نہ مسجدوں کی بے حرمتی سے۔ علی عادل یہ سب دیکھ بھی رہا تھا اور سن بھی رہا تھا لیکن وہ اس وقت کچھ نہ بولا کہ مصلحت یہی تھی لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اس کا افسوس اور دکھ بڑھتا گیا۔ انہی دنوں اس نے خواب دیکھا۔ کوئی اس سے کہہ رہا تھا، تم کیسے مسلمان ہو۔ اپنے سامنے مسجدوں کو جلتے ہوئے دیکھتے رہے اور خاموش رہے۔ مسلمانوں کو قتل ہوتے ہوئے دیکھتے رہے اور کسی کا ہاتھ نہ پکڑ سکے۔ روزِ محشر خدا کو کیا منہ دکھاؤ گے۔ اس کی آنکھ کھلی تو اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اس نے اسی وقت ارادہ کرلیا کہ وہ ہندوؤں سے جنگ کرے گا اور مسلمانوں کے قتل کا بدلہ لے گا۔ شاید اس طرح اس کی بخشش ہوجائے۔ اس نے امراء اور اراکینِ سلطنت کو مشورے کے لیے بلایا اور اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ ان امراء نے تمام باتیں غور سے سنیں۔ ان میں محمد کشور خاں بھی تھا جو نہایت صاحبِ فہم اور بادشاہ کا رازدار تھا۔ اس نے نہایت ادب سے عرض کیا۔

''حضور کی رائے نہایت ٹھوس اور جامع ہے۔ اس پر مزید غوروفکر کی گنجائش نہیں تاہم چونکہ آپ نے ہمیں اظہارِ خیال کا حکم صادر کیا ہے اس لیے بصد ادب گزارش ہے کہ اس قدم کے اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ تمام مسلمان فرماں روا باہمی اتحاد و اتفاق سے کام لیں کیونکہ یہ معاملہ کشور کشائی کا نہیں تمام مسلمانوں کی غیرت کا ہے۔ رام راج کے لشکر کی کثرت اور اس کی روز افزوں قوت روزِ روشن کی طرح واضح ہے۔ اس کا ملک چھ بندرگاہوں، ان گنت قلعوں اور شہروں پر مشتمل ہے۔ اس کا محصول بارہ کروڑ ہون ہے۔ اس کے جاہ و جلال کا سکہ ہر دل پر لکھا ہوا ہے۔ اس سے تنہا جنگ کرنا مناسب نہیں۔ اتحاد میں بڑی برکت ہے۔ ہماری رائے میں اس وقت حضور کو حسین نظام سے دوستانہ مراسم پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔''

علی عادل نے کشور خاں کے اس مشورے کو پسند کیا اور اسے اس معاملے میں مختارِ کل بنا دیا۔

''آپ اس معاملے میں مختارِ کل ہیں جو قدم اٹھانا چاہیں اٹھائیں، آپ کو میری منظوری کی ضرورت نہیں۔ فیصلہ بھی آپ کریں گے، عمل بھی آپ کریں گے۔''

کشور خاں نے اختیار ملتے ہی ایک قاصد ابراہیم قطب شاہ کے پاس بھیجا۔ ابراہیم قطب شاہ پہلے ہی رام راج سے نالاں تھا۔ رام راج نے اس کے کئی علاقوں پر قبضہ کرلیا تھا۔ اس نے مدعا سنتے ہی اپنی خدمات پیش کردیں۔ کشور خاں نے یہ ذمے داری ابراہیم قطب شاہ کے سپرد کی کہ وہ حسین نظام کو اس معاملے میں قائل کرے۔

ابراہیم قطب شاہ نے مصطفیٰ خاں اردستانی جو صحیح النسب سید اور ایک عظیم المرتبت فرد تھا، احمد نگر بھیجا۔ اس نے حسین نظام سے ملاقات کی اور تاریخی حوالوں سے وقت کی ضرورت کو بیان کیا۔

''سلاطین، بہمنیہ کے عہدِ حکومت میں جبکہ تمام ملک دکن پر ان کی حکومت تھی، کبھی مسلمان فتح حاصل کرتے تھے، کبھی بیجانگر کے ہندو مسلمانوں پر غالب آتے تھے۔ بہمنی سلاطین عام طور پر بغیر کسی نتیجے کے ہی جنگ موقوف کردیتے تھے اور بیجانگر کے ہندوؤں کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کرتے تھے۔ اب کی بات دوسری ہے۔ اب ملک دکن کسی ایک حکمران کے تابع نہیں۔ کئی حکمرانوں میں تقسیم ہوچکا ہے۔ اب دانش مندی اسی میں ہے کہ تمام مسلمان فرماں روا ایک دوسرے کے دوست بن کر رہیں، باہمی اتحاد و اتفاق سے کام لیں تاکہ زبردست دشمن سے نجات پاسکیں۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہندو متحد ہیں اور مسلمان حکمران ایک دوسرے کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ رام راج کی روز افزوں قوت سے آپ اچھی طرح واقف ہیں۔ نیز آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ کرناٹک کے تمام فرماں روا اس کے تابعدار ہیں۔ ایسی صورت میں مسلمان فرماں رواؤں کا ایک دوسرے سے کشیدہ رہنا بالکل بے جا ہے۔''

حسین نظام شاہ نے مصطفیٰ خاں کی تعریف کی اور اسے ہدایت کی کہ وہ امرائے نظام شاہی سے ملاقات کرکے صلح کے معاملات طے کرے۔

مصطفیٰ خاں نے حسین نظام کے چند اہم امراء سے تنہائی میں ملاقات کی اور قربت کے لیے نئے نئے راستے تلاش کیے گئے۔ ان ملاقاتوں میں عادل شاہی امراء بھی شریک ہوئے۔ فریقین نے طے کیا کہ حسین نظام شاہ اپنی بیٹی چاند بی بی کی شادی علی عادل شاہ سے کردے اور اپنی بیٹی کو جہیز میں شولاپور کا قلعہ دے دے۔ اسی طرح علی عادل شاہ اپنی بہن ہدیہ سلطان کو حسین نظام شاہ کے بڑے بیٹے شہزادہ مرتضیٰ سے بیاہ دے اس طرح دونوں فرماں رواؤں کے تعلقات بہتر ہوجائیں گے، اس کے بعد یہ تینوں حکمران آپس میں مل کر رام راج پر حملہ کریں۔ اسی طرح شولاپور کا قضیہ بھی نمٹ جائے گا جو ہر مرتبہ جھگڑے کی بنیاد بنتا ہے۔

ان ملاقاتوں کے نتیجے میں ایک ہی دن دونوں طرف شادی کی محفلیں آراستہ ہوئیں۔ چاند بی بی بیجاپور آگئی اور ہدیہ سلطان بیاہ کر احمد نگر آگئی۔

یہ شادیاں بڑی دھوم دھام سے ہوئیں۔ طرفین نے جی کھول کر جشنِ مسرت منعقد کیے۔

اتحاد میں بڑی برکت ہے۔ اب اس مقولے پر عمل کرنے کا وقت تھا۔

شادی کے امور سے فراغت کے بعد علی عادل شاہ نے حسین نظام شاہ، ابراہیم قطب شاہ اور علی برید کے ہمراہ رام راج کو تباہ و برباد کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ یہ چاروں فرماں روا بیجاپور کے قریب ایک جگہ جمع ہوئے اور پوری تیاری سے لشکرِ عظیم کو لے کر بیجانگر کی طرف روانہ ہوئے۔ سفر کی منزلیں طے ہوتی رہیں یہاں تک کہ دریائے کرشنا کا کنارہ آگیا۔ یہ علاقہ علی عادل شاہ کے قبضے میں تھا۔

''دریا کے تمام گھاٹ بند کردو۔'' رام راج اس زور سے چیخا کہ دربار کے در و دیوار ہل گئے۔

اس نے اپنے بھائی تمراج کو بیس ہزار سواروں، پانچ سو ہاتھیوں اور ایک لاکھ پیادوں کے لشکرِ جرار کے ساتھ دریا کے تمام گھاٹوں کو بند کرنے کے لیے روانہ کیا۔

اس لشکر کی روانگی کے بعد رام راج نے اپنے مجھلے بھائی تنکنادری کو مال و اسباب کے ساتھ روانہ کیا۔ ان لوگوں نے گھاٹ بند کردیے جس کی وجہ سے مسلمانوں کا دریا کے پار اترنا مشکل ہوگیا۔

یہ انتظامات ہوگئے تو رام راج خود بھی آس پاس کے راجاؤں اور ایک لشکرِ عظیم کے ساتھ روانہ ہوگیا۔

مسلمان بادشاہوں نے ایک جماعت کو دریا کی گہرائی کا اندازہ کرنے کے لیے پانی میں اتارا۔ ان لوگوں نے تیس چالیس کوس تک دریا میں چلنے کے بعد دو تین راستے ایسے دریافت کیے جہاں دریا کم گہرا تھا لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتادیا کہ جہاں پانی کم ہے اس کے بالکل سامنے دوسرے کنارے پر ہندوؤں کی فوج کھڑی ہوئی ہے۔

آخر ایک طویل مشورے کے بعد یہ خبر اڑادی کہ ہم نے ایک اور انوکھا اور نیا گھاٹ دریافت کرلیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی لشکر کے سپاہی گروہ در گروہ اس طرف جانے

لگے۔ دوسری طرف کھڑا دشمن ان حرکات وسکنات کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ صحیح نتیجے پر پہنچا۔ اس نے اصل گھاٹ کو خالی کردیا اور اس طرف کوچ کر گیا جس طرف عادل شاہی سپاہی گئے تھے۔ دریا کے دوسرے کنارے پر مسلمانوں کے مقابل چلنے لگے۔ ہندوؤں سے غلطی یہ ہوئی کہ اپنی فوج کا کوئی حصہ اصل گھاٹ پر مسلمانوں کو روکنے کے لیے نہیں چھوڑا۔ مسلمانوں نے اپنی تجویز کو کامیاب ہوتے ہوئے دیکھا تو اصل گزرگاہ کا رخ کیا اور دو تین روز کے راستے کو صرف بارہ گھنٹے میں طے کرکے اصل گھاٹ پر پہنچ گئے۔ دشمن کی فوج ابھی تک نہ پہنچی تھی۔ مسلمانوں کی ایک جماعت بڑے سکون کے ساتھ گھاٹ سے اتری۔ اس کے بعد مسلمانوں کا سارا لشکر گھاٹ عبور کرکے میدان میں آ گیا۔ صبح ہوتے ہی یہ لشکر رام راج کی فوج کی طرف روانہ ہوا۔ رام راج کی فوج یہاں سے پانچ کوس کے فاصلے پر مقیم تھی۔

مسلمان فرماں رواؤں نے اپنے لشکر کو منظم ومرتب کیا۔ تمام توپیں بارود اور گولوں سے بھر دی گئیں۔ حسین نظام کے تیراندازوں نے رام راج کی فوج کو توپ خانے کے سامنے دھکیل دیا اور پھر توپوں کے دہانے کھل گئے۔ رام راج کی فوج کا بڑا حصہ تباہ ہوگیا۔

رام راج اب تک کسی غلط فہمی میں تھا۔ اس تباہی کے بعد اس کی آنکھیں کھلیں۔ وہ فوراً اپنے سنگھاسن سے نیچے اترا۔ زربفت کا شامیانہ نصب کیا گیا۔ وہ اسی شامیانے میں ایک جڑاؤ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے حکم کے مطابق اس کے چاروں طرف روپے، اشرفیوں اور موتیوں کے انبار لگا دیے گئے۔ دولت کے یہ ڈھیر اس نے بغیر کسی حساب کے اپنے لشکریوں میں تقسیم کرنا شروع کردیے۔ انعام کے لالچ میں اس کے سپاہی پہلے سے کہیں زیادہ جوش وخروش سے لڑنے لگے۔ اس زور کے حملے ہوئے کہ مسلمانوں میں پریشانی پھیل گئی۔

یہ کیفیت دیکھ کر مسلمان بادشاہوں پر مایوسی نے غلبہ کرلیا مگر حسین نظام شاہ اپنی جگہ ڈٹا رہا۔ اس کے چاروں طرف ہزاروں بان اور تفنگ چھوٹ رہے تھے لیکن وہ آگے بڑھاتا کہ دشمن پر حملہ کرے۔ مسلمانوں کے مایوس سپاہیوں نے اس کے علم کو بلند دیکھا تو فوراً نظام شاہ کے پاس پہنچ گئے۔ رام راج کے لشکر میں سخت ابتری پھیل گئی۔ اسی برس کا بوڑھا رام راج حواس باختہ ہوکر دوبارہ سنگھاسن پر بیٹھ گیا۔ حسین نظام بڑی دور سے اسے سنگھاسن پر بیٹھے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھی کو آگے بڑھایا اور لوگوں کو پامال کرتا ہوا سنگھاسن کے قریب پہنچ گیا۔ وہ مزدور جو سنگھاسن اٹھائے ہوئے تھے، ایسے خوفزدہ ہوئے کہ رام راج سمیت سنگھاسن کو زمین پر پھینک کر بھاگ گئے۔ رام راج میدانِ جنگ میں بے یارومددگار پڑا رہا۔ کچھ لمحوں بعد فیل بان کی نظر سنگھاسن پر پڑی۔ ایسا خوب صورت سنگھاسن دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا اور سنگھاسن حاصل کرنے کے لیے ہاتھی کو اسی طرف بڑھایا۔ قریب ہی ایک برہمن کھڑا تھا۔ اس نے فیل بان سے درخواست کی۔

''اس سنگھاسن میں رام راج ہے۔ تم اس کے لیے گھوڑا لا دو تو راجا تمہیں بہت انعام واکرام دے گا۔''

فیل بان تو خالی سنگھاسن سمجھ رہا تھا، یہاں تو معاملہ ہی دوسرا نکلا۔ اس نے فوراً راجا کو اپنے ہاتھی کی سونڈ میں لپیٹ لیا اور حسین نظام شاہ کے توپ خانے کے افسر کے پاس پہنچ گیا۔ اس افسر نے رام راج کو گرفتار کرلیا اور حسین نظام شاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ حسین نظام نے اسی وقت راجا کو قتل کردیا اور اس کا سر جسم سے الگ کرکے میدانِ جنگ میں پھینک دیا۔

ہندو لشکریوں نے جب راجا کے سر کو دیکھا تو ان کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ میدانِ جنگ سے ایسے فرار ہوئے کہ پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ مسلمان بادشاہوں نے مفرور ہندوؤں کا دس کوس تک تعاقب کیا۔

اس جنگ میں ایک لاکھ سے زیادہ ہندو قتل ہوئے۔ مسلمان فرماں رواؤں نے بعد میں بیجانگر میں قتل وغارت گری کا بازار گرم کیا۔

اس جنگ کے بعد پھر کبھی ہندوؤں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔

یہ سب نتیجہ تھا اتحاد واتفاق کا کیونکہ......اتحاد میں بڑی برکت ہے۔

ماخذات:

تاریخ فرشتہ، محمد قاسم فرشتہ۔ طبقات ناصری، منہاج سراج الدین۔ تاج الماثر، حسن بن احمد نظامی۔ منتخب التواریخ، ملا عبدالقادر بدایونی۔

مغربی معاشرے میں پنپنے والے جرائم کی پردہ پوشی کا انوکھا انداز

بعض اوقات جذبات کی انتہا انسان کو جانے انجانے میں کسی نہ کسی جرم سے ہمکنار کردیتی ہے کیونکہ... جب رستہ سیدھا نہ ملے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ خواہش اور مقصد بھی غلط ہے... اسی لیے تو انہیں بھی مقصد براری کے لیے اتنے پاپڑ بیلنے پڑے ہے اور بات کہ ناحق کیے جانے والا خون اپنے قاتلوں کو کسی طور معاف کرنے کے حق میں نہ تھا۔

ہوشیاری

محمد یاسر اعوان

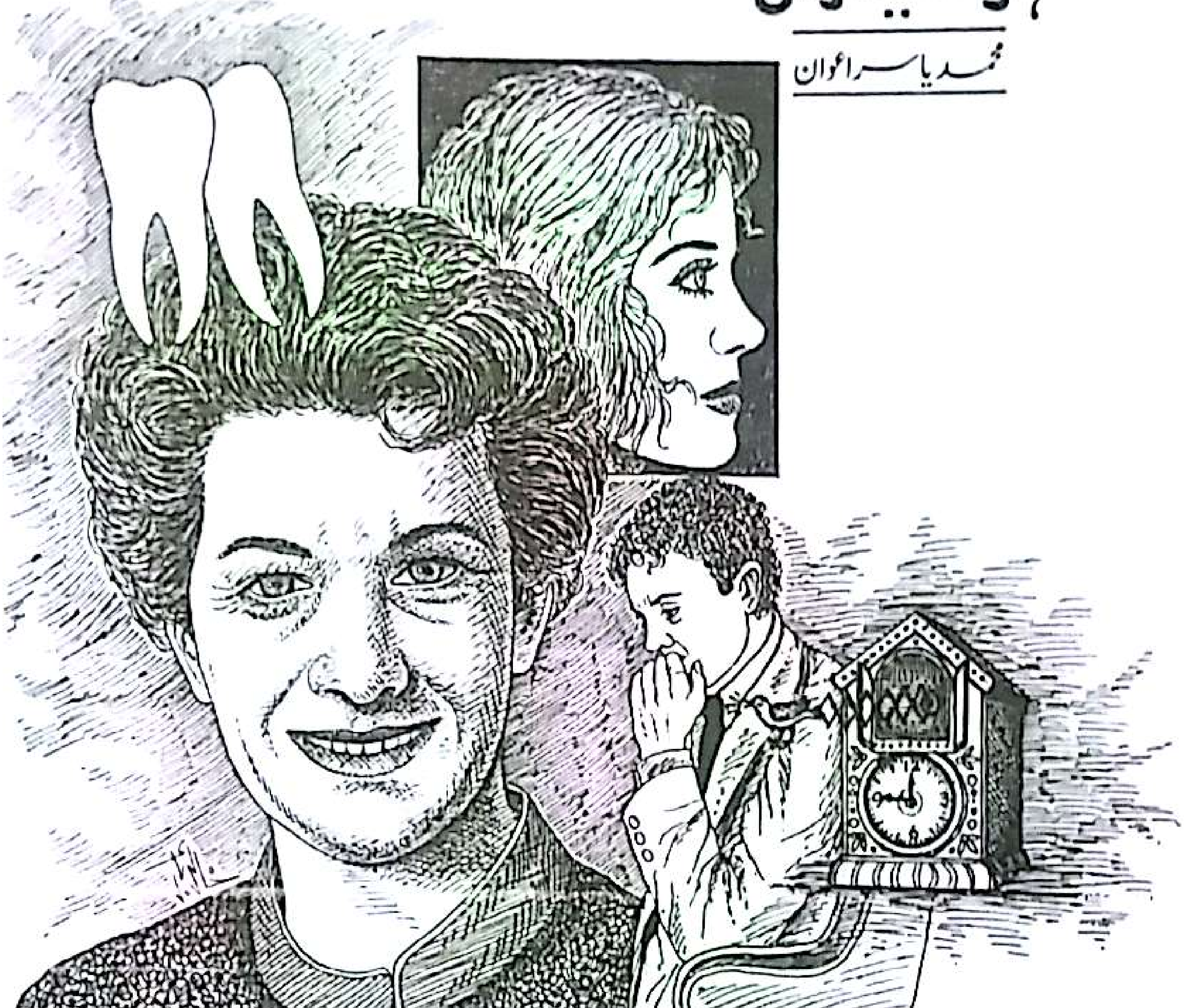

ماحول پر سردی طاری تھی۔ اپنے گھر میں بوڑھی کلیرا آتشدان کے سامنے بیٹھی اپنی پالتو بلی کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیر رہی تھی کہ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ''ہیلو!'' کلیرا نے ریسیور اٹھا کر کہا...... جواب میں دوسری طرف سے ایک نرم اور خوبصورت نسوانی آواز سنائی دی۔

''میں نے اخبار میں آپ کا نمبر ذاتی کالم میں دیکھا تھا۔'' کلیرا کو اس قسم کے ٹیلی فون آنے کی امید تھی۔ کیونکہ رات کے گیارہ بجے کوئی بھی اسے ٹیلی فون

Download These Beautiful PDF Books

Click on Titles to Download

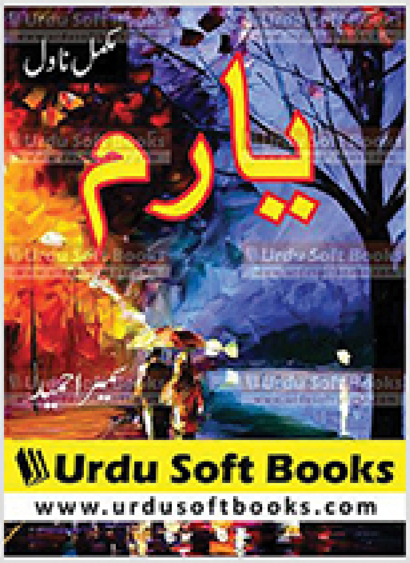

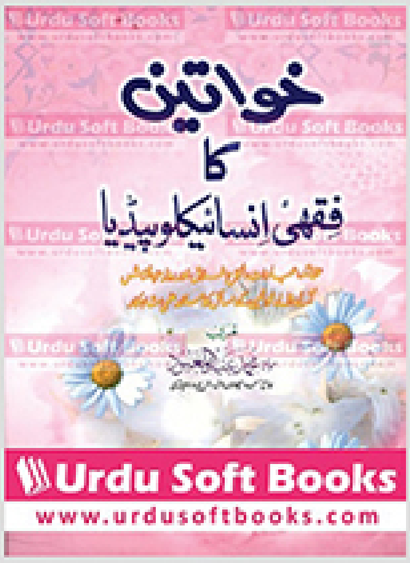

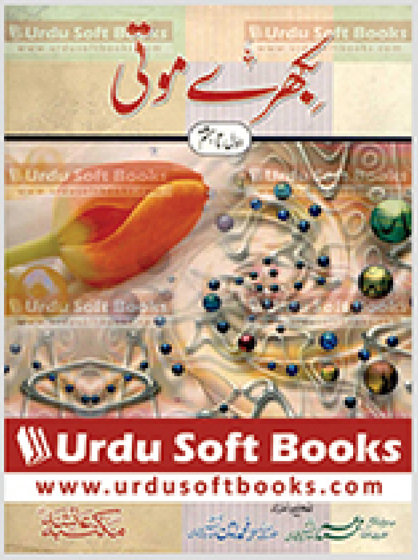

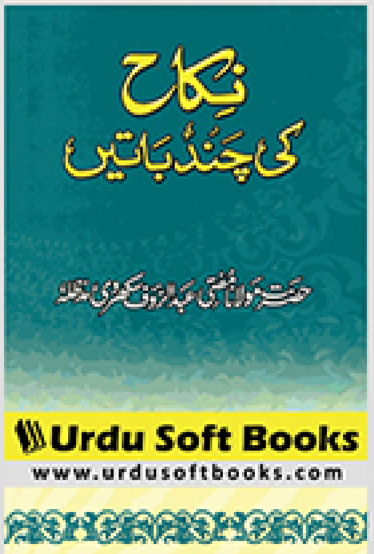

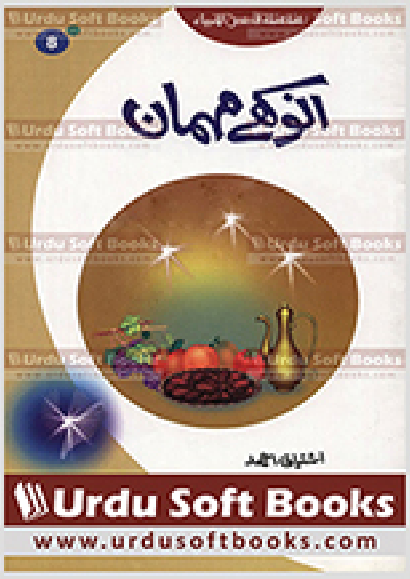

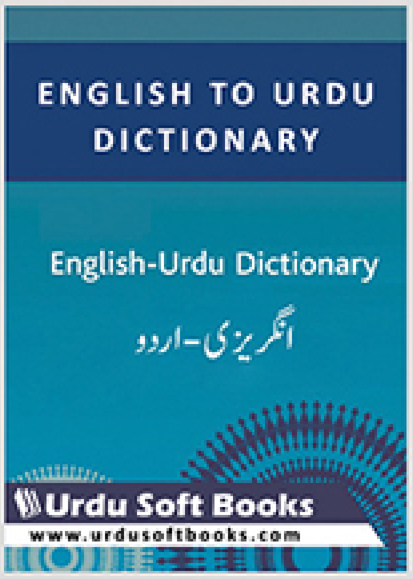

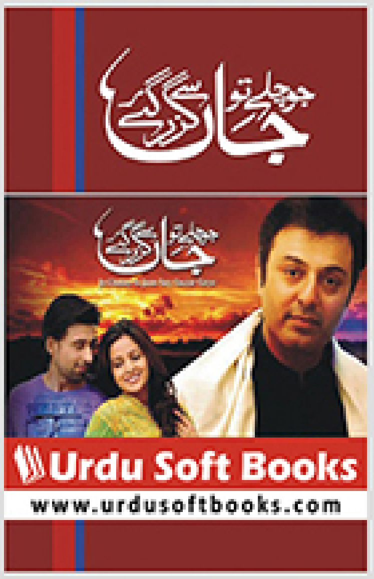

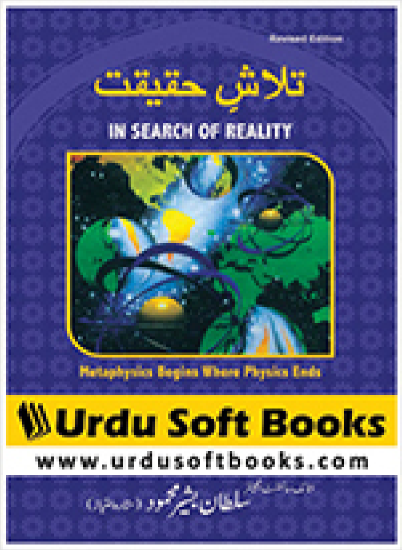

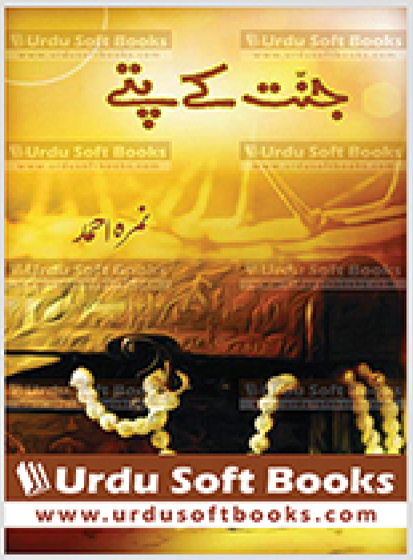

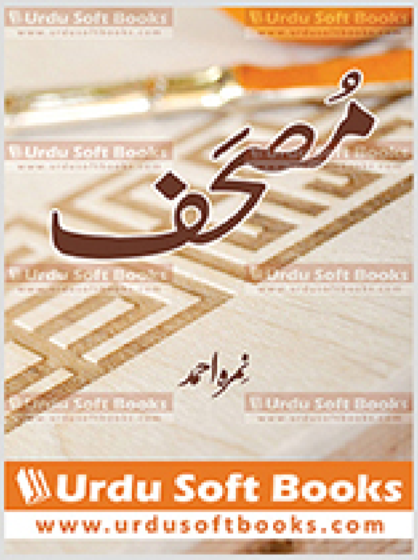

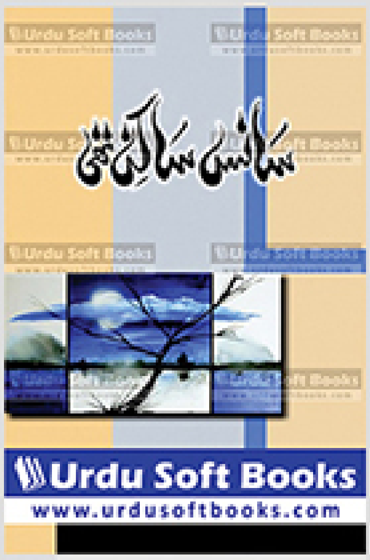

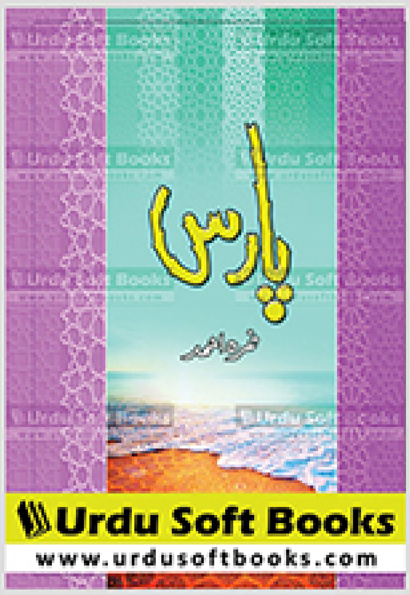

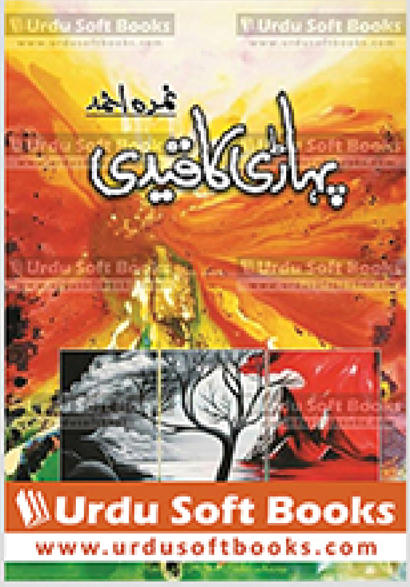

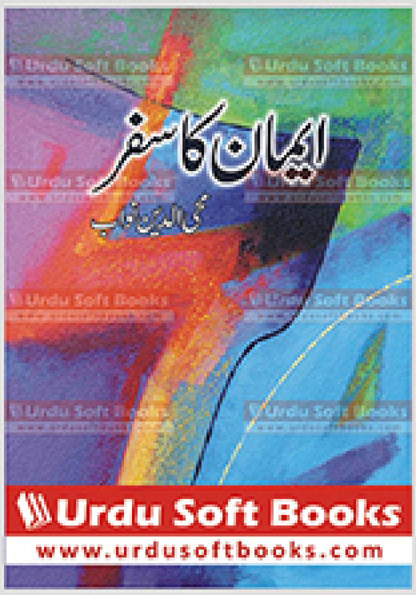

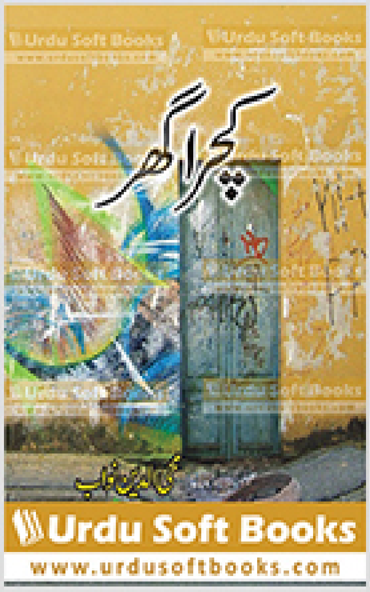

Download These Beautiful PDF Books

Click on Titles to Download

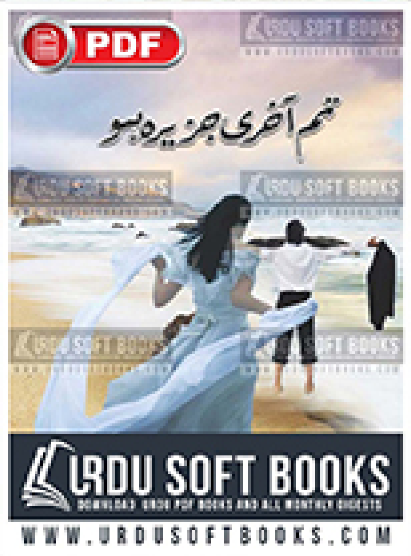

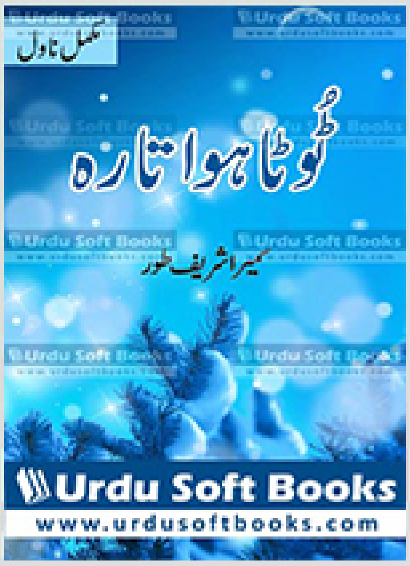

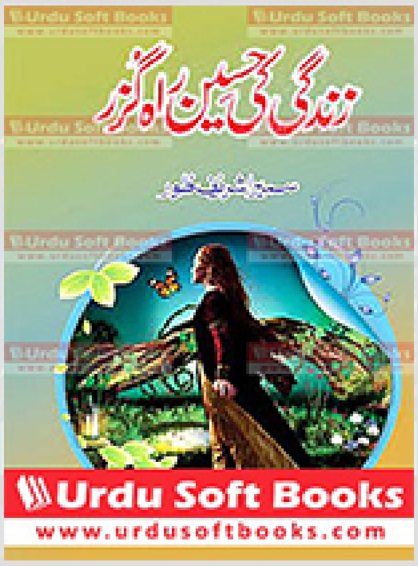

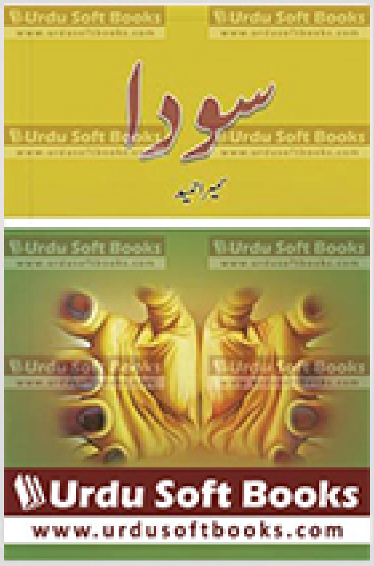

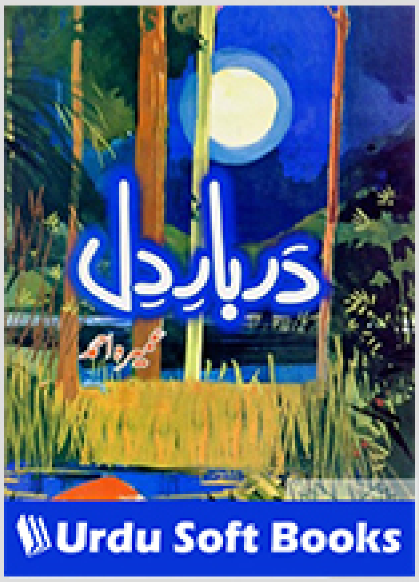

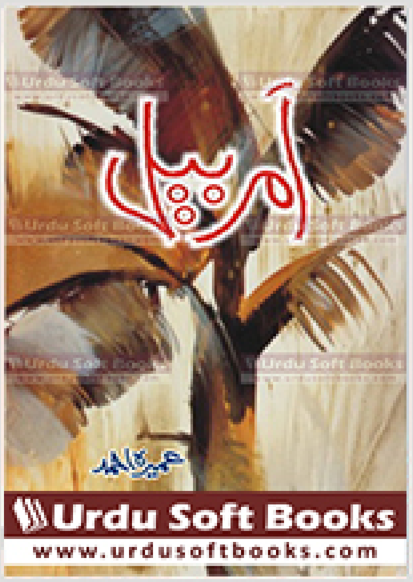

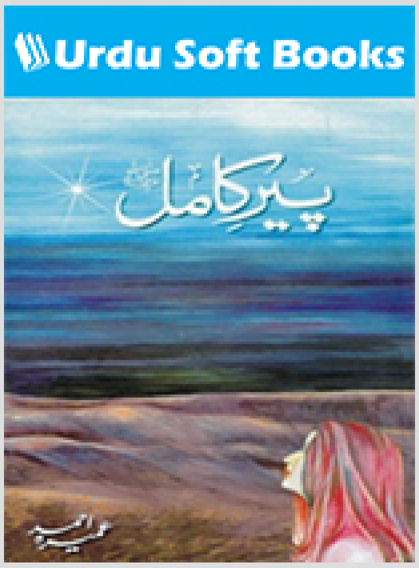

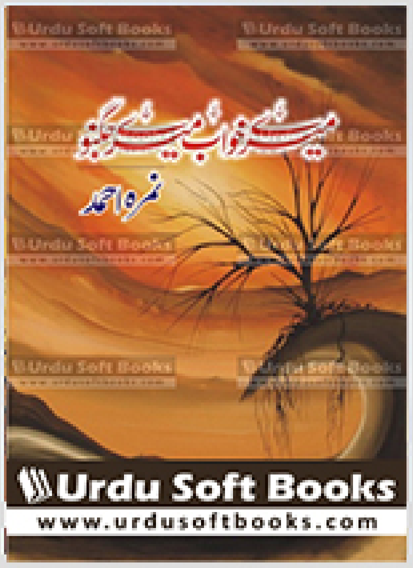

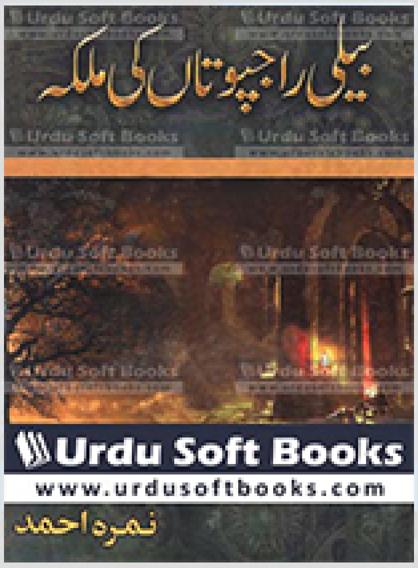

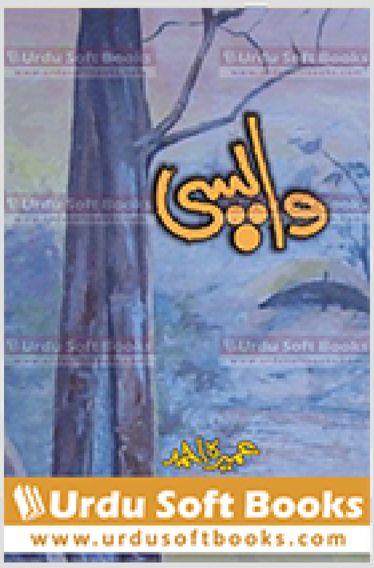

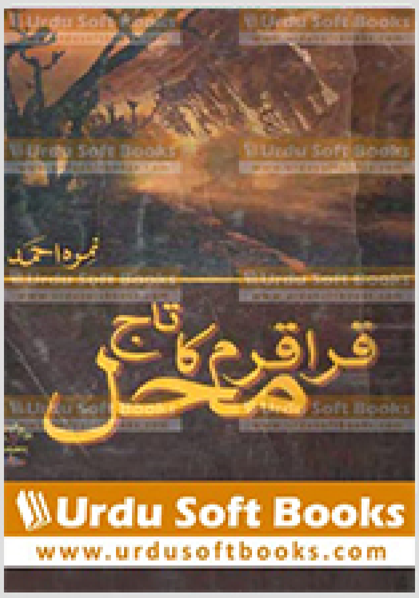

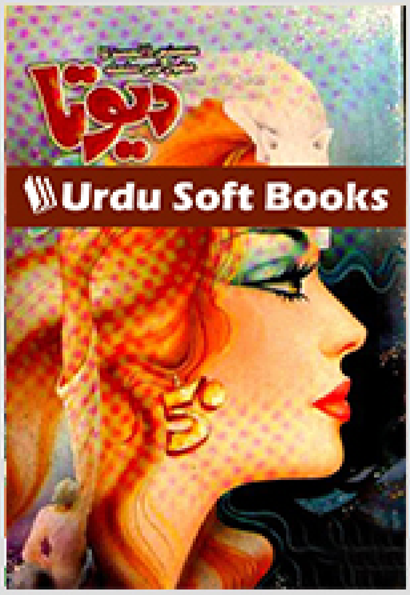

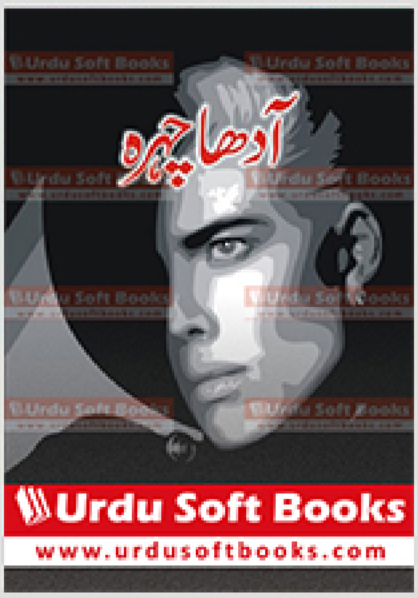

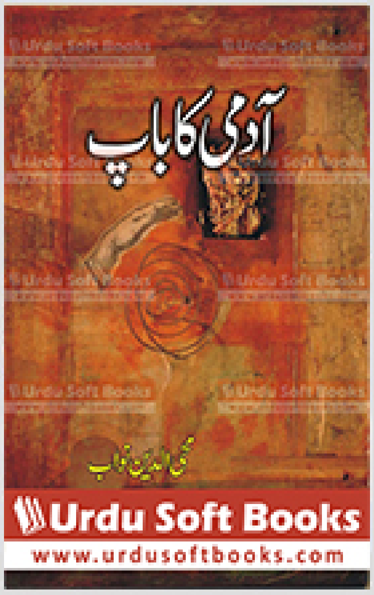

Download These Beautiful PDF Books

Click on Titles to Download

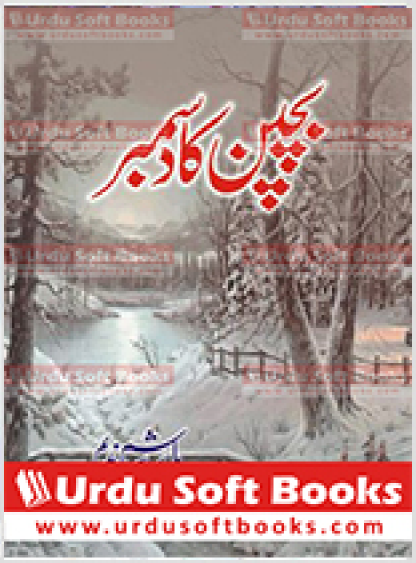

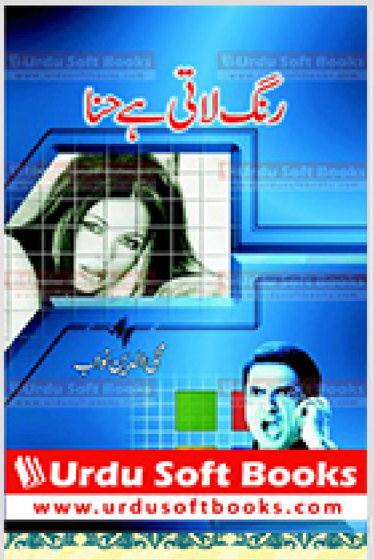

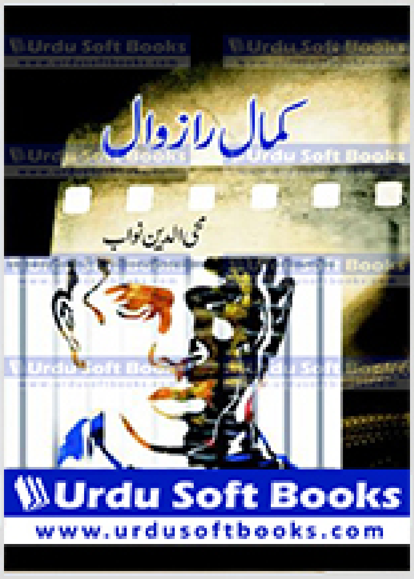

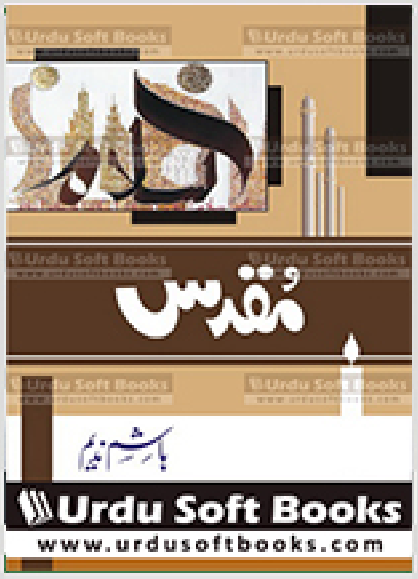

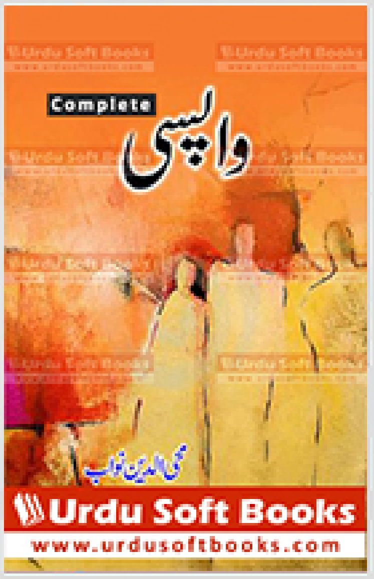

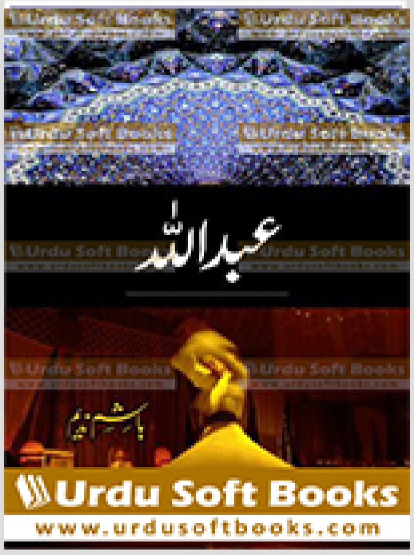

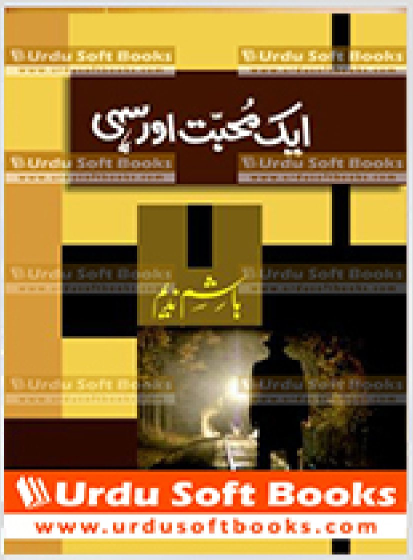

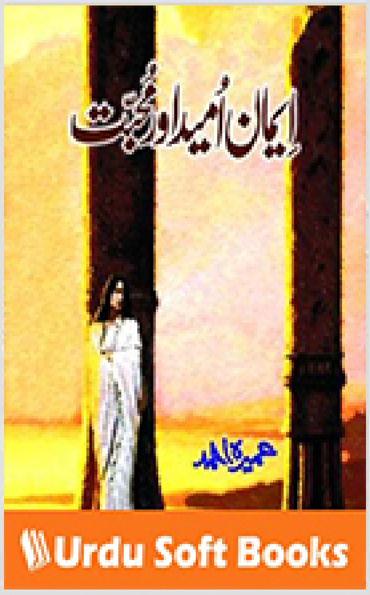

کرسکتا تھا۔ نسوانی آواز نے جس اشتہار کا ذکر کیا، وہ صبح ہی اخبار میں شائع ہوا تھا۔ اس کا عنوان تھا۔ ''خودکشی کی روک تھام کے لیے چوبیس گھنٹے مفت خدمات۔'' نیچے کلیرا کا ٹیلی فون نمبر بھی درج تھا۔ وہ نمبر کلیرا کا ذاتی نہیں تھا بلکہ ایکس چینج کا نمبر تھا جہاں سے ٹیلی فون کال خودبخود اس رضا کار کے گھر منتقل ہو جاتی تھی جو اس وقت ڈیوٹی پر ہوتا......

کلیرا نے دوستانہ لہجے میں جواب دیا۔ ''آپ نے ٹھیک جگہ فون کیا ہے، میں آپ کی کیا خدمت کرسکتی ہوں؟''

دوسری جانب کچھ دیر خاموشی رہی، پھر عورت نے جواب دیا۔ ''میں ٹھیک سے کچھ نہیں کہہ سکتی کہ میں نے آپ کو کیوں فون کیا ہے، دراصل میں بالکل تنہا ہوں اور کسی سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔''

یقیناً یہ خاتون ان میں سے تھی جو خودکشی کے ارادے کو دوسروں سے پوشیدہ رکھنا پسند کرتے ہیں اور اس کا اعتراف نہیں کرتے۔ کلیرا نے سوچا۔ اس خاتون کا فون کرنا ہی اس امر کی دلیل ہے کہ وہ خودکشی کے بارے میں سنجیدہ ہے۔

''میرا یہی کام ہے خاتون کہ دوسروں سے باتیں کروں مگر آپ اتنی رنجیدہ کیوں ہیں؟'' کلیرا نے پوچھا۔

''اوہ! اس کی کئی وجوہات ہیں۔'' نامعلوم عورت نے کہا پھر چند لمحے کے توقف کے بعد بولی۔ ''کہیں آپ لوگ اس قسم کے فون کرنے والوں کا پتا لگانے کی کوشش تو نہیں کرتے......؟''

''ہرگز نہیں۔'' کلیرا نے اسے یقین دلایا۔ ''اگر ہم ایسا کریں گے تو لوگ ہمیں فون کرنا بند کردیں گے۔ ہم یہ جاننا ضروری خیال کرتے ہیں کہ ہمارا مخاطب کون ہے مگر اس کے لیے بھی اصرار نہیں کرتے۔ اگر آپ اپنی شخصیت پوشیدہ رکھنا چاہتی ہیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں اور اگر اپنا نام بتانا پسند کریں تو اسے مکمل راز میں رکھا جائے گا۔ آپ اس سلسلے میں پریشان نہ ہوں۔ میں ایسی ویسی کوئی حرکت نہیں کروں گی۔ مثلاً یہ کہ پولیس کو آپ کے مکان پر بھیجنا تاکہ وہ آپ کو ہاسپٹل میں داخل کرادیں۔ میری یہاں موجودگی کا مقصد آپ کی مدد کرنا ہے آپ کے لیے پریشانیاں پیدا کرنا نہیں۔''

دوسری جانب خاموشی طاری رہی پھر اس عورت نے کہا۔ ''آپ مجھے اچھی خاتون معلوم ہوتی ہیں، آپ کون ہیں؟''

کلیرا کو اس سوال کا تقریباً ہر مرتبہ سامنا کرنا پڑتا تھا۔ رضا کاروں کو سختی سے ہدایت تھی کہ وہ ایسے لوگوں کو اپنا نام ہرگز نہ بتائیں جو خودکشی کا ارادہ رکھتے ہوں کیونکہ ایسے لوگ ذہنی اعتبار سے صحت مند نہیں ہوتے۔ نام معلوم کرنے کے بعد وہ لوگ ملاقات کرنے پر اتر آتے ہیں اور جن کا ذہنی توازن درست نہ ہو اور جو بے حد جذباتی ہوں، ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کب کیا کر گزریں...... پھر کلیرا تو پچاس سالہ بوڑھی عورت تھی، کمزور اور بے بس، جو اپنی بلی کے ساتھ تنہا رہتی تھی......

''میں ان بے شمار رضا کاروں میں سے ایک ہوں...... اس خدمت کے لیے اپنا وقت استعمال کرتے ہیں۔ میں اپنا نام پتا نہیں بتاسکتی۔''

''لیکن تمہارا نام بہت اہم ہے خاتون......'' وہ عورت بولی...... ''کیا آپ کا کوئی نام نہیں ہے؟''

''کیوں نہیں، میرا نام کلیرا ہے۔''

انہیں نامکمل نام بتانے کی تو اجازت تھی مگر گھر کا پتا اور مکمل نام بتانے کی سخت ممانعت تھی۔

''میرا نام کیرولین ہے۔'' دوسری جانب سے بولنے والی عورت نے کہا۔ کلیرا نے کوشش کی کہ وہ عورت اپنا مکمل نام بتادے لیکن اس نے انکار کردیا۔

''کیرولین! تم آواز سے بہت کم عمر معلوم ہوتی ہو، کیا تمہاری عمر بیس سال کے قریب ہے......؟''

''نہیں، میں بتیس سال کی ہوں۔''

''پھر بھی تم میرے مقابلے میں بہت کم عمر ہو، کیا تم شادی شدہ ہو؟'' کلیرا نے پوچھا۔

''ہاں تقریباً دس سال سے۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا تمہارا شوہر اس وقت گھر پر ہے؟''

''نہیں وہ ہر منگل کی رات کو کھانا باہر کھاتا ہے اور رات گئے گھر واپس آتا ہے۔''

''کیا تمہارا کوئی بچہ بھی ہے؟'' کلیرا نے پھر پوچھا۔

''نہیں، البتہ کئی مرتبہ اسقاط ہوچکا ہے۔'' کیرولین نے کہا۔ اس کی آواز میں تاسف نہ تھا۔

''تو تم اس وقت تنہا ہو؟''

''ہاں۔'' کیرولین نے جواب دیا۔

کلیرا نے چند لمحے دانستہ خاموشی طاری رکھنے کے بعد کہا۔ ''کیا تم اپنا مکمل نام بتانا پسند کرو گی؟'' دوسری جانب چند لمحے خاموشی رہی۔

''کیا یہ بہت اہم ہے؟'' آواز میں جھجک نمایاں تھی...... کلیرا نے یہ سوچتے ہوئے کہ کہیں وہ فون بند نہ کردے۔ جلدی سے کہا۔

''نہیں، نہیں، یہ اتنا اہم نہیں۔'' پھر چند لمحوں بعد بولی۔

''تمہارے شوہر کیا کام کرتے ہیں؟''

''وہ کاروباری آدمی ہیں۔'' کیرولین نے جواب دیا۔ کلیرا نے آواز میں نمایاں تبدیلی محسوس کی جیسے کیرولین ایسی کوئی معلومات نہ دینا چاہتی ہو جس سے اس کا پتا معلوم ہوسکے۔ کلیرا نے فوراً پوچھا۔

''کیا تم اپنے شوہر کی طرف سے پریشان ہو، کیرولین؟''

''ارے نہیں، کریسٹ ایک عمدہ شوہر ہے، میری پریشانیاں عام نوعیت کی ہیں......''

کلیرا نے اپنے ذہن میں اس کے شوہر کا نامکمل نام محفوظ کرلیا جسے کیرولین بے اختیار بتا گئی تھی۔ کریسٹ...... پھر اچانک کلیرا کو دوسری جانب سے قدیم طرز کی گھڑی کی آواز آئی جسے کوکو گھڑی کہا جاتا ہے۔ اس میں ایک چھوٹا سا پرندہ اندر سے نکلتا اور کوکو کی آواز نکال کر وقت بتاتا ہے...... اس وقت ٹھیک گیارہ بجے تھے۔ کلیرا نے دو مرتبہ کوکو کی مدھم آواز سنی پھر گھڑی نے جلترنگ کے انداز میں گیارہ مرتبہ گھنٹی بجائی۔ اس نے دوبارہ کوکو کی آواز سنی...... کلیرا نے تصوراتی نظروں سے اس گھڑی کو دیکھا جس کا دروازہ بند ہوا اور چھوٹی سی چڑیا دوبارہ گھڑی کے اندر چلی گئی......

اس قسم کی آوازیں بہت مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ ان کی مدد سے فون کرنے والوں کا اتا پتا بہ آسانی معلوم ہوجاتا ہے مثلاً ٹریفک کی آوازیں، ریل گاڑی کی آواز، اس سے کم از کم ماحول کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ اس قسم کی آوازوں کے ساتھ گھر کے اندر کوئی نشانی اگر معلوم ہو تو ٹیلی فون کرنے والے کا پتا معلوم ہوجاتا ہے۔ کلیرا کو اس قسم کی آوازیں نوٹ کرنے میں مہارت حاصل ہوگئی تھی...... ''تمہیں کس قسم کی پریشانیاں لاحق ہیں، کیرولین؟'' کلیرا نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''ایسی باتیں جو پہلے بہت اہم نظر آرہی تھیں لیکن آپ کو فون کرنے کے بعد اتنی اہم نہیں رہیں۔ آپ سے باتیں کر کے میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی ہوں۔ اگر میں دوبارہ خود کو اتنا رنجیدہ محسوس کروں تو کیا آپ کو پھر فون کرسکتی ہوں؟''

''ضرور، لیکن آئندہ شاید فون پر میں تمہیں نہ مل سکوں۔ ہوسکتا ہے میری جگہ کوئی اور رضاکار ہو لیکن کوئی نہ کوئی تمہیں ضرور مل جائے گا۔''

''اوہ!'' کیرولین کی آواز سے ناامیدی واضح تھی۔

''آپ کب ڈیوٹی پر ہوتی ہیں؟ میں صرف آپ سے گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔''

''ہر منگل اور جمعرات کی رات آٹھ بجے سے صبح آٹھ بجے تک۔'' کلیرا نے جواب دیا۔

''ہوسکتا ہے آئندہ مجھ پر اداسی کا دورہ صرف منگل اور جمعرات ہی کو پڑے۔'' کیرولین نے مزاحیہ لہجے میں کہا۔ ''بہت بہت شکریہ کلیرا صاحبہ۔''

''مجھے تم سے باتیں کر کے بڑی خوشی ہوگی کیرولین۔'' کلیرا نے کہا۔ ''تمہیں یقین ہے کہ اب تم بالکل ٹھیک ہو؟''

''ہاں...... میں خود کو قدرے بہتر محسوس کر رہی ہوں۔'' کیرولین نے یقین دلایا۔ ''آپ نے میری بڑی مدد کی میں آپ کی بے حد شکرگزار ہوں۔''

جمعرات کی رات کلیرا اونگھ رہی تھی کہ فون کی تیز گھنٹی نے اسے چونکا دیا۔ اس نے ریسیور اٹھالیا۔ دوسری طرف ایک گھڑی بارہ بجنے کا اعلان کر رہی تھی پھر دو مرتبہ کوکو کی آواز سنائی دی اور گھڑی خاموش ہوگئی۔

''ہیلو!'' کلیرا نے کہا۔ وہ کوکو گھڑی کی وجہ سے فون کرنے والی کو فوراً ہی پہچان گئی تھی۔

''کلیرا!'' دوسری طرف سے وہی نرم اور لوچدار نسوانی آواز سنائی دی لیکن آج ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ آواز نشے میں ڈوبی ہوئی ہو۔ ''کیرولین بول رہی ہو؟''

''اوہ! آپ میری آواز پہچان گئیں؟'' اس عورت نے حیرت سے کہا۔ ''میرا خیال تھا آپ بہت سارے لوگوں سے گفتگو کرتی ہیں، اس لیے شاید میری آواز نہ پہچان سکیں۔''

''تم نے دیکھ لیا کہ میں تمہیں نہیں بھولی، کیا آج تم

پھر اداس ہو؟''

''بہت زیادہ۔'' دوسری جانب سے سسکیوں کی آواز آئی۔''میں نے...... میں نے منگل کو تم سے جھوٹ بولا تھا کلیرا۔''

''اوہ! لیکن کس سلسلے میں؟''

''میں نے تم سے کہا تھا کہ میں خودکشی کے بارے میں زیادہ سنجیدہ نہیں۔ میں نے جھوٹ بولا تھا، میں نہ جانے کیا کر بیٹھوں۔''

''تمہارا شوہر کہاں ہے، کیرولین؟''

''وہ شہر سے باہر نیشنل ڈین......'' جملہ ادھورا رہ گیا...... کلیرا کو ایسا لگا جیسے کیرولین بے خیالی میں کوئی بات کہنے والی تھی لیکن اپنی حماقت کا احساس ہوتے ہی خاموش ہوگئی۔ چند لمحے بعد ریسیور پر اس کی آواز ابھری۔''میں گھر پر تنہا ہوں کلیرا۔''

''کیا تمہارے گھر کے قریب کوئی تمہاری سہیلی ہے جو تھوڑی دیر تمہارے ساتھ رہ سکے؟'' کلیرا نے نیشنل ڈین کا لفظ ذہن نشین کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں! میں اپنی کسی سہیلی کو نہیں بلاسکتی۔ میں کسی کو بھی اپنی پریشانی سے آگاہ نہیں کرسکتی۔''

''تمہیں کیا پریشانی ہے کیرولین؟'' کلیرا نے بے حد نرم لہجے میں پوچھا...... دوسری جانب کچھ دیر تک مکمل خاموشی رہی پھر کیرولین کی سرگوشی نما آواز آئی۔

''میں نے کسی کو نہیں بتایا کلیرا، صرف تمہیں بتارہی ہوں۔ میری پریشانی یہ ہے کہ میں پاگل ہونے والی ہوں۔''

''تمہیں یہ خیال کیوں آیا کیرولین؟''

''یہ خیال ہی نہیں حقیقت ہے اور ایک ایسی حقیقت ہے جس کا علم صرف مجھے ہے۔ میں اپنے شوہر سے بے حد محبت کرتی ہوں لیکن کبھی کبھی میرے دل میں شدت سے یہ خواہش ابھرتی ہے کہ میں اسے قتل کردوں...... ابھی پچھلے اتوار کو اس خواہش نے مجھ پر اتنا غلبہ پالیا کہ میں بستر سے نکل کر کچن...... میں گئی اور وہاں سے چھری اٹھالائی۔ جب میں چھری ہاتھ میں لیے اپنے شوہر کو قتل کرنے خواب گاہ کی طرف جارہی تھی تو یکایک مجھے ہوش آگیا۔ اس سے پہلے میری حالت ایسی نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے میں نے منگل کی شب تمہیں ٹیلی فون کیا تھا۔''

یہ سن کر کلیرا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کیرولین کوئی عام قسم کی جذباتی عورت نہیں جو جذبات کی رو میں بہہ کر خودکشی کرلیتی ہیں بلکہ خطرناک قسم کی نفسیاتی مریضہ بھی تھی...... ایسے لوگوں سے گفتگو بہت احتیاط سے کرنی چاہیے...... کلیرا کو نفسیات کی تھوڑی بہت شدبد تھی، اگرچہ اس طرح وہ...... اس عورت کا علاج تو نہیں کرسکتی تھی لیکن اسے اتنا ضرور معلوم تھا کہ ایسے لوگوں کو محض دلائل کے ذریعے خودکشی سے روکا بھی نہیں جاسکتا۔ ایسے لوگوں سے نمٹنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انہیں فوراً نفسیاتی علاج کرانے پر آمادہ کیا جائے۔

''تم نے کسی اور کو اس بارے میں نہیں بتایا......؟'' کلیرا نے پوچھا۔

''نہیں، تمہارے علاوہ کسی کو نہیں۔'' دوسری طرف سے جواب ملا۔

''تمہارے شوہر کو تمہارے ان خیالات کا علم ہے؟''

''ہرگز نہیں۔'' کیرولین نے بے بسی سے کہا......

''انہیں یقین ہے کہ میں ان سے محبت کرتی ہوں۔ اسی لیے بعض اوقات مجھے اپنے خیالات سے نفرت ہونے لگتی ہے...... میں سوچتی ہوں کہ اس سے قبل کہ میں اپنے شوہر کو کسی روز قتل کردوں، کیوں نا خود ہی مرجاؤں۔''

''نہیں۔ تمہیں ایسا کرنے کی ضرورت نہیں۔'' کلیرا نے مضبوط لہجے میں کہا۔''تم نے مجھ سے مشورہ لینے کے لیے فون کیا ہے۔ کیا تم میرا مشورہ قبول کرنے کو تیار ہو...؟''

''کون سا مشورہ؟'' عورت نے سرگوشی میں پوچھا۔

''تمہیں اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ تم ذہنی طور پر بیمار ہو۔ اس حقیقت سے آگاہ ہونا ہی بیماری سے چھٹکارا پانے کی جانب پہلا قدم ہے۔ اس کے برعکس ایسے لوگ جو ذہنی طور پر بیمار ہونے کے باوجود خود کو بیمار نہیں سمجھتے، ماہرین نفسیات کے لیے بہت سی دشواریاں پیدا کردیتے ہیں۔''

''مجھے یہ مت کہنا کہ میں اپنے خاندانی ڈاکٹر سے مشورہ کروں اور اپنا معائنہ کراؤں کیونکہ خاندانی ڈاکٹر میرا دیور ہے جسے میں اپنی پریشانی سے آگاہ نہیں کرسکتی۔''

''نہیں، یہ ضروری نہیں کہ تمہاری پریشانی سے تمہارا شوہر یا تمہارا خاندانی ڈاکٹر آگاہ ہو۔ شہر میں بے شمار ماہر

نفسیات موجود ہیں، تم ان کے پتے ٹیلی فون ڈائریکٹری میں دیکھ سکتی ہو۔ اگر چاہو تو میں دو چار نام بتا سکتی ہوں۔''

دوسری جانب سے طویل خاموشی کے بعد اس عورت نے ڈوبی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''وہ ڈاکٹر میرے شوہر کو تو کچھ نہیں بتائے گا؟''

''تمہیں معلوم ہونا چاہیے کیرولین کہ ڈاکٹروں کے اپنے کچھ اصول ہوتے ہیں، جو کچھ انہیں اپنے مریضوں سے معلوم ہو، وہ سختی سے اپنے تک ہی محدود رکھتے ہیں اور کبھی کسی کو کچھ نہیں بتاتے۔''

''آپ جس ڈاکٹر کا نام مجھے بتانا چاہتی ہیں آپ کے خیال میں وہ قابلِ اعتماد ہے؟'' اب اس عورت کی آواز پُرامید تھی۔

''ہاں، تم بے فکر رہو۔ اس کا نام ڈاکٹر رابرٹ ہے۔ اس کا دفتر میڈیکل ایکسچینج بلڈنگ میں ہے...... بہتر ہوگا اگر تم یہ نام کسی کاغذ پر لکھ لو......''

''نہیں، مجھے یاد رہے گا۔'' وہ بولی......

''پھر مجھ سے وعدہ کرو کہ صبح سب سے پہلے تم ڈاکٹر کے پاس جاؤ گی۔''

''میں وعدہ کرتی ہوں۔ بہت بہت شکریہ، کلیرا۔''

''تمہارا شوہر کب گھر واپس آئے گا؟'' کلیرا نے پوچھا لیکن سلسلہ منقطع کردیا گیا تھا...... تیسری بار کلیرا کو کیرولین کا فون منگل کے روز ملا...... نو بجنے سے چند منٹ پہلے...... کلیرا پہلے تو کیرولین کی آواز نہیں پہچان سکی کیونکہ آواز بہت مدھم سی تھی لیکن پھر مخصوص اندازِ گفتگو سے اس نے فوراً پہچان لیا۔

''بہت دیر ہوگئی، بہت دیر، کل کا انتظار......'' وہ کہہ رہی تھی۔

''کیرولین!'' کلیرا تیز لہجے میں بولی۔

''ہوں۔'' آواز نے بہکے بہکے انداز میں کہا۔

''ہیلو کلیرا۔''

''کیا تم نے کچھ کھالیا ہے کیرولین؟''

''دیر ہوگئی، بہت دیر ہوگئی، میں کل کا انتظار نہیں کرسکتی۔''

''کل کا انتظار کس لیے کیرولین؟'' کلیرا متفکر تھی۔

''ڈاکٹر سے ملاقات، ڈاکٹر رابرٹ، شاید میں آج اسے قتل کردوں...... جب وہ گھر آئے، کھانے پر، یہ بہتر ہے۔'' کیرولین نے کہا۔

بجٹ

ہماری تجویز ہے کہ آئندہ بجٹ بابوؤں کی بجائے ایسے لوگوں سے تیار کروایا جائے جو بابو نہ ہوں۔ مثلاً چند معمار حضرات کی خدمات حاصل کی جائیں تاکہ وہ اس کی تعمیر صحیح طور پر کرسکیں۔ کہیں کجی نہ رہنے پائے۔ کیونکہ

خشت اول چوں نہد معمار کج
تاثریا می رود دیوار کج

چند لوہار حضرات کو بھی بجٹ کی تیاری میں شریک کیا جائے۔ وہ بجٹ کو مضبوط سے مضبوط بنیادوں پر تیار کرنے میں مدد کریں گے اور آہنی بجٹ میں خامیوں کے لیے لچک نہیں رہے گی۔

کچھ بڑھئی کا کام کرنے والے بھی شامل کیے جائیں جو بجٹ کی چولیں درست طور پر بٹھا سکیں۔ چولیں درست ہوں گی تو بجٹ کا ڈھانچا بھی درست ہوگا۔

کچھ ایسے لوگ بھی بلائے جائیں جن کا تعلق طباعت کے فن سے ہو۔ وہ یہ بتا سکیں گے کہ بجٹ کے کونسے حصے سنہری حروف میں چھاپے جائیں اور کونسے عام سیاہی سے طبع ہوں؟

چند ایک جلد سازوں کی بھی ضرورت پڑے گی جو بجٹ کی مضبوط اور دلفریب جلد بندی کا اہتمام کریں اور اس طرح بجٹ ہر شخص کو خوبصورت دکھائی دے گا۔

ان میں دیگر پیشوں کے ہنرمند بھی شامل کیے جاسکتے ہیں مگر یہ بات ہم وزیرِ خزانہ پر چھوڑ دیتے ہیں وہ جس کو چاہیں شامل کرلیں۔ صرف ہمارا نام چھوڑ دیں کیونکہ ہم پہلے ہی ہر ماہ اپنے گھر کا بجٹ تیار کرنے میں مصروف رہتے ہیں اس لیے ہمیں ان کی مدد کرنے کے لیے فرصت نہیں ملے گی۔ اگر ہماری ان تجاویز پر توجہ دی گئی تو کسی کو یہ اعتراض کرنے کا موقع نہیں ملے گا کہ بجٹ بابوؤں کا تیار کردہ ہے۔ دوسرا یہ کہ ہنرمندوں کی شرکت سے واقعی بجٹ خالص عوامی ہوگا۔ اس طرح متوازن اور غیر متوازن کا چکر بھی ختم ہوجائے گا کیونکہ اس میں سرے سے توازن ہی نہیں رہے گا۔

شفیع عقیل کی کتاب ''سرخ سفید سیاہ'' سے اقتباس

''کیرولین!'' کلیرا نے زور سے کہا۔ ''تم نے کیا کھایا ہے؟''
''کریسٹ سے کہہ دینا، یہ میں نے اس کے لیے کیا ہے۔'' آواز بھاری اور مدھم ہوتی جا رہی تھی۔ ''کیونکہ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔''
''لیگل لیف بتا دینا اسے...... محبت!'' آواز مدھم ہوتی ہوئی خاموش ہوگئی...... اچانک کلیرا نے کوکو کی آواز سنی اور پھر گھڑی نے نو بجنے کا اعلان کیا...... اس کے بعد دو مرتبہ کوکو کی آواز آئی۔
''کیرولین۔'' کلیرا نے آواز دی مگر دوسری طرف خاموشی طاری ہو چکی تھی۔ کلیرا نے کئی مرتبہ آوازیں دیں مگر دوسری طرف سے کوئی آواز سنائی نہ دی...... کلیرا کے پاس کئی معلومات تھیں۔ سب سے اہم یہ کہ کیرولین کا شوہر لیگل لیف نامی کلب میں کھانا کھا رہا ہوگا۔ اس کے شوہر کا نامکمل نام کریسٹ ہے اور شوہر کا بھائی ڈاکٹر ہے۔ کلیرا نے ڈائریکٹری میں لیگل لیف کلب کا نمبر دیکھا اور ٹیلی فون کرنے کے لیے ڈائل گھمایا۔
دوسری جانب سے کسی مرد نے ریسیور اٹھالیا۔
''میں کسی ایسے آدمی سے بات کرنا چاہتی ہوں جو کلب لیگل لیف کے تمام ارکان کے ناموں سے واقف ہو...'' کلیرا نے۔
''بہت بہتر، ذرا توقف کیجیے۔'' دوسری طرف سے آواز آئی اور خاموشی طاری ہوگئی پھر کچھ دیر بعد اس نے ایک مرد کی آواز سنی۔ ''میں خودکشی کی روک تھام کے ادارے کی رضاکار بول رہی ہوں، آپ کے ایک رکن سے بات کرنا بہت ضروری ہے۔ پریشانی یہ ہے کہ مجھے اس کا مکمل نام معلوم نہیں، مختصر طور پر اسے کریسٹ کہتے ہیں۔''
''کریسٹ!'' دوسری جانب سے آواز آئی۔
''ٹھہریے اس وقت میرے ذہن میں تین کریسٹ آرہے ہیں۔''
''ان کی بیوی کا نام کیرولین ہے اور ان کا ایک بھائی ڈاکٹر ہے۔ کیا آپ نے پہچان لیا؟''
''بے شک، آپ ڈاکٹر کریسٹ مارشل کی بات کررہی ہیں۔ وہ دانتوں کے ڈاکٹر ہیں۔''
''آپ ذرا فوراً انہیں ٹیلیفون پر بلا دیں۔'' کلیرا نے درخواست کی۔

''بہتر، آپ انتظار کریں۔''
ٹھیک ہے، کیرولین کا شوہر دندان ساز ہی ہوگا۔ تبھی ایک روز کیرولین نے نیشنل ڈین کا نام لیا تھا۔ وہ غالباً نیشنل ڈین سرجن ایسوسی ایشن کہنا چاہتی تھی لیکن درمیان ہی میں رک گئی۔ کلیرا نے سوچا۔
''ہیلو کیرولین! کیا بات ہے؟'' اچانک ریسیور میں مردانہ آواز ابھری۔
''ڈاکٹر کریسٹ! میں کلیرا بول رہی ہوں۔ خودکشی کی روک تھام کے ادارے سے۔'' اس نے کہا۔ ''ابھی دس پندرہ منٹ پہلے مجھے آپ کی بیوی کیرولین کا ٹیلی فون ملا ہے۔ اس نے شاید کسی قسم کی گولیاں کھالی ہیں۔ وہ فون پر گفتگو کرتے کرتے بے ہوش ہوگئی تھی۔''
''کیا!'' ڈاکٹر کریسٹ کی آواز میں خوف اور استعجاب نمایاں تھا۔ ''میری بیوی نے گولیاں کھالی ہیں! کس قسم کی گولیاں؟''
''مجھے نہیں معلوم ڈاکٹر، آپ فوراً گھر پہنچیں۔ اگر آپ کا گھر کلب سے کافی فاصلے پر ہے تو بہتر ہے کہ آپ پہلے ایمبولینس کے لیے فون کردیں اور پھر یہاں سے روانہ ہوں۔''
''بہت اچھا میڈم۔'' ڈاکٹر کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔
''آپ نے کیا نام بتایا تھا اپنا؟''
''کلیرا ڈیول، آپ میرا فون نمبر نوٹ کرلیں اور بعد میں مجھے اپنی بیوی کی حالت سے آگاہ کرنا نہ بھولیں۔''
کلیرا نے اپنا نمبر نوٹ کرانے کے بعد فون بند کردیا...... دو گھنٹے اس نے بے چینی کے عالم میں گزارے، تب ہی اس کے فون کی گھنٹی بجی۔
''ہیلو میں کلیرا بول... رہی ہوں۔''
''میں لیفٹیننٹ جیکسن بول رہا ہوں۔ محکمۂ پولیس کے دفتر سے۔'' دوسری طرف سے ایک اجنبی آواز نے کہا۔
''ڈاکٹر کریسٹ مارشل نے مجھے آپ کا نمبر دیا ہے کیونکہ ان کی حالت ایسی نہیں کہ وہ کسی سے بات کرسکیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کا تعلق خودکشی کی روک تھام کے ادارے سے ہے اور آپ ہی نے ڈاکٹر کریسٹ کو ان کے کلب فون کرکے بتایا تھا کہ ان کی بیوی نے زہریلی

گولیاں کھالی ہیں؟''
''جی ہاں، درست ہے، اب کیرولین کیسی ہے؟''
''وہ اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہوگئی۔'' لیفٹیننٹ نے بتایا۔
''اوہ مجھے بے حد افسوس ہوا لیفٹیننٹ!''
''صحیح رپورٹ تو پوسٹ مارٹم کے بعد معلوم ہوگی لیکن کریسٹ کے مطابق خواب آور گولیوں کی وہ شیشی بالکل خالی ہے جس میں پوری دو درجن گولیاں موجود تھیں۔''
''میرے خدا! ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی...... بتیس سال۔''
''کیا آپ مرحومہ سے ذاتی طور پر واقف تھیں؟ میرا خیال تھا کہ آپ لوگ کسی کو بھی اپنا نام نہیں بتاتے۔''
''درست لیکن ہم دونوں کافی بے تکلف ہو گئے تھے اور اس سے مجھے کافی معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ آج رات سے قبل بھی ہمارے درمیان دو مرتبہ گفتگو ہو چکی ہے۔''
''اوہ! اس کا مطلب ہے کہ وہ پہلے بھی دو مرتبہ خودکشی کی کوشش کر چکی ہے۔''
''یہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن اس کا ارادہ ضرور تھا۔ میں اس کے شوہر سے پہلے ہی رابطہ کر لیتی لیکن کیرولین نے مجھے کبھی اپنا مکمل نام نہیں بتایا، آج رات بھی نہیں، بہرحال تین مرتبہ گفتگو کے بعد چند ایسی باتیں ضرور معلوم ہوئیں، جن کی وجہ سے میں آج ڈاکٹر کریسٹ مارشل سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہوگئی۔''
''ہمیں آپ کے بیان کی ضرورت پڑے گی۔ آپ کس وقت پولیس صدر دفتر تشریف لا سکتی ہیں؟''
''جب آپ کہیں۔'' کلیرا نے وقت مقرر کر کے فون بند کر دیا۔ دوسرے روز اخباروں میں خودکشی کی ایک مختصر خبر شائع ہوئی...... جب کلیرا پولیس صدر دفتر پہنچی تو وہاں کیرولین کا شوہر کریسٹ بھی موجود تھا۔ کریسٹ لانبے قد اور دبلے پتلے جسم کا خوبصورت آدمی تھا۔ اس کے بال گھنگرالے اور دانت بے حد چمکدار تھے......
ڈاکٹر کریسٹ سے چند منٹ گفتگو کرنے کے بعد کلیرا کو احساس ہوا کہ ڈاکٹر نہ صرف خوب صورت بلکہ خوش مزاج اور مہذب بھی ہے۔ اسے یہ سن کر شدید ذہنی صدمہ پہنچا کہ اس کی بیوی کافی عرصے سے خودکشی کرنے کے بارے میں غور کر رہی تھی اور شاید اس نے پہلے بھی کوشش کی تھی، یا کی ہو۔
کلیرا نے ایک ٹیپ پر اپنا بیان ریکارڈ کرایا اور اپنے اور کیرولین کے درمیان ہونے والی گفتگو کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ لیفٹیننٹ نے اس کا بیان ٹائپ کروا کر اس کے دستخط لیے۔ صرف آدھ گھنٹے میں کلیرا کو چھٹی مل گئی۔ لیفٹیننٹ نے نفسیات کے ڈاکٹر کو ٹیلی فون کر کے اس بات کی تصدیق کی کہ واقعی کیرولین نے اس سے نفسیاتی علاج کے لیے رابطہ قائم کیا تھا۔ یہ تمام معلومات ڈاکٹر کی استقبالیہ کلرک سے ملیں۔
واپسی کا سفر کلیرا نے ڈاکٹر کریسٹ کے ساتھ کیا۔ سفر کے دوران ان کے درمیان بہت کم گفتگو ہوئی۔ کلیرا نے سوچا چونکہ اس کا اپنا دانتوں کا ڈاکٹر باہر گیا ہوا ہے اس لیے وہ آئندہ کچھ عرصہ اپنے دانتوں کا معائنہ ڈاکٹر کریسٹ سے کرائے گی......
تین ماہ بعد اس نے ڈاکٹر کریسٹ کو اس کے دفتر میں فون کیا تاکہ اپنا دانت نکلوانے کے لیے وقت لے سکے۔ استقبالیہ لڑکی نے اسے اتوار کی شام چار بجے کا وقت دیا......
ڈاکٹر کریسٹ کا دفتر گنجان آبادی والے علاقے میں ایک عمارت کی پہلی منزل پر واقع تھا۔ اسے وہاں پہنچنے میں پانچ منٹ تاخیر ہوگئی۔ استقبالیے پر بیٹھی لڑکی نے معذرتی مسکراہٹ کے ساتھ کلیرا کو اطلاع دی...
''ڈاکٹر صاحب ایک مریض کے ساتھ معروف ہونے کی وجہ سے اسے پانچ بجے سے پہلے نہیں دیکھ سکتے۔ جب پانچ بجے آپ ان سے ملاقات کریں گی تو ممکن ہے میں یہاں سے چلی جاؤں کیونکہ میں چھٹیوں میں شہر سے باہر جا رہی ہوں اور مجھے چھ بجے کی بس پکڑنی ہے۔ اگر میں چلی گئی تو میں آپ کا چارٹ دے جاؤں گی، آپ ڈاکٹر صاحب کو دے دیجیے گا۔'' استقبالیہ پر بیٹھی لڑکی نے معذرتی انداز میں کہا۔
''کوئی بات نہیں۔'' کلیرا نے جواب دیا۔
کلیرا انتظار گاہ میں بیٹھ کر رسالے وغیرہ پڑھنے لگی۔ دس منٹ بعد کلیرا نے کوکو کی آواز سنی پھر ٹن کی ایک آواز نے پونے پانچ بجنے کا اعلان کیا۔
اس کے بعد پھر کوکو کی آواز سنائی دی۔ کلیرا نے نظر

اٹھا کر دیوار پر لگے قدیم طرز کے لکڑی سے بنے ہوئے گھڑیال کو دیکھا...... دیکھتے ہی دیکھتے گھڑیال کی کھڑکی بند ہوگئی اور چھوٹی سی چڑیا اندر چلی گئی۔

یہ غالباً وہی گھڑی ہے جس کی آواز میں نے مرحومہ کیرولین سے گفتگو کرتے ہوئے فون پر سنی تھی۔ اس وقت کوکو کی آواز دو مرتبہ آئی تھی، شاید اس لیے کہ ان اوقات میں ہر مرتبہ وقت مکمل ہوتا ہے یعنی ایک مرتبہ گیارہ بجے تھے دوسری مرتبہ بارہ اور تیسری مرتبہ نو۔ غالباً یہ گھڑیال ہر پندرہ منٹ بعد وقت کا اعلان ایک مرتبہ کوکو کی آواز نکال کر کرتا ہے۔ کلیرا نے سوچا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ گھڑیال پہلے ڈاکٹر کے گھر پر تھا اور کیرولین کی خودکشی کے بعد ڈاکٹر نے اسے اپنے دفتر منتقل کردیا۔''

کلیرا نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور بولی۔ ''محترمہ! کیا آپ کو معلوم ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے گھر پر بھی ایک ایسی ہی گھڑی ہے جیسی یہاں موجود ہے؟'' کلیرا نے استقبالیہ پر بیٹھی لڑکی سے دریافت کیا۔

''مجھے معلوم نہیں خاتون، مجھے یہاں ملازمت کرتے ہوئے دو تین ہفتے ہی ہوئے ہیں۔''

''اوہ!'' کلیرا خاموش ہوگئی...... چند منٹ بعد لڑکی نے کام ختم کر کے رجسٹر ایک طرف رکھتے ہوئے کلیرا کو مخاطب کیا۔

''ہوسکتا ہے کہ ایک ایسی ہی گھڑی ڈاکٹر صاحب کے مکان پر بھی ہو بھی ان لوگوں نے اس گھڑی کو یہاں لگایا ہے۔ اس گھڑی نے میرا دماغ خراب کردیا ہے۔ ہر پندرہ منٹ بعد مجھے اس منحوس کی آواز سننی پڑتی ہے۔''

''ان لوگوں نے...... کیا مطلب ہے تمہارا؟'' کلیرا نے الجھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''میرا مطلب ڈاکٹر صاحب اور ان کی بیوی سے ہے۔ ان کی شادی کے بعد ہی یہ گھڑیال یہاں لگایا گیا ہے۔''

''لیکن ان کی شادی ہوئے تو دس سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔'' کلیرا کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

''اوہ! میں پہلی شادی کی بات نہیں کررہی، خاتون۔'' لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں ڈاکٹر صاحب کی دوسری شادی کی بات کررہی ہوں۔ وہ ابھی چند ہفتے قبل ہوئی ہے اور اسی وجہ سے مجھے یہ ملازمت ملی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی موجودہ بیوی میری جگہ کام کرتی تھی، شادی کے بعد یہ جگہ خالی ہوگئی اور ڈاکٹر کریسٹ نے ملازمت کے لیے میرا انتخاب کرلیا۔''

کلیرا کو بڑا صدمہ پہنچا۔ وہ شکل سے تو ایسا نظر نہیں آتا تھا۔ پھر وہ سوچنے لگی۔ ''ابھی اس کی بیوی کو مرے ہوئے تین ماہ پورے نہیں ہوئے اور اس نے چند ہفتے قبل دوسری شادی کرلی حالانکہ اس روز پولیس صدر دفتر میں وہ کس قدر غمگین اور رنجیدہ نظر آرہا تھا جیسے اب کبھی شادی ہی نہیں کرے گا۔''

''یہ گھڑیال سیسل کے مکان پر تھا میرا مطلب ہے ڈاکٹر صاحب کی موجودہ بیوی سیسل کے گھر میں...... شادی کے بعد سیسل ڈاکٹر صاحب کے ہاں منتقل ہوگئی۔ اس نے اپنا بیشتر فرنیچر فروخت کردیا کیونکہ ڈاکٹر صاحب کے مکان میں اسے رکھنے کی جگہ نہیں تھی لیکن وہ اپنی چند اشیا یہاں لے آئی۔ ان ہی میں سے ایک یہ گھڑیال بھی ہے جسے آپ یہاں دیکھ رہی ہیں۔'' یہ کہہ کر استقبالیہ پر بیٹھی ہوئی لڑکی دوبارہ اپنے کام میں لگ گئی اور حیرت زدہ کلیرا منہ کھولے اسے دیکھتی رہی۔ اس کے ذہن میں عجیب عجیب سوالات جنم لے رہے تھے۔

''اگر یہ گھڑیال ڈاکٹر کریسٹ کے مکان پر نہیں تھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسے ٹیلی فون کرنے والی ڈاکٹر کی پہلی بیوی کیرولین نہیں۔ موجودہ بیوی سیسل تھی......اور وہ تمام ٹیلی فون اس نے اپنے گھر سے کیے تھے۔ اگر اس بات کو مدنظر رکھا جائے کہ پہلی بیوی کی وفات کے بعد ڈاکٹر نے اتنی جلد اس لڑکی سے شادی کرلی جو اس کے دفتر میں استقبالیہ کلرک تھی تو تصویر کا بالکل مختلف رخ سامنے آتا ہے۔''

وہ اپنے خیالوں سے اس وقت چونکی جب گھڑیال نے پانچ بجنے کا اعلان کیا۔ گھڑیال کی کھڑکی کھلی اور چڑیا نے باہر نکل کر دو مرتبہ کوکو کی آواز نکالی اور واپس اندر چلی گئی اس کے ساتھ ہی کلیرا کے ذہن سے تمام شکوک دور ہوگئے۔ یقیناً یہ وہی گھڑیال تھا جس کی آواز اس نے ٹیلی فون پر سنی تھی......

اسی وقت دفتر کا اندرونی دروازہ کھلا اور ڈاکٹر کریسٹ ایک مریض کے ساتھ باہر نکلا۔ اس نے استقبالیہ پر بیٹھی لڑکی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''مسز گریک

آئندہ ہفتے پھر آئیں گے، ان کا وقت نوٹ کر لو۔ اس کے بعد تم جا سکتی ہو کیونکہ مجھے معلوم ہے تمہیں چھٹی منانے کے لیے چھ بجے والی بس سے جانا ہے۔" اس کے بعد ڈاکٹر کی نظر کلیرا پر پڑی اور ایک لمحے کے لیے وہ حیران رہ گیا۔ کہنے لگا۔

"ارے آپ! مجھے معلوم نہیں تھا کہ میری آج کی آخری مریضہ آپ ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کو اتنا انتظار کرنا پڑا......" استقبالیہ پر بیٹھی ہوئی لڑکی نے حیرت بھری نظروں سے کلیرا کو دیکھا اور کہا۔

"یہ ان کا چارٹ ہے ڈاکٹر۔" اس نے ڈاکٹر کو ایک لمبا سا کاغذ دیتے ہوئے کہا۔

"آئیے، اندر تشریف لائیے۔" ڈاکٹر کریسٹ نے کہا اور کلیرا اس کے پیچھے دفتر میں داخل ہو کر دندان ساز کی مخصوص کرسی پر بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر نے اس کے گلے میں ایک کپڑا باندھا اور پھر اس سے منہ کھولنے کو کہا۔ کلیرا نے منہ کھول دیا۔ ڈاکٹر خاموشی سے اس کا معائنہ کر رہا تھا۔ پندرہ منٹ گزر گئے۔ کلیرا کو وقت گزرنے کا احساس نہ ہوتا اگر گھڑیال نے اپنی مخصوص آواز میں پندرہ منٹ گزرنے کا اعلان نہ کیا ہوتا۔ اس کی آواز اندر بھی آ رہی تھی۔

"اوہ! معاف کرنا ڈارلنگ! میرا خیال تھا کہ تم اپنے مریضوں سے فارغ ہو چکے ہو۔"

لڑکی نے نرم اور لچکدار آواز میں کہا اور دروازہ بند کر کے واپس جانے لگی۔

اسی وقت کلیرا نے بلند آواز میں کہا۔ "آپ یقیناً سیسل ہیں؟"

اس عورت نے سوالیہ نظروں سے ڈاکٹر کریسٹ کو دیکھا۔ ڈاکٹر کے چہرے سے اندرونی کشمکش کا اظہار ہو رہا تھا جیسے یہ فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ دونوں عورتوں کا ایک دوسرے سے تعارف کرایا جائے یا نہیں......

"مجھے کلیرا کہتے ہیں سیسل، تم مجھے بھولی نہیں ہو گی؟" کلیرا نے بے دھڑک اور فیصلہ کن انداز میں کہا۔ وہ سیسل کی آوز پہچان گئی تھی۔ ٹیلی فون پر کیرولین کے نام سے بات کرنے والی عورت یہی تھی......

ڈاکٹر کریسٹ اور سیسل دونوں کے چہرے زرد پڑ گئے۔ سیسل خاموشی سے اندر داخل ہوئی اور اس نے دروازہ مضبوطی سے بند کر دیا۔ اس کی نظریں کلیرا پر جمی ہوئی تھیں......" خاتون! آپ کی گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے جیسے ہماری ملاقات اس سے پہلے بھی کہیں ہو چکی ہے!" سیسل نے کہا۔

اس کے انداز سے الجھن کا اظہار ہو رہا تھا لیکن وہ اپنی اداکاری سے کلیرا کو بے وقوف نہ بنا سکی۔ وہ سیسل کا چہرہ دیکھ کر بتا سکتی تھی کہ وہ اسے پہچان گئی ہے، بالکل اسی طرح جس طرح کلیرا نے اس کی آواز پہچان لی تھی......

"بے شک۔" کلیرا نے سرد لہجے میں کہا۔ "لیکن ٹیلی فون پر ایک غیر متعلق آدمی کی مدد سے تم دونوں نے واقعی قتل کا عمدہ منصوبہ بنایا اور کیرولین کو پاگل اور نفسیاتی مریضہ ثابت کر دیا۔ ایسی مریضہ جس نے خودکشی کر لی جبکہ وہ عورت کیرولین بالکل عام سی اور سادہ عورت تھی اور اسے اس تمام ڈرامے کا قطعی علم نہیں تھا۔" کلیرا نے ڈاکٹر کریسٹ کی طرف دیکھ کر کہا۔ "لیکن ڈاکٹر! تم نے اسے خواب آور گولیاں کھانے پر کس طرح مجبور کیا؟ شاید کلب جانے سے پہلے چائے یا کافی میں حل کر کے دے دیں؟"

......اچانک کلیرا کو احساس ہوا کہ اس سے بہت بڑی

آج کی بات

جتنا تم کسی کو پرکھو گے اتنا ہی ٹوٹتے جاؤ گے اس لیے لوگوں سے صرف پیار کرو۔ انہیں آزمانے اور پرکھنے کی کوشش نہ کرو۔ اپنی اچھائی اور دوسروں کی برائی بھولتے چلے جاؤ۔

☆☆☆

خالق سے اچھا تعلق اور مخلوق سے اچھا برتاؤ مومن کی نشانی ہے۔ کھانا پینا، سونا، سانس لینا کام کرنا ہی زندگی نہیں...... دوسروں کے دلوں میں........ اور ان کی دعاؤں میں زندہ رہنا اصل زندگی ہے۔

☆☆☆

صبح کی حقیقی خوشی اس شخص کو نصیب ہوتی ہے...... جو صبح کا استقبال نماز، تلاوت اور ذکر سے کرتا ہے...... اللہ پاک ہم سب کو نماز، تلاوت اور ذکر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

مرسلہ: شفیق حسین۔ نیو کراچی، سندھی ہوٹل

غلطی سرزد ہو چکی ہے۔ اسے تنہائی میں دو قاتلوں کے سامنے اپنی زبان نہیں کھولنی چاہیے تھی۔ اس نے جلدی سے اپنی گردن سے بندھا کپڑا کھولا اور جوتے پہن کر کھڑی ہوگئی۔

''میرا خیال ہے، مجھے اب چلنا چاہیے۔'' وہ اس وقت کچھ خوفزدہ نظر آرہی تھی۔ سیسل بند دروازے سے ٹیک لگائے کھڑی تھی، دروازے سے ہٹنے کا اس کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ اس نے سرد لہجے میں اپنے شوہر سے کہا۔

''ڈاکٹر کریسٹ! ڈاکٹر کبھی کبھی غلطی سے اپنے مریضوں کو کسی خطرناک دوا کی زیادہ مقدار بھی کھلا دیتے ہیں۔ ایسے حادثات ہوتے رہتے ہیں۔ اگر ایسا ہی حادثہ آج بھی ہو جائے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اس طرح تم کم از کم قتل کے مقدمے میں پھانسی چڑھنے سے بچ جاؤ گے۔''

کلیرا نے دہشت زدہ نظروں سے سیسل کو دیکھا جو دروازے پر جمی کھڑی تھی۔ ''ہٹ جاؤ میرے راستے سے، مجھے جانے دو۔'' اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

ڈاکٹر کریسٹ اپنی بیوی کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ چہرے سے ایسا ظاہر ہو رہا تھا جیسے کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہو، سیسل نے پھر کہا۔ ''تمہارے پاس اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے کریسٹ۔ ایسے حادثات اکثر ہوتے رہتے ہیں اور میں نے آج تک نہیں سنا کہ ایسے حادثے کے نتیجے میں کسی ڈاکٹر کو سزا دی گئی ہو۔''

کلیرا کی توجہ اس وقت سیسل کی جانب تھی..... اچانک..... اسے اپنے کندھوں پر فولادی پنجوں کی مضبوط گرفت کا احساس ہوا..... دوسرے لمحے ڈاکٹر اسے دھکا دے کر ڈینٹل چیئر پر گرا چکا تھا..... کلیرا کی عمر اگرچہ پچاس سال سے اوپر تھی لیکن وہ صحت مند تھی۔ اس نے بے تحاشا لاتیں اور گھونسے چلانا شروع کر دیے لیکن بہرحال وہ ایک کمزور عورت تھی اور اس کا مقابلہ دو جوان اور تندرست دشمنوں سے تھا..... بہت جلد ڈاکٹر نے اسے بے بس کر دیا۔

''سیسل! تمہیں معلوم ہے کہ گیس کس طرح استعمال کی جاتی ہے؟'' ڈاکٹر نے اپنی بیوی سے کہا۔ ''تم گیس ماسک اس بڑھیا کے چہرے پر لگا دو، میں اسے مضبوطی سے پکڑے رکھتا ہوں۔''

سیسل اس کے چہرے پر گیس ماسک باندھنے لگی۔ کلیرا نے سخت جدوجہد کی، وہ بار بار اپنا سر جھٹک رہی تھی تاکہ گیس ماسک کی نلکیاں اس کے ناک اور منہ میں نہ لگیں۔ سیسل نے پوری قوت سے ایک ہاتھ سے اس کا منہ پکڑا اور دوسرے سے گیس ماسک چہرے پر چڑھا ہی دیا.....

جونہی کلیرا نے ماس کے اندر گیس کی موجودگی محسوس کی اور گیس کی وجہ سے اس کے رخسار سرد ہونے لگے اس نے اپنا سانس روک لیا لیکن کب تک.....؟ کلیرا نے بہت ضبط کیا لیکن سانس روکنے کی وجہ سے اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے پھیپھڑے پھٹنے والے ہیں۔ بے بسی کے عالم میں اس نے جدوجہد ختم کرنے اور خود کو موت کے حوالے کرنے کے بارے میں سوچا..... بس ایک گہرا سانس اور..... اس کے بعد موت آہستہ آہستہ اپنا عمل شروع کر دے گی..... مگر ٹھیک اسی وقت کسی نے ڈاکٹر کریسٹ کے اندرونی دفتر کا دروازہ کھولا اور کلیرا کو استقبالیہ پر بیٹھی ہوئی لڑکی کی آواز سنائی دی۔

''میں بس کا ٹکٹ دراز ہی میں بھول گئی تھی ڈاکٹر! بڑی مشکل.....''

لڑکی کی آواز رک گئی۔ ''یہ کیا.....!''

لڑکی کے اچانک اندر داخل ہونے سے ڈاکٹر کریسٹ پر شاید ردعمل ہوا۔ اس کی گرفت کلیرا پر ڈھیلی پڑ گئی اور وہ استقبالیہ کلرک لڑکی کو دیکھنے لگا جو آنکھیں پھاڑے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ کلیرا نے اس سنہری موقع سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے پوری قوت سے دونوں گھٹنے ڈاکٹر کے پیٹ میں مارے اور دونوں ہاتھ آزاد ہوتے ہی سیسل کا منہ نوچ لیا..... ڈاکٹر پیٹ دباتے ہوئے دہرا ہو گیا اور سیسل تکلیف سے کراہتے ہوئے اپنا چہرہ رگڑنے لگی..... کلیرا نے پھرتی سے گیس ماسک اپنے چہرے سے اتار پھینکا اور اچھل کر کھڑی ہوگئی..... ڈاکٹر تیزی سے اسے پکڑنے کے لیے لپکا لیکن..... کلیرا استقبالیہ لڑکی کو دھکا دے کر باہر نکل چکی تھی.....

باہر نکل کر اس نے ایک گہرا سانس لیا اور پھر تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگی..... سڑک پر نکل کر وہ پوری قوت سے اپنی کار کی طرف دوڑ پڑی..... راہ گیر رک کر اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے..... گاڑی کے قریب پہنچ کر اس نے پلٹ کر دیکھا، ڈاکٹر بے بسی کے عالم میں عمارت کے دروازے پر کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ راہ گیروں کی موجودگی میں وہ کر بھی کیا سکتا تھا؟ کلیرا نے بیٹھتے ہی گاڑی چلا دی اور اس کا رخ پولیس صدر دفتر کی جانب تھا.....

مات

ناہید سلطانہ اختر

رشتوں کی خوشبو سے معمور ایک ناکام عاشق کی زندہ دلی

کہتے ہیں کہ جیت اور ہار تو زندگی کا حصہ ہے مگر اسے مکمل زندگی سمجھنے والے... اپنی زندگی مکمل ہونے سے پہلے ہی شاید مر جاتے ہیں کیونکہ حوصلہ اور امنگ ہی تو زندہ دلی کا نام ہے... البتہ اس کی خوش نصیبی تھی کہ زندگی کے اس کمزور موڑ پر اس کا سہارا اور پیارا دوست کوئی اور نہیں بلکہ اس کا باپ تھا بس اسی ایک احساس نے اس کے حوصلوں کو مات نہیں ہونے دیا۔

''مبارک ہو۔'' میں نے بیوی کے ہاتھ سے چائے کی پیالی لیتے ہوئے کہا۔

''عید نہ بقرعید...... کس بات کی مبارک؟'' بیوی نے حیران ہو کر مجھے دیکھا۔

''نمبر ون کو عشق ہو گیا ہے۔'' اپنے پانچ بیٹوں کو ہم نے ان کی ترتیب پیدائش کے لحاظ سے نمبر ون، ٹو، تھری، فور اور فائیو کے نک نیم دے رکھے تھے۔

''کس سے؟'' بیوی جس کا نام تو نور جہاں تھا مگر میں

اسے پیار سے ملکہ کہا کرتا تھا چونکی۔

''ظاہر ہے لڑکی ہے۔'' میں نے چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگاتے ہوئے جواب دیا۔

''ظاہر ہے لڑکی ہی ہوگی...... شکر ہے خبیث معاشروں کی طرح ہمارے ہاں لڑکوں کی لڑکوں سے شادی کارواج نہیں ہے۔''

''جو حالات جا رہے ہیں اللہ ہی بچائے۔''

''ہاں اللہ ہی بچانے والا ہے۔'' ملکہ نے کہا پھر اسی تجسس کے ساتھ گویا ہوئی۔''بتائیں نا کون ہے؟ کیا کرتی ہے؟ کہاں رہتی ہے؟''

''نمبرون کی کلاس فیلو ہے...... کلاس فیلو ہے تو ظاہر ہے پڑھتی ہی ہوگی، یہیں ہمارے علاقے میں ہی رہتی ہے۔''

''باپ کیا کرتا ہے؟''

''ابھی یہاں تک نہیں پہنچا ہوں میں۔''

''تو جہاں تک پہنچے ہیں، وہاں تک کیسے پہنچے؟'' بیوی نے مجھے ترچھی نگاہوں سے دیکھا۔''ڈائریکٹ؟'' بیوی کا لہجہ بیک وقت سوالیہ بھی تھا جوابیہ بھی۔

''ظاہر ہے۔''

اپنے پانچوں بیٹوں کو ہم میاں بیوی نے ایسا اعتماد دے رکھا تھا کہ وہ اپنی ہر اچھی بری بات ہم سے بلاجھجک شیئر کرتے تھے نمبر فور اور نمبر فائیو تو ابھی چھوٹے تھے۔ تین بڑے بچوں کی ملکیت میں ہر شے تک ہم میاں بیوی کی بھرپور رسائی تھی۔ اپنے زیر استعمال سیل فونز پر ان میں سے کسی نے سیکیورٹی لاک نہیں لگا رکھا تھا۔ ان کی ای میلز کھلی رہتیں۔ ان کی الماریاں غیر مقفل ہوتیں۔ اپنے دل کی ہر بات وہ بے دھڑک ہم میاں بیوی کو بتا دیتے۔ ان کی کوئی بات ہم سے راز نہ تھی۔ تین بڑوں کی دیکھا دیکھی دونوں چھوٹے بھی ہم میاں بیوی کو اپنا دوست اور ہمراز سمجھتے تھے۔ دونوں ہی اسکول سے گھر واپسی پر دروازے سے اندر بعد میں داخل ہوتے، اسکول میں گزارے دن کی روداد پہلے سنانا شروع کر دیتے۔

پانچوں بچے اور ہم میاں بیوی قطعاً دوستانہ ماحول میں رہتے۔ ایک دوسرے کو''یار'' کہہ کر مخاطب کرتے۔ بچے مجھے''یار ابا'' کہہ کر بات کرتے، اپنی ماں کو''یار امی'' پکارتے۔ ہم ایک دوسرے کے کندھوں پہ ہاتھ رکھ کر بات کرتے۔ ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں حمائل کر کے چلتے۔ غلط یا صحیح، روا یا ناروا بہرحال تھا ایسا ہی جس پر ہم دونوں میاں بیوی کو اپنے اپنے خاندانوں اور احباب میں اکثر تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا۔

''نور جہاں تم نے اپنے بچوں کو بہت ہی سر چڑھا رکھا ہے۔'' میری خوش دامن بیٹی سے کہتیں۔

''وسیم تم تو کہیں سے اپنے بچوں کے باپ نہیں دکھائی دیتے، لنگوٹیا یار بنے رہتے ہو ان کے۔'' میرے والد محترم خاصی ناگواری سے کہتے۔

''ابا جی یہ دور ایسا جا رہا ہے کہ اس میں والدین کو بچوں کا دوست بن کر رہنے کی ضرورت ہے۔'' میں اپنی دانش بگھارتا۔

''بکواس!'' والد محترم میری دانش کو بیک جنبش بکواس قرار دیتے اور فرماتے۔'' والدین اور اولاد کے درمیان ایک حد فاصل رہنی چاہیے۔''

میں بحث میں نہ پڑتا، اپنے حال میں مست ہو جاتا۔ بچوں کے ساتھ ہنسی مذاق کرتا، دوڑیں لگاتا، کرکٹ، ہاکی اور بیڈمنٹن کھیلتا، فون پر ان کی اور ان کے دوستوں کی گپ شپ میں شریک ہوتا...... ان کے دوستوں میں لڑکے بھی تھے، لڑکیاں بھی۔ میں نے ان سے بے تکلفی سے کہہ رکھا تھا کہ جب بھی ان میں سے کسی کو کوئی لڑکی پسند آ جائے سب سے پہلے مجھے بتائیں، سو نمبرون نے گزشتہ رات مجھ سے کہا تھا۔''ابا ایک لڑکی پسند آ گئی ہے مجھے۔''

''اچھا!'' میں ہمہ تن متجسس ہو کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔''گڈ نیوز!''

میں نے کہا۔''کون ہے؟''

''میری کلاس فیلو۔''

نمبرون ان دنوں انجینئرنگ یونیورسٹی میں چھٹے سمسٹر کا طالب علم تھا اور چونکہ میری اس کے اکثر کلاس فیلوز سے گپ شپ رہتی تھی سو میں نے اس سے پوچھا۔''میں جانتا ہوں اسے؟''

''نہیں۔'' نمبرون نے جواب دیا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے یار! میں تو تمہارے ہر اس کلاس فیلو سے واقف ہوں جس سے تمہاری دوستی ہے۔''

''یار ابا اس سے دوستی نہیں تھی۔''

''دوستی نہیں تھی تو پھر کیسے پسند آ گئی!'' میں نے تعجب کا اظہار کیا۔

''بالکل الگ تھلگ رہتی تھی...... نہ کبھی اس نے مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی، نہ میں نے اسے لفٹ کرائی مگر آج اچانک ہی وہ مجھے اچھی لگنے لگی۔''

''وہ کیسے بھلا!''

''سردی تھی..... میں چائے پینے یونیورسٹی کیفے ٹیریا میں گیا تو وہ وہاں بیٹھی تھی..... ہیٹر کے بالکل نزدیک..... اس نے مجھے دیکھا اور میں نے اسے..... میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا ابا..... اس کا چہرہ ایک دم گلابی ہو رہا تھا..... اور پہلی بار مجھے پتا چلا کہ وہ تو میری کالج کیا یونیورسٹی کی حسین ترین لڑکی تھی شی از کیوٹ ابا..... آپ اسے دیکھیں گے تو کہیں گے واقعی خوب صورت ہے۔''

''خوب صورتی کسی کے چہرے میں نہیں، دیکھنے والے کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔'' میں نے فراست جھاڑی۔

''اور لڑکی یونہی اچانک اچھی لگتی ہے..... تمہاری ماں بھی مجھے اسی طرح اچانک اچھی لگی تھی۔''

''اچانک کیوں! اماں تو آپ کی کزن تھیں اور آپ لوگ جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ آپ تو انہیں دن میں دس بیس مرتبہ دیکھتے ہی ہوں گے۔''

''گھامڑ! وہ بھی تو پچھلے تین برس سے تیری کلاس فیلو ہے..... تو بھی تو اسے صبح سے دوپہر تک دیکھتا رہتا ہوگا..... آج سے پہلے تجھے وہ اچھی کیوں نہ لگی؟''

''آج سردی بہت تھی ابا اور میرا چائے پینے کا موڈ تھا۔''

''اس روز آسمان ابر آلود تھا۔ صبح سے بادل چھائے ہوئے تھے مگر برس نہیں رہے تھے۔ شام دل میں کھب سی رہی تھی۔ ماں جی، ابا، چاچا، چاچی سب صحن میں بیٹھے تھے۔ تمہاری ماں اچانک کمرے سے صحن میں نکل آئی۔ اس نے شربتی رنگ کا جوڑا پہن رکھا تھا اور اس کے لانبے سیاہ بال شربتی رنگ کے ساتھ غیر معمولی جوبن دکھا رہے تھے۔ میں نے اسے دیکھا اور آنکھوں کے راستے وہ میرے دل میں اتر گئی۔''

''پھر؟'' نمبرون کے لہجے میں تجسس تھا۔

''پھر کیا..... میں نے تہیہ کرلیا اسی سے شادی کرنی ہے۔''

''میں نے بھی تہیہ کرلیا ہے ابا۔''

''اس سے پوچھا؟''

''آپ نے پوچھا تھا؟''

''ضرورت ہی نہیں پڑی..... ادھر میں نوکری سے لگا ادھر ماں جی نے کہہ دیا وسیم میں تیرے چاچا چاچی سے نور جہاں کے لیے بات کرنے لگی ہوں۔''

''اور آپ یہ بات کب کہیں گے؟''

''وہ گھر کی بات تھی..... لڑکی کے ماں باپ سے بات کرنے سے پہلے تجھے لڑکی سے بات کرنی ہوگی..... اسے آمادہ کرنا ہوگا..... کیا تو نے اس سے بات؟''

''ابھی کہاں..... ابھی تو کہانی شروع ہوئی ہے ابا۔'' نمبرون نے کہا۔

''اوئے ڈالو..... بات آگے بڑھاؤ..... بائی دی وے آج کیا بات ہوئی؟''

''کچھ بھی نہیں..... بس وہ مجھے اچھی لگی..... میں دوسری ٹیبل پر بیٹھ گیا اور چائے منگوا کر چائے پینے لگا۔''

''احمق!''

''کیوں؟''

''ایکسکیوزمی کہہ کر اسی کے ساتھ بیٹھنا تھا بلکہ اس سے پوچھتا چائے پئیں گی۔''

''وہ آل ریڈی پی رہی تھی۔''

''بندہ تکلفاً تو پوچھتا ہی ہے اور یونہی کہانی شروع ہوتی ہے۔''

''اب پوچھ لوں گا۔'' نمبرون نے کہا پھر سرگوشی میں بولا۔ ''ابا میرا خیال ہے مجھے اس سے عشق ہوگیا ہے۔''

''واقعی!'' میں چونکا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''آل دی بیسٹ۔''

''تھینک یو۔''

☆☆☆

دو دن بعد نمبرون نے مجھے قدرے دل گرفتگی سے بتایا۔ ''ابا میں نے اسے چائے آفر کی مگر اس نے نو تھینکس کہہ کر منع کردیا۔''

''شریف لڑکی معلوم ہوتی ہے یار۔'' میں نے کہا۔

''مغرور ہے ابا۔''

''کس بات پر؟''

''اپنے باپ کی امیری پر..... ڈیفنس میں رہتی ہے ابا..... سٹی کے نئے ماڈل میں یونیورسٹی آتی ہے۔''

''آنے دو یار تمہاری طرح جینئس تھوڑی ہوگی۔''

میں نے نمبرون کو پُرغرور نگاہوں سے دیکھا۔ میں امیر باپ تھا یا نہیں، مجھے اپنے بچوں کی ذہانت و لیاقت پر ناز تھا۔

''کیا فرق پڑتا ہے ابا'' نمبرون کے لہجے میں دل گرفتگی تھی۔

''کیوں فرق نہیں پڑتا۔'' میں نے کہا۔

''آپ فیس بک پر اس کے گھر کا صرف فرنٹ و یو ہی دیکھیں نا تو.....'' نمبرون نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''بے ہوش ہو جاؤں!'' میں نے اس کا نامکمل جملہ مکمل کیا۔

نمبرون کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔ ''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔''

''تو پھر کیا مطلب تھا؟''

''وہ بہت امیر ہے ابا۔''

''اس کا امیر یا غریب ہونا ہمارا مسئلہ نہیں ہے یار۔''

''مگر یہ تو ہمارا مسئلہ ہے نا کہ وہ مجھے اچھی لگتی ہے...... آئی لو ہر ابا۔'' نمبرون روہانسا ہو گیا۔

''لگے رہو اللہ شفا دے گا۔''

''یار ابا کیسے ہوگی شفا، وہ تو لفٹ ہی نہیں کراتی۔''

''اگر تمہارا عشق سچا ہے تو ایک دن ضرور کرائے گی۔''

☆☆☆

کچھ ہی دن گزرے کہ ایک روز نمبرون نے یونیورسٹی سے مجھے فون کیا۔ ''مبارک ہو ابا۔''

میں سمجھا اس کے سمسٹر کا نتیجہ آ گیا۔ ''کیا جی پی اے رہا؟'' میں نے پوچھا۔

''ابا آج اس نے مجھ سے بات بھی کی' مجھے چائے بھی پلائی۔'' نمبرون کے لہجے میں انوکھی سرخوشی تھی۔

''مبارک!''

''تھینک یو۔''

گھر واپسی پر نمبرون نے مجھے بتایا کہ لڑکی نے نمبرون کو اپنے فیس بک اکاؤنٹ پر ایڈ بھی کر لیا تھا۔

''ابا اس نے کہا ہے مجھے اپنی اچھی اچھی تصویریں بھیجو۔''

''بھیج دو یار۔''

''آپ بتائیے گا کون کون سی بھیجوں۔''

''بتادوں گا بلکہ ایک دو میری بھی بھیج دو کہ یہ لڑکے کا ابا ہے۔''

''آپ کو تو میں ڈائریکٹ ملوا دوں گا۔'' نمبرون نے حاتم طایانہ انداز میں کہا۔

''رات کو فون بھی کرنے کو کہا ہے اس نے۔'' نمبرون نے آہستہ سے بتایا۔

''گڈ! وہ کرے گی یا تم کرو گے اسے؟''

''وہ کہہ رہی تھی میں خود کروں گی...... اچھا ہی ہے نا ابا، وہ تو مینج کر سکتی ہے میرے پاس تو بیلنس ہی نہیں ہوتا۔''

''یار بیلنس تو میرے پاس بھی نہیں ہوتا۔''

''آپ فکر نہ کریں۔ اسٹڈیز مکمل ہونے کے بعد جاب ملتے ہی پہلا کام یہی کروں گا۔''

''کون سا کام؟'' میں چونکا۔

''بیلنس والا...... پہلی تنخواہ ملتے ہی آپ کے موبائل میں بھی بیلنس ڈلواؤں گا اور اپنے میں بھی۔''

''اور اپنی ماں کے؟''

''ان کے بھی...... ایک ایک سے پوچھتی رہتی ہیں بیلنس ہے تمہارے پاس۔'' نمبرون کے لہجے میں ہلکی سی دل گرفتگی تھی۔

''تمہاری نانو اور خالاؤں کو جو فون کرنا ہوتا ہے اسے۔''

''ویسے ابا اگر وہ مجھے فون کرنے کو کہہ دیتی تو گڑبڑ ہو جاتی' میرے پاس تو بیلنس ہی نہیں ہوتا۔'' نمبرون نے مصرعہ اول پھر دہرایا۔

نمبرون نے گیلری کھولی اور ہم نے باہم مشورے سے نمبرون کی چھ آٹھ اچھی اچھی تصویریں منتخب کر کے نیلوفر کو بھیج دیں۔ اس کا نام نیلوفر مجھے اچھا لگا تھا۔

رات کو اس نے نمبرون کو فون کیا اور اس نے جو کچھ کہا نمبرون نے وہ سب کچھ من و عن مجھے بتا دیا۔ اس نے نمبرون کو اپنے فیس بک اکاؤنٹ میں اچھے اچھے کمنٹس بھیجنے کو کہا تھا۔

''کیا کمنٹ کروں ابا؟''

''یار وہی جو لڑکیاں سننا چاہتی ہیں۔''

''کیا سننا چاہتی ہیں۔''

''گھامڑ ہو...... عشق کرنے چلے ہو اور یہ نہیں پتا کہ لڑکیاں کیا سننا چاہتی ہیں۔''

''آپ بتائیں نا کیا سننا چاہتی ہیں۔''

''اپنی تعریف اور کیا۔''

''یو آر سو بیوٹی فل؟'' نمبرون نے سوالیہ لہجے میں کہا۔

''صرف اتنا سا جھوٹ نہیں یار...... اور بھی بہت کچھ۔''

''سمجھ گیا...... سمجھ گیا۔'' نمبرون مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے ہنس دیا پھر بولا۔ ''یار ابا لڑکیاں جھوٹ کیوں سننا چاہتی ہیں!''

''پاگل جو ہوتی ہیں یار...... ایسے ہی تو نہیں ناقص العقل نہیں کہہ دیا گیا...... اکیلی کی تو گواہی بھی معتبر نہیں...... دو ہونی چاہئیں۔''

''اسی لیے ایک مرد کو چار کی اجازت ہے۔''

''یار فی الحال تم صرف ایک پر فوکس کرو۔''

''او کے۔''

☆☆☆

نیلوفر سے نمبرون کا عشق پورے طمطراق سے شروع ہو گیا۔ یونیورسٹی سے آنے کے بعد نمبرون کا زیادہ وقت موبائل پر گزرنے لگا۔ اس کے اور نیلوفر کے درمیان ٹیکسٹ میسجز کا تبادلہ ہوتا۔ ایک دوسرے کو وائس کالز کی جاتیں۔

فیس بک پر تصویریں بھیجی جاتیں۔ عزت کا معاملہ تھا سو میں نمبرون کے موبائل میں بیلنس ڈلوانے میں اعانت کرتا۔ نمبرون مجھے نیلوفر کے ٹیکسٹ میسجز اور فیس بک پر اس کی پوسٹس براہِ راست دکھانے میں تامل نہ کرتا۔ نمبرون نے عشقیہ انگریزی گانے سننا شروع کر دیے تھے۔ اپنے واٹس ایپ اسٹیٹس پر نمبرون نے ایک مشہور انگریزی گانے کے ساتھ نہایت دلکش اسٹوری ڈال دی تھی۔ اسٹوری شروع ہونے پر نمبرون ایک دریچے سے باہر دیکھتا نظر آتا پھر کسی ہیرو کے سے انداز میں مڑتا اور دھیرے دھیرے زوم آؤٹ کر جاتا۔

دو تین ہفتے نیلوفر اور نمبرون کے معاملات دھواں دھار اوپر ہی اوپر گئے اور نمبرون کی سج دھج روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ اسے اپنے کپڑوں، جوتوں اور ہیئر اسٹائل کا خاص خیال رہنے لگا۔ وہ جو اپنے گیٹ اپ کے سلسلے میں نہایت بے پروا رہا کرتا تھا' خوشبو میں بس کر یونیورسٹی جانے لگا۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنا زمانہ یاد آجاتا۔ جب اس کی ماں مجھے اچھی لگنے لگی تھی، تب میں بھی تو یوں ہی اپنا خیال رکھنے لگا تھا۔ باجی کی پرفیوم جو انہیں چھوٹی خالا نے دبئی سے لاکر دی تھی' چرا چرا کر لگاتا اور یہ نہ سوچتا کہ باجی کی پرفیوم قطعاً زنانہ خوشبو تھی جو مجھے لگانا زیب نہ دیتی تھی۔ نہ مجھے ان دنوں زنانہ اور مردانہ خوشبوؤں کی تخصیص کا علم تھا، نہ ہی اسے جس کے لیے میں خوشبو لگایا کرتا تھا!

تیسرے ہفتے ایک روز نمبرون نہایت پریشان سا رات گیارہ بجے میرے پاس آیا۔ میں سونے کی تیاری کر رہا تھا، اس کی ماں دو چھوٹوں کی یونیفارمز پریس کر رہی تھی۔ بڑے تین اس معاملے میں خود کفیل تھے۔

''ابا ذرا باہر آئیں گے۔'' نمبرون نے آہستہ سے مجھ سے کہا۔

''کیوں؟''

''آئیں تو؟''

''خیریت؟''

''یار آپ آئیں تو...... بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔''

میں اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔ ''ہاں کیا ہوا؟''

''ابا ابھی ایک فون آیا مجھے' امی کے سامنے اس لیے نہیں بتایا کہ وہ پریشان ہو جاتیں۔''

''کس کا فون تھا، اس کا؟''

''نہیں...... اس کے کسی بوائے فرینڈ کا۔''

''تمہارے علاوہ بھی کوئی دوست ہے اس کا'' میں چونکا۔

''مجھ سے پہلے سے ابا۔'' نمبرون جیسے صدمے میں تھا۔

''کیا مطلب؟''

''اس نے مجھے دھمکی دی ہے ابا۔''

''کیسی دھمکی؟''

''کہ اگر میں نے نیلوفر سے اپنی دوستی ختم نہ کی تو وہ مجھے شوٹ کر دے گا۔''

''ایویں شوٹ کر دے گا...... شوٹ کرنا اتنا آسان ہوتا ہے کیا۔''

''اس کے لیے آسان ہی ہوگا ابا...... وڈیرے کا بیٹا ہے...... ہارس رائیڈنگ کرتا ہے...... بوٹنگ پر جاتا ہے......

کراچی
ماہنامہ
پاکیزہ

میں، قاری بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک نیا اور منفرد سلسلہ باتیں بہار و خزاں کی...... پیش کیا جا رہا ہے جس میں ہر قاری بہن دیے گئے سوالوں کے جوابات دے کر شمولیت اختیار کر سکتی ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

تو قارئین آج ہی
ماہنامہ پاکیزہ
اپنے ہاکر سے بک کروالیں

شکار کے لیے جنگل جاتا ہے...... اس کے پاس ریوالور بھی ہے بڑی بندوق بھی۔''

''تمہیں یہ سب کس نے بتایا؟''

''اس نے اپنا نام بتایا...... میں نے سرچ کیا...... فیس بک پر اس کی ایک دو نہیں بے شمار تصویریں ہیں...... دکھاؤں آپ کو؟''

''دکھاؤ۔''

نمبرون نے اپنے اسمارٹ فون پر فیس بک سائن ان کی اور ٹچ اسکرین پر اپنی انگلی کو دھیرے دھیرے حرکت دیتے ہوئے اپنے رقیبِ روسیاہ کا فیس بک اکاؤنٹ کھول کر میرے سامنے کر دیا۔

وہ واقعی ویسا ہی تھا جیسے ٹی وی ڈراموں میں وڈیروں کے بیٹے ہوتے ہیں۔ ہر تصویر میں نیا لباس، ہر انداز میں بانکپن، ہر پس منظر امارت کا مظہر، ہر پیش منظر میں تمکنت...... کہیں گھوڑے پر سوار، کہیں کہیں بندوق سے نشانہ لیتے ہوئے، کہیں شکار کو قدموں میں ڈھیر کیے، کہیں آباؤاجداد کی تصویروں کے ساتھ، کہیں یار دوستوں کے جمگھٹ میں، کسی تصویر میں حویلی کے دریچوں سے جھانکتے ہوئے تو کہیں بیش قیمت لگژری گاڑی سے اترتے ہوئے۔ اس حویلی کی تصویریں بھی لگا رکھی تھیں اس نے اپنے فیس بک اکاؤنٹ پر جہاں وہ رہتا تھا اور ان مربعوں کے سرسبز و شاداب مناظر بھی جو اس کے باپ دادا کی جاگیر تھے۔ خدمتگاروں کی تصویریں بھی تھیں اس کے قدموں میں بیٹھے ہوئے۔ مزارعین بھی موجود تھے اس کے سامنے ہاتھ باندھے مؤدب کھڑے ہوئے۔

میں نے نمبرون کا فون خاموشی سے اس کی طرف بڑھا دیا۔

''ہے نا امیر۔'' نمبرون نے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''ہاں یار لگتا تو ہے۔''

''اب بولیں۔''

''کیا بولوں؟''

''کیا کروں؟''

''کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''میں اسے نہیں چھوڑ سکتا یار۔''

''کسے؟'' میں نے پوچھا۔

''نیلوفر کو۔''

''کون کہتا ہے چھوڑ دو۔''

''یہی...... کتا...... کمینہ...... کہتا ہے اس کا پیچھا نہ چھوڑا تو شوٹ کر دوں گا۔''

''اسے پتا کیسے چلا؟''

''کس بات کا؟''

''تمہاری اور اس کی دوستی کا۔''

''نیلوفر کے فیس بک اکاؤنٹ میں تصویریں اور ہم دونوں کی کنورسیشن دیکھ کر۔''

''پاس ورڈ معلوم ہوئے بغیر کیسے دیکھ سکتا ہے وہ نیلوفر کے اکاؤنٹ میں تمہاری تصویریں اور تم دونوں کی کنورسیشن۔''

''معلوم ہوگا نا تبھی۔''

''کیسے؟''

''مجھے کیا پتا۔'' نمبرون نے شانے اچکائے۔

''پتا کرو یار...... نیلوفر سے پوچھو...... کسی کو بتا رکھا ہے اس نے اپنا پاس ورڈ؟''

''پوچھوں گا اس سے۔''

''زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے نمبرون کے شانے پر ہاتھ دھر کر اسے تسلی دینے کی کوشش کی اور مزید کہا۔ ''چل کر سوؤ۔ صبح یونیورسٹی بھی جانا ہے تمہیں...... دیکھ لیں گے وہ کتنے بڑے وڈیرے کا بیٹا ہے۔'' باپ ہونے کے ناتے میں نمبرون کا مورال ہائی رکھنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن یونیورسٹی سے آنے کے بعد نمبرون نے مجھے بتایا کہ یونیورسٹی میں اس کی نیلوفر سے بات ہوئی تھی اور اس نے اقرار کیا تھا کہ نمبرون سے دوستی ہونے سے قبل اس کی وڈیرے کے بیٹے سے دوستی رہی تھی۔ پھر کسی بات پر دونوں میں ان بن ہوگئی تھی اور ہر قسم کا رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ وہ نیلوفر سے بری طرح اینٹھ گیا تھا۔ اس نے سوشل میڈیا پر بھی نیلوفر کو ان فرینڈ تو نہ کیا تھا مگر نیلوفر کے بار بار رابطہ کرنے کے باوجود اسے جواب نہیں دیا تھا۔ اس کی بے اعتنائی سے تنگ آ کر نیلوفر نے اسے جلانے کو نمبرون سے دوستی کر لی تھی۔ نیلوفر کا حربہ کامیاب رہا تھا۔ اس کے فیس بک اکاؤنٹ میں نمبرون کی پوسٹس دیکھ کر وہ چراغ پا ہو گیا تھا۔ اس نے نیلوفر کو بھی سنگین نتائج کی دھمکی دی تھی اور نمبرون کو بھی دھمکایا تھا۔

''ابا نیلوفر نے مجھے چیٹ کیا ہے۔'' نمبرون نہایت دل شکستہ ہو رہا تھا۔

''دفع کرو یار۔'' میں نے نمبرون کا دل رکھنے کی

کوشش کی۔

''نہیں ابا۔'' وہ ہونٹ نکال کر رونی صورت بناتے ہوئے گویا ہوا۔ ''میں تو سیریس تھا۔''

''چھوڑو یار...... ایسی لڑکی کے لیے سیریس ہونے سے فائدہ؟''

''آپ خود ہی تو کہتے ہیں محبت اور عشق میں فائدہ نقصان نہیں دیکھا جاتا ہے۔'' نمبرون نے مجھے قائل کرنا چاہا۔

مگر میں اس کا باپ تھا۔ اسے دل شکستہ اور ٹوٹا ہوا دیکھنا میرے لیے نہایت دل شکن احساس تھا سو میں نے اس پر اپنی اصل قلبی کیفیت ظاہر کیے بغیر نہایت اعتماد سے کہا۔ ''ہاں...... بشرطیکہ جس لڑکی سے آپ محبت یا عشق کر رہے ہوں وہ تمہاری ماں کی طرح مخلص ہو۔''

نمبرون مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''تمہاری ماں سے میری لائن ملنے اور مجھے ملازمت ملنے کے درمیانی وقفے میں تمہاری ماں کے لیے برادری کے ایک بڑے گھر سے...... رشتہ آگیا تھا۔ ماں جی مجھ سے بولیں تو نوکری پہ ہوتا تو میں نے تیرے چاچا، چاچی سے تیرے لیے نور جہاں کے رشتے کی بات کرنی تھی اب کس منہ سے کروں۔ جو رشتہ آیا ہے اونچے گھر کا ہے تیرے چاچا، چاچی کیا اس رشتے سے کوئی بھی انکار نہیں کرے گا مگر پتا ہے کیا ہوا۔''

''کیا؟'' نمبرون نہایت تجسس سے بولا۔

''تمہاری ماں ڈٹ گئی...... اس نے انکار کر دیا۔''

''کیوں انکار کر دیا؟''

''ابے یار وہ مجھ سے جو محبت کرتی تھی۔''

''آپ کے زمانے میں بھی ہوتی تھی؟''

''کیا؟''

''محبت۔''

''الو کی دم! محبت تو آدم، حوا کے زمانے سے ہو رہی ہے۔ کہتے ہیں جب شیطان کے بہکائے میں آ کر دونوں جنت سے نکالے گئے اور انہیں زمین پر بھیجا گیا تو ایک دوسرے کے فراق میں زار و قطار روتے تھے اور اللہ سے اپنی غلطی کی معافی طلب کرتے تھے۔''

''میں کیا کروں ابا؟'' نمبرون نے پھر رونی صورت بنالی۔

''کیا مطلب؟''

''آئی لو ہر۔''

''نیلوفر؟''

''ظاہر ہے اسی سے۔''

''ڈونٹ۔''

''کیا مطلب!'' وہ چونکا۔

میرے تصور میں وڈیرے کے بیٹے کی تصویریں گڈمڈ ہونے لگیں۔ گھوڑے پر سوار، بندوق سے نشانہ لیتے ہوئے، شکار کو قدموں میں ڈھیر کیے اسے فاتحانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے، خدمتگاروں سے پاؤں دبواتے ہوئے، مزارعین کو مالکانہ تفاخر سے دیکھتے ہوئے! نہ جانے کیسے اس کے قدموں میں ڈھیر شکار کی جگہ نمبرون نے لے لی تھی!

''یار دفع کرو نیلوفر کو...... دو حرف بھیجو اس پر......'' میں نے نمبرون کو دلاسا دینے کی کوشش کی۔ ''وہ تمہارے لائق تھی ہی نہیں یار۔''

نمبرون کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر میں نے اسے پدری شفقت سے معمور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یار تم تو لاکھوں میں ایک ہو...... تمہارے لیے تو کوہ قاف سے پری اترے گی۔'' میں نمبرون کو وڈیرے باپ کی طرح گھڑسواری، کشتی رانی، تیراندازی، بندوق زنی، خدمتگاروں اور مزارعین کا رعب داب نہیں دے سکتا تھا تو کیا اسے اچھے دنوں کے خواب تو دکھا سکتا تھا۔

نمبرون ٹکٹکی باندھ کر مجھے دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہوں میں یاس تھی، حسرت تھی، بے بسی تھی، شرمندگی تھی۔ دفعتاً اس کی آنکھوں میں آنسو ہلکورے لینے لگے۔

''کیا ہوا یار؟'' میں نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

''سوری ابا۔'' وہ دل شکستہ لہجے میں بولا۔

''فار وھاٹ!'' میں چونکا۔

''اپنی حماقت میں...... میں نے آپ کا ٹائم بھی ضائع کیا۔''

نوجوان بیٹے کو ناکامیٔ عشق پر ٹوٹے ہوئے دیکھنا مجھ سے معمولی حیثیت باپ کے لیے نہایت دل شکن تجربۂ حیات تھا۔ اس کی روشن اور توانا آنکھوں کو گہرے پانیوں میں ڈوبتے دیکھنا جاں گسل تھا سو اسے دلاسا دینے کو اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے میں نے اسے گلے لگانے کے بہانے اپنا چہرہ اس کے کندھے کے دوسری جانب کرلیا کہ مجھے اپنی آنکھوں میں در آئی نمی کو بھی نمبرون سے چھپانا تھا۔

ہم غریبوں کے بچے عشق میں بھی امیروں سے مات کھا جاتے ہیں!

دوسرا حصہ

رنگ آسماں

اے۔آر۔راجپوت

ماضی کی تنگ و تاریک مگر خوابناک راہداریوں سے جنم لینے والے ایسے کردار... جنہیں واقعات و شواہد نے خود ترتیب دے کر ان کی زندگی کی بے قراریوں کو ایک ایسے مقصد میں ڈھال دیا جس کا ادھورا پن بے شمار ہلاکتوں کا سبب بن جاتا... لہٰذا اس کی تکمیل کے لیے وہ باغی فطرت انسان میدانِ جنگ میں یوں اترا کہ دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کردینے والے گداز احساسات کو بھی بھول گیا لیکن... عشق تو پھر عشق ہوتا ہے... کوئی کتنا ہی بھولنا چاہے، عشق اپنا مسکن کبھی نہیں بھولتا۔ جس دل میں بس جائے اسے اپنے ساتھ ہی لے کر جاتا ہے... اور پھر ایک دن اچانک اس کے من کا موسم بھی بدل گیا کیونکہ... وہ فرنگی حسینہ دلّی کے اس نوجوان کو دل دے بیٹھی تھی، جس کا ہر قدم آزمائش اور ہر نظر کسی امتحان سے کم نہ تھی، اس کے باوجود... خاک و خون کے اس کھیل میں نہ تو اس نے خوابوں کو بکھرنے دیا اور نہ ہی جذبوں کو بے لگام ہونے دیا۔ کیونکہ وہ آسمان پر بکھرے رنگوں کا مطلب جان گیا تھا۔

مشرق و مغرب کے عجب امتزاج اور تاریخی خوں خیزیوں کے عبرت اثر اشاروں میں لہراتی دلچسپ داستان

Interesting News

بچت کرنے کے 7 طریقے | Seven Methods of Savings

computerxtech 0 Oct 13, 2017

پیسہ خرچ کرنا جتنا ضروری ہے، پیسے بچانا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ یہ بچی ہوئی رقم مستقبل میں کسی آڑے وقت میں کام آ سکتی ہے۔ روز بروز بڑھتی مہنگائی ... Readmore

Interesting News

دنیا کے خطرناک روڈ | World's Most Dangerous Roads

computerxtech 0 Oct 02, 2017

دنیا بھر کے خطرناک ترین روڈ میں ایسی گزرگاہیں شامل ہیں جو اپنی تعمیر، محل وقوع، اونچائی، طوالت اور موسم کی وجہ سے عام سڑکوں کی نسبت مختلف ہیں.دنیا بھر... Readmore

Interesting News

عرب امارات کے حکمران کروڑوں ڈالر خرچ کرکے زمین پر مریخ بنائیں گے

computerxtech 0 Oct 01, 2017

امارات کی حکومت نے اگلے 100 سال میں مریخ پر انسانی آبادی بسانے کے منصوبے کا افتتاح کردیا. فوٹو: حکومتِ بیئیدبئی; متحدہ عرب امارات کے حکمران 15 ک... Readmore

Interesting News

کیا آپ مریخ پر جانا چاہتے ہیں ؟

computerxtech 0 Oct 01, 2017

مریخ ایک ایسا سیارہ ہے جہاں کہا جاتا ہے کہ پانی کی موجودگی ہوسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرخ سیارہ انسان کی دلچسپی کا سبب بن چکا ہے فوٹو: فائلانسان چاند پر... Readmore

Interesting News

مریخ کے بارے میں 11 حیرت انگیز معلومات

computerxtech 0 Oct 01, 2017

خلائی کھوجیوں کی بڑی تعداد مریخ پر بھیجی گئی ہے اور امید ہے کہ اگر زمین کے علاوہ زندگی اسی سیارے پر ممکن ہے۔ فوٹو، فائلکراچی: زمین کے بعد مریخ عا... Readmore

Interesting News

اے ٹی ایم استعمال کرنے والے اسے ضرور پڑھیں اور فراڈ سے بچیں

computerxtech 0 Sep 24, 2017

سائبر لٹیرے اے ٹی ایم میں تبدیلی کرکے بھی آپ کو قیمتی سرمائے سے محروم کرسکتے ہیں۔ (فوٹو: فائل)کراچی: پورے ملک میں نقد رقم نکلوانے کے لیے آٹو ٹیل... Readmore

گریزلی (Grizzly) کا پہاڑ سا جسم، ہلکے بھورے رنگ کے گھنے بالوں سے ڈھکا ہوا تھا اور بڑا سا تھوتھنا سیاہی مائل تھا جہاں سے دو لمبے نکیلے اور شکاری دانت جھانک رہے تھے۔ وہ کسی دیوزاد بن مانس کی طرح اپنے پچھلے دونوں پیروں پر الف کھڑا تھا اور تاریک آسمان کی طرف تھوتھنا کیے ہوئے عجیب ہولناک منظر پیش کر رہا تھا۔ شوکت نے اپنی شکاری مہمات کے دوران اتنا بڑا اور غیر معمولی طور پر جسیم درندہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے اندازے کے مطابق اس کا قد چھ فٹ کے قریب تھا اور لمبائی سو سینٹی میٹر سے کم نہ تھی جبکہ اس کا جثہ دو سو سینٹی میٹر کے لگ بھگ نظر آتا تھا۔

اس عظیم الجثہ درندے کے سامنے شوکت کے ہاتھ میں تھمی ہوئی قرولی، کچن میں رکھی سبزی کاٹنے والی ایک چھری سے زیادہ محسوس نہیں ہوتی تھی۔

یہ درندہ اگر غضب ناک ہو جاتا تو یہاں ایک خون ریز قیامت مچا سکتا تھا۔ شوکت اسے بہ غور دیکھنے لگا۔ وہ اس کے انداز و اطوار سے بہ خوبی اندازہ لگا سکتا تھا۔

شوکت اسے مخصوص انداز میں پچکارنے لگا۔ گریزلی (ریچھ) اسے بھوکا لگ رہا تھا۔ شوکت کا تجربہ بتاتا تھا کہ ریچھ جب بھوکا ہوتا ہے تو وہ خیموں یا انسانی آبادی کا رخ کرتا ہے۔ اسے کھانے کی خوشبو آ جاتی ہے۔ یہ سوچ کر شوکت جلدی سے اپنے خیمے سے رات کے بھنے ہوئے ایک گوشت کا بچا کھچا پارچہ اٹھا لایا اور اس کے آگے پھینک دیا۔ گریزلی نیچے جھک گیا۔ اب وہ اپنی چاروں ٹانگوں پر آ گیا تھا۔ وہ بڑی رغبت کے ساتھ پارچہ چبانے لگا اور شوکت نے بے اختیار سکون کی سانس لی مگر یہ سکون زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا تھا اور اچانک رات کے اس پُرہول سناٹے میں گولی چلنے کا دھماکا ابھرا...... پارچہ چباتے ہوئے گریزلی نے اپنا تھوتھنا فضا میں اٹھا کر ایک دل دہلا دینے والی چنگھاڑ ماری...... دوسرا فائر ہوا اور گریزلی جیسے غیظ و غضب سے پاگل ہو گیا۔ شوکت نے لرزتی نظروں سے دیکھا۔ رابرٹ ہاتھ میں لمبی نال والا پستول پکڑے اپنے خیمے کے باہر کھڑا تھا۔ اس کے پستول کی نال سے نیلگوں دھوئیں کی لکیر سی بلند ہو رہی تھی۔ وہ گریزلی پر تیسرا فائر جھونکنے کی تیاری کر رہا تھا کہ شوکت چلا کر بولا۔

”ارے! رکو...... رکو...... یو فول...... ! فائر مت کرو......“

اس کی فائر کی ہوئی دونوں گولیاں گریزلی کے وجود میں گم ہو کر رہ گئی تھیں اور شوکت کو معلوم تھا کہ وہ دو گولیاں اس دیوہیکل گریزلی کے لیے ”جوں“ سے بڑھ کر حیثیت نہیں رکھتی تھیں البتہ اسے غضب ناک ضرور بنا سکتی تھیں اور وہی ہوا تھا۔

گولیوں اور گریزلی کی چنگھاڑوں کی آواز پر اور لوگ بھی جاگ گئے۔ گریزلی غضب ناک انداز میں پلٹا اور رابرٹ کی طرف لپکا۔ خواتین نے چیخیں مارنا شروع کر دیں اور دونوں فوجیوں نے اپنی گن سے اس پر فائر کھول دیا لیکن گریزلی رکا نہیں۔

شوکت جانتا تھا کہ جب تک گریزلی کے کسی نازک مقام پر گولی نہیں لگے گی، وہ گرنے والا نہیں تھا اور یہ کام صرف ایک ماہر شکاری ہی کر سکتا تھا، جبکہ وہاں کوئی ماہر شکاری تو نہ تھا مگر شوکت کو چونکہ شکاری مہمات کا تجربہ تھا اسی لیے وہ اپنے طور پر گریزلی جیسے درندے کی خو کو پہچانتا تھا اور اپنے مطابق اسے ہشکارے دے کر ”پُرامن“ طریقے سے چلتا کر دینا چاہتا تھا مگر رابرٹ نے عین وقت پر گولی چلانے کی بے وقوفی کر کے معاملہ بگاڑ دیا تھا اور گریزلی جیسے درندے کو برافروختہ کر ڈالا تھا۔

”پلیز...... شوکی! رابرٹ کو بچاؤ......“ دفعتاً ہی ہک بک کھڑے شوکت کے کانوں میں رینا کی چیخ گونجی اور شوکت گریزلی کی طرف لپکا۔ گریزلی رابرٹ کے سر پر پہنچ چکا تھا اور رابرٹ مارے دہشت و خوف کے چند قدم پیچھے پلٹا تو اپنے ہی خیمے کے ساتھ الجھ کر گر پڑا۔ شوکت نے ایک چیخ مار کر گریزلی پر چھلانگ لگا دی اور اس کی پیٹھ پر گردن کے قریب جا لپٹا۔

قرولی اس کے دائیں ہاتھ میں مضبوطی سے تھمی ہوئی تھی اور اس نے وہی گریزلی کے تھوتھنے پر آزما ڈالی۔ دیو قامت گریزلی کے تھوتھنے پر بڑا گہرا چرکا لگا تھا اور اس نے دل دہلا دینے والی چنگھاڑ کے ساتھ پلٹا کھایا اور ساتھ ہی اپنے دائیں ہاتھ کا پنجہ اپنی گردن کے قریب سوار شوکت پر مارا۔ پنجہ شوکت کے بائیں شانے پر لگا اور وہ نیچے گر پڑا......

گریزلی کا خون آلود تھوتھنا اور وہاں سے جھانکتے ہوئے شکاری دانت اسے مزید خوفناک بنا رہے تھے۔ گریزلی زخمی ہونے کے بعد مزید وحشت ناک ہو گیا تھا اور اس نے رابرٹ کو چھوڑ کر پتھریلی زمین پر گرے پڑے شوکت کی طرف قدم بڑھائے۔ ادھر رابرٹ شوکت کی بروقت مداخلت کے بعد اپنی جان بچا کے بھاگا۔ ایک فوجی کو احساس ہوا اور اس نے گریزلی کے خون آلود تھوتھنے کا نشانہ لے کر گولی داغ دی۔ گریزلی کے جسم نے ایک جھٹکا کھایا اور وہ چنگھاڑ مار کر اپنے چاروں پیروں پر آیا اور ایک طرف کو بھاگ گیا۔

اس مختصر سے پڑاؤ میں اچھی خاصی بھگدڑ مچ گئی تھی۔ پروفیسر ہنری، رینا اور گارشیا...... زخمی شوکت کی طرف لپکے۔ ہنری نے شوکت کے بائیں شانے کے زخم کا جائزہ لیا۔ وہاں

سے شرٹ پھٹ کر خون آلود ہو رہی تھی۔

''تھینکس گاڈ! زخم زیادہ گہرا نہیں ہے۔ اسے میرے خیمے میں لے آؤ۔'' پروفیسر ہنری بولا۔ ''وہاں فرسٹ ایڈ باکس موجود ہے۔''

شوکت کے مضروب شانے کی مرہم پٹی کردی گئی۔ اس کے بعد اس نے سب کو اپنی عقل مندی اور رابرٹ کی بے وقوفی کے بارے میں بتایا۔

''ربش......!'' رابرٹ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ غصے سے شوکت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے تو اس کی جان بچانے کی خاطر گریزلی پر فائر کیا تھا۔ اب یہ مجھ پر ہی الزام تھوپ رہا ہے۔''

''سب سے پہلے میں نے ہی گریزلی کو دیکھا تھا۔'' شوکت نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ اسے رابرٹ کی ڈھٹائی اور جھوٹ پر غصہ آگیا تھا۔ ''مجھے شکاری مہمات کا تجربہ ہے۔ میں جانتا تھا کہ گریزلی جیسا درندہ امن پسند ہوتا ہے، جب تک کہ اسے چھیڑا نہ جائے۔ فقط بھوک اور شکار نہ ملنے کی صورت میں یہ انسانی آبادی اور خیمہ پڑاؤ کا رخ کرتا ہے۔ میں تو اس کے سامنے آکر اسے ہشکارنے اور پلٹ کر جانے پر مجبور کرنے کی کامیاب کوشش کر رہا تھا کہ اچانک رابرٹ نے اس درندے پر بلاوجہ فائر کردیا اور یوں وہ بپھر گیا۔''

شوکت کی بات کو کوئی رد نہیں کرسکتا تھا کیونکہ سب نے اس کے ہاتھ میں پہلے ہی سے قرولی تھامے ہوئے دیکھ لی تھی، نہ صرف یہ بلکہ اس نے بڑی بہادری سے رابرٹ کی جان بھی بچائی تھی اور گریزلی کو زخمی بھی کیا تھا، جبکہ خود رابرٹ بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ رابرٹ نے دوبارہ ڈھٹائی دکھانے کی کوشش میں اپنا منہ کھولا ہی تھا کہ پروفیسر ہنری جو ساری بات سمجھ چکا تھا، رابرٹ سے نہایت سنجیدگی سے بولا۔

''میرا خیال ہے تمہیں اب ایکسکیوز کرلینا چاہیے اور میں امید کروں گا کہ آئندہ تم ایسی بے وقوفی کا...... مظاہرہ نہیں کروگے۔ اس مہم کو کامیابی سے سر کرنے کے لیے مسٹر شوکی کو میں تمام صوابدیدی اختیارات دے چکا ہوں۔''

ایک نوکر کے مقابلے میں رابرٹ کو اس سرزنش پر بری طرح اپنی سبکی کا احساس ہوا اور وہ اندر سے جل بھن گیا۔

اس کے بعد خیمہ درست کیا جانے لگا اور شوکی نے دیکھا کہ رینا، رابرٹ کے پاس کھڑی اس سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ اس نے اپنا سر جھٹکا اور پلٹ کر اپنے خیمے کی طرف چلا۔ گارشیا ایک طرف کھڑی بڑی گہری نگاہوں سے مسلسل اس کی طرف تکے جا رہی تھی۔

شوکت اپنے خیمے میں آیا۔ وہ تنہا تھا۔ نندو بابا اور اس کی بیوی شانتا باہر تھے۔ شوکی کا موڈ بری طرح خراب تھا، اس نے لیمپ کی روشنی تھوڑی تیز کردی تھی۔ اسی وقت کوئی اندر داخل ہوا۔ اس نے آہٹ پر اپنا سر اٹھا کر دیکھا۔ سامنے گارشیا کھڑی تھی۔ اس نے منہ پھیر لیا۔ گارشیا کی جگہ وہ رینا کے آنے کی توقع کیے بیٹھا تھا۔

''آئی نو...... برادر رابرٹ تمہیں بہت ہرٹ کرتا ہے......'' گارشیا نے آہستگی سے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''حالانکہ غلطی اسی کی ہوتی ہے مگر تم نے پھر بھی اس کی دو تین بار مدد کی ہے۔''

''مجھے کیا فائدہ ہوتا ہے اس کی مدد کرکے...... میں تو صرف......'' وہ غصے کی تیزی اور روانی میں آگے بھی کچھ ایسا کہہ ڈالنا چاہتا تھا کہ یک دم خاموش ہوگیا، لیکن گارشیا نے گویا اس کا جملہ مکمل کردیا۔

''رینا کی خاطر کرتا ہوں...... یہی کہنا چاہتے ہو نا تم......؟''

شوکی کا چہرہ بے تاثر رہا۔ اس نے کہا۔ ''ہاں......''

''تم رینا سے محبت کرتے ہو......؟'' گارشیا نے شاکی سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو شوکی اس بار قدرے چونک کر اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

''م...... میرا یہ مطلب تو نہیں تھا...... مس رینا میرے مالکوں سے تعلق رکھتی ہے اور میں ان کا احترام کرتا ہوں۔''

اس کی بات پر گارشیا کے ہونٹوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ ابھری اور وہ اسی لہجے میں بولی۔ ''اچھا......! تمہارے مالکوں سے تو ہم بھی تعلق رکھتے ہیں۔''

''تو کیا مس گارشیا! میں آپ لوگوں کا احترام نہیں کرتا......؟'' شوکت نے لیمپ کی تیز روشنی میں اس کے دمکتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔ گارشیا نے کچھ کہنے کے لیے لب وا کیے ہی تھے کہ اچانک شوکی نے دیکھا گارشیا کچھ کہتے کہتے رہ گئی اور خیمے کے نکاسی والے راستے کی طرف باہر دیکھنے لگی، تب ہی دو لمحوں بعد گارشیا کو نجانے کیا ہوا کہ وہ اپنے لبوں پر محبت بھری مسکراہٹ بکھیرتی ہوئی اس کے قریب ہوگئی اس قدر...... کہ اس کا جذبات سے سلگتا ہوا چہرہ شوکی کے بالکل کاندھوں سے آن لگا اور وہ اسی مخمور انداز میں بولی۔

''تم ہمارا بھی احترام کرتے ہو...... اس میں کیا شک ہے بھلا......'' یہی وہ وقت تھا جب کوئی اندر داخل ہوا تھا۔ اس وقت تک گارشیا، شوکی کے بالکل قریب آچکی تھی۔ آنے والی رینا تھی...... جسے دیکھتے ہی شوکی یوں بدکا جیسے گھوڑا بدکتا ہے۔ اس نے گارشیا کو خود سے پرے دھکیل دیا، وہ بوکھلا سا گیا تھا

مگر رینا یہ سب دیکھ چکی تھی۔ ایک طنزیہ سی مسکان اس کے عنابی لبوں پر اُمڈی اور جلد ہی معدوم بھی ہوگئی۔

''مم..... مس رینا! آ آ..... آپ.....''

''سوری..... امیں شاید آپ دونوں کی تنہائی میں مخل ہوگئی.....'' وہ بولی۔ شوکی کو اس کے کھنکتے لہجے سے طنزیہ کاٹ نمایاں ہوتی محسوس ہوئی تھی۔

''نن..... نہیں تو..... بب..... بالکل بھی نہیں.....'' شوکی گھبرا کر بولا۔ وہ ہنوز اپنی بوکھلاہٹ پر قابو نہ پاسکا تھا جبکہ گارشیا کے چہرے پر بدستور لطیف جذبوں سے لبریز مسکراہٹ رقصاں تھی۔ اس بار وہ رینا سے معنی خیز انداز میں بولی۔

''نوڈاؤٹ..... مخل تو ہوئی ہو تم..... خیر، آجاؤ..... خیریت تو ہے نا..... رابرٹ کیسا ہے.....؟''

''وہ بالکل ٹھیک ہے۔ میں اسی کے پاس سے آرہی ہوں.....'' رینا نے جیسے بے تاثر سی مسکراہٹ تلے جواب دیا۔ شوکی کو یوں لگا جیسے اس نے یہ بات اسے جلانے کے لیے کہی ہو۔ شوکی جانتا تھا کہ یہ فرنگن عورتیں جیلسی کے معاملے میں بڑی متعصب ہوتی ہیں۔ ڈسپریٹ ہونے میں ذرا دیر نہیں لگاتیں اور فوراً اس کا بدلہ اتارنے کی کوشش کرتی ہیں۔ گارشیا کی موجودگی میں رینا نے دانستہ رابرٹ کا ذکر کیا تھا۔

''میں تمہارا شکریہ ادا کرنے آئی تھی..... مسٹر شوکی کہ تم نے رابرٹ کی دوسری بار جان بچائی..... ونس اگین تھینکس.....'' وہ کہہ کر واپس لوٹ گئی اور شوکی اس سے کچھ کہتا ہی رہ گیا۔

''رینا، رابرٹ سے کافی کلوز ہے.....'' رینا کے خیمے سے نکلتے ہی گارشیا نے گویا جی جلانے کی خاطر شوکی سے مسکرا کے کہا۔ ''میں جانتی ہوں..... ایسا اب سے نہیں بچپن سے ہے۔ رینا، میں اور برادر رابرٹ..... ہم جب بھی تینوں مل کر کھیلا کرتے تھے تو رابرٹ ہمیشہ رینا کی ہی سائڈ لیتا تھا اور مجھے بالکل نظرانداز کردیا کرتا تھا۔''

شوکی کو لگا، جیسے گارشیا دانستہ اس موضوع کو طول دینا چاہ رہی ہو..... اسے گارشیا کی اس حرکت پر غصہ بھی آیا تھا۔ اسے صاف لگا تھا کہ گارشیا نے رینا کو خیمے کے پاس آتے دیکھ کر رینا کو اس سے بدظن کرنے کے لیے دانستہ طور پر یہ حرکت کی تھی۔

''آپ یہاں سے جاسکتی ہیں مس گارشیا.....'' دوسرے ہی لمحے شوکی نے ٹھنڈی ہوئی متانت سے کہا۔

''میں تو چلی جاتی ہوں..... مگر تمہیں ایک دوستانہ مشورہ دیے جاتی ہوں.....'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''رینا کا خیال بھی اپنے دل سے نکال پھینکو..... وہ برادر رابرٹ کے ساتھ انوالو ہوچکی ہے جبکہ رابرٹ کو تو تم جانتے ہی ہو.....''

زہر میں بجھے ہوئے یہ الفاظ ادا کرکے گارشیا بھی خیمے سے نکل گئی۔ شوکی بری طرح جھلایا ہوا تھا۔ اسے گارشیا پر بری طرح طیش آرہا تھا۔ وہ اب سمجھ چکا تھا کہ گارشیا ایک مکار اور سازشی ذہن کی عورت تھی اور اس سے دور رہنا ہی اس کے لیے بہتر تھا مگر وہ رینا کی اس غلط فہمی کی وجہ سے پریشان تھا۔ نجانے وہ گارشیا کی اس حرکت پر کیا سمجھ بیٹھی ہو.....؟ لیکن ساتھ ہی گارشیا کے یہ الفاظ بھی زہر میں بجھے تیر کی طرح اس کے وجود کو چھلنی کیے دے رہے تھے کہ رینا اس کے بھائی رابرٹ کے ساتھ ''انوالو'' ہوچکی تھی۔

''کیا گارشیا نے ایسا رقابت کے جذبے تلے کہا تھا؟ یا اس میں واقعی حقیقت بھی تھی؟''

اس نے سوچا۔ وہ دل مسوس کر رہ گیا۔ اس کے دل میں ایک بے چینی سی گھر کرنے لگی۔ وہ رینا سے بے حد محبت کرنے لگا تھا۔ رینا کا زندگی سے معمور دلکش چہرہ، اس کے عنابی لبوں کا گداز اور مخموری دل موہ لینے والی نیلی آنکھیں..... ہر لخت اس کے تصور کا حصہ بلکہ مدار بن کر رہ گئی تھیں۔ رینا کا حسین اور دلکش سراپا..... اس کے لیے ایک مدار کی حیثیت اختیار کر گیا تھا جس کے طلسمی حصار میں وہ خود کو گردش میں محسوس کرتا رہتا۔ وہ جب بھی رینا کو اپنے آس پاس دیکھتا، اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوجاتی تھیں، پھر بس وہ ہوتا اور رینا ہوتی۔ رینا کی محبت کا ایک طوفان سا اپنے اندر مچلتا محسوس کرتا، جو اسے کسی پل چین نہیں لینے دیتا تھا مگر آج والے واقعے نے اس کی بے چینی اور فرزانگی جیسے فزوں تر کر ڈالی تھی۔ نینداب اس کی آنکھوں سے، کائنات میں گردش کرتے سیاروں سے بھی کوسوں دور ہوچکی تھی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور خیمے سے باہر آگیا۔

رات اپنے آخری پہر کے اختتامی سفر میں تھی۔ دور سنگلاخ افق کے پار سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا تھا۔ بائیں جانب ڈھلوان میں ہر دوار کا جنگل بھی بھانت بھانت کے چرند پرند سے جاگنے لگا تھا۔ گریزلی شاید ادھر ہی سے یہاں آن بھٹکا تھا اور اب زخمی ہونے کے بعد اس نے وہیں کی راہ لی تھی۔ ان کا پڑاؤ جنگل کی شمال مشرقی سمت پر تقریباً پانچ سوفٹ کی بلندی پر دو سربفلک پہاڑیوں کے دامن میں ایک

قدرے سطح قطعہ اراضی پر قائم تھا۔ فضا میں سردی گھلی ہوئی تھی لیکن اس میں ایک عجیب طرح کی خوشگواری کا احساس پنہاں تھا۔

اس ناخوشگوار واقعے کے بعد کوئی بھی نہ سو سکا تھا۔ وہ سب فولڈنگ چیئرز اور ٹیبلیں بچھا کر اس پر براجمان، آپس میں باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ پروفیسر ہنری ایک کرسی پر بیٹھا، میز پر کوئی فائل کھولے اس پر جھکا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک قلم تھا۔ آنکھوں میں نفیس فریم کی عینک تھی۔

لسانیات اور مختلف قبائل کی زندگیوں اور ان کے رہن سہن پر مشتمل دو موٹی کتابیں بھی دھری پڑی تھیں، جسے وہ کبھی کبھی کھول کر دیکھ لیتے تھے اور پھر فائل پر کچھ لکھنے کے لیے جھک جاتے تھے۔ اس کے برابر والی کرسی پر گارشیا بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں نگی پیک تھا جس میں سے وہ ویفر نکال کر چبانے میں مصروف تھی۔ وہ حسب سابق مختصر اور چست لباس میں تھی، جو محض ایک ٹائٹ سی "شارٹ" (نیکر) اور بغیر آستین والی پنک کلر کی شرٹ پر مشتمل تھا جو ناف سے ذرا ہی نیچی تھی جبکہ رینا اور رابرٹ بھی وہیں ساتھ ساتھ براجمان تھے۔ رینا البتہ فرنگن ہونے کے باوجود ذرا ڈھنگ کا لباس ہی پہنا کرتی تھی۔ وہ حسبِ سابق فل اسکرٹ ڈریس میں تھی اور شوکی کو ہمیشہ سے اس کا ایسا لباس ہی اچھا لگتا تھا جس میں کسی بھی قسم کی عریانی کا شائبہ تک نہ ہوتا تھا۔ وہ اس میں اسے ہمیشہ ... پاکیزہ لگتی تھی۔ ورنہ تو اس نے گارشیا کو نیم عریاں لباس میں بھی دیکھا تھا۔ رابرٹ البتہ حسبِ سابق اپنے مخصوص "گیٹ اَپ" میں تھا۔ اس نے وہی کاؤبوائے طرز کی ٹائٹ براؤن پتلون اور شوخ کلر کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ پیروں میں لانگ بوٹ تھے اور دونوں ہولسٹرز میں بھرے ہوئے لمبی نال والے پستول اڑسے ہوئے تھے۔

ان کے ہاتھوں میں چپس کے لفافے تھے۔ تندو بابا اور شانتا الاؤ دہکائے اس پر کافی کا برتن رکھے بیٹھے تھے۔ دونوں فوجی پڑاؤ کی مخالف سمتوں میں چوکس کھڑے دوسری جانب دیکھنے میں محو تھے۔

کسی بات پر اچانک رینا مترنم آواز میں ہنسی اور رابرٹ کا قہقہہ بھی گونجا تھا۔ شوکی نے جلتی نظروں سے ان کی طرف دیکھا جبکہ گارشیا نے اس کی طرف دیکھ کر اپنا ایک ہاتھ ہلا دیا تھا۔ رینا اور رابرٹ نے البتہ ایک چھلتی سی نظر اس پر ڈالی تھی۔

شوکی اپنے دل کو ہی نہیں بلکہ تفتہ وجود کو سنبھالتا ہوا، قریب ایک پہاڑی پتھر پر جا بیٹھا۔

"اے...... ادھر آؤ......" معاً رابرٹ نے اس کی طرف دیکھ کر آواز لگائی، جسے شوکی سنی ان سنی کرتے ہوئے دوسری جانب دیکھنے لگا۔

"بہرے ہوگئے ہو کیا......؟ میں تم سے کہہ رہا ہوں......" رابرٹ چلّایا۔

"واٹ نان سینس......! آہستہ بولو، رابرٹ بڈی......!" قریب بیٹھے پروفیسر ہنری نے اسے ٹوکا تو رابرٹ بپھرے ہوئے لہجے میں اس سے بولا۔

"انکل ہنری! آپ دیکھ رہے ہو نا اس دو ٹکے کے ملازم کی حرکت...... آواز دے رہا ہوں پر نہیں سن رہا۔"

"ہے بڈی! بی ہیو یور سیلف!" پروفیسر ہنری نے اسے پھر ٹوکا۔ "ملازموں کی تذلیل نہیں کیا کرتے...... یہ ہم پر جان دیتے ہیں......"

"ہونہہ...... جان دیتے ہیں...... میں اس راسکل کو......"

"رابرٹ......" دفعتاً ہی پروفیسر نے سخت لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔ اسے بھی اپنے بھتیجے پر غصہ آ گیا تھا۔

"میں تمہیں وارننگ دیتا ہوں...... یہ ملازم صرف میرے کہنے پر ہیں اور میری ہی خاطر سفر کی سختیاں جھیل رہے ہیں۔ آئندہ تم ان پر کسی قسم کا حکم چلانے کی کوشش نہیں کرو گے کلیئر......؟"

رابرٹ کو بری طرح اپنی سبکی کا احساس ہوا...... ایک نوکر کے سامنے اس کی یہ تذلیل کم نہ تھی۔

"اوکے، فائن......!" وہ پروفیسر ہنری کی طرف دیکھ کر تیز لہجے میں بولا۔ اسی وقت گارشیا نے تھوڑا سا جھک کر رابرٹ کے کان میں کچھ کہا تھا۔ شوکی اب انہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اس کے بعد رابرٹ رینا سے مخاطب ہوا۔

"کم آن رینا...... یہاں بہت خشکی ہے۔ اس طرف چلتے ہیں......" یہ کہتے ہوئے رابرٹ نے کرسی چھوڑ دی تو رینا بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ پروفیسر ہنری نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا اور پھر جھٹک کر دوبارہ فائل اور کتابوں پر جھکا دیا۔

گارشیا نے سامنے پتھر پر ٹکے بیٹھے شوکی کی طرف دیکھ کر ایک معنی خیز اشارہ کیا اور آنکھ ماری اس کے بعد اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ شوکت کے قریب آئی اور اس سے مسکراتے ہوئے بولی۔

"میرے ساتھ صبح خیزی کے لیے نہیں چلو گے......؟"

"میرا موڈ نہیں ہو رہا"۔ شوکت نے رکھائی سے جواب دیا۔

"فائن! میں اکیلی جا سکتی ہوں......" یہ کہہ کر اس نے

وہیں کھڑے کھڑے منہ پھیرا اور پروفیسر ہنری سے بولی۔

”انکل! میں ذرا سیر کو اس طرف جا رہی ہوں اکیلی......“ گارشیا نے لفظ ”اکیلی“ کو ذرا کھل کر بلند آواز میں ادا کیا تھا جس... پر پروفیسر ہنری... کا جھکا ہوا سر ایک... دم اونچا ہوا اور وہ اپنی عینک کو تھوڑا اونچی کر کے بولے۔

”اکیلی مت جاؤ......“ یہ کہہ کر اس نے شوکی سے کہا۔ ”ہے بڈی! تم ذرا بے بی کے ساتھ چلے جاؤ......اور دیکھو......زیادہ آگے مت چلے جانا......“

شوکی کو گارشیا کی چالاکی کا اندازہ ہوا۔ وہ پروفیسر ہنری کا حکم کیسے ٹال سکتا تھا۔ ناچار اسے گارشیا کے ساتھ جانا پڑا۔ وہ بے دلی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

☆☆☆

دونوں کافی دیر تک دوڑتے رہے تھے۔ بارش اب رک چکی تھی۔ آسمان دُھلا نکھرا اور شفاف نظر آتا تھا۔ دور ایک اندھیری سی چٹانی افق سے پورے چاند کا سنہرا اَرتھ، چوٹی پر سونے کی گیند کی طرح لٹکا ہوا محسوس ہوتا تھا جیسے اب تب میں لڑھک کر نیچے وادی میں جا پڑے گا۔ تارے بھی کہکشاں بنائے ضوفشاں تھے۔ وہ دونوں ایک پتھریلے چھجے کے نیچے آن کھڑے ہوئے جہاں سے بارش کا جمع شدہ آبِ استادہ بلوریں قطروں کی صورت ٹپک رہا تھا۔ سردی بڑھنے لگی تھی۔ دونوں کے جسم گرم تھے۔ وہ چٹانی دیوار سے پشت لگائے دم بخود سے بیٹھے تھے۔

چہار اطراف گہرے سناٹے کا راج تھا۔ بھیگی بھیگی سی رات بھیدوں بھری آہٹوں کے ساتھ دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ ماسوائے چٹانی چھجے کی نگر سے ٹپکنے والے قطروں کی آواز کے اور کوئی آواز سماعتوں میں نہیں پڑتی تھی۔

”ہمیں صبح کی روشنی پھیلنے سے پہلے پہلے شمائل کے پاس پہنچ جانا چاہیے۔“ شاہ زمان نے علی ریحان سے کہا۔

”تم کیا سمجھتے ہو......کہ ہم مشن کے پہلے مرحلے میں کامیاب ہو چکے ہیں؟“ نجانے کس خیال کے تحت علی ریحان نے ایسا کہا تھا جس پر شاہ زمان کو اچنبھا سا ہوا۔ وہ بولا۔

”کیا کہنا چاہتے ہو؟ میں کچھ سمجھا نہیں؟“

”ہمیں بڑی خاموشی سے ناگرہ ریاست میں داخل ہونا تھا مگر اب دیکھتا ہوں کہ ہمارے اس طرح ریاست میں داخلے کا راز، اب راز نہیں رہا۔ پوری ریاست میں ہماری ڈھنڈیا پڑی رہے گی اور ہم شاید اپنا کام اس طریقے سے صحیح طور پر انجام نہ دے پائیں۔“

”سمجھ گیا......“ شاہ زمان نے گرد و پیش پر ایک نگاہ ڈالی۔ ”مشن کے دوسرے آخری مرحلے میں مشکلات پیش آسکتی ہیں۔ یہ بات ہمیں مدِنظر رکھتے ہوئے ازحد احتیاط رکھنا ہوگی۔“

”بالکل۔“ علی ریحان نے کہا۔ وہ اپنے دل کی اُلجھن بتا کر کچھ مطمئن سا ہو گیا تھا۔

ذرا دیر ستانے کے بعد یہ لوگ آگے روانہ ہو گئے۔ شمائل نے انہیں اپنی رہائش گاہ کا پتا بتا رکھا تھا۔ وہاں وہ تیندوے کے بیوپاری کی حیثیت سے رہتا تھا۔ دونوں رات کی تاریکی کا حصہ بنے تیز تیز قدموں سے چلتے رہے۔ آبادی کے آثار شروع ہو چکے تھے۔ ریاست کی رعایا خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہی تھی۔ لیکن یہ دونوں جانتے تھے کہ بہت جلد گلی گلی نقارچی پھیلا دیے جائیں گے کہ دو خطرناک جاسوس ریاست میں در آئے ہیں لہٰذا کسی بھی مشکوک یا نئے آدمی کو دیکھتے ہی ریاست کے ذمے داران کو اس کی اطلاع کریں۔ اس کے بدلے عزت مآب مہاراجا (چندر گپتا...) بذاتِ خود، جاسوسوں کی اطلاع دینے والے کو انعام و اکرام سے بھی نوازیں گے۔

دونوں تھوڑی دیر میں ایک اندھیری گلی میں داخل ہو چکے تھے۔ یہاں بھی سناٹا طاری تھا۔ وہ اطراف میں محتاط سی نگاہ ڈالتے ہوئے گلی کے آخری سرے کے دو گھر پہلے والے ایک گھر کے دروازے کے قریب جا پہنچے۔

”شش......دستک مت دینا......“ علی ریحان نے جب شاہ زمان کا ہاتھ دروازے پر اٹھتے دیکھا تو ہلکی سی سرگوشی میں اس سے کہا۔ ”قریب کسی گھر میں کوئی جاگ رہا ہوگا تو اسے بھنک پڑ جائے گی کہ رات کے اس سمے فلاں مکان میں دستک کی آواز سنی گئی تھی۔“

”تو پھر جو طریقہ کرنا ہے، جلدی کرو۔ ہم ہی نہیں بلکہ شمائل بھی اس وقت خطرے میں ہے۔“ شاہ زمان بولا۔ ”ہم تا دیر یہاں نہیں کھڑے رہ سکتے۔“

شاہ زمان نے کہا اور پھر علی نے اپنے دونوں ہاتھوں کا بھونپو بنا کر اپنے منہ سے لگایا اور دو تین بار الو کی آواز نکالی......

کچھ نہیں ہوا۔ اندر اسی طرح سناٹا کسی لاش کی طرح پڑا رہا۔

”کیا وہ سو گیا ہے؟ اسے تو ہمارے انتظار میں......“ شاہ زمان کا جملہ حلق میں ہی اٹک گیا۔ کیونکہ اسی وقت بغیر آواز پیدا کیے دروازہ کھلا تھا، مگر اپنے سامنے دروازے کی چوکھٹ پر خلافِ توقع شمائل کے بجائے ایک خوبرو سی خاتون کھڑی تھی۔ اس نے ہلکے عنابی رنگ کا جبہ سا پہن رکھا تھا۔

عمر ستائیس اٹھائیس کے قریب معلوم ہوتی تھی۔ وہ خاصی دراز قامت اور صحت مند جسم کی خاتون تھی۔ اس کے ہونٹوں کا گداز تھرکتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ تاہم اس خاتون کو دیکھ کر دونوں ہی کچھ مخمصے کا شکار ہوگئے تھے، کیونکہ ان کی معلومات کے مطابق شمائل اکیلا اپنی رہائش گاہ میں رہتا تھا۔ اگرچہ وہ شادی شدہ تھا مگر اس کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا لیکن اب تک اس نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔

''اندر آجائیں...... جلدی۔'' خاتون نے ان کی حیرت اور شش و پنج کی پروا کیے بغیر ہولے سے کہا اور ان دونوں نے اندر قدم رکھ دیا۔ اندر کوئی روشنی نہیں کی گئی تھی۔ صحن پر اوپری منزل کے کسی کمرے کی چھت ہونے کے باعث فقط کچھ ہی حصہ کھلا ہوا تھا جہاں سے مقدور بھر آسمان، قدرے روشن روشن سا نظر آرہا تھا۔ وہ وہیں کھڑے ہوگئے۔ ادھر خاتون نے دروازہ بند کیا اور ان کے عقب میں ہی کھڑے ہو کر بولی۔

''تمہارے دائیں ہاتھ پر ایک زینہ اوپر کو جاتا ہے۔ شمائل وہاں تم دونوں کا منتظر ہے۔'' یہ کہہ کر وہ ایک طرف کو تاریکی میں نجانے کہاں غائب ہوگئی۔ دونوں کا دل دھڑکا تھا۔ اس کے بعد یہ لوگ دائیں ہاتھ کی جانب مڑ گئے۔ آسمان سے آتی ہوئی تھوڑی بہت روشنی میں انہیں پختہ اینٹوں کا بنا زینہ دکھائی دے گیا تھا۔

دونوں بغیر آواز پیدا کیے، اسے طے کرنے لگے۔ زینہ زیادہ طویل نہ تھا۔ جلد ہی دونوں اوپر پہنچ گئے تو الٹے ہاتھ پر ایک کمرے سے ہلکی روشنی آتی دکھائی دی۔ دونوں اسی طرف کو بڑھ گئے۔ دروازے کو ہولے سے اندر دھکیلا تو دونوں بے اختیار ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گئے۔

سامنے ایک گٹھیلی جسامت شخص کھڑا تھا۔ وہ عمر میں ان سے بڑا تھا۔ قد ٹھگنا، رنگ سانولا اور سر گنجا۔ شمائل کو اگرچہ علی ریحان اور شاہ زمان پہلی بار دیکھ رہے تھے، تاہم اس کا ناک نقشہ سمجھا دیا گیا تھا جو خاصا نمایاں تھا۔ اسی سبب وہ اسے جلد پہچان گئے۔ شمائل جیسے عام شکل و صورت ادھیڑ عمر آدمی کے ہاں اس دراز قامت حسین خاتون کو دیکھ کر انہیں حیرت ہوئی تھی، تاہم انہیں بھلا اس معاملے سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔

شمائل نے پہلے مسکرا کر ان سے اپنا تعارف کروایا اور پھر انہیں لیے چٹائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے بتی جلا دی تھی۔ شمائل ایک خوش باش اور پُرخلوص شخص ثابت ہوا تھا۔

''سب کچھ ٹھیک تو رہا ہے نا......؟ میرا مطلب ہے کوئی گڑبڑ......؟'' اس نے دونوں کے چہروں پر باری باری نظر ڈالتے ہوئے پوچھا اور علی ریحان نے اسے ''گڑبڑ'' کے بارے میں بڑی صراحت سے بتادیا جسے سن کر شمائل کے چہرے پر ایک دم سنجیدگی کھنڈ آئی۔ علی اور شاہ زمان کی نظریں اس کے چہرے پر جم کر رہ گئی تھیں۔ اس کی آواز گھمردری تھی۔ چند ثانیے متوقف رہنے کے بعد وہ بولا۔

''یہ کچھ اچھا تو نہیں ہوا...... لیکن خیر فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں...... کام میں کچھ تاخیر تو ہو جائے گی... بہ صورت دیگر ہم کل ہی اپنے مشن کی ابتدا کر سکتے تھے۔''

''ہم کل ہی ابتدا کریں گے۔'' شاہ زمان نے فوراً کہا۔

''نہیں۔'' شمائل نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ابھی صبح صادق کی روشنی پھیلتے ہی گلیوں میں نقارے گونجنا شروع ہو جائیں گے۔ کوئی بعید نہیں کہ گھر گھر تلاشی بھی لی جائے۔ ابھی اپنے مشن کو اس طرف رکھ کے ایک مصیبت سے چھٹکارا پانے کی... کوشش کرنا ہوگی۔''

''لیکن...... ہم تاخیر کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ لیفٹیننٹ کمانڈر رمائیکل شا اپنے نائب کمپنی افسر جان پال کو دو ایک روز میں ایک خصوصی نشست کے لیے یہاں روانہ کرنے والا ہے۔ ہم نے اسی نشست کو سبوتاژ کر کے فوراً سے پیشتر واپس لوٹ جانا ہے۔ اگر نشست کامیابی سے طے پا گئی جس کی سب کو امید واثق بھی ہے تو سمجھو ہمارا مشن بری طرح ناکامی سے دوچار ہو جائے گا۔'' علی ریحان نے اپنے اس اہم مشن سے متعلق غایت درجے کی مجبوری اور اہمیت شمائل کے گوش گزار کرتے ہوئے کہا۔

اسی لمحے کمرے میں وہی خوبرو خاتون داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھوں میں گول تھالی تھی۔ اس پر چار چھوٹی پیالیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کسی اور نے تو شاید نہیں، البتہ شاہ زمان نے چار پیالیوں کو دیکھ کر فوری طور پر یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی تھی کہ یہ خاتون بھی ان کی اس اہم گفتگو میں شامل ہونے والی تھی اور...... دوسری اہم بات جو سب کے لیے نوٹ کرنے والی تھی، وہ تھا اس کا لباس ...... جو تبدیل ہو چکا تھا۔ یعنی اب وہ لبے جبے کے بجائے کاسنی رنگ کی خوب کسی ہوئی ساڑی میں ملبوس تھی۔ جس میں اس کا بھرا بھرا شباب امڈا پڑتا محسوس ہوتا تھا۔ شاہ زمان کو اس کا روپ سنگھار جیسا بدن کسی سانچے میں ڈھلا ہوا دکھتا تھا۔ رنگت اس کی شہابی تھی۔ کجراری کشادہ آنکھیں جن پر گھٹاؤں جیسی پلکوں نے سایہ کر رکھا تھا۔ گھنے ریشمی بال بڑے سلیقے سے کھول کر اس نے اپنے شانوں پر پھیلا رکھے تھے۔ اس کے تو یہ شکن بدن سے عجیب سی مسحور کر دینے والی نکہت اٹھتی محسوس ہوتی تھی۔

شاہ زمان کو اب بھی حیرت ہو رہی تھی کہ شمائل جیسے

ادھیڑ عمر بے رنگ روپ آدمی کے پاس یہ اپسرا مثل کا کیا کام تھا؟ کیا یہ اس کی دوسری بیوی تھی؟ یا مہاراجا کے کسی اعلیٰ افسر نے کسی بات پر خوش ہو کر شائل کو یہ پری وش کنیز کے طور پر ''دان'' کر دی تھی۔

وہ بڑے سلیقے سے ان کے سامنے اور شائل کے ساتھ ٹانگیں سمیٹ کر بیٹھ گئی تو شاہ زمان اس کے گدرائے ہوئے سکڑے سمٹے وجود میں جیسے کھو سا گیا۔ عورت نے بھی شاہ زمان کی نظروں کی دلچسپی کو شاید بھانپ لیا تھا، اسی سبب وہ بھی بہ ظاہر ایک نظرِ بہ غائر اس کی طرف دیکھ کر ہولے سے مسکرائی تھی۔

''یہ اریبہ ہے......''

معاً شاہ زمان کو شائل کی آواز نے چونکا دیا اور اسے اپنے اس قدر کھو جانے پر خجالت کا احساس ہوا تھا۔

''یہ میرے ساتھ رہتی ہے، میری بہترین مددگار اور ساتھی ہے......'' شائل نے اس کا مختصراً اور قدرے ادھورا ادھورا سا تعارف کرایا۔ شاید وہ اس سے آگے کچھ بتانے سے محترز رہا تھا، اسی سبب اس نے تھالی ان کے قریب سرکا دی۔

''لو...... قہوہ پیو۔ اریبہ قہوہ بہت اچھا اور خوش ذائقہ بناتی ہے۔''

علی ریحان اور شاہ زمان نے پیالیوں کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ سب سے آخر میں شائل اور پھر اریبہ نے پیالی اٹھالی۔

''کیا ہم کھل کر بات کر سکتے ہیں......؟'' علی نے ایک نظر اریبہ پر ڈالتے ہوئے شائل کی طرف دیکھ کر پوچھا تو وہ جیسے اس کی بات کا مطلب سمجھ کر ہنس کر بولا۔

''میں نے بتایا نا...... اریبہ میری بہترین ساتھی اور مددگار ہے۔ قابلِ بھروسا تو یہ ہے ہی...... مگر ذہین بھی بہت ہے۔ میں اکثر بعض اہم مسائل میں اس سے مشورے کرتا ہوں اور مجھے کبھی بھی اس کے مشوروں نے نقصان نہیں پہنچایا ہے، بلکہ فائدہ ہی ہوا ہے۔''

''اچھی بات ہے......'' علی ریحان نے اختصار سے کہا۔ زمان پیالی منہ سے لگائے اریبہ کے چہرے کو تکے جا رہا تھا۔ اریبہ نے ایک نگاہ پھر اس پر ڈالی تھی۔ دونوں کی بصری تال میل نے...... جیسے خانۂ دل کے کسی چور گوشوں میں امیدوں کے سنکھ بجا ڈالے......

''میرے ساتھ رہتی ہے ...... بہترین ساتھی...... مددگار...... کیا مطلب ہوا اس کا......؟'' شاہ زمان نے شائل کے الفاظ پر غور کیا۔ ''کیا یہ اس کی رکھیل ہے......؟ اف! میں بھی کیا سوچنے لگا۔''

''تمہاری بات غور طلب اور اہم ہے...... لیکن ابھی چند گھنٹوں بعد کی صورتِ حال دیکھ لیتے ہیں......'' شائل نے علی ریحان کی بات کے جواب میں کہا۔ ''تم دونوں بھی ابھی تھکے ہوئے ہو گے۔ کچھ کھا پی کر آرام کر لو...... میرے گھر کا یہ اوپری حصہ گودام کے لیے مخصوص ہے۔ فقط یہ کمرا میں نے کل ہی تم دونوں کے لیے صاف کروایا تھا...... اگر کوئی خطرے کی بات ہوئی تو تم دونوں کو جگا دوں گا۔''

شائل کی بات پر علی اور زمان نے کچھ خاص طمانیت کا اظہار نہیں کیا تو ایسے میں اریبہ ایک نگاہ ان دونوں پر ڈالتے ہوئے شائل کی طرف دیکھ کر بولی۔

''میرا خیال ہے انہیں اب اس کمرے کے بجائے...... نیچے تہ خانے میں ٹھہرا دیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔''

اریبہ کو بھی اس دوران شائل نے تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ باقی وہ سب پہلے ہی سے جانتی تھی۔

''یہاں تہ خانے تو گھر گھر بنے ہوئے ہیں...... سب سے پہلے اسی کی تلاشی لی جائے گی۔'' شائل نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''تلاشی گودام کمرے کی بھی ہو سکتی ہے مگر اس کی باری بعد میں آئے گی، تب تک حالات اور موقع مناسبت سے ہمیں بچاؤ کے لیے مہلت مل جائے گی۔''

اس کی بات پر اریبہ نے اپنے سر کو تفہیمی جنبش دی تھی۔ علی ریحان اور شاہ زمان کو بھی اس تمہید کے بعد، جو کم از کم کسی تاویل کے زمرے میں نہیں آتی تھی، کہیں جا کر تسلی ہوئی تھی۔ تب ہی اریبہ کی مترنم سی آواز ابھری۔

''اگر ایسا ہے تو پھر یہ سب اگلے چند گھنٹوں میں ظاہر ہو جائے گا اور ہمیں ابھی سے بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔''

''یقیناً۔'' شائل نے اپنا سر ہلایا۔

''ہم بھی زیادہ دیر ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے رہ سکتے۔'' علی ریحان بولا۔ ''کیونکہ ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہمیں مقررہ وقت پر اپنا مشن ہر صورت میں پایۂ تکمیل تک پہنچانا ہے۔ لہٰذا اس کے لیے ہم چند گھنٹے آرام کرنا چاہتے ہیں۔ ہم پر شدید تھکن اور نیند کا غلبہ طاری ہے۔''

شائل اور اریبہ اس کی بات سمجھ چکے تھے۔ دونوں کو آرام کرنے کا موقع دیا گیا جبکہ شائل اور اریبہ نیچے آ گئے۔ شائل کچھ فکرمند نظر آنے لگا تو اریبہ نے قدرے ملائمت سے پوچھا۔ ''تم کچھ پریشان دکھائی دینے لگے ہو......؟''

''آں...... ہاں! کچھ خاص تو نہیں بس یہی سوچ

رہا ہوں کہ اگر ان کا ریاست میں داخلہ راز میں رہتا تو باقی کا کام ہمارے لیے بھی آسان رہتا۔لیکن ان کی بدقسمتی کہ یہ دونوں پوری بٹالین کو اپنے پیچھے لگا آئے ہیں، اس طرح اب ہم بھی کسی بڑی مصیبت میں پھنس سکتے ہیں......"

"تو پھر تم اس نئی اور خطرناک صورتِ حال میں کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

اریبہ نے فوراً پوچھا، اندازِ مستفسرانہ کچھ ایسا ہی تھا جیسے وہ اس کے دل کا کوئی بھید لینا چاہتی ہو۔

وہ دونوں دھیمے لہجے میں باتیں کررہے تھے اور اوپر سے گودام کے تاریک زینے طے کرتے ہوئے نیچے اپنے کمرے میں آ گئے تھے۔یہاں بتی جل رہی تھی۔ دونوں فرشی نشست پر بیٹھ گئے تھے۔کمرے میں دو کھڑکیاں تھیں ایک باہر گلی میں کھلتی تھی جس میں فولادی سلاخیں نصب تھیں۔اس کا ایک پٹ وا تھا جہاں سے صبح کی روشنی نظر آرہی تھی۔دوسری کھڑکی مکان کے اندرونی گوشے میں کھلتی تھی۔

اریبہ کی آنکھیں کچھ بھانپنے کے انداز میں بدستور شائل کے چہرے پر ثبت تھیں اور اس کا ذہن تیزی سے کچھ سوچنے میں محو تھا۔تاہم وہ شائل کے جواب کی بھی منتظر رہی۔

"وہی سوچ رہا ہوں......لل......لیکن ایک خیال بھی میرے دل میں آتا ہے......" شائل کا لہجہ آخر میں کچھ اٹکا ہوا سا محسوس ہوا تھا......وہ بولی۔

"کیسا خیال......؟" اس نے ذرا بھویں سکیڑتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔اندازِ نگاہ بدستور کچھ بھانپنے جیسا ہی تھا۔شائل کے چہرے پر ہلکے سے ارتعاش کا شائبہ ابھرا تھا۔وہ اب اریبہ کی آنکھوں میں جھانکنے کے انداز میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"اریبہ! تمہیں تو میرا حال معلوم ہی ہے۔مانا کہ ہمیں کھانے پینے کی کوئی تنگی ترشی نہیں لیکن......زندگی گزارنے کے لیے صرف یہی کچھ کافی تو نہیں ہوتا نا......کچھ اور لوازم بھی ہوتے ہیں جنہیں عیش و آرام کا نام دیا جاتا ہے لل......لیکن......" وہ کہتے ہوئے رکا۔پھر خجل سا ہو کر بولا۔"سمجھ میں نہیں آتا تم سے کیسے بات کروں......اور......اور......نجانے تم کیا سمجھو، کیا مطلب لو......؟"

"میں تمہاری بات سن رہی ہوں میرے پیارے دوست شائل......!" اریبہ نے فوراً ہی جیسے اس کی حوصلہ افزائی کی۔"......لہٰذا تمہارے دل میں اس وقت جو کچھ بھی ہے وہ تم بلا جھجک مجھ سے کہہ سکتے ہو۔میں تمہاری دوست اور ساتھی ہوں۔اچھا ہوگا کہ ہم کسی اہم بات پر کھل کر صلاح مشورہ کرلیں گے۔" اس کی بات سن کر شائل کا چہرہ اچانک کھل اٹھا۔جیسے اس کے اندر کی کوئی الجھن دھیرے دھیرے دور ہونے لگی ہو، تاہم اس کے بولنے سے پہلے ہی جیسے اریبہ نے کسی اچانک خیال کے تحت اس سے کہا۔

"ایک بات بتاؤ گے......؟"

"ہاں! بولو......"

"تم ان کے لیے کب سے کام کررہے ہو......؟"

"کچھ زیادہ تو نہیں، یہی کوئی دو تین سال ہی ہوئے ہوں گے۔"

"رقم کے لالچ میں کرتے ہو یا کسی جذبے کے تحت؟"

اریبہ کے اس سوال پر وہ کچھ الجھ سا گیا۔ بولا۔

"خیریت! تم مجھ سے کیا پوچھنا چاہتی ہو؟"

"مجھ پر بھروسا کرتے ہو نا......؟" اریبہ نے اس کی طرف ایک خاص ادائے مسکان تلے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں! بہت بھروسا کرتا ہوں تم پر......" شائل نے اس کے گداز لبوں کی دل موہ لینے والی مسکراہٹ سے لطف لیتے ہوئے جواب دیا۔

"بے شک تمہارا اور میرا ساتھ زیادہ پرانا نہیں ہے۔" اریبہ بولی۔"آٹھ نو ماہ کہہ لو......لیکن اس عرصے میں تمہیں میری ذات سے کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے آج تک۔"

"قطعاً نہیں......مجھے اس کا اعتراف ہے۔" شائل نے کہا۔اسے اریبہ کا لب و لہجہ کچھ پراسرار سا محسوس ہونے لگا تھا۔

"تو بس پھر میرے سوالوں کے جواب دیتے جاؤ ......اور مجھ سے اپنے دل کی کوئی بات چھپانا مت۔" کہتے ہوئے اریبہ نے اپنا سوال دہرا دیا۔اس بار شائل نے۔ترنت جواب دیا تھا۔

"ہاں! پیسوں کا لالچ ہی کہہ سکتی ہو......تمہیں شاید معلوم نہیں کہ کچھ عرصے سے میرا کاروبار مندا جارہا تھا۔ درمیان میں تو یہاں تک نوبت آگئی تھی کہ میں عاتکہ کا علاج بھی صحیح طریقے سے نہ کروا سکا تھا اور وہ بے چاری پیٹ کی رسولی کے باعث تڑپ تڑپ کر مرگئی......"

اپنی مرحومہ بیوی کے بارے میں یہ بتاتے ہوئے شائل کا لہجہ مغموم سا ہو گیا تھا۔اریبہ دھیرے سے سرک کر اس کے قریب آگئی اور اس کے شانے پر اپنا نرم و گداز ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"تب پھر تمہارے سامنے دو راستے ہیں......ایک تو یہ کہ ان کی مدد کرو اور خود کو خطرے میں ڈالے رکھو......لیکن

مجھے نہیں لگتا کہ ہم اس مشکل صورتِ حال سے پھر بھی نکل پائیں گے اور اس طرح تمہارا جو بھی بچا کھچا کاروبار ہے وہ تو ملیامیٹ ہوگا ہی، ساتھ میں ہم بھی بے موت مارے جائیں گے۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ ان دونوں کی مخبری کرتے ہوئے مہاراجا سے بھاری انعام وصول کرلیا جائے۔"

اریبہ کی اس بات پر شائل نے چونکنے کے انداز میں اس کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ کمرے کی دھیمی روشنی میں اریبہ کا حسین چہرہ کسی ناگن کی طرح نظر آنے لگا تھا تب ہی شائل کے چہرے پر بھی مکروہ سی مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ ایسے میں دونوں ہی کے چہرے بھیانک منظر پیش کرنے لگے۔

"اریبہ! سچ پوچھو تو تم نے جیسے میرے دل کی بات پڑھ لی ہے۔ میں تو اسی وقت سے یہی سوچنے لگا تھا جب ان دونوں نے مجھے یہ بتایا تھا کہ ریاست کے اندر ان دونوں جاسوسوں کو پکڑوانے والے کے لیے مہاراجا چندر گپتا نے بھاری انعام رکھا ہے۔"

"میں چائے بنا کر بھی آتی ہوں......" اریبہ نے اچانک کہا اور اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ شائل سہانے خوابوں میں کھویا رہا۔ اس نے دل ہی دل میں شکر کیا تھا کہ اریبہ سے زیادہ بحث نہیں کرنی پڑی تھی۔ بلکہ اس نے خود ہی کہہ ڈالا تھا کہ وہ بھی اسی کی طرح سوچ رہی ہے۔ ورنہ اسے ڈر تھا کہ کہیں اسے اس کی بات بری نہ لگے۔ بری لگتی بھی تو، اس کا حل بھی شائل پہلے ہی سوچ چکا تھا۔ وہ اسے ٹھکانے لگانے پر سنجیدگی سے غور کرنے کا بھی ارادہ کرچکا تھا۔ اب وہ شکر کررہا تھا کہ چلو یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ اریبہ پہلے ہی سے اس کی ہم خیال رہی تھی اور وہ اریبہ جیسی حسین عورت کو قتل کر کے اس سے محروم ہونے سے بچ گیا تھا۔ وہ عرصے سے اس کی دل بستگی کا سامان پیدا کیے ہوئے تھی۔

درحقیقت اریبہ اسے ایک تباہ حال اور لٹے پٹے قافلے سے ملی تھی۔ وہ ایک ہمالیائی ریاست رتی گڑھ کی رہنے والی تھی۔ وہاں ہیضہ پھیل گیا تھا جو آن کی آن میں ایک وبائی مرض کی طرح عفریت کی صورت اختیار کرگیا تھا اور اس نے تیزی سے رتی گڑھ کے باشندوں کو نگلنا شروع کردیا تھا اور لوگ اس علاقے سے کوچ کرنے لگے۔ راستے میں انہیں راہزنوں نے گھیرلیا۔ چند ہی لوگوں نے ادھر ادھر بھاگ کر اپنی جانیں بچائی تھیں، ان میں اریبہ بھی تھی مگر اس کی اپنی حالت ناگفتہ بہ ہورہی تھی۔ راہزنوں کے سردار اور اس کے چند قریبی ساتھیوں نے جہاں قافلے کی دیگر عورتوں کو اپنی شیطانی بربریت اور ہوس کا نشانہ بنایا تھا، وہاں اریبہ بھی نہیں بچ سکی تھی۔ شائل اس وقت اپنی گاڑی میں تیندو پتوں کے گٹھر لادے پاس کے کسی علاقے میں فروخت کرنے جارہا تھا اور راستے میں اریبہ اسے بے ہوشی کی حالت میں ملی تھی، جو کسی طرح سے راہزنوں کے چنگل سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوچکی تھی اور پیدل گرتی پڑتی ایک جگہ بے دم ہوکر گر پڑی تھی۔

شائل اسے اٹھالایا تھا۔ اس کی اپنی بیوی کا بھی انہی دنوں انتقال ہوا تھا۔ شائل پہلے تو اس کے ہاں ایک کنیز کی حیثیت سے رہنے لگی، اس کے بعد داشتہ بن گئی۔ تاہم اریبہ کا خیال تھا کہ وہ اس سے شادی کرلے گا لیکن جلد ہی اسے احساس ہوگیا کہ شائل کو اپنی "حقیقت" بتانے کے بعد وہ اس کے لیے بے معنی ہوچکی تھی۔ اسے جلد ہی اس کڑوی حقیقت کا ادراک ہوچلا تھا کہ شائل محض اپنی دل بستگی اور تنہائیاں دور کرنے کی خاطر ہی اسے اٹھالایا تھا۔ سو وہ بھی کہاں جاتی، اس کے ساتھ وقت کاٹنے لگی اور وہ اسے شادی کے لیے بہلاتا رہا۔

اسی اثنا میں اریبہ چائے لے آئی۔ ایک پیالہ اس نے اپنے سامنے رکھا اور دوسرا شائل کے سامنے سرکا دیا۔

"تو تم بالآخر ان دونوں کو پکڑوانے کا حتمی فیصلہ کرچکے ہو......؟" اریبہ نے چائے کا گھونٹ بھر کر اس سے کہا۔

"اب بھلا اس میں شک کی کیا گنجائش رہ گئی ہے کہ تم پہلے ہی میرے چہرے سے میرے اندر کا احوال پڑھ چکی تھیں۔" شائل نے معنی خیز مسکراہٹ سے کہا۔ اس نے بھی چائے کا ایک گھونٹ بھرا۔ تب اچانک ہی شائل نے اریبہ کے چہرے ہی نہیں، آنکھوں سے بھی ایک عجیب سا تاثر محسوس کیا۔ وہ پیالے سے چائے کی ہلکی ہلکی چسکیاں بھرتے ہوئے شائل کے چہرے کو بڑے غور سے تکے جارہی تھی۔

☆☆☆

ادھر اوپری منزل کے گودام والے کمرے میں علی ریحان تو بے چارہ زمین پر پڑتے ہی گہری نیند میں ڈوب گیا تھا مگر شاہ زمان کی آنکھ دیر سے لگی تھی۔ اس کی وجہ اریبہ تھی۔ اس کا حسین و پرکشش چہرہ اس کی چشمِ تصور میں ہی نہیں بلکہ دماغ میں بھی گھر کرگیا تھا۔ وہ سوچنے پر مجبور ہوگیا تھا کہ آخر اریبہ کون تھی؟ اس کی حقیقت کیا تھی اور وہ شائل جیسے ادھیڑ عمر آدمی کے پاس کیوں اور کس حیثیت سے رہ رہی تھی؟ جبکہ شائل نے اس کے متعلق زیادہ تفصیل بتانے سے بھی گریز کیا تھا۔ کیا وجہ تھی اس کی؟ محض ساتھی کہا تھا اریبہ کو اپنا...... پھر کچھ دیر بعد اسے بھی نیند نے آلیا۔ آنکھ لگتے

سے پہلے وہ یہی دعا مانگ رہا تھا کہ انہیں چند گھنٹے ہی سہی کچھ نیند لینے کا موقع مل جائے تا کہ اپنے اصل مشن کی انجام دہی کے لیے وہ نئے سرے سے خود کو تازہ دم محسوس کر سکیں۔ کیونکہ موجودہ حالات میں اس امر کا احتمال تھا کہ تلاشی کے سلسلے میں انہیں دوبارہ اور کہیں جلد نہ جاگنا پڑ جائے۔

اچانک اس کی آنکھ کھلی تھی۔ کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ کھڑکی سے روشنی اندر آرہی تھی۔ اس نے گردن گھما کر اپنے ساتھی علی ریحان کی طرف دیکھا۔ وہ سو رہا تھا۔ شاہ زمان کو اچانک کسی اور کی موجودگی کا بھی احساس ہوا اور تب ہی اس کی نظر دروازے پر پڑی اور وہ چونک گیا۔

☆☆☆

گارشیا اس کے آگے چل رہی تھی اور شوکی اس کے عقب میں چند قدموں کے فاصلے پر بے دلی سے چلا آرہا تھا۔ جلد ہی اس نے محسوس کر لیا کہ وہ کچھ زیادہ ہی دور جانے لگی تھی۔ اس نے فوراً آواز دی۔

''مس گارشیا! زیادہ آگے مت جائیں......'' وہ رک گئی اور اس کی جانب پلٹی۔ تب تک شوکی بھی اس کے قریب آچکا تھا۔ وہ بھی رک گیا۔ گارشیا اس کی طرف مسکرا کے دیکھتے ہوئے بولی۔

''اوکے......! تمہارا حکم مانتی ہوں لیکن پلیز...... تھوڑا سا اور آگے تک چلو نا...... اس طرف میں نے ایک بہت خوبصورت پہاڑی جھرنا دیکھا تھا۔ اس سے آگے نہیں جاؤں گی پرومس......'' مجبوراً شوکی ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

گارشیا اسے گہری گہری نگاہوں سے دیکھتی ہوئی پلٹی اور قدم بڑھا دیے۔ ایک چٹانی کگر سے وہ نیچے اترنے لگی۔ شوکی نے اس کا مرمریں سا بازو تھام لیا تو گارشیا ڈھلان اترنے کے بہانے اس کے ساتھ لگ گئی۔ شوکی نے اسے دھیرے سے پرے کیا اور وہ نیچے اتر آئے۔ وہ اس سے الگ ہو گیا۔ اب ان کے سروں پر کگر تھی اور سامنے ایک قدرتی آبشار پہاڑی نالے سے بہتی ہوئی نیچے برساتی تالاب پر گر رہی تھی۔ دونوں تالاب کے کنارے پر تھے۔ ان کے چہار اطراف سر بفلک چوٹیاں تھیں جہاں سفید بادلوں کی ٹکڑیاں اٹکی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ اوپر کھلا آسمان صبح کی پُرنور روشنی سے صاف اور نتھرا نظر آتا تھا۔ وادی میں مختلف النوع پرندے اپنے خوش رنگ پنکھ پھیلائے محو پرواز تھے۔ بارانی تالاب کے دوسرے کنارے پر چھتنار سے درخت، ڈھلان پر عمودی سمت چلے گئے تھے۔ جہاں گھنی جھاڑیوں کی بہتات نظر آتی تھی، وہاں انہیں، ہرن قلانچیں بھرتے ہوئے دکھائی دیے۔

یہ سارا منظر آنکھوں کو بہت بھلا محسوس ہوتا تھا لیکن شوکی کے لیے ان دلفریب مناظر میں کوئی کشش نہیں رہی تھی۔ ریناکا اس کے ساتھ بدستور رویہ ایسا ہی تھا جیسے کسی مصور نے اس حسین منظر سے درخت، پرندے، آبشار، نوک قلم سے مٹا ڈالے ہوں اور صرف خشک اور بنجر پہاڑیوں کا روکھا پھیکا لینڈ اسکیپ باقی رہ گیا ہو......

''تم ایک بہادر انسان ہو...... لیکن مجھے برادر رابرٹ کا تم سے نازیبا رویہ ایک آنکھ نہیں بھاتا۔'' گارشیا سامنے اپنی نگاہیں گاڑتے ہوئے بولی، جہاں آبشار کی موٹی دھار بلندی سے گرنے کے سبب منقسم ہو کے شاور کی طرح ٹھہرے ہوئے...... تالاب کے صاف وشفاف پانی کی سطح پر عجیب سا جلترنگ بجاتی ہوئی گر رہی تھی۔

شوکی نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ آگے بولی۔ ''حالانکہ مجھے پورا یقین ہے کہ اگر تم اپنی جان خطرے میں ڈال کر گریزلی پر حملہ آور نہ ہوتے تو وہ بھائی کی بے وقوفی کے باعث ہم سب کے لیے مصیبت بن جاتا۔''

''آپ لوگوں کی حفاظت اور تحفظ کرنا میرا فرض ہے۔'' شوکی نے اس بار مختصراً جواب دیا۔

''میرا تو اس تالاب میں نہانے کو دل کر رہا ہے۔ تمہارا کیا ارادہ ہے؟'' اچانک جیسے گارشیا نے روئے سخن موڑا تو شوکی نے نفی میں اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''میرا تو ایسا کوئی موڈ نہیں ہو رہا ہے لیکن مس گارشیا! میں آپ کو بھی یہی مشورہ دوں گا کہ تالاب کی گہرائی کا اندازہ کیے بغیر آپ کو اس میں نہانا نہیں چاہیے۔''

''آئی ڈونٹ کیئر......'' وہ بولی۔ ''مجھے تیرنا آتا ہے۔ یونیورسٹی میں پیراکی کے مقابلوں میں اگر پہلے نہیں تو دوسرے تیسرے نمبر پر تو ضرور آتی تھی۔ کیا تم شناوری سے نابلد ہو؟''

''آتی ہے مجھے بھی......'' شوکی نے مختصر جواب دیا۔

گارشیا اپنی شرٹ کی ''گانٹھ'' کھولنے لگی۔ شوکی منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا اور سنجیدگی سے بولا۔

''آپ نہا کر جب فارغ ہو جائیں تو مجھے آواز دے دیجیے گا مگر پلیز! دیر مت لگائیے گا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ایک طرف کو بڑھ گیا۔ اسے عقب سے گارشیا کی کھنکتی ہوئی ہنسی کی آواز سنائی دی تھی۔

ایسے ہی وقت میں جب شوکی ایک گوشے کی جانب بڑھ رہا تھا، اسے اپنے عقب میں زوردار چھپاکے کی آواز سنائی دی۔ وہ غیر ارادی طور پر رک کر پلٹا تو اسے گارشیا تالاب کے

کھلے پانیوں میں گردن تک ڈوبی اٹکھیلیاں کرتی نظر آئی۔ کنارے پر اس کا لباس بکھرا پڑا تھا۔ اسی وقت گارشیا نے ایک چلبلی سی چیخ بلند کی، جو اس چٹانی وادی کی سنگلاخ بلندیوں میں ''ایکوساؤنڈ'' پیدا کرتی دیر تک گونجتی ہوئی عجیب سا تاثر پیش کرتی رہی۔

''کم آن شوکی! تم بھی آجاؤ... بہت مزہ آرہا ہے...'' کہتے ہوئے اس نے اپنا ایک ہاتھ بھی اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہلا دیا۔ شوکی نے سر جھٹک دیا اور پلٹا۔

''دیکھو... دیکھو... زیادہ دور مت جانا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ شوکی خجالت سی محسوس کرنے لگا اور ایک قریبی ابھرے ہوئے پتھر پر ٹکنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔ گارشیا کی شوخ وشنگ پیراکی جاری تھی۔ وہ کسی جل پری کی طرح تیرتی ہوئی اوپر پہاڑی نالے سے آبشار کی صورت گرنے والے پانی کے نیچے آگئی اور گویا ''شاور'' لینے لگی۔

شوکی اس کی طرف گاہے بہ گاہے ایک اچٹتی سی نگاہ ڈال لیتا تھا اور پھر رینا کے خیالوں میں کھو جاتا۔ ایسے میں اسے گارشیا کے زہر میں بجھے ہوئے الفاظ بھی یاد آنے لگے تھے۔

''رینا کا خیال بھی اپنے دل سے نکال پھینکو... وہ برادر رابرٹ کے ساتھ انوالو ہو چکی ہے جبکہ رابرٹ کو تو تم جانتے ہی ہو۔''

گارشیا نے اپنے بھائی رابرٹ اور رینا کے حوالے سے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ دونوں بچپن سے ہی ایک دوسرے کو پسند کرتے چلے آرہے تھے۔

''یہ نہیں ہو سکتا...'' دفعتاً ہی جانے کس رقیبانہ جذبے تلے اس کے دل کی بات لبوں پہ آگئی۔ وہ گارشیا کی اس بات کی نفی کرتے ہوئے بولا۔

''گارشیا نے ضرور مجھ سے ایسا جھوٹ کہا ہے۔ وہ رینا سے جیلس ہو رہی ہے اور میرا اس سے دل خراب کرنے کے لیے ایسی بکواس کر رہی ہے۔ رینا اور رابرٹ قریبی رشتے دار ہیں اور بس...'' اس نے اپنے دلِ بے قرار کو تسلی دینی چاہی۔

ادھر آبشار تلے نہاتی ہوئی گارشیا نے اس کی طرف دیکھا، کچھ سوچتی رہی۔ اس کے بعد وہ کسی جل پری کی طرح تیرتی ہوئی تالاب کے قدرے کنارے آگئی اور پھر نجانے اسے کیا ہوا کہ وہ ایک دم چیخنے چلانے لگی۔ شوکی خیالات سے چونک پڑا۔

''بب... بچاؤ... بچاؤ... مم... مگرمچھ...''

شوکی ایک دم گھبرا گیا اور اٹھ کر تالاب کی طرف دوڑا۔ کیا دیکھتا ہے کہ گارشیا زور دار چھپاکے مار رہی تھی، کبھی الٹ رہی تھی اور کبھی پلٹ رہی تھی۔ بادی النظر میں یہی معلوم ہوتا تھا جیسے پانی کے اندر چھپی کسی شے سے نبرد آزما ہونے کی کوشش میں ہو۔ شوکی نے یک دم اپنی دائنی ٹانگ کی پنڈلی سے بندھی میان سے قرولی نکال کر ہاتھ میں پکڑلی اور کپڑوں سمیت تالاب میں جا کودا۔ وہ تیزی سے تیرتا ہوا ہڑبڑاتی، بلکتی گارشیا کے سر پر جا پہنچا تو گارشیا اپنا تڑپنا چھوڑ کر اس کے ساتھ لپٹ گئی... اس کی اس حرکت پر پہلے تو شوکی گھبرا سا گیا مگر اس کا ڈراما سمجھتے ہی وہ اس سے جان چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔

''مت کرو ایسا... پلیز... افار مائی سیک... کیوں دور بھاگتے ہو مجھ سے...'' گارشیا حلاوت بھرے جذبات سے بھرپور لہجے میں بولی۔ شدتِ جذبات سے اس کی آواز بھی حلق سے اٹک اٹک کر برآمد ہو رہی تھی۔ گارشیا کا نیم عریاں سیم تن وجود اس کے ساتھ لپٹا ہوا تھا۔ اس نے شوکی کے گلے کے گرد اپنی برہنہ مرمریں بانہوں کا ہار سا پہنا رکھا تھا۔ وہ اپنے سلگتے لب اس کی گھنی مونچھوں تلے ہونٹوں پر ثبت کر دینا چاہتی تھی۔

''میں... میں کیا رینا سے کم حسین ہوں...'' وہ جذبات کی شدت تلے بہے جا رہی تھی، کہے جا رہی تھی۔

''مجھے ذرا ایک نظر بھر کے دیکھو تو... بہت آتش مزاج ہوں میں... بھڑکانے کی ماہر اور... اس سنہری موقعے سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے بے وقوف... میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں... رینا میرے مقابلے میں کیا ہے بھلا...''

جب اس کی لن ترانیاں اور دست درازیاں حد سے تجاوز کرنے لگیں تو شوکی کو مجبوراً اسے ہوش دلانے کے لیے اس کے منہ پر اپنے ایک ہاتھ کا تھپڑ رسید کرنا پڑا مگر وہ ہوس زادی پھر بھی باز نہ آئی، بہکے بہکے مخمور سے لہجے میں بولی۔

''آہ... بیٹ می... بیٹ می... اور... مارو مجھے... عشق میں ایسی اذیت میرے جذبات کو مزید دوآتشہ کر دیتی ہے۔''

اب تو شوکت بری طرح سٹپٹا گیا اور اسے لپٹائے ہوئے ہی تیرتا ہوا کنارے پر آگیا اور باہر نکل آیا۔ گارشیا بھی پانی سے نکل آئی تھی۔ اس کا توبہ شکن نیم عریاں بدن پانی کے بلوریں قطروں سے شرابور بری طرح بھیگ رہا تھا۔ شوکی بڑھی

سے بولا۔

''اپنا لباس پہن لو اور جلد نکل چلو...... ورنہ میں تمہارے انکل ہنری برنارڈ سے شکایت کردوں گا......''

شوکی اس سے یہ کہتا ہوا...... اس کی طرف سے منہ پھیر کر چند قدم دور جا کے کھڑا ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد گارشیا بھی لباس پہنے اس کے سامنے آگئی۔

''سوری...... ! میں شاید تمہاری محبت میں زیادہ بہک گئی تھی...... سوسوری......'' وہ اس سے ندامت بھرے لہجے میں بولی تھی۔

''ٹھیک ہے...... اب واپس چلو......''

دونوں پتھریلے اور ٹیڑھے میڑھے راستوں پر چٹانی دیواروں کا سہارا لیتے ہوئے پڑاؤ کی جانب بڑھنے لگے۔

جب پڑاؤ پر پہنچے تو شوکی کی جلتی نظروں نے دیکھا کہ رابرٹ اور رینا بھی ہنستے باتیں کرتے ہوئے ایک طرف سے چلے آرہے تھے۔ رابرٹ کا ایک ہاتھ رینا کی شاخ گل جیسی کمر کے گرد حمائل تھا اور رینا بالکل اس کے ساتھ لگی چلی آرہی تھی۔ ایسے میں رینا اور شوکی کی نظریں ایک لمحے کو چار ہوئی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی رینا کے کھلکھلاتے چہرے پر ایک دم سنجیدگی طاری ہوگئی تھی جبکہ رابرٹ کا چہرہ ایک دم سرخ ہوگیا۔ وہ رینا کو چھوڑ کر اس کی طرف جارحانہ انداز میں بڑھا۔ اسی وقت پروفیسر ہنری کے ہولے سے کھنکھارنے کی آواز ابھری۔ رابرٹ اس ''کاشن'' کو سمجھ کر اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے ایک غصیلی نظر شوکی پر ڈالتے ہوئے اپنی بہن گارشیا سے بولا۔

''تم اس کے ساتھ کہاں گئی تھیں؟''

''اٹ از نان آف یور بزنس برادر...... !'' گارشیا نے بڑی رکھائی سے بھائی کو جواب دیا تھا۔ ''آئی ایم ایٹین ابو (میں اٹھارہ سے اوپر کی ہوں) تم مجھ پر کوئی حکم نہیں چلا سکتے۔''

اس کی بات پر رابرٹ دانت پیس کر رہ گیا لیکن شوکی نے کچھ سوچ کر رابرٹ سے کہا۔

''مس گارشیا کا صبح کی سیر کرنے کا جی چاہ رہا تھا۔ یہ اکیلی ہی جا رہی تھیں لیکن انکل ہنری نے مجھے بھی ان کے ساتھ بھیج دیا تھا۔''

''یو شٹ اپ...... ! میں نے تم سے بات نہیں کی ہے۔'' رابرٹ کو جیسے شوکی پر بولنے کا موقع ملا...... ''تم......''

وہ غصے سے بپھر کر شوکی سے اور بھی کچھ کہنا چاہتا تھا کہ پروفیسر ہنری جنہوں نے تھوڑی دیر پہلے ہی رابرٹ کے تیور دیکھ کر ہولے سے کھنکھار کر اسے کسی قسم کی بدمزگی نہ پھیلانے کی وارننگ دی تھی، اس کا جملہ پورا کرنے سے پہلے ہی درمیان میں بول پڑے۔

''رابرٹ ! مائنڈ یور لینگویج...... وٹس انف ناؤ...... اب میں تمہیں باقاعدہ وارن کرتا ہوں کہ تم قطعاً کسی سے نہیں الجھو گے۔'' انہیں بھی غصہ آگیا تھا۔ ''جب شوکی نے میرے سامنے تمہیں یہ بتا دیا ہے کہ گارشیا کو میں نے ہی اس کے ساتھ بھیجا تھا تو بات ختم ہو جاتی ہے۔''

''انکل ! گارشیا بچی ہے، وہ شوکی کو نہیں جانتی ......''

رابرٹ سے شوکی کے خلاف زہر اگلتے نہیں بن رہی تھی۔

''تم کیا جانتے ہو شوکی کو......'' پروفیسر ہنری اس کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے بولے۔ انہیں بھی شاید رابرٹ کی ڈھٹائی اور شوکی سے بلاوجہ کی جلن اور کج روی پر غصہ آگیا تھا، اسی سبب جیسے وہ خود اس کی وکالت کرنے کی ٹھان چکے تھے۔

''یہی جانتے ہو نا تم اس کے بارے میں کہ...... اس نے ایک بار رینا کی جان بچائی، دوسری بار تمہاری اپنی ضد نے تمہیں اس پاگل گھوڑی (مارگریٹ) کے ہتھے چڑھا دیا اور تب بھی مسٹر شوکی آگے آئے اور اب یہاں گزشتہ شب کو جو تمہاری اپنی بے وقوفی سے ہم سب ایک خوفناک حادثے کا شکار ہوتے ہوتے بچے تھے، وہاں بھی یہی اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر اس خطرناک اور دیو قامت درندے پر کود پڑا تھا۔ بولو...... کیا یہی جانتے ہو نا...... تم...... یا اور کچھ جانتے ہو تو آج ہمیں وہ بھی بتا دو......''

پروفیسر ہنری برنارڈ طبعاً ایک سلجھے ہوئے اور بااصول انسان تھے۔ وہ صرف اپنے کام سے کام رکھنے کے عادی تھے اور کسی کے معاملے میں ٹانگ اڑانا پسند نہیں کرتے تھے نہ ہی اپنے کسی معاملے میں کسی کی دخل اندازی انہیں پسند تھی۔ ان کی نظروں میں سچ ہمیشہ سچ ہی ہوتا تھا اور جھوٹ صرف جھوٹ، چاہے سامنے والا کسی بھی ملک یا مذہب سے تعلق رکھتا ہو...... وہ اگر کسی غلطی پر ہوتا تو وہ اسے بری طرح ٹوک دیا کرتے تھے۔ حلیم طبع تو وہ تھے ہی مگر اس سے زیادہ وہ قدر شناس بھی تھے۔ اگر اس وقت ان کے سامنے رابرٹ کی جگہ ان کا اپنا افسر دوست جنرل مائیکل شا بھی ہوتا تب بھی پروفیسر ہنری اس پر شوکی کی سچائی کو ہی ترجیح دیتے، یہ تو پھر رابرٹ تھا۔

بہرکیف...... رابرٹ کو ایک بار پھر منہ کی کھانی پڑی تھی۔ شوکی کے لیے اپنے باپ کریم بخش کی تربیت کام آرہی

Health

دنیا کا سب سے مہنگا زہر جس کی قیمت اربوں روپے میں ہے | World's Most Expensive Poison

computerxtech 0 Oct 03, 2017

اس ایک لیٹر زہر کی قیمت تقریباً ایک ارب 10 کروڑ پاکستانی روپوں کے مساوی ہے۔ دنیا کا سب سے مہنگا زہر بچھوؤں کی ایک(World's Most Expensive Poison) قسم "ل... Readmore

Health

بوڑھوں کو جوان بنانے والی سائنس | Old to Young Conversion Science

computerxtech 0 Sep 11, 2017

انسان کے جسم میں خلیوں کی دو سو سے زائد اقسام پائی جاتی ہیں۔ فوٹو : فائلپچھلے سال [illegible] 29... Readmore

Health

صحت کے معاملے میں خواتین کی 10 سنگین غلطیاں | Ten Health Mistakes by the Women

computerxtech 0 Sep 11, 2017

خوبصورت نظر آنے کے لیے خواتین دنیا بھر کے جتن کرتی ہیں لیکن اکثر کو شکایت رہتی ہے کہ انہیں کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ فوٹو، فائلکراچی: اچھی صحت اور خ... Readmore

Health

ایسپرین دانتوں کو خرابی سے روک کر انہیں ازخود مرمت کے قابل بناتی ہے | Dental Treatment with Aspirin

computerxtech 0 Sep 11, 2017

کوئنزیونیورسٹی کے سائنسدانوں نے انکشاف کیا ہے کہ اسپرین دانتوں کی حفاظت کرتی ہے۔ فوٹو: فائل لندن: سائنسدانوں نے انکشاف کیا ہے کہ گھریوں میں ... Readmore

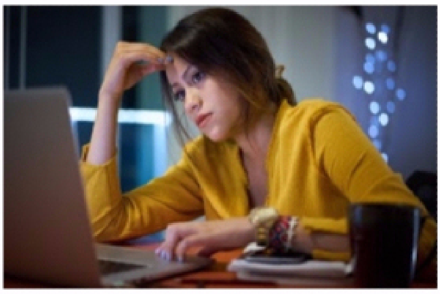

Health News

فکر اور پریشانی سے نجات پانے کے تین آسان طریقے | Three easy ways to eliminate Tension

computerxtech 0 Sep 03, 2017

ماہرین نفسیات نے پریشان خیالی سے چھٹکارا پانے کے تین اہم طریقے بیان کئے ہیں۔ فوٹو: فائل لندن: ماہر نفسیات کے مطابق پریشان اور فکرمندی کی س... Readmore

Health News

ادرک جوڑوں کے درد کے لیے اکسیر دوا | Benefits of Ginger

computerxtech 0 Sep 03, 2017

ادرک میں کئی اجزا جلن، درد اور سوزش کو کم کرتے ہیں۔ فوٹو: فائلکراچی: ادرک کے جسمانی و طبی فوائد سے ہم سب بخوبی واقف ہیں اور اب ماہرین نے اس کے اس... Readmore

تھی۔ اس کا باپ ہمیشہ اسے یہی نصیحت کرتا تھا کہ اگر اس کے حق میں کوئی دوسرا بول رہا ہو تو اسے اپنی زبان بند ہی رکھنی چاہیے۔ وہ یہی کیے ہوئے تھا۔ ادھر رابرٹ بری طرح زچ ہو کر واپس اپنے خیمے کی جانب پلٹنے لگا تو پروفیسر ہنری نے اسے پکارا۔

"ہے بڈی! ٹھہر جاؤ......" وہ رک گیا اور اس کی جانب مڑا۔ پروفیسر ہنری بھی جیسے آج معاملہ صاف ہی کرنے کے موڈ میں نظر آتا تھا۔ اس سے متانت سے بولا۔

"اب یہ سب ختم ہو جانا چاہیے۔ میں آئندہ تمہیں شوکی سے تو کیا کسی سے بھی الجھتا ہوا نہ دیکھوں...... بصورت دیگر میں تمہیں واپس لوٹ جانے کا پروانہ جاری کردوں گا۔ اس کارواں کا اس وقت میں سالار ہوں اور تم اس وقت جنرل مائیکل شا کے بھتیجے نہیں بلکہ میرے قافلے کے ایک رکن ہو......اسے اب آخری وارننگ سمجھنا۔"

رابرٹ کے لیے یہ ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ جس شخص کو وہ دو ٹکے کا نوکر کہہ کر پکارتا تھا، آج اسی کے سامنے اس کی عزت دو کوڑی کی کردی گئی تھی۔ بلاوجہ کی مخالفت اور حسد نے بالآخر رابرٹ کو اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں رسوا کر ڈالا تھا۔

"اوکے......فنی!" رابرٹ چڑے ہوئے منہ سے بولا۔ پروفیسر ہنری بھی آج سارا ادھار اتارنے کی تیاری میں تھے، فوراً سنجیدگی سے بہ دستور اس کی طرف سخت نظروں سے گھورتے ہوئے بولے۔

"نو، اٹ از ناٹ فنی......اینڈ نار اینی فینٹسی، جسٹ رسپانسبلیٹی......"

رابرٹ نے اپنے سر پر آڑے انداز میں جمے ہوئے ہیٹ کو چھوا اور پلٹ گیا۔ رینا وہیں کھڑی رہ گئی تھی۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی کے تاثرات ہویدا تھے۔ شوکی نے اس کی طرف ایک دزدیدہ سی نظر ڈالی۔ رینا بھی اپنا نچلا ہونٹ دانتوں کی اوپری قطار تلے دبائے اس کی جانب تکے جارہی تھی اور پھر اس سے ایک دم ہی نگاہیں پھیر کر پلٹ گئی۔ وہ رابرٹ کے پیچھے جارہی تھی۔

پروفیسر ہنری نے کوچ کے احکامات صادر کردیے۔

موسم خاصا خوشگوار ہو چلا تھا۔ دھوپ نکل آئی تھی اور اس میں ایک خوشگواریت کا احساس تھا۔ نیچے اوپر دور...... ان وادیوں کی بلندیوں اور ترائیوں میں قدرتی صناعی کے شاہکار وجود میں آنے لگے تھے۔ چرند پرند سب ہی اپنی اپنی مستیوں میں محو خرام و پرواز تھے۔ ان کی گونج وادی میں عجیب سا تاثر ابھارتی محسوس ہوتی تھی۔

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

ماہنامہ سرگزشت کراچی

شمارہ دسمبر 2017ء کی جھلکیاں

عمر خیام
ضیا تسنیم بلگرامی کے قلم سے اس شخصیت کا احوال جسے سائنسی علوم پر دسترس تھا لیکن دنیا والے اسے شاعر سمجھتے رہے

مصنفہ
تنویر ریاض لائے ایک معروف فنکار کا زندگی نامہ

جنرل کا فرار
سید احتشام کی تلاش، ایک ایسے جنرل کا احوال جسے دشمنوں نے محاذِ جنگ سے گرفتار کیا تھا

رسم سال نو
وسیم بن اشرف کی دلچسپ تحریر، دنیا بھر میں سال نو کا استقبال کیسے کیا جاتا ہے

محبت گزیدہ
زدیا اعجاز کی ایک دلچسپ مگر انوکھی سچ بیانی جس میں انتہائی انوکھی سزا تجویز ہوئی تھی

اس کے علاوہ
بہت سی سچ بیانیاں دلچسپ سچے قصے اور تاریخی واقعات

پروفیسر ہنری برنارڈ کے ''اعلانیے'' کے مطابق اب شوکی کی حیثیت اس مہماتی ٹیم کے نائب سالار کی تھی۔

ڈرائیور امجد خان سے اس کی اچھی خاصی دوستی ہوگئی تھی۔ وہ ایک بھاری جسم کا ٹھگنا سا ہنس مکھ شخص تھا۔ اس کے چہرے پر چھدری سی ڈاڑھی تھی اور عمر تیس کے قریب تھی۔ اس نے گھٹنے تک شارٹس اور اوپر ٹیلس والی شرٹ چڑھا رکھی تھی۔ پیروں میں مضبوط سول کے جوتے پہنے ہوتے تھے۔ پڑاؤ سمیٹنے کی تیاری یہ چاروں کررہے تھے۔ نندو بابا اور اس کی بیوی شانتا سامان وغیرہ سمیٹ رہے تھے۔ باقی لوگ بھی اپنا اپنا ضروری سامان ایڈونچر کٹس میں منتقل کرنے میں مصروف تھے۔

''اس کاؤبوائے کی اولاد رابرٹ سے محتاط رہنا شوکی!''

خیمے اکھاڑنے کے دوران ڈرائیور امجد خان نے نیچی آواز میں شوکی کو متنبہ کیا۔ ''میں اس کی آنکھوں میں تمہارے لیے عناد اور بغض دیکھ رہا ہوں۔''

''تم نے یہ آج دیکھا ہے، میں یہ سب روانگی سے بہت پہلے دیکھ چکا ہوں۔'' شوکی نے پتھریلی زمین سے ایک بڑے زنبور کے ذریعے میخ اکھاڑتے ہوئے جواب دیا۔

''اوہ...... تو اس کا مطلب ہے معاملہ پرانا ہے۔'' امجد خان نے بھویں سکیڑلیں۔

''ویسے میں نے روانگی کے وقت سے ہی یہ بات محسوس تو کرلی تھی بلکہ مجھے یہ فرنگی زادہ ابتدا سے ہی ایک متعصب اور مغرور شخص لگا تھا کیونکہ میرے اور نندو بابا، اس کی بیوی شانتا کے ساتھ بھی اس کا رویہ متعصبانہ تھا مگر تمہارے ساتھ تو کچھ زیادہ ہی......'' وہ اکھڑے ہوئے خیمے کو لپیٹتے ہوئے ایک ذرا توقف کے بعد دوبارہ بولا۔ ''ویسے تم نے اس مغرور فرنگی زادے کو اچھا سبق سکھایا۔ بڑی سبکی محسوس کررہا تھا یہ اپنی، جب پروفیسر صاحب اسے ڈانٹ پلا رہے تھے۔''

''ذلت و رسوائی ایسوں کا مقدر ہوتی ہے دوست!'' شوکی نے کہا۔ ''یہ سب کٹس میں لپیٹ لو، میں ذرا نندو بابا اور شانتا کی مدد کو جاتا ہوں۔''

''ایک بات سنو......'' امجد خان نے اس سے کہا۔ وہ رک گیا۔ ''تمہیں کچھ معلوم ہے یہ پاگل سنکی پروفیسر آخر اس پُرخطر مہم پر کس مقصد کے لیے نکلا ہے؟''

''کیا تمہیں نہیں معلوم......؟'' شوکی نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی بھویں اچکائیں......

''ہمیں تو یہی پتا ہے کہ یہ کوہ شالیہ کے اطراف میں بسنے والے بعض قبائل پر ریسرچ کرنا چاہتا ہے۔''

''مجھے بھی یہی پتا ہے۔'' شوکی نے جواب دیا۔

''لیکن نندو بابا اور شانتا کا خیال اس بارے میں کچھ اور ہے۔'' یہ بتاتے ہوئے امجد خان نے اپنی آواز دھیمی کرلی تھی۔ لہجہ ایکا ایکی پُراسرار سا ہوگیا تھا۔ شوکی بے تاثر سے لہجے میں بولا۔

''کیا کہتے ہیں دونوں......؟''

''تمہیں شاید اس موضوع سے کوئی دلچسپی نہیں ہے تو رہنے دو، کیا بتاؤں......'' امجد بولا۔ شوکی بھی خاموش رہا۔

ایک گھنٹے بعد یہ لوگ اپنی مکمل تیاری کے ساتھ ایک جگہ جمع ہوگئے۔ پروفیسر ہنری نے ان سب سے مخاطب ہوکر کہا۔

''پہلے میرا ارادہ تھا کہ ناگرہ تک ریل کے ذریعے پہنچنے کی کوشش کی جائے، کیونکہ میں نے یہاں قیام کے دوران دیکھا ہے کہ پورے دن میں ایک بار سامنے والی ریلوے لائن سے دو ریل کاریں گزرتی ہیں، ایک آنے والی اور دوسری جانے والی۔''

یہ کہتے ہوئے انہوں نے اس ریلوے لائن کی طرف اشارہ کیا جو سیدھے ہاتھ کی طرف والی پہاڑی سرنگ سے نکل کر قوس کی صورت میں ناگرہ کی طرف جارہی تھی۔ یہاں انہوں نے دخانی انجن والی ایک ریل کار کو بھی گزرتے دیکھا تھا۔

''اگرچہ اس ریل کی آمد کا وقت ہوا چاہتا ہے، لیکن اس علاقے کا نقشہ دیکھنے کے بعد میں نے اپنا ریل کار میں روانگی کا ارادہ بدل ڈالا ہے۔ کیونکہ نقشے کے مطابق ناگرہ، جو ہماری منزل ہے اس سے ملحقہ دیگر دور ریاستیں پالن پور اور تر پیال کے جنوب مشرق والے چوحدے کی جانب، لگ بھگ پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک قبیلہ راکاشی ہے۔ لہٰذا اب ہم باقی کا پیدل سفر اسی سمت جاری رکھیں گے۔''

''فنٹاسٹک...... یہی بہتر رہے گا ہنری انکل!'' گارشیا نے کلکاری مارتے ہوئے کہا۔

''میں بھی پاپا کے اس خیال سے متفق ہوں......'' پروفیسر ہنری کی لاڈلی بیٹی ریتا نے بھی اپنی کزن گارشیا کی تائید میں خوش ہوکر کہا۔ ''اس طرح ہمیں مشرق کی اس پُراسرار زمین کے نیچرل حسن کو قریب سے دیکھنے اور اس سے لطف اندوز ہوتے رہنے کا بھی موقع ملتا رہے گا۔''

''بالکل ٹھیک...... ہم خود بھی یہی چاہتے ہیں ہنری

انکل!'' رابرٹ نے اپنے دونوں پہلوؤں پر ہاتھ رکھتے اور ٹانگیں پھیلاتے ہوئے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

''ویل! تو چلو پھر انجوائے .... کرو......'' پروفیسر ہنری برنارڈ مسکرا کے بولا اور پھر یہ لوگ روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

چھت کے ایک کونے پر بنے ایک چھوٹے سے سلاخ دار روشن دان سے روشنی اندر آرہی تھی۔ اسی روشنی میں شاہ زمان نے دروازے پر اریبہ کو کھڑے دیکھا تھا۔ وہ دروازے کی چوکھٹ پر چپ چاپ کھڑی تھی۔ شاہ زمان کو اس کے یوں خاموش خاموش سا دروازے کی چوکھٹ پر کھڑے ہونا بہت عجیب سا لگا تھا۔ اسی سبب اس کے دھڑکتے دل کی رفتار ایکا یکی تیز ہو گئی تھی۔

''تت......تم......خیریت تو ہے نا......؟'' اس نے اٹکتے لہجے میں، بدستور اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہولے سے کہا۔ اس کے برابر میں فرشی بستر پر علی ریحان ہنوز بے سدھ سو رہا تھا۔

''میرے ساتھ آؤ......'' اریبہ نے سپاٹ لہجے میں اس سے کہا۔ زمان اٹھ کر اسی طرح یک ٹک اس کی طرف دیکھتا ہوا آگے بڑھا۔ اس کے قریب پہنچا تو وہ پلٹی اور زینے اترنے لگی۔ زمان بھی حیران پریشان سا اس کے پیچھے چل پڑا۔

نیچے کمرے میں پہنچا تو اسے ایک حیرت آمیز تشویش کا زبردست جھٹکا لگا۔ سامنے قالین پر دو کپ رکھے ہوئے تھے۔ ایک تو سیدھا پڑا تھا، جبکہ دوسرا الٹا دھرا تھا۔ اس کے پاس ہی اس نے شائل کو بے ڈھنگے انداز میں بے سدھ پڑے پایا۔ اس طرح کہ اس کی سیاہ رو باچھوں سے خون کی ایک سرخ لکیر، قطروں کی صورت بہہ کر قالین میں جذب ہو رہی تھی۔ یہ عجیب اور دہشت ناک منظر دیکھ کر شاہ زمان جیسا آدمی بھی سر تا پا خوف سے جھرجھرا گیا۔

''یی یی......یہ کیا ہوا......کس نے ہلاک کیا اسے؟''

''میں نے......'' اریبہ نے قریب کھڑے زمان سے سرد لہجے میں کہا۔ ''میں نے اسے چائے میں زہر دیا تھا۔''

''مگر کیوں......؟''

''میں اس کی فتورِ نیت سے آگاہ ہو چکی تھی۔'' وہ بولی۔ ''یہ ذلیل شخص بہ ظاہر تو لوگوں کی نظروں میں میرا محسن کہلاتا تھا لیکن درحقیقت یہ بدطینت شخص میری مجبوریوں اور مجھ سے......کھیلتا رہا۔ شادی کے جھانسے میں مجھے گناہ کی پوٹ بناتا رہا اور اپنی نوکرانی۔''

''تم مجھے اس کی فتورِ نیت سے آگاہ کرنا چاہ رہی تھیں۔'' شاہ زمان نے اس کی دکھ بھری داستان میں دلچسپی لیے بغیر کہا تو وہ ایک گہرا سانس کھینچ کر بولی۔

''یہ آدمی تمہیں انعام کے لالچ میں پکڑوانا چاہتا تھا کیونکہ تم دونوں اس کے لیے دردِ سر بن چکے تھے۔ میں اس کی نیت بھانپ چکی تھی۔ اسے مزید کھولنے کے لیے میں نے اسے اپنی نیت ظاہر کرنے کا موقع دیا اور یوں وہ مجھے بھی اپنا ہم خیال سمجھ بیٹھا اور اپنا راز دل مجھ پر عیاں کر دیا۔''

''پھر تم نے اسے چائے میں زہر دے کر مار ڈالا؟'' شاہ زمان نے اس کے دلکش مگر مغموم سے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں تشکیک کے سائے ہلکورے لے رہے تھے۔

''ہاں!''

''تمہیں ہم سے بھلا کس جذبے کے تحت ہمدردی ہو گئی تھی؟'' زمان کی بات پر اریبہ کے لبوں کی گدازیت پر بھیدوں بھرا ارتعاش سا تھرا گیا۔ کونوں سے کھنچی ہوئی کشادہ اور گھنیری پلکوں کے مہین سائے تلے اس کی چشمِ آہو میں قوسِ قزح جیسے رنگ لیے خفتہ و نا خفتہ جذبات کی شمع طلب فروزاں ہوئی۔ وہ انہی نگاہوں سے چند ثانیوں تک اس کی طرف دیکھتی رہی پھر ہولے سے بولی۔

''مجھے واقعی تم دونوں کے مقاصد یا مشن سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن جہاں معاملہ داری اور وعدے وعید طے پا جائیں تو اس کے خلاف کسی بھی بات پر میرا ضمیر مجھے جھنجوڑ ...ڈالتا ہے۔ دھوکا، مکر اور فریب سے مجھے سخت نفرت ہے۔ جب شائل نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اپنے کسی ذاتی جذبے کے بغیر محض دولت کے لالچ میں تم لوگوں کے لیے مخبری کرتا ہے اور اب اسی طمع کی خاطر وہ تمہیں دھوکے سے مروانا چاہتا ہے تو میرے ضمیر نے مجھے اسے ایسا کرنے سے روکنے پر مجبور کر ڈالا۔''

''تم اسے سمجھا بھی تو سکتی تھیں؟'' زمان شاید ابھی تک اس پر بھروسا کرنے سے اجتناب برتتے ہوئے تھا۔

''میں ایسا کرتی تو وہ مجھے بھی پیسوں کے لالچ میں تمہارا ساتھی بتا کر پھنسوا سکتا تھا۔''

تب ہی اچانک شاہ زمان کسی شکاری باز کی طرح قریب کھڑی نازک اندام اریبہ پر جھپٹ پڑا اور اس کے گھنے بالوں کو اپنی مٹھی میں جکڑ لیا۔ اریبہ کے لبوں سے ہلکی سی سسکاری خارج ہوئی لیکن اس میں کسی درد اور تکلیف کا ذرا بھی شائبہ معلوم نہیں ہوتا تھا نہ ہی شاہ زمان کے اس

طرح اچانک جھپٹ پڑنے پر اریبہ کے حسین چہرے پر کسی قسم کے خوف کی پرچھائیں تک کے آثار ابھرتے نظر آئے تھے۔ وہ سرتاپا خود سپردگی کی تفسیر بنی ہوئی تھی۔

''تم کیا سمجھتی ہو کہ میں تمہاری باتوں میں آجاؤں گا...... سچ سچ بتاؤ...... کون ہو تم اور ہمارے ساتھ کیا چکر چلا رہی ہو......؟'' شاہ زمان نے شیر جیسی غراہٹ سے کہا۔ ''تمہارے پیچھے اور کون کون لوگ ہیں؟''

دوسرا لمحہ شاہ زمان کے لیے حیرت کا سبب بنا جب اس کے جواب میں اریبہ نے ایک کھنکتی ہنسی اپنے حلق سے خارج کی تھی۔ اس ہنسی میں لاچارگی اور مایوسی کا عنصر غالب تھا۔ اس نے زمان کی آہنی گرفت سے خود کو چھڑانے کے لیے ذرا بھی حرکت نہ کی تھی، انداز خود سپردگی جوں کا توں برقرار رہا تھا۔ بلکہ اریبہ زمان کے تقریباً ساتھ ہی لگ چکی تھی۔ شاہ زمان کو اس کے بھرے بھرے بدن کی گدازیت صاف محسوس ہو رہی تھی۔

''میرے سوال کا جواب دو...... تم نے شائل کا قتل کس مقصد کے لیے کیا؟ وہ ہمارا قابلِ بھروسا مخبر تھا۔''

''قابلِ بھروسا...... ہونہہ......'' جواب میں اریبہ نے زہریلے طنز سے کہا۔ ''جس کو تم قابلِ بھروسا کہہ رہے ہو وہ تم دونوں کی موت کا سامان کرنے والا تھا۔ حیرت ہے...... تم جیسے لوگ بھی یہ نہیں جان سکے کہ دولت کے لالچ میں مخبری کرنے والا تمہارے ساتھ کس قدر سچا ہو سکتا ہے؟'' اس کی بات نے شاہ زمان کو واقعی لاجواب سا کر دیا۔ تاہم بولا۔

''اسی دولت کے لالچ میں تم بھی تو ہمیں مہاراجا کے سپاہیوں کے حوالے کر سکتی ہو۔''

''اگر ایسا ہوتا تو اب تک تم دونوں کی لاشیں بیچ چوراہے پر جھولتی ہوئی نظر آ رہی ہوتیں...... کیونکہ جس وقت تم دونوں بے خبر اور بے سدھ سو رہے تھے، مہاراجا کے سپاہی اور فرنگی فوجی گھر گھر کی تلاشی لیتے ہوئے یہاں تک بھی آن پہنچے تھے...... لیکن میں نے بڑی صفائی سے تمہیں بچا لیا تھا۔''

''کیا ثبوت ہے اس بات کا......؟''

''وہ سامنے دیکھو، کھڑکی کے پار...... چمکتی دھوپ دیکھو...... سورج نکلا ہوا ہے، کوئی دم کو سہ پہر ہونے والی ہے...... اور تم دونوں صبح سوئے تھے۔ جبکہ یہ تمہیں بھی معلوم ہے کہ سویرا ہونے سے پہلے ہی تم لوگوں کی ڈھنڈیا چہار دانگ پڑ چکی تھی۔'' اریبہ کی اس دوسری دلیل نے بھی شاہ زمان کو لاجواب کر دیا، لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے ذہن میں بڑی سرعت کے ساتھ ایک خیال چمکا۔

''اتنی دیر گزر جانے کے باوجود تم نے شائل کی لاش کو ادھر ہی پڑے رہنے دیا اب تک...... جبکہ تم کہتی ہو کہ سپاہی بھی یہاں تلاشی لینے آئے تھے...... کیا لاش دیکھ کر وہ چونکے نہیں؟ جبکہ اوپر ہم بھی بے خبر سو رہے تھے۔ ایسا کیسے ممکن ہو گیا کہ یہ لاش اور ہم ان کی نظروں سے بچے رہے؟''

''اسی لاش نے تو تمہیں بچایا ہے۔'' اریبہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب؟''

''جیسے ہی ڈونڈی پٹی گئی اور تمام لوگوں کو اپنے اپنے گھروں میں محبوس رہنے کا حکم دیا گیا تو میں اپنے بال کھولے بین کرتی ہوئی باہر گلی میں آ گئی اور ان سے کہا کہ میرے گھر میں فوتگی ہو گئی ہے تو مجھے ڈرا دھمکا کر واپس بھیج دیا گیا۔ میرا مقصد پورا ہو چکا تھا مگر میں پھر بھی گھر کی چوکھٹ پر بیٹھی بین کرتی رہی اور جب اس گھر کی تلاشی کی باری آئی تو محض ایک شخص کو اندر بھیجا گیا جو شائل کی لاش کو دیکھ کر ہی واپس پلٹ گیا تھا۔ میں دہائیاں دینے لگی تو.... باہر موجود سپاہی بیزار ہو کے مجھ سے جان چھڑا کے چلتے بنے۔''

''اسے چھوڑ دو شاہ زمان......! یہ سچ بول رہی ہے......'' دفعتاً باہر زینے کی طرف جاتے والے دروازے کی تاریک سی چوکھٹ سے علی ریحان کی آواز ابھری۔ دن کی روشنی وہاں مقدور بھر ہی پہنچ رہی تھی۔ وہاں سے علی ریحان نمودار ہوا۔ اس کی بھی آنکھ زمان کے جاگنے کے تھوڑی دیر بعد ہی کھل گئی تھی اور وہ کب سے تاریک سی چوکھٹ پر کھڑا ان کی باتیں غور سے سن رہا تھا۔ وہ ان دونوں کے قریب آ گیا تھا۔

''میں نے خود اوپر سے نیچے جھانک کر دیکھا ہے، باہر گلی میں...... مہاراجا کے سپاہی گردش کر رہے ہیں......''

زمان نے ایک گہری ہنکاری خارج کرتے ہوئے اریبہ کو چھوڑ دیا۔ اس کی مٹھی سے اریبہ کے گھنے ریشمی بال نکلے اور اریبہ کی سبک کندنی پشت پر بکھر گئے۔ اس نے سر گھما کر مضبوط اور کسرتی جسم کے حامل زمان کو مسکراتی نگاہوں سے دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر ناراضگی یا برہمی کے ذرا بھی آثار نہ تھے۔

''اریبہ بہن! اگر تمہاری بات سچ ہے تو یقین کرو ہم تمہارا یہ احسان ساری زندگی فراموش نہیں کریں گے۔'' علی ریحان نے اسے مخاطب کرتے ہوئے ملائمت بھرے لہجے میں کہا۔ ''لیکن اب ان مخدوش حالات میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تم ہماری کیا مدد کر سکتی ہو؟''

علی ریحان کے منہ سے ''بہن'' کا لفظ سن کر اریبہ ایک

دم آبدیدہ سی ہوگئی۔

''کیا ہوا بہن! کیا میری کوئی بات بری لگی تمہیں؟''

''نہیں بھائی!'' اریبہ اپنی اوڑھنی کے ایک کونے سے اپنی ستارہ آنکھوں کے نمناک گوشے پونچھتے ہوئے بولی۔ ''آپ کے بہن کہنے پر مجھے اپنا بھائی دینو یاد آگیا تھا۔ وہ بے چارہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔'' اور تب ہی اریبہ نے اپنی دکھ بھری کتھا بھی سنا ڈالی۔ اس کے بعد بولی۔

''آپ دونوں آرام سے بیٹھ جائیں...... اور مجھے تھوڑا وقت دیں......'' اریبہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''خطرہ اب بھی پوری طرح سے ٹلا نہیں ہے...... باہر گلی گلی اور چوراہوں پر مہاراجا اور انگریز سرکار کے سپاہی گشت کر رہے ہیں اور مجھے معلوم ہے کہ وہ دوبارہ بھی کسی مشتبہ نظر آنے والے مکان میں جا گھسیں گے۔ میں سودا سلف کے بہانے ذرا باہر نکل کر حال معلوم کر کے آتی ہوں...... ''

علی ریحان نے مسکراتے ہوئے اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔ قالین پر دھری پڑی شمائل کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اریبہ بولی۔

''اس لاش کا ابھی ادھر ہی پڑے رہنا مناسب ہوگا۔ کرفیو کی کیفیت ختم ہونے والی ہے۔ لوگ میرے گھر کا رخ کریں گے اور از راہِ ہمدردی میری مدد کرنا چاہیں گے۔ میں چاہتی ہوں یہ ڈراما اسی طرح اپنے انجام کو پہنچ جائے۔''

''تم باہر جا کر کیا دیکھنا چاہتی ہو......؟'' زمان نے سوال کیا۔ اریبہ نے دلفریب سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر ڈالی اور بولی۔

''وہی کچھ جو ابھی بتا چکی ہوں......''

وہ چلی گئی اور باہر سے مکان کو تالا لگا گئی۔

''اس کے آنے سے پہلے پہلے ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے...... ورنہ ہم چوہے دان میں پھنس جائیں گے۔'' اریبہ کے جاتے ہی زمان نے علی سے کہا تو وہ مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''تمہیں شاید ابھی اس بے چاری پر اعتبار نہیں آیا......''

''دولت کی چمک اچھے بھلوں کو اندھا کر دیتی ہے۔'' زمان گہری متانت سے بولا۔

''جو عورت ایک جیتے جاگتے شخص کو اس طرح ہلاک کر سکتی ہے اور پھر بڑی چالاکی سے باقی معاملات پر قابو پانے کی صلاحیت بھی رکھتی ہو، وہ کوئی عام عورت نہیں ہو سکتی علی!'' اس نے کچھ دیر توقف پھر کہا۔

''اور اگر اس نے ہمیں دولت کے لالچ میں گرفتار کرانا ہوتا تو اب تک ہم مہاراجا کے شاہی قید خانے میں ہوتے۔'' علی نے کہا۔

''یہی ٹھوس دلیل مجھے الجھائے ہوئے ہے۔'' کہتے ہوئے زمان نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے تھے، علی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا۔

''جو ہوگا دیکھا جائے گا...... آؤ اوپر چلتے ہیں۔ اپنے ہتھیار سنبھالیں، ہمیں چوکس رہنے کی ضرورت ہے بس۔''

دونوں دوست زینے کی طرف بڑھتے چلے گئے۔

☆☆☆

وہ سب پیدل ناگرہ کی جانب گامزن تھے۔ گاڑیوں اور خچروں سے محرومی کے بعد اب انہیں سفر کی تکان کا اندازہ ہونے لگا تھا۔ بالخصوص ''صاحب'' لوگوں کو...... نوکر تو بے چارے یوں بھی پیدل ہی تھے جو خچروں کی رسی تھامے ہوئے تھے مگر اب ان سے محرومی کے بعد تو ''صاحب لوگ'' بھی پیدل سفر کرنے پر مجبور ہوگئے تھے۔ نوکروں کا خیال تھا کہ اب بس پروفیسر ہنری بھی اس دشوار گزار سفر کے سامنے ہتھیار ڈال کر واپسی کا بگل بجا دیں گے، مگر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے تھے کہ ان سب سے زیادہ چاق و چوبند وہی تھے۔ انہوں نے خاکی رنگ کی پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ سر پر ہیٹ تھا۔ اپنی شرٹ پر انہوں نے بھی گیلس لگا رکھے تھے۔ پائپ مٹھی میں دبا ہوا تھا اور وہ کسی دخانی انجن کی طرح جیسے جھٹکے مارے ڈبوں کو کھینچ رہے تھے۔

ان کے ساتھ گرمجوشی میں فقط دو ہی افراد حصہ دار بنے ہوئے تھے۔ ایک شوکت اور دوسری گارشیا۔ اگرچہ رینا اور رابرٹ بھی کم جوش کا مظاہرہ نہیں کر رہے تھے، مگر اب ان اونچے نیچے پتھریلے راستوں پر تو ان دونوں کی بھی ہمت جواب دینے لگی تھی۔ یوں بھی پیدل سفر کرتے ہوئے ایک گھنٹا بیت چکا تھا۔

''انکل ہنری! میرا خیال ہے آپ کا ریل کار کو چھوڑ کر پیدل سفر کرنے کا فیصلہ درست نہ تھا۔'' بالآخر ایک جگہ بے دم ہو کر بیٹھ جانے والے رابرٹ نے کہا۔ اس کی دیکھا دیکھی سب ٹھہر گئے تھے۔ بلکہ جسے جہاں جگہ ملی وہ وہیں بیٹھ گیا تھا۔ ناچار پروفیسر ہنری کو بھی رکنا پڑا۔

''ہمیں راکاشی کی طرف پیدل نکلنے کے بجائے ریل میں ناگرہ پہنچنا چاہیے تھا۔ پھر وہاں سے خچروں اور گھوڑوں کا بندوبست کرنے کے بعد راکاشی عازم

سفر ہونا چاہیے تھا۔‘‘

بہ ظاہر رابرٹ کی بات سب کو معقول لگی تھی۔ اس میں شوکی بھی شامل تھا مگر وہ کچھ بولا نہیں تھا البتہ اس کی تائید میں گارشیا اور رینا پیش پیش تھیں۔

’’ہاں! یہ خیال میرے دل میں بھی آیا تھا۔‘‘ پروفیسر ہنری نے رک کر ان کی طرف گھومتے ہوئے کہا۔ ’’لیکن...... میں بتا چکا ہوں کہ نقشوں کا جائزہ لینے کے دوران مجھے ایک قریبی قبیلے راکاشی کا انکشاف ہوا۔ یہ بے حد عجیب و غریب قبیلہ ہے۔ اس کے رہن سہن کو قریب سے دیکھنے کا موقع بہت کم مہم جوؤں کو ملا ہے۔ میرے ایک غائر جائزے کے مطابق ہم اس قبیلے کا ’’وزٹ‘‘ کرنے والے دوسرے یا تیسرے مہم جو ہوں گے۔‘‘

’’ان کے رہن سہن میں ایسا کیا ہے پاپا تھوڑی تفصیل بتائیں گے ان کے بارے میں......؟‘‘ رینا نے پروفیسر ہنری کی طرف دیکھا۔ اس کی بلوریں سی نیلی آنکھوں میں تجسس ہویدا تھا۔

’’سچ پوچھو تو مجھے اسی قبیلے کی تلاش تھی۔‘‘ پروفیسر ہنری گویا اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے مزید بولے۔ شوکی نے دیکھا وہ خاصے پُرجوش نظر آرہے تھے۔

’’میں اس قبیلے کے نام سے تو واقف نہ تھا تاہم میری ریسرچ کے مطابق انہی پراسرار اوصاف کا حامل ایک قبیلہ یہاں کوہِ شمالیہ کے اطراف میں مذکورہ تینوں ریاستوں کے چوحدہ کے شمال مشرق میں موجود ہے۔ اب خدا کرے کہ یہی وہ قبیلہ ہو جس کا نام مجھے راکاشی معلوم ہوا ہے۔‘‘

’’پراسرار قبیلے سے آپ کی کیا مراد ہے انکل ہنری؟‘‘ گارشیا نے سوال کیا۔ وہ اپنی پشت سے موٹی سی ایڈونچر کٹ اتار کر اسی پر ٹنک کر بیٹھ گئی تھی۔

پروفیسر ہنری نے پائپ کا کش لگایا اور بولے۔ ’’پراسراریت مشرق کا حسن ہے۔ اسے کسی اور معنی میں نہ لیا جائے۔‘‘

’’کیا اس قبیلے تک کا راستہ ہمیں معلوم ہے اور یہ کتنی دور ہے؟‘‘ گارشیا نے سوال کیا۔

’’چند سو کوس کی مسافت مزید طے کرنے کے بعد ہم وہاں پہنچ جائیں گے۔‘‘ پروفیسر ہنری بولے۔ ’’ناگرہ جانے سے ہمارا بہت سا وقت برباد ہو جاتا۔ اگرچہ ہمارا بیس کیمپ ناگرہ ہی ہے۔ راکاشی کے بعد ہی ہم ناگرہ کا رخ کریں گے۔‘‘

شوکی کو اس گفتگو سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ بار بار کن انکھیوں سے رینا کو تکے جاتا جو رابرٹ کے قریب ایک پہاڑی پتھر پر بیٹھی تھی۔

تھوڑی دیر سستانے کے بعد یہ لوگ پھر روانہ ہو گئے۔ سہ پہر تک یہ لوگ ایک چٹانی درّے سے گزر کر پیالہ نما وادی میں پہنچ گئے۔ اس وقت سہ پہر ہو چلی تھی۔ سورج کوہِ شمالیہ کی مغربی چوٹیوں کی طرف جھکنے لگا تھا۔ وہاں انہیں ترائیوں میں ایک آبادی کے آثار نظر آئے، بے ترتیب قطاروں میں بنے کھپریل کی مخروطی چھتوں والے جھونپڑے کچھ دیگر اشیا کے بکھراؤ کے ساتھ دکھائی دے رہے تھے۔ یہ سب لوگ رک کر نیچے دیکھنے لگے۔ پروفیسر ہنری کے چہرے پر پہلے تو چند ثانیے جوش کے تاثرات اُمڈتے دکھائی دیے تھے اس کے بعد وہ کسی الجھن میں مبتلا نظر آنے لگے۔ رینا نے پوچھا۔

’’پاپا! ہم شاید اپنی منزل تک پہنچ چکے ہیں۔‘‘

’’یس مائی بے بی! آجاؤ سب لوگ...... لیکن ذرا دھیان سے اترنا۔‘‘ پروفیسر ہنری نے کہا اور یہ سب لوگ پروفیسر ہنری کی ہدایت کے مطابق ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ایک چین کی صورت ڈھلان طے کرنے لگے اور بالآخر آبادی میں داخل ہو گئے۔

وہ لوگ ایک جگہ رک گئے۔ سب نے اپنا اپنا مختصر سامان پشت سے اتار کر زمین پر رکھ دیا اور حیرت و عجیب نظروں سے سامنے کھپریل کی مخروطی چھتوں والے جھونپڑوں کی طرف دیکھنے لگے۔ پروفیسر ہنری کی آنکھوں میں الجھن نمایاں تھی۔

’’انکل! یہاں تو کوئی نظر نہیں آرہا......؟‘‘ گارشیا نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

’’ہوسکتا ہے یہ لوگ سو رہے ہوں۔‘‘ رابرٹ نے کہا۔ ’’قبائلی لوگ سرِشام ہی سو جایا کرتے ہیں۔‘‘

’’گڈ، بڈی! تم نے بالکل ٹھیک کہا۔‘‘ پروفیسر ہنری مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ’’لیکن ہمیں آگے بڑھ کر دیکھنا پڑے گا۔ قدم بڑھاؤ میرے ساتھ...... اور سامان ادھر ہی رہنے دو۔‘‘

یہ لوگ اور آگے بڑھے۔ ہر کوئی ایک جھونپڑے کی طرف بڑھا مگر حقیقت یہی تھی جو تقریباً سب نے ہی محسوس کی تھی کہ یہاں آبادی کے آثار تو نظر آتے تھے لیکن انسانوں کا دور دور تک پتا نہ تھا۔

’’یہ تو کوئی ویران بستی ہے۔ کوئی ذی نفس تک موجود نہیں۔ نہ انسان نہ کوئی جانور......‘‘ رابرٹ حیرت سے بولا تھا۔

انہیں سارے جھونپڑے خالی ملے تھے۔ اندر سامان بکھرا پڑا تھا۔ ایک عجیب اور پراسراری ویرانی بکھری ہوئی تھی چہارسو......!

''کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ لوگ راتوں میں کام سے نکلتے ہوں......'' گارشیا نے خیال ظاہر کیا تو رابرٹ بولا۔

''ڈیم اٹ......! کیا فضول بکواس ہے سسٹر! کیا تم نے غور نہیں کیا؟ ان جھونپڑوں اور اس بستی کی حالت زار بتا رہی ہے کہ یہاں اب کوئی نہیں رہتا۔''

گارشیا نے بھائی کی بات پر منہ سا بنا لیا اور اسی لہجے میں بولی۔ ''تمہارا کیا خیال ہے ان کے جھونپڑوں میں ائرکنڈیشنر ہوگا، پنکھے ہوں گے؟ باہر گاڑیاں پارک ہوں گی اور اندر ریشم و کمخواب کے بستر لگے ہوں گے؟''

گارشیا کی بات پر سب ہنس دیے تھے۔

''یہ قبائلی لوگ اسی طرح رہتے ہیں۔ جیسے یہاں پل بھر کے مہمان ہوں۔''

''تم نے ٹھیک کہا میفیو ڈارلنگ! لیکن یہاں آثار کچھ ایسا بتا رہے ہیں کہ یہ لوگ بستی چھوڑ کر جاچکے ہیں۔'' پروفیسر ہنری بولے۔

''کیا ہم راکاشی قبیلے میں موجود ہیں پاپا؟'' ریٹا نے باپ کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''ہاں! میرا خیال ہے ہم اپنی پہلی منزل پر کھڑے ہیں...... یہاں ہمیں ایک آدھ دن خیمہ زن ہونا پڑے گا۔'' ہنری بولا۔ ''ناگرہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ وہ سامنے والی پہاڑی کے پیچھے ناگرہ کی سرحد شروع ہوجاتی ہے۔ دوسری منزل ہماری وہیں ہوگی جدھر ہم کچھ دن آرام سے قیام کریں گے اور سفر کی تکان اتاریں گے۔ اس کے بعد اگلی منزل کی طرف روانگی ممکن ہوگی جبکہ یہاں میں اپنا تحقیقی کام آج ہی سے شروع کردیتا ہوں۔ کچھ کھا پی لیا جائے، اس کے بعد بستی کا تفصیلی جائزہ لیا جائے گا۔''

خیمے گاڑے جانے لگے۔ شوکی سمیت سارے ملازم بڑی تندہی کے ساتھ اپنے کاموں میں مصروف ہوگئے۔ اس ویران بستی کے وسط میں انہوں نے رہائش اختیار کرلی تھی۔

زادِ راہ جو بھی تھا، وہ آج رات کا ہی بچا تھا یا تھوڑا بہت تک صبح کام آجاتا۔ الاؤ روشن کردیا گیا تھا کیونکہ اسی دوران سورج چٹانی افق پر سرخیاں پھیلاتا ہوا دوسری جانب لڑھک چکا تھا۔ اب دور سنگلاخ افق پر سناٹے دار تاریکیاں اترنے لگی تھیں۔ فضا رکی رکی سی محسوس ہوتی تھی۔ ٹھنڈ بڑھنے لگی تھی۔ اوپر کھلے آسمان پر تارے چمکنے لگے تھے اور چاند دور

چالاک نوکر

مالک نے سزا کے طور پر نوکر کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ ساری رات گھوڑے کی مالش کرے۔ نوکر نے گھوڑا فروخت کردیا اور اس کی جگہ ایک خرگوش باندھ دیا۔

صبح مالک آیا تو گھوڑا غائب تھا۔ مالک نے غصے سے پوچھا۔ ''گھوڑا کہاں ہے؟''

نوکر نے خرگوش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ بندھا ہوا ہے۔ دراصل میں ساری رات گھوڑے کی مالش کرتا رہا۔ اب یہ گھس گھس کر اتنا ہی رہ گیا ہے۔''

مالک اس سے بھی کایاں تھا بولا۔ ''چلو۔ چھوڑو جو ہوا سو ہوا۔ آج پوری رات تم میری کار کی مالش کروگے۔''

کاش

ایڈیٹر، افسانہ نگار سے۔ ''آپ بہت خوبصورت کہانیاں لکھتے ہیں۔''

افسانہ نگار۔ ''کاش اسی قسم کا کوئی تعریفی جملہ میں بھی آپ کے بارے میں کہہ سکتا۔''

ایڈیٹر۔ ''ضرور کہہ سکتے ہیں بشرطیکہ آپ بھی میری طرح جھوٹ بولنے کے عادی ہوں۔''

عملی مظاہرہ

ٹائپسٹ کی ملازمت کے لیے امیدوار کا انتخاب ہو رہا تھا۔ ایک امیدوار سے انٹرویو کرنے والے نے پوچھا۔

''آپ ٹائپنگ کے علاوہ اور کیا کام جانتے ہیں؟''

امیدوار۔ ''مذاق کرنا۔''

انٹرویو کرنے والے نے پوچھا۔ ''کیا آپ اس کا عملی مظاہرہ کرنا پسند کریں گے؟''

امیدوار۔ ''کیوں نہیں؟'' امیدوار نے یہ کہا اور دفتر سے باہر آکر لائن لگا کر بیٹھنے والے دیگر امیدواروں سے کہا۔

''آپ سب حضرات جاسکتے ہیں کیونکہ میرا انتخاب کرلیا گیا ہے۔''

مرسلہ: ریاض بٹ۔ حسن ابدال

کہیں جھکا ہوا تھا مگر اس کی ضوفشانیوں کے آثار دھیرے دھیرے نمودار ہونے لگے تھے۔ موسم کی مناسبت سے انہوں نے گرم کپڑے پہن رکھے تھے۔ ان میں موٹی شالیں اور جیکٹوں کے علاوہ اونی ٹوپیاں بھی تھیں۔ ریتا، گارشیا اور رابرٹ نے گرم جرسیاں پہن لی تھیں۔ سلیپنگ بیگ تیار کرلیے گئے تھے۔ نندو بابا اور شانتا اپنے باورچیوں کے فرائض میں مشغول ہوچکے تھے اور ذرا دیر بعد ہلکے پھلکے طعام کا دور چلنے والا تھا۔ خوراک کے خشک ڈبے، دودھ اور شکار کیے ہوئے چھوٹے موٹے پہاڑی جانوروں کا گوشت باقی بچا ہوا تھا۔ اسے ہی آگ پر بھونا جارہا تھا۔ مٹر آلو اور چاول بنائے گئے تھے۔

کھانے سے یہ لوگ فارغ ہوئے تو پروفیسر ہنری کے پاس جا پہنچے۔ شوکی اور امجد بھی ساتھ تھے۔ جبکہ نندو بابا اور شانتا الاؤ پر اب کافی بنانے کی تیاری کررہے تھے۔ یہ لوگ سب الاؤ کے گرد آبیٹھے۔ چہار سو ہو کا عالم تھا۔ ویران بستی خالی پن کا عجیب اور پراسرار منظر پیش کررہی تھی۔ ہردوار کا گھنا جنگل پہاڑی کے پیچھے جا چھپا تھا اور وہاں سے اب کسی جانور وغیرہ کے بولنے کی آوازیں آنا تقریباً مفقود ہوچکی تھیں۔

ذرا دیر میں نندو اور شانتا نے الاؤ کے گرد بیٹھے افراد کے ہاتھوں میں کافی کے مگ تھمادیے۔ گرما گرم دھواں اڑاتی کافی کے مگ تھامتے ہی انہیں ایک عجیب سی خوشگواریت کا احساس ہوا۔ سب آپس میں باتیں کرتے ہوئے، مزے لے لے کر اس کی چسکیاں بھرنے لگے۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں، اس کے بعد ہر کسی نے اپنے خیموں کا رخ کیا۔ شوکی کی نظریں ریتا اور رابرٹ پر لگی ہوئی تھیں۔

طباق چاند ابھر کر آکاش پر کسی مادھوناری کے تلک کی طرح پوری تب و تاب کے ساتھ دمکنے لگا تھا۔ بستی پر ویرانی مسلط تھی۔ بغیر مکینوں کے اس بستی کا خالی پن دلوں میں انجانے سے خوف کا تاثر بھی پیش کرتا تھا۔ تاہم یہ لوگ یہاں ایک عجیب طرح کا سکون بھی محسوس کررہے تھے۔ پروفیسر ہنری نے صبح ہوتے ہی ناگرہ کوچ کرنے کا پروگرام محفوظ کررکھا تھا۔ وہ اپنے خیمے میں آکر چھوٹی سی فولڈنگ ٹیبل اور کرسی پر بیٹھے کچھ لکھنے پڑھنے میں محو ہوگئے تھے۔ تاہم انہوں نے ہر کسی کو سختی سے منع کررکھا تھا کہ کوئی بھی کیمپ سے دور جانے کی کوشش نہ کرے۔ نندو اور شانتا خیموں میں جاتے ہی سوگئے تھے۔ دونوں فوجی بھی تھکے ہوئے تھے اور لیٹتے ہی نیند کی وادیوں میں چلے گئے تھے۔ ریتا، گارشیا اور رابرٹ اپنے خیمے میں گھسے بیٹھے باتوں میں معروف تھے جبکہ ڈرائیور امجد اور شوکی ہنوز جاگ رہے تھے اور الاؤ کے گرد بیٹھے تھے۔

"یہ خبطی پروفیسر ہم سب کو کسی مصیبت میں ڈال کر ہی دم لے گا۔" حسب سابق امجد نے اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے کہا۔

"اچھا! وہ کیسے؟" شوکی نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"تو اور کیا..... اب دیکھو بھلا..... اس ڈراؤنی اور ویران بستی میں خیمہ زن ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ چند سو کوس کے فاصلے پر ہی تو ناگرہ تھا، وہیں چل کر قیام کرلیا جاتا۔ اب ساری رات ڈر ڈر کے گزرے گی، نیند کیا خاک آئے گی۔"

ایک ذرا توقف کے بعد وہ ہراس پھیلانے والی عورتوں کی طرح دوبارہ بولا۔

"مجھے تو لگتا ہے اس بستی میں کوئی خوفناک عفریت آتا ہے، جس نے بستی کے سارے لوگوں کو ہڑپ کرڈالا ہے۔ اب رات کے کسی سمے وہ ہمیں بھی نہیں چھوڑے گا۔"

شوکی اس کی بات پر ہنسا اور بولا۔

"ہمارے پاس ہتھیار ہیں۔ کوئی عفریت آیا تو ہم اسے گولی ماردیں گے۔"

"سچ کہوں تو یہاں کسی آسیب کا بسیرا ہے۔ کسی بدروح کا آسیب....." وہ پھر ہولادینے والے لہجے میں بولا۔

"تم جاکر سوجاؤ..... ورنہ ڈراؤنے خواب آئیں گے تمہیں۔" شوکی نے اسے مشورہ دیا۔

"نیند تو آرہی ہے مجھے..... پر یہ بتاؤ کہ تم جاگ رہے ہونا.....؟ کسی ایک کو تو جاگتے رہنا چاہیے۔" وہ بولا۔

"ہاں! میں جاگ رہا ہوں..... تم جاکر سوجاؤ....." شوکی بولا۔ اس کی نظریں سامنے والے خیمے کی جانب اٹھ گئیں۔ وہاں سے ریتا، گارشیا اور رابرٹ کے ہنسنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ امجد تو اٹھ کر اپنے خیمے کی طرف بڑھ گیا جبکہ شوکی وہیں بیٹھا رہا۔ اس کا دل جانے کیوں نامعلوم سی بے چینی محسوس کررہا تھا۔ پروفیسر ہنری کے خیمے کی بتی بھی بجھ چکی تھی۔

سردی بڑھنے لگی تو شوکی بھی اپنے خیمے کی طرف سونے کی غرض سے اٹھا مگر دوسرے ہی لمحے اچانک ٹھٹک کر رکا۔ اس نے دیکھا خیمے سے رابرٹ اور ریتا ہنستے ہوئے نمودار ہوئے تھے۔ وہ دونوں خالی اور ویران جھونپڑوں سے آگے تاریکی میں کہیں جارہے تھے۔ شوکی نے انہیں آواز دی۔ وہ دونوں رک گئے۔

شوکی تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ان کی طرف بڑھا۔ رابرٹ اس کی طرف غصیلی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"آپ دونوں کہاں جارہے ہیں؟" اس نے ان

دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''تم سے مطلب؟'' رابرٹ نے اسے گھورتے ہوئے کہا تو شوکی نے اسے نظرانداز کرتے ہوئے رینا سے مخاطب ہو کے کہا۔
''مس رینا! آپ کے پاپا نے یہاں سے دور کہیں جانے کے لیے سختی سے منع کر رکھا ہے۔'' اس کے لہجے میں بردبارانہ سی سنجیدگی تھی۔ وہ ان کے سامنے اپنے دونوں پاؤں پھیلائے پورے قد سے کھڑا تھا۔
''تم کون ہوتے ہو ہمیں کہیں آنے جانے سے روکنے والے......'' رابرٹ پھنکارا تو رینا نے رابرٹ کو ٹوک دیا۔
''رابرٹ! پلیز تم خاموش رہو......'' پھر وہ شوکی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔
''ہم زیادہ دور نہیں جائیں گے......وہ دیکھ رہے ہو......'' اس نے اپنے سیدھے ہاتھ کی سمت انگلی سے اشارہ کیا۔ ''وہ جگہ بڑی دلفریب چاندنی میں نہائی ہوئی ہے۔ بس تھوڑی دیر وہاں بیٹھنے کے بعد لوٹ آئیں گے......پلیز مسٹر شوکی!''
رینا کے کہنے کے انداز نے شوکی کو ڈھا سا دیا۔ ابھی وہ کوئی جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ گارشیا اندر سے نمودار ہوئی تو رینا حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔
''ارے! تم جاگ رہی ہو؟ ہم تو سمجھے تھے کہ تم سو گئی ہو۔''
''مجھے معلوم تھا کہ تم دونوں میرے سونے کا انتظار کر رہے ہو......اس لیے سوتی بن گئی تھی۔'' وہ شرارت بھرے لہجے میں بولی تو رینا نے بھی اس سے جھینپی جھینپی ہنسی کے ساتھ کہا۔
''تم ایسا کرو مسٹر شوکی کے ساتھ دل بہلاؤ......''
''یہ ٹھیک رہے گا......اب تم جا سکتے ہو......'' گارشیا نے جیسے انہیں اجازت دی۔
''سوری! میں کوئی کمپنی نہیں دے سکتا۔ میں خود سونے کے لیے جا رہا ہوں۔'' شوکی نے فوراً گہری متانت سے کہا۔ ''ولیکن......پلیز، مس رینا! آپ دونوں زیادہ دور مت جائیے گا اور جلد اپنے خیمے کا رخ کیجیے گا۔'' یہ کہتے ہوئے شوکی گارشیا کی طرف دیکھے بغیر واپس اپنے خیمے کی طرف پلٹ گیا۔
وہ اپنے سلیپنگ بیگ میں سونے کے بجائے اس کے اوپر ہی موٹی شال اوڑھے لیٹ گیا۔ اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ رینا اس کے تصور میں بار بار آکر مسکرا رہی تھی۔ اس کا رابرٹ کے اس قدر قریب ہونا اسے سخت بے چین کیے

دے رہا تھا۔ جب اس کی بے چینی فزوں تر ہونے لگتی تو وہ خود ہی اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگتا۔
''شوکت میاں! رینا کا خیال اپنے دل سے نکال دو......بھلا ایک غلام اور ملکہ کا کیا جوڑ......؟ یوں بھی رینا کو تم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ گارشیا کی بات درست ہے۔ رابرٹ اور رینا کی دوستی بچپن سے ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے ہیں۔ زمین پر بیٹھ کر تم چاند کو دیکھ تو سکتے ہو مگر اسے حاصل کرنا تمہارے بس سے کوسوں دور ہے۔''
''دل......لیکن میں رینا سے محبت کرنے لگا ہوں......میں کیسے اپنے دل کی بے چینی پر قابو پا سکتا ہوں......محبت تو محبت ہوتی ہے۔ یہ تو ایک جذبہ ہے، اس میں امیری غریبی کی تفریق کیونکر ہو سکتی ہے؟''
''دل کو بہلانے کے لیے خیال اچھا ہے ....''
اس کے اندر کوئی استہزائیہ ہنسی ہنسا۔ ''شوکی میاں! تمہارا یہ جذبہ تو یک طرفہ ہے۔ محبت کا مزہ تو دو طرفہ کی آتشِ عشق میں ہے......جاؤ سو جاؤ اپنی حسرتوں پہ آنسو بہا کر......''
وہ اندر ہی اندر کڑھنے لگا۔ وہ آتشیں مزاج نوجوان تھا۔ رابرٹ سے اسے بری طرح رقابت محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ بھی انسان تھا اس میں بھی بعض بشری کمزوریاں تھیں۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ رابرٹ کو مار مار کر ادھ موا کر ڈالے جس نے رینا کو اس سے دور کر دیا تھا۔
تھوڑی دیر اور گزر گئی۔ خیمے میں امجد اور تندو بابا کے خراٹے گونجنے لگے۔ اس نے سوچا پتا نہیں رابرٹ اور رینا واپس اپنے خیموں کی طرف لوٹے تھے یا نہیں......وہ یہ دیکھنے کے لیے اٹھا اور اپنے خیمے سے باہر آگیا۔
الاؤ سرد پڑ چکا تھا۔ اس کے اطراف میں کھپریل کی مخروطی چھتوں والی جھونپڑیاں پھیلی ہوئی تھیں، جس سے آسیب سا ٹپک رہا تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا کہ سناٹا بھی چیختا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ خیموں کی تنی ہوئی چادریں تاریک پڑ چکی تھیں۔ کسی کے خیمے میں اس طرح تاکا جھانکی کرنا اگرچہ اسے معیوب لگا تھا مگر اس کے دل میں کوئی چور نہ تھا۔ اس نے سب سے پہلے پروفیسر ہنری کے خیمے کے اندر جھانکا۔ وہ اپنے سلیپنگ بیگ میں مزے سے لپٹے پڑے سو رہے تھے۔ وہاں رینا نہیں تھی کیونکہ وہ اپنے باپ کے خیمے میں سوتی تھی۔ اسے حیرت و تشویش ہوئی۔
''کیا رینا ابھی تک نہیں لوٹی تھی اور رابرٹ......؟'' وہ یہ دیکھنے کے لیے دوسرے خیمے کی طرف آیا۔ اندر جھانکا تو چونک گیا۔ وہاں صرف گارشیا لیٹی ہوئی تھی۔ وہ پلٹا اور تیز تیز

قدموں سے اس طرف کو چلا جدھر رینا نے اشارہ کرتے ہوئے اس طرف جانے کی اس سے اجازت لی تھی۔ وہ وہاں پہنچا تو مزید پریشان اور فکرمند ہوگیا۔ وہ دونوں وہاں بھی نہیں تھے۔ اچانک اسے اپنے دائیں جانب کسی کی موجودگی کا احساس ہوا، وہ تیزی سے گھوما...... گارشیا کے خیمے سے اس نے کسی کا سایہ لپکتے دیکھا...... اس سائے کی ساخت عجیب وضع کی محسوس ہوئی تھی۔ جیسے کوئی کبڑا انسان دو ٹانگوں کے بجائے ہاتھوں پیروں کی مدد سے چل رہا ہو...... عجیب انسان نما حیوانی سایہ تھا وہ...... شوکی ٹھٹکا اور اسی جانب بڑھا مگر وہاں کچھ نہیں تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے یہ سب اپنا وہم سمجھنے کی کوشش کی مگر جھٹلا نہ سکا لیکن ایسے ہی ایک دوسرے عجیب انسان نما حیوان کا سایہ وہ ابھی نہیں دیکھ سکا تھا جو ایک اور قریبی چٹانی اوٹ میں دبکا ہوا اس کی جانب گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھیں گول سی تھیں۔ اس کے عقب سے ایسے ہی عجیب وضع کے دو تین اور سائے نمودار ہوئے اور تیزی کے ساتھ کرالنگ کرتے ہوئے پروفیسر ہنری اور گارشیا کے خیموں کی طرف لپکے اور ان کی آڑ میں چھپ کر دبک گئے۔

''کدھر چلے گئے یہ دونوں؟'' ادھر شوکی نے رینا اور رابرٹ کے متعلق خود سے سوال کیا۔ ٹھیک اسی وقت ایک چیخ ابھری......

☆☆☆

مکان کی اوپری منزل کے ایک چھوٹے سے چوراہے سے انہوں نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ گلی میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ انہیں کچھ شاہی مسلح سپاہیوں کے علاوہ سرخ وردی پوش فرنگی بھی چوکس انداز میں گشت کرتے نظر آئے۔ یہی نہیں وہ لوگ کسی بھی آنے جانے والے پر اچانک شبہ کرتے ہوئے اس سے کھڑے کھڑے پوچھ گچھ شروع کر دیتے تھے اور جامہ تلاشی بھی لے ڈالتے۔

''پہرا واقعی سخت ہے دوست!'' شاہ زمان نے علی ریحان کے کان میں سرگوشی کی۔ ''ہمیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔''

''ہوں......''

علی نے ہنکاری بھری۔ یہ خطرہ محسوس کرتے ہی دونوں اندر کمرے میں آ گئے۔

''جب تک اریبہ واپس نہیں لوٹ آتی...... ہمیں کسی ایک کھڑکی پر کھڑے رہتے ہوئے نیچے دروازے پر مستقل نظر رکھنا ہوگی۔'' زمان نے کہا۔

''میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں دوست!'' علی نے زمان کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز مسکراہٹ سے کہا۔ ''تمہیں ابھی تک اریبہ پر شبہ ہے۔''

''ہاں!'' زمان نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں اتنی جلدی کسی اجنبی پر بھروسا نہیں کر سکتا۔''

''لیکن...... میرا خیال ہے کہ اریبہ تمہیں پسند کرنے لگی ہے۔'' علی نے کہا تو زمان اس کی بات پر چونکا۔

''یہ تم نے بھلا کس طرح اندازہ لگا لیا؟'' زمان کی آواز پھنسی پھنسی سی تھی۔

''جب میں نے یہ اندازہ لگا لیا ہے تو کیا تم نے نہیں لگایا ہوگا دوست!؟'' علی مسکرایا تو زمان بے اختیار جھینپ سا گیا۔ بولا۔

''باوجود اس کے میں اس پر بھروسا نہیں کر سکتا۔ چلو اب باتیں چھوڑو اور ڈیوٹی سنبھالو۔ ہم سب اس وقت خطرے میں ہیں۔''

دونوں باری باری چند منٹوں کے لیے دریچے کے پاس جا کر کھڑے ہو جاتے۔ ایک گھنٹا گزر گیا۔ بندوقیں ان کے ہاتھوں میں تھمی ہوئی تھیں۔ اس وقت زمان کھڑکی پر کھڑا تھا۔ وہ نیچے گلی میں دیکھ کر چونکا اور علی کو آواز دی۔ وہ فوراً بڑھا۔ اریبہ نیچے کھڑی تھی۔ کچھ اریب قریب کے لوگ باگ بھی جمع ہو گئے تھے۔ ان میں عورتیں اور مرد بھی تھے۔ ان کا تعلق قریبی گھروں سے تھا۔ وہ سب اریبہ کے ساتھ مکان میں داخل ہو رہے تھے۔

شاید...... شمائل کی تجہیز و تکفین کی جانے والی تھی۔ نیچے شور مچنے لگا۔ دونوں اوپر ہی دبکے بیٹھے رہے۔ تھوڑی دیر بعد کسی بہانے سے اریبہ اوپر آئی اور ان سے سرگوشی میں بولی۔

''تم لوگ ابھی اوپر ہی رہو اور کسی قسم کی کوئی آواز مت نکالنا۔ نیچے سب کو معلوم ہے کہ اب اس مکان میں میرے سوا اور کوئی نہیں رہا۔ شمائل کے کفن دفن کے بعد ہی ہم تفصیل سے گفتگو کریں گے۔''

اریبہ یہ کہہ کر نیچے چلی گئی۔

اگلے ایک دو گھنٹوں بعد سارا معاملہ نمٹ گیا۔ شمائل کی میت دفنانے کے لیے لے جائی گئی اور اب مکان میں صرف عورتیں رہ گئیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی ایک ایک کر کے اریبہ کو تسلیاں دیتی ہوئی اپنے اپنے گھروں کو چل دیں۔

اب مکان میں ان تینوں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ اریبہ اوپر آ گئی۔

''میں باہر کی صورتِ حال کی خبر لے آئی ہوں......'' اس نے کہنا شروع کیا۔ علی اور زمان بڑے غور سے اس کی

طرف دیکھ رہے تھے۔

''تمہیں بھی اندازہ ہو چکا ہوگا کہ نیچے گلی میں کتنا سخت پہرا ہے۔ گھر گھر تلاشی لینے کے باوجود بھی کسی نہ کسی آتے جاتے ہوئے شخص سے اچانک تلاشی کے ساتھ پوچھ گچھ شروع کر دی جاتی ہے......'' وہ رکی تو زمان اس کے چہرے پر اپنی نظریں جمائے ہوئے بولا۔

''تم کہاں گئی تھیں؟''

''یہ معلوم کرنے کہ اب تمہارے سلسلے میں تلاشی کا اگلا مرحلہ کیا اختیار کیا جانے والا ہے۔''

''کیا پتا چلا پھر......؟'' علی نے پوچھا۔

''ابھی تھوڑی دیر میں ریاست کا سیناپتی موج سنگھ......اپنے خاص سپاہیوں کی معیت میں خود بھی نکلنے والا ہے اور کسی بھی مشکوک نظر آنے والے گھر کی تلاشی لینے کے لیے بے دھڑک داخل ہو جائے گا۔''

''اسپیشل چیکنگ۔'' زمان کے منہ سے نکلا۔

''ہاں!'' اریبہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔

''بس! یہی ایک بڑا خطرہ ابھی سر پر مسلط ہے۔''

اریبہ اور زمان نے دیکھا۔ علی ریحان کے چہرے پر ایکا ایکی عجیب سی گمبھیر تا طاری ہو گئی تھی۔

''کیا سوچنے لگے علی......؟'' زمان نے اس سے کہا۔

''میرا خیال ہے ہمارا مشن خود ہی چل کر اس طرف آ رہا ہے۔'' وہ جیسے گومگو سے لہجے میں بولا۔

''کیا مطلب؟'' زمان نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''موج سنگھ کو موت کے گھاٹ اتار دینا بھی ہمارے اس اہم مشن کا ایک حصہ ہے۔''

اس کی بات پر زمان نے ایک نظر سامنے بیٹھی اریبہ کے چہرے پر ڈالی اور بولا۔

''اس طرح اریبہ کی جان بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ یہ دشمن کی نظروں میں زبردست مشکوک کہلائے گی۔''

''مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔'' اریبہ نے فوراً کہا۔ ''تمہیں اپنے مشن کے لیے جیسی آسانی ممکن محسوس ہو وہ کر ڈالو، میری فکر مت کرو۔ فرنگیوں کی اس جنگ میں مجھے بھی تم دونوں اپنے ساتھ شامل سمجھو۔ ان فرنگی غاصبوں کی وجہ سے ہی تو ہمارا گاؤں تباہ و برباد ہوا اور خود میں بے خانماں ہو کر اس حال کو پہنچی ہوں۔'' یہ بتاتے ہوئے اس کا لہجہ مغموم سا ہو گیا۔

زمان بہ غور اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ ہنوز اس طرف سے نامعلوم سی بے چینی کا شکار تھا۔ حالانکہ اب تک اریبہ نے ان دونوں کے ساتھ ایسی کوئی مشکوک حرکت نہیں کی تھی جو کسی قسم کے شبہے کے دائرے میں آتی۔ علی اس پر مکمل بھروسا کر چکا تھا لیکن زمان ہنوز اس کی جانب سے اشتباہ انگیزی کا شکار تھا۔

''دیکھو بہن!'' علی نے نرمی سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''ہم تمہارے اس جذبے کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن آپ کے حالات جان کر ہمیں بے حد افسوس بھی ہوا ہے۔ اس لیے ہم نہیں چاہتے کہ تمہیں مزید کسی ایسے حالات کا شکار بنا دیں جو تمہارے لیے ایک بڑی مصیبت کا سبب بن جائے۔''

اریبہ نے کچھ کہنا چاہا تھا کہ زمان بھی گفتگو میں شامل ہوتے ہوئے اس سے بولا۔

''اور میرا خیال ہے کہ اب شاتل کے مرنے کے بعد تم بھی آزاد ہو۔ اس کا کاروبار اور یہ مکان اب تمہاری ملکیت ہی تصور کیا جائے گا۔ تم نے اب تک ہماری جتنی مدد کی اس کا ہم تہِ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔ مجھے اور میرے ساتھی کو اب جلد از جلد یہ مکان چھوڑنا ہوگا۔''

''باہر سخت پہرا ہے۔ گلی گلی میں تم دونوں کو تلاش......''

اریبہ کی بات ادھوری رہ گئی۔ زمان بول پڑا۔

''یہ ہمارا مسئلہ ہے۔ ہم خود ہی اسے حل کر لیں گے۔''

''تم شاید مجھ پر ابھی تک شبہ کیے ہوئے ہو۔'' اریبہ نے زمان کی طرف دیکھ کر شکایتی لہجے میں کہا۔ ''جب میں تم لوگوں کی مدد کر سکتی ہوں تو پھر اتنی جلد بازی کی کیا ضرورت ہے؟ تمہارا شکار صرف سیناپتی موج سنگھ تو نہیں ہوگا نا......''

علی نے غور کرنے کے انداز میں اس کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ پھر اپنے ساتھی زمان سے مخاطب ہو کے رائے طلب لہجے میں بولا۔

''میرا خیال ہے ہمیں اریبہ کی بات مان لینی چاہیے۔''

زمان خود ہچکچاہٹ میں مبتلا تھا۔ سمجھ تو وہ بھی گیا تھا کہ ان مخدوش حالات میں اریبہ کا ساتھ ان کے مشن کو وسیع تر کامیابی سے ہمکنار کر سکتا تھا۔ مگر وہ ابھی تک اس کی جانب سے تشکیک میں مبتلا تھا۔

''میرا خیال ہے تمہارا ساتھی مجھ پر ابھی تک بھروسا ......کرنے کے لیے تیار نہیں۔'' اریبہ نے زمان کی طرف دیکھتے ہوئے علی ریحان سے کہا تو علی مسکرا کر بولا۔

''نہیں بہن! ایسی بات نہیں، دراصل ہماری تربیت کا سب سے پہلا اصول ہی یہی ہے کہ اپنے سوا کسی پر بھروسا

نہ کرو۔"

"اور اگر کسی مددگار کا ساتھ میسّر آرہا ہو تو......؟"

اریبہ نے اس بار براہِ راست زمان کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔ جس پر زمان کچھ گڑبڑا سا گیا مگر دوسرے ہی لمحے پورے اعتماد سے بولا۔

"اس کی وفاداری جانچنے کے لیے بدقسمتی سے ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہوگا...... جتنا کہ گزرتے ہوئے وقت اور حالات سے پتا چل سکے۔"

"جانچنے والے تو غضب کی نگاہ رکھتے ہیں۔ کیا تمہیں اب بھی مجھ پر بھروسا نہ ہوسکا، جبکہ میں نے تم لوگوں کی خاطر شائل کو قتل کیا......"

"اس میں تمہارا بھی فائدہ تھا......"

"اگر صرف میرے فائدے کی بات ہوتی تو میں کب کا اسے ختم کرچکی ہوتی۔" زمان کے محتاط رویّے سے اریبہ کا لہجہ تلخ ہوتا جارہا تھا۔

"تم موقعے کی منتظر تھیں۔" زمان بھی اس کی ہر دلیل رد کرنے کے درپے تھا۔

"چلو، یہی سہی...... اگر یہ بات ہے تو...... میرا کام ختم ہوا...... تم لوگ یہاں سے جاسکتے ہو......"

"ہم تمہیں ختم کرکے ہی اب اس مکان سے نکلیں گے۔" اچانک زمان کا لہجہ بدل گیا۔ "تم ہمیں پھنسوا سکتی ہو......" زمان کہے جارہا تھا۔ اس کی اور اریبہ کی بحث تلخی سے اب ایکا ایکی دشمنی پر اتر آئی تھی۔ یہی وہ وقت تھا جب اریبہ نے بہ سرعت ایک عجیب حرکت کرڈالی۔ وہ زمان کے بالکل قریب آگئی۔ اتنی کہ اس کی گرم گرم سانسوں کا تموّج زمان کو اپنے چہرے پر محسوس ہونے لگا۔ اس کے بدن کی رعنائی کی قربت اور اس سے پھوٹتی قدرتی خوشبو اسے مسحور کیے دے رہی تھی۔ وہ اپنی جگہ جہاں کا تہاں یک ٹک اسے دیکھتا ہی چلا گیا حتیٰ کہ اریبہ نے اس کے دونوں ہاتھوں کی کلائیوں کو دبوچ لیا۔ اس کے نرم و نازک ہاتھوں کی گرفت بھی زمان کو ایسی غیر مرئی سی محسوس ہوئی تھی کہ وہ خود اس سے چھڑانے کی محض کوشش ہی کرتا رہ گیا۔ اریبہ نے اس کے دونوں ہاتھ اپنی صراحی دار گردن کے گرد کس ڈالے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

"لو...... میرا گلا دبا کر ابھی ختم کردو مجھے...... شاید تب ہی تمہیں اعتبار آئے گا مجھ پر......" زمان نے اس کی اپنے سامنے کھلی آنکھوں میں جھانکا تو وہاں اسے دکھ کی نمی کی چمک سی نظر آئی۔ اس کے تراشیدہ لبِ غم دوراں کے بوجھ تلے تھرتھرا رہے تھے۔ سایہ دار سی گھنیری پلکیں اس کی کجراری سیاہ آنکھوں کو ایک پل کے لیے ڈھانپتیں تو جیسے بھادوں مینہ برسے ہوئے بھیگے بھیگے جنگل کا سا منظر پیش کرنے لگتیں۔ اشکوں کی غمناک سنگت میں پلکیں چپکنے لگی تھیں اس کی۔

علی ریحان خاموش تھا، زمان گنگ...... اریبہ پیچھے ہٹ گئی اور اٹھ کر دیوار کے ساتھ لگی کھڑی سسکنے لگی۔ زمان اور علی کی آنکھیں ملیں تو علی نے اسے ایک مخصوص اشارہ کیا جسے سمجھ کر زمان اپنی جگہ سے اٹھا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا اریبہ کی طرف بڑھا۔ وہ ہنوز کمرے کی دیوار سے لگی کھڑی، سر جھکائے سسکے جارہی تھی۔ تب ہی زمان نے بہت دھیرے پن کے ساتھ اپنا ایک ہاتھ اس کے کاندھے پر دھرا تو اریبہ نے جیسے تڑپ کر اپنا سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا خوبصورت و حسین مگر اشکبار چہرہ حسنِ غمگسار کا عجیب سا تاثر دیتا دکھائی دیا۔ ایسے میں پہلی بار زمان کا بھی دل اس دکھیاری اور الم نصیب حسینہ پر رقت زدہ ہوگیا۔

"مجھے افسوس ہے...... میں نے آپ پر شک کرکے آپ کا دل دکھایا......" زمان نے ہولے سے کہا۔ اس کے لہجے میں ملامت آمیز نرمی عود کر آئی تھی۔ "درحقیقت...... ہم ایسے کاز کے سپاہی ہیں جو اپنے سائے پر بھی کم ہی بھروسا کرتے ہیں اور یہ ہماری مجبوری بھی ہے۔ آؤ بیٹھ کر آرام سے باتیں کرتے ہیں۔"

زمان اسے محبت سے تھامے واپس اس کی جگہ پر لے آیا۔ اریبہ نے خود کو اس کے سپرد کردیا تھا۔ زمان کے اس طرح سہارنے پر اسے بھی اب اپنے دل کا بوجھ کم محسوس ہونے لگا تھا۔

وہ تینوں ایک بار پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ اریبہ نے اپنے آنسو پونچھ لیے تھے۔

"جب تک اریبہ بہن کے مکان میں ہماری خفیہ رہائش قائم ہے، ہم اپنے مشن کو کامیابی کی طرف لے جاسکتے ہیں۔" علی نے گفتگو کی ابتدا کرتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

"ہاں! میرا بھی اب یہی خیال ہے...... اریبہ کو زحمت تو ہوگی مگر......" زمان اس کی طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے رکا تو اریبہ نے فوراً اس کی طرف گہری نگاہ اٹھا کے دیکھا۔

زمان کو اس کی جھیل سی گہری آنکھوں میں عجیب سی گیرائی اور بھیدوں بھرے تاثر کا شائبہ ابھرتا محسوس ہوا تھا۔ ایسا چند پل کے لیے ہوا تھا اس کے بعد اریبہ بولی۔

"مجھے بھلا کیسی زحمت ہوگی؟ میں تو خوشی محسوس کروں گی کہ میری بے مصرف زندگی کسی نیک مقصد میں کام آئے۔ اپنا منصوبہ بتاؤ...... موج سنگھ نکلنے والا ہوگا......"

"منصوبہ یہی ہے کہ ہم اسے موت کے گھاٹ اتاریں گے۔" علی ریحان نے کہا اور تائید طلب نظروں سے زمان کی طرف دیکھا جو کسی گہری سوچ میں مستغرق ہوگیا تھا۔ تاہم بولا۔

"میرا خیال ہے کہ موج سنگھ سے زیادہ...... اس فرنگی کمانڈر کو موت کے گھاٹ اتارنا زیادہ سودمند رہے گا کیونکہ تریپال اور ناگرہ کے خلاف اصل سازش وہی تیار کر کے لارہا ہے اور دوسری اہم بات یہ ہے کہ وہ...... دلی میں قابض...... لیفٹیننٹ جنرل مائیکل شا...... کا نائب اور خاص آدمی بھی ہے۔"

"ہوں......" اس کی بات پر علی نے ایک پُرسوچ سی ہنکاری خارج کی تھی۔

"اس کے ہمیں دوررس نتائج حاصل ہوں گے۔" زمان نے اپنی عملی حکمت عملی کی صراحت جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔

"شہر میں قابض فرنگیوں کی ایک بڑی بریگیڈ کو دھچکا پہنچے گا اور ان کی بیرونی آزاد ریاستوں کو بھی ساتھ ملنے اور لڑانے کا خواب ایک خوف کی شکل اختیار کرلے گا، کیونکہ ان کے اتنے بڑے افسر کا دھڑلے سے قتل باقیوں کے لیے دہشت کا ہی سبب بنے گا۔"

"کلیئر...... اس کے بعد ہمیں مشن کا اگلا اور آخری مرحلہ طے کرنا ہوگا۔" علی نے مطمئن ہو کے کہا۔ "ہمیں فوراً تریپال کا رخ کرنا ہوگا اور وہاں کے مسلمان نواب شہباز خان کو اس سازش سے باخبر کرنے کے ساتھ ساتھ اسے...... اغیار (مہاراجا چندر گپتا) اور فرنگی سامراج کی اس گھناؤنی سازش کے بارے میں بھی آگاہ کرنا ہوگا تاکہ وہ اپنی حلیف ریاستوں کو اعتماد میں لے کر آپس میں جنگ کرنے سے گریزاں رہیں اور مذاکرات کے بہانے کسی فرنگی سامراجی آفیسر کے آنے کی دعوت قبول ہرگز نہ کریں بلکہ ہر ممکن طرح سے ان کا راستہ بھی روکیں۔"

"تم دونوں کا منصوبہ بے داغ اور مربوط ہے......" اریبہ نے کہا۔ "مگر اس کے لیے تم دونوں کو مہاراجا چندر گپتا کی محل نما حویلی تک رسائی حاصل کرنا ہوگی، نہ صرف یہ بلکہ وہاں سے یہ خطرناک مشن مکمل کر کے زندہ بھی نکلنا ہوگا......"

"ہاں! اسی کے محلِ وقوع کا جائزہ لینے کے لیے ہم نے اپنی آمد کو خفیہ رکھنے کی ازحد کوشش کی تھی مگر بدقسمتی سے ہماری آمد طشت از بام ہوگئی۔ اس لیے ہم نے مہاراج ریاست کے سیناپتی موج سنگھ کو ہی ہلاک کرنے پر اکتفا کرنے کا سوچا تھا۔" علی بولا۔

"لیکن میرا خیال ہے کہ اب اریبہ کی مدد سے ہم اپنے اصل شکار یعنی اس فرنگی آفیسر جان پال کو ہی موت کے گھاٹ اتاریں گے۔ دوسرا شکار ہمارا نسبتاً سہل ہوگا یعنی موج سنگھ......" زمان بولا۔

"ہماری کوشش یہی ہوگی کہ موج سنگھ کو بھی نہ چھوڑیں......" علی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "تاکہ اس طرح فرنگی سامراجیوں کے دلوں میں ہی نہیں بلکہ ان سے گٹھ جوڑ کرنے والی دیگر بیرونی ریاستوں کو بھی عبرت حاصل ہوسکے۔"

اب یہ تینوں چند ضروری باتیں کرنے لگے۔

انہیں باتیں کرتے تھوڑی دیر گزری تھی کہ باہر نقارہ پیٹے جانے کی آواز پر تینوں چونک پڑے۔ اس کے ساتھ ہی نیچے گلی میں بہ آوازِ بلند منادی کی جانے لگی۔

"ہوشیار...... خبردار! باخبر رہیں سب...... ریاست ناگرہ کے سیناپتی موج سنگھ...... دشمن جاسوسوں کی تلاش میں نکلے ہیں گھر کے دروازے کھلے رکھے جائیں اور جو جہاں ہے وہیں موجود رہے۔ نہ کوئی گھر سے باہر نکلے نہ اندر داخل ہوتا نظر آئے۔ یہ دشمن ریاست کی رعایا کے جان کے دشمن ہیں اور ان کا مقصد انتشار پھیلانا اور کاروبارِ ریاست کو نقصان پہنچانا ہے، اس لیے آپ سب سے بھی تعاون اور مدد کی درخواست کی جاتی ہے جس کا فرض یہاں کے ہر مرد، عورت بوڑھے اور بچے پر لاگو ہے۔ اعلان ختم ہوا......"

ڈھنڈورچی کی اس منادی کے بعد وہ تینوں ایک دوسرے کا چہرہ تکنے لگے۔ اس کے بعد لپک کر دریچے کی جانب بڑھے۔ دریچے کا ایک پٹ ذرا کھسکا کر نیچے گلی میں جھانکا تو مخصوص وردیوں میں ملبوس بہت سے مسلح افراد چوکس کھڑے دکھائی دیے جو گلی میں موجود ہر گھر پر کڑی نگاہ ڈالے ہوئے تھے۔

"سیناپتی ابھی نہیں پہنچا ہے۔" اریبہ نے سرگوشی میں کہا۔

"منادی کرادی ہے، وہ پہنچنے والا ہوگا۔" علی بولا۔

"اس سے پہلے کہ وہ یہاں پہنچے...... ہمیں چھپنے کے لیے کسی محفوظ جگہ کی ضرورت پڑے گی۔" زمان نے کہا تو اریبہ ایک لمحہ کچھ سوچ کر بولی۔

"ضروری نہیں ہے کہ موج سنگھ ہر گھر کی تلاشی لے

......جس پر شبہ ہوگا اسی گھر کی تلاشی لی جائے گی لیکن پریشان ہونے کی ضرورت نہیں......تم ادھر ہی ٹھہرے رہو......"

زمان کو اریبہ کی یہ بات بالکل بھگا نا لگی جس کا اس نے برملا اظہار بھی کرڈالا۔ بولا۔

"یہ انتہا درجے کی بے وقوفی ہوگی کہ ہم اس خوش فہمی میں رہیں کہ اس مکان کی تلاشی نہیں لی جاسکتی......"

"جس گھر میں فوتگی ہوجائے وہاں اس کے امکانات کم رہ جاتے ہیں۔" اریبہ نے برامنائے بغیر جواز پیش کیا۔

"میرا خیال ہے کہ اریبہ بہن کی بات درست ہے۔" علی ریحان بولا مگر اس کا لہجہ گومگو سا تھا۔ زمان بولا۔

"باوجود اس کے اس خطرے کا احتمال موجود رہے گا کیونکہ جب انہیں بتایا جائے گا کہ اس مکان میں اب صرف ایک اکیلی عورت رہتی ہے تو ممکن ہے ان کی نظروں میں اکیلی عورت کھٹک جائے۔ اس لیے اب وقت ضائع کیے بغیر فوراً چھپنے کی کوئی محفوظ جگہ تلاش کرلی جائے۔"

اریبہ نے انہیں تہ خانے کے بجائے اسی بالائی منزل کے گودام میں ایک اسٹور نما کمرے کے اندر ایک ایسی جگہ چھپنے کے لیے دکھادی، جہاں تیندو پتوں کے گٹھڑوں کی بوریاں رکھی ہوئی تھیں۔

اس کے بعد اریبہ نے نیچے جاکر سیاہ لبادہ اوڑھ لیا اور چہرے پر ماتمی تاثرات قائم کرلیے۔ چولہے کا خاص طور پر جائزہ لیا کہ ظاہر نہ ہو یہاں چولہا جلا ہے۔ اسے سرد کردیا گیا۔ چائے وغیرہ کے تازہ استعمال کیے ہوئے برتن بھی ایک طرف سمیٹ کر رکھ دیے کیونکہ فوتگی والے گھر میں؛ وہ بھی پہلے دن یہ سب ان کے لیے شکوک کا سبب بن سکتا تھا۔ اسے یہ کام نمٹاتے دیکھ کر علی اور زمان کو بھی اریبہ کی ذہانت کا قائل ہونا پڑا تھا۔

علی اور زمان ......متوقع خطرے کا جائزہ لینے تک سردست دریچے کے قریب ہی کھڑے رہے۔ نیچے گلی میں لوگوں کی آمدورفت ایک دم جام کردی گئی تھی۔ جو جہاں تھا وہیں ٹھہر گیا تھا اور پھر اسی وقت گھڑسواروں کا ایک دستہ نمودار ہوا۔ انہوں نے دیکھا تلواروں اور بندوقوں سے لیس اس گھڑسواروں کے دستے میں ریاستی اور چند فرنگی فوجی بھی شامل تھے۔ ان میں سب سے آگے دو گھوڑے تھے اور ان کے درمیان میں ایک گھوڑے پر کسرتی بدن والا شخص مخصوص لباس میں سوار نظر آیا۔ اس کے چہرے پر گھنی ڈاڑھی اور مونچھیں تھیں۔ سر پہ چمکیلا سا پگ تھا۔ میان سے تلوار جھول رہی تھی۔ چہرے پر رعب اور دبدبے کے ساتھ ایک کرختگی بھی نمایاں ہوتی تھی جو اسے تندمزاج ظاہر کرتی تھی۔ گھڑسواروں کی رفتار آہستہ تھی اور وہ ایک ایک گھر کے دروازے کا جائزہ لے رہے تھے۔ ساتھ ہی اوپر بھی دیکھتے جاتے تھے۔ علی اور زمان کو سمجھنے میں چنداں دیر نہ لگی تھی کہ یہی سیناپتی موج سنگھ تھا۔

گھڑسواروں کا یہ دستہ پیادہ فوجیوں کی سنگت میں آگے بڑھ رہا تھا۔ چند ایک گھروں میں رک کر جس گھر کی طرف موج سنگھ اشارہ کرتا، فوجی حرکت میں آجاتے اور چند ہی منٹوں میں کسی بھی مشکوک گھر کی تلاشی لے ڈالتے۔ پیدل اور گھڑسوار دستہ اب ان کے مکان کے سامنے سے گزرنے لگا۔ علی اور زمان کے دل یکبارگی زور سے دھڑکے اور وہ دونوں ایک دم دریچے کے پاس سے ہٹ گئے، پٹ بھی آہستگی کے ساتھ بھیڑ دیا تھا۔

ٹھیک اسی وقت اسی مکان کے سامنے لوگ رک گئے۔ موج سنگھ نے مکان کی جانب اشارہ کیا۔ زمان اب دریچے کے پٹ کی باریک جھری سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ پیدل سوار دستے میں سے ایک دم دو افراد موج سنگھ کے گھوڑے کی طرف بڑھے اور مؤدبانہ انداز میں دست بستہ کھڑے ہوگئے۔

موج سنگھ اس مکان کی طرف بار بار اشارہ کرتے ہوئے ان سے تحکمانہ انداز میں کچھ پوچھ رہا تھا اور تب ہی زمان کا دل یکلخت اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ اس کا خدشہ درست ثابت ہوا تھا۔ موج سنگھ نے اس مکان کی تلاشی لینے کا حکم صادر کردیا تھا۔

"چلو......" دریچے سے ہٹتے ہی زمان نے علی سے کہا۔

نیچے دروازہ بری طرح دھڑدھڑایا جارہا تھا۔ یہ دونوں لپک کر اسٹور میں آگئے اور تیندو پتوں سے بھری ہوئی بوریوں کے پیچھے جادبکے۔ اریبہ کی ہدایت کے مطابق انہوں نے اسٹور کا دروازہ بند کردیا تھا مگر اندر سے کنڈی نہیں لگائی تھی۔ باقی اسٹور میں دانستہ بتی وغیرہ نہیں جلائی گئی تھی۔

دونوں گھورتاریکی میں دم سادھے دبکے بیٹھے رہے۔ تاہم ان کی دھڑکتی ہوئی سماعتیں چوکس تھیں۔ نیچے سے کچھ آوازیں آتی رہیں۔ اس کے بعد یکلخت خاموشی چھاگئی۔ دونوں نے سکون کا سانس لیا کہ شاید خطرہ ٹل چکا مگر...... دوسرے ہی لمحے یہ ان کی خام خیالی ثابت ہوئی کیونکہ اس کے دو لمحے بعد ہی "کھٹ......کھٹ......کھٹا......کھٹ" کی آوازیں ابھریں......یہ ایک سے زائد افراد کے بھاری جوتوں کی آوازیں تھیں اور وہ لوگ اوپر ہی آرہے تھے۔ علی

اور زمان کے پورے وجود میں اندیشناک وسوسوں کے سناٹے اترتے چلے گئے۔

☆☆☆

چیخ کی آواز پر شوکی بری طرح چونکا...... اس چیخ پر وہی پراسرار کبڑے سائے بھی ٹھٹکے تھے اور شوکی کی نظروں میں آئے بغیر ادھر ادھر کو لپکنے لگے تھے۔ ان کی تعداد بتدریج بڑھتی جارہی تھی۔ وہ اریب قریب کی چٹانی دیواروں میں چھپے ہوئے اپنی چندی چندی چمکتی آنکھوں سے اس مختصر پڑاؤ کو تکے جارہے تھے۔ کچھ خیموں کے قریب بھی دبکے ہوئے تھے۔

شوکی چیخ سے مشابہ اس آواز کو ہزار آوازوں میں پہچان سکتا تھا۔ یہ رینا کی چیخ تھی، جو زیادہ بلند تو نہ تھی، مگر کہیں قریب سے آتی ہوئی ضرور محسوس ہوئی تھی۔ تب ہی جیسے اس کے پورے وجود میں یکلخت بجلیاں دوڑ گئیں۔ وہ بگولے کی طرح پلٹا اور آواز کی سمت کا اندازہ کرتے ہوئے تاریکی میں اسی پہاڑی کی طرف لپکا جہاں سے چیخ کی آواز ابھری تھی۔

اسے یوں ایک دم دوڑتا دیکھ کر اطراف میں چھپے ہوئے وہ پراسرار کبڑے نما سائے بھی دبکے رہے تھے۔

باقی سب لوگ تھکن کے سبب بے سدھ سو رہے تھے۔

شوکی...... چٹکی ہوئی چاندنی میں پتھریلی اور ناہموار سی زمین پر دوڑتا ہوا، مذکورہ چٹانی اوٹ کے پیچھے جا پہنچا اور تب ہی ایک منظر نے جیسے اس کا پورا وجود آگ اور شعلوں سے بھر دیا۔

اس سے صرف چند قدموں کے فاصلے پر جدھر اونچی اور سنگلاخ دیوار تھی، اس کے نیچے خشک سی روئیدگی پھیلی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ اس نے رابرٹ کو کسی شکرے کی طرح رینا کو دبوچے ہوئے پایا اور رینا معصوم چڑیا کی طرح اس کی آہنی گرفت سے نکلنے کے لیے مچل رہی تھی۔ رابرٹ نے ایک ہاتھ اس کے منہ پر رکھا ہوا تھا تا کہ وہ دوبارہ نہ چیخ سکے۔ رابرٹ کی اس قبیح حرکت کو دیکھ کر صاف نظر آتا تھا کہ وہ رینا سے دست درازی کی کوشش کر رہا تھا۔ شوکی کے سر پر خون سوار ہوگیا۔ آنکھیں شعلوں کے مانند دہکنے لگیں۔ اس نے وہیں سے ایک جست بھری...... اور رابرٹ کے سر پر جا پہنچا......

اسے دیکھتے ہی رابرٹ نے اپنے ایک ہولسٹر سے پستول نکال لیا۔ یوں اسے رینا پر گرفت ذرا ڈھیلی کرنا پڑی تھی۔

''رک جاؤ ادھر ہی...... ورنہ گولی ماردوں گا۔'' وہ شوکی کی طرف دیکھ کر غرایا۔ اس نے شاید شوکی کی غضب ناکی کا اندازہ ...... لگالیا تھا کیونکہ خود رابرٹ کے چہرے پر بھی تشویش و پریشانی کی جھلک ابھری تھی۔

''اسے چھوڑ دو...... رابرٹ!'' شوکی نے اپنے اندرونی غیظ تلے حلق کے بل... پورازور دیتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں سے خوں ناکی مترشح ہو رہی تھی۔ وہ جیسے رابرٹ کو پھاڑ کھانے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔ اسے پستول نکالتے دیکھ کر وہ اس سے صرف دو تین قدموں ہی کے فاصلے پر رک گیا تھا۔ رینا ہراساں تھی۔ شوکی کو اس کے حسین چہرے پر سرخ سی خراشیں دکھائی دی تھیں۔

''دفع ہوجاؤ یہاں سے......'' رابرٹ بھیڑیے جیسی آواز میں اس کی طرف گھور کر غرایا۔ ''یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔''

''ذاتی معاملہ ایسا نہیں ہوتا......'' رابرٹ سے یہ کہتے ہوئے شوکی نے رینا کے سراسیمہ چہرے پر بھی ایک نظر ڈالی تھی۔ ''یہ زبردستی ہے اور تم رینا کو ہرٹ کر رہے ہو......''

''بتاؤ بے بی اسے...... کہ ہمارا اور تمہارا کیا معاملہ ہے......؟'' رابرٹ نے رینا کے کان کی طرف اپنا بدہیت چہرہ لے جاتے ہوئے اس سے کہا تو شوکی کی آنکھوں میں عجیب سی الجھن تیر گئی...... رابرٹ کے کہنے کے انداز میں شوکی کو ایک طرح کا جابرانہ تحکم محسوس ہوا تھا اور اسے رینا بے بس سی نظر آرہی تھی۔

''تم پہلے چھوڑو مجھے...... رابرٹ!'' رینا نے بالآخر گھٹے گھٹے لہجے میں کہا۔

''نہیں، پہلے اسے جانے کا کہو......'' رابرٹ بدستور اپنے سامنے کھڑے شوکی کی طرف گھورتے ہوئے رینا سے بولا۔

''شش...... شوکی! تم جاؤ......'' رینا نے اٹکتے ہوئے لہجے میں شوکی سے کہا تو وہ رینا کی بات پر بھونچکا رہ گیا۔ اسے دکھ بھی ہوا، پہلے تو اسے یقین ہی نہیں آیا کہ رینا ایسی صورتِ حال میں اس سے یہ بھی کہہ سکتی ہے۔

''چلو اب دفع ہوجاؤ یہاں سے اور اپنی اوقات میں رہنا آئندہ...... سمجھے تم......'' رابرٹ گویا رینا کی شے پر شوکی سے بولا۔

''ری ی...... یہ تم کیا کہہ رہی ہو رینا......! یہ تمہیں ہرٹ کر رہا ہے......'' شوکی نے دکھ آمیز حیرت سے رینا کی طرف دیکھ کر کہا۔ اس کی آنکھوں میں کرب کی پرچھائیاں اتر آئی تھیں۔

''شوکی! پلیز...... گو......'' رینا نے دبے دبے لہجے میں ایک بار پھر شوکی کو جانے کے لیے کہا تو شوکی اپنے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ وہ چند ثانیے دونوں کو دیکھتا رہا اس کے بعد واپس پلٹ گیا۔ مگر اوٹ سے ہٹنے کے بعد وہ ایک جگہ چٹانی دیوار کے قریب کھڑا ہو گیا۔ اس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ اس بار اگر رینا کی چیخ سنائی دی تو وہ رینا کی پروا کیے بغیر رابرٹ

پر چڑھ دوڑے گا۔ وہ ابھی تک ورطۂ حیرت میں مبتلا تھا کہ یہ کیا چکر تھا؟ رینا، رابرٹ کے سامنے اتنی بے بس کیوں تھی؟

اچانک اس کی نظر چاند کی طلسماتی روشنی میں سامنے پڑی۔ وہ دونوں اب تیز تیز قدموں سے پڑاؤ کی طرف جا رہے تھے۔ رینا آگے تھی اور رابرٹ اس کے پیچھے...... شوکی نے بھی ان کی نظروں میں آئے بغیر قدم آگے بڑھا دیے تھے۔ اس نے دیکھا کہ رینا اپنے خیمے کے پاس پہنچ کر رکی۔ رابرٹ نے اس کا ہاتھ تھامنا چاہا مگر رینا نے سختی کے ساتھ اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور اندر داخل ہو گئی۔ رابرٹ تھوڑی دیر تک خیمے کے دروازے پر کھڑا رہا، اس کے بعد واپس اپنے خیمے کی طرف چلا گیا۔ شوکی بھی اپنے خیمے میں آ کر لیٹ گیا۔

پس منظر میں سر بفلک پہاڑیوں کی چوٹیاں تاریک خلا میں برچھیوں کی طرح پیوست ہوتی محسوس ہو رہی تھیں اور وہاں چاند نکلا ہوا تھا۔ ان کے درمیان بادلوں کے ٹکڑے تیرتے ہوئے عجیب منظر پیش کر رہے تھے۔ دور کہیں کسی پہاڑی بھیڑیے نے چاند کی طرف تھوتھنی اٹھا کر ہوکنے کی آواز نکالی جس نے ماحول کی اسراریت کو دوچند کر ڈالا تھا۔

پڑاؤ پر رات کا سناٹا طاری تھا۔ ہر سو خاموشی کا راج تھا۔ دھیمی دھیمی چاندنی میں خالی جھونپڑوں کے بدوضع ہیولے عجیب سے نظر آ رہے تھے۔ شوکی سو چکا تھا۔ رات اپنے نصف پہر میں تھی۔ اچانک وہی پراسرار سائے کرالنگ کرتے ہوئے دھیرے دھیرے خیموں کی جانب بڑھنے لگے اور ایک ایک خیمے کے اندر جھانکتے رہے۔ ان کے جسم برہنہ تھے۔ آنکھیں پھٹی پھٹی سی تھیں اور ایسا لگتا تھا جیسے بغیر پپوٹوں کے ہوں۔ البتہ...... ان کے چہرے انسانی لگتے تھے، مگر قدرے مخروطی تھے۔ رنگت سیاہ تھی۔ ان کی جسمانی ساخت انہیں ایک دوسرے سے مختلف جنس ظاہر کرتی تھی۔ یعنی مرد اور عورتیں بھی تھیں، چھوٹی بڑی عمروں کے بچے بھی تھے۔ شیرخوار بچے ماؤں کی پشت اور سینے کے ساتھ چپکے ہوئے تھے۔ ان کی وضع انہی کی طرح کی تھی۔ ان کی ہاتھوں پیروں کی ہڈیاں خم کھائے ہوئے تھیں اور ریڑھ کی ہڈی بھی خم کھائے ہوئے تھی، جس کی وجہ سے یہ لوگ اپنے دونوں پیروں پر چلنے کے بجائے چوپایوں کی طرح چلنے پر مجبور تھے۔

چند سائے بھی ضرور تھا اپنے دو پیروں پر بھی کھڑے ہونے کی کوشش کرتے۔ ان کی تعداد کافی ہو چلی تھی۔ وہ سب آزادانہ ادھر ادھر پھدکتے پھر رہے تھے اور عجیب عجیب سی آوازیں بھی خارج کرنے لگتے۔ اگر اس وقت خیموں میں گہری نیند سوئے کسی کی آنکھ کھل جاتی اور وہ باہر نکل کر ان

بادشاہ کی پسند

ایک بادشاہ نے اعلان کیا کہ جو کوئی میری پسند کا پھل لائے گا، اس کے برابر ہیرے جواہرات انعام دوں گا اور اگر پسند نہ آیا تو وہی پھل لانے والے کو نگلنا پڑے گا۔ ایک مسلمان ایک بیر لایا جو بادشاہ کو پسند نہ آیا تو مسلمان نے اسے بہ آسانی اسے نگل گیا۔ ہندو ایک سیب لایا وہ بھی بادشاہ کو پسند نہ آیا اور بادشاہ نے ہندو کو سیب نگلنے کا حکم دیا۔ (دراصل شرط یہ تھی کہ پھل کھانا نہیں نگلنا ہے)۔ ہندو رونے لگا پھر اچانک ہنسنے لگا بادشاہ نے غصے سے پہلے رونے اور پھر ہنسنے کی وجہ پوچھی تو ہندو نے کہا۔ ”بادشاہ سلامت! میں پہلے رویا اس لیے کہ میں سیب نگل نہیں سکتا۔ بعد میں ہنسا اس لیے کہ باہر ایک سکھ بیٹھا ہوا ہے جو تربوز لایا ہے۔“

(مرسلہ: ریاض بٹ۔ حسن ابدال)

کو دیکھ لیتا تو یقیناً خوف کے مارے گنگ ہو جاتا۔

تھوڑی دیر ادھر ادھر متحرک رہنے کے بعد یہ کیڑے چوپائے پھدکتے ہوئے جھونپڑوں کی طرف بڑھ گئے۔ ان کی موجودگی سے دیکھتے ہی دیکھتے وہی...... جھونپڑے آباد نظر آنے لگے، جو تھوڑی دیر پہلے ویرانی اور خالی پن کا منظر پیش کیے ہوئے تھے۔ وہاں روشنی ہو گئی۔ الاؤ جل پڑا۔ اس ویران بستی کی زندگی جیسے اچانک بیدار ہونے لگی تھی۔ جھونپڑوں سے ان کی عجیب سی چیخی چیخی بھنبھنی آوازیں بھی خارج ہو رہی تھیں۔ یہ سب ایک گھنٹا جاری رہا اس کے بعد خاموشی چھانے لگی۔ جھونپڑوں کی دھیمی روشنیاں بھی گل ہونے لگیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بھی سو گئے ہوں۔

دن چڑھے یہ سب جاگے تھے۔ سب سے پہلے پروفیسر ہنری کی آنکھ کھلی تھی۔ شوکی بھی آنکھیں صاف کرتا ہوا اپنے خیمے سے نکلا تو چونک پڑا۔ اس نے دیکھا پروفیسر ہنری نے اپنے ایک ہاتھ میں محدب عدسہ تھام رکھا تھا اور وہ پتھریلی زمین پر جھکے جھکے کچھ دیکھتے ہوئے کبھی آگے جاتے کبھی پیچھے اور کبھی دائیں بائیں مڑتے۔

رینا، رابرٹ اور گارشیا بھی جاگ چکے تھے۔ شوکی نے محسوس کیا تھا کہ رینا اب رابرٹ سے کچھ کھنچی کھنچی سی نظر آ رہی

تھی۔تاہم وہ اب بھی اس کے ساتھ تھوڑی بہت بات کرلیتی تھی،البتہ لگ ایسا ہی رہا تھا جیسے کچھ ہوا نہیں ہو۔

''خیریت پروفیسر؟ کچھ ہوا ہے یہاں......؟''اس نے پوچھ لیا۔

''شش......شش......''پروفیسر ہنری اپنے کام میں محو رہے اور پھر اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ان کا رخ اب جھونپڑوں کی طرف تھا۔وہ اندر گئے۔وہاں بھی اسی طرح جھک کر فرش پر کچھ دیکھتے رہے۔اس کے بعد پلٹ آئے۔شوکی حیران تھا کہ آخر پروفیسر ہنری برنارڈ کو ایک رات گزرنے کے بعد ایسا کیا نظر آ گیا تھا؟

بہرکیف......اس وقت تو انہوں نے کچھ نہیں بتایا لیکن......ہلکے پھلکے ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے ایک عجیب وغریب انکشاف کرڈالا۔

''رات کے کسی پہر......اس ویران بستی کو آباد کیا گیا تھا......''

ان کی بات نے سب کو ایک دم چونکا دیا تھا۔ریتا اور گارشیا سمیت نندو بابا اور اس کی بیوی شانتا کے چہروں پر دبا دبا ہراس بھی ابھرا تھا۔البتہ شوکی اس لیے پروفیسر کی بات پہ چونکا تھا کہ اس نے خود بھی رات کے پہر ایک عجیب وغریب وضع کا سایہ دیکھا تھا جو تیزی سے ایک جانب کو لپک گیا تھا۔اس نے اسے اپنے واہمہ یا کسی چھوٹے موٹے آوارہ جانور پر محمول کیا تھا۔تاہم سر دست خاموش رہا۔

یہ پانچوں دائرے کی صورت میں ایک گول فولڈنگ ٹیبل کے گرد اسی طرح کی چیئرز پر بیٹھے تھے۔شوکی کو بھی پروفیسر ہنری اپنے ساتھ بٹھایا کرتا تھا۔باقی ملازمین نندو بابا، شانتا، امجد خان اور دونوں فوجی ان کے گرد کھڑے غور سے پروفیسر کی باتیں سن رہے تھے۔البتہ شوکی کو پروفیسر کے ساتھ والی کرسی پر بٹھائے جانے پر رابرٹ نے ناک بھوں ضرور چڑھائی تھی۔

ایک نیا اور چونکا دینے والا موضوع چھڑ جانے کے باوجود شوکی گزشتہ شب والے واقعے کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا اور ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ وہ پروفیسر ہنری سے رابرٹ کی شکایت کرے یا نہیں......کیونکہ اسے خدشہ تھا کہ ریتا ناراض ہوسکتی تھی۔نجانے ان کا آپس میں ایسا کیا رشتہ تھا کہ ریتا، رابرٹ کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے محترز تھی؟

''انکل ہنری! اس بستی کو تو ہم نے آباد کر رکھا ہے۔ ہمارے علاوہ اور تو کوئی ابھی تک نظر نہیں آیا......؟''رابرٹ نے بے تاثر سے لہجے میں کہا۔

''یہ سب اس وقت ہوا ہے جب ہم لوگ گہری نیند میں پڑے سو رہے تھے۔''ہنری بولا۔

''اب آپ ہی بتایئے جناب! آپ کو ایسا کیوں اور کیسے محسوس ہوا کہ یہاں کوئی اور لوگ بھی آئے تھے؟''اس بار امجد نے سوال کیا۔

''وہ لوگ جو کوئی بھی تھے، اس بستی کے باسی ہیں۔دن بھر میں کہیں چلے جاتے ہیں اور رات کے کسی پہر لوٹتے ہیں۔یہ امن پسند لگتے ہیں اور یہ بے چارے شاید کسی مصیبت میں مبتلا ہیں۔''ہنری پُرغور سے انداز میں کہے جا رہا تھا۔اس کے چہرے پر ایک جوش سا ابھرتا محسوس ہوتا تھا۔اس میں رنج کی خوشی بھی تھی اور کچھ کرنے کا جذبہ بھی۔اس نے بات جاری رکھی اور آگے بولا۔''مجھے خوشی ہے کہ میں اپنی مہم کی پہلی منزل پر پہنچ چکا ہوں......میری علمی تحقیق کا آغاز اسی راکاشی قبیلے کی بستی سے ہوگا۔یہ لوگ کیوں اور کیسے اس حال کو پہنچے، میں نے نہ صرف اس کا کھوج لگانا ہے بلکہ ان کی مدد بھی کرنا ہے۔''

''بات اب بھی کلیئر نہیں ہوئی ہے انکل ہنری!'' گارشیا نے کہا۔وہ سب سے زیادہ متجسس ہو رہی تھی۔''آپ کو یہ کیسے پتا چلا کہ وہ یہاں آئے تھے؟''

''ان کے پیروں کے نشانات......جو بہ ظاہر انسانی لگتے ہیں، مگر کسی مجبوری کی بنا پر یہ چوپایوں کی طرح چلنے پر مجبور ہیں......یہ رات کو آئے تھے اور پھر چلے گئے۔نجانے کہاں جاتے ہیں اور کیوں......؟ یہ نہیں سمجھ میں آیا۔''

''میں نے کل رات ایک ایسا ہی سایہ اپنے خیمے کے باہر دیکھا تھا مگر میں نے اسے اپنا واہمہ سمجھا تھا۔''بالآخر شوکی بولا۔ہنری نے مسکرا کر کہا۔

''یقیناً دیکھا ہوگا......''پھر وہ کرسی چھوڑتے ہوئے بولے۔''اگلے کوچ کی تیاری کرو......اب ناگرہ پہنچ کر اپنا بیس کیمپ سنبھالنا ہے۔میں دوبارہ یہاں آؤں گا، کیونکہ یہ جگہ یہاں سے دور نہیں ہے۔''

ایک بار پھر کوچ کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔اس نئے انکشاف کے بعد ہر کوئی اپنے اندر ایک عجیب سی سنسنی محسوس کر رہا تھا۔ہر کسی کو تجسس ہو رہا تھا کہ آخر پتا تو چلے یہ پراسرار چکر تھا کیا......؟

ناگرہ یہاں سے چند سو کوس کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ روانگی کے وقت سے ذرا پہلے جب شوکی تنہا اپنے خیمے میں ضروری سامان باندھ رہا تھا کوئی اندر داخل ہوا......کسی کی آہٹ پر اس نے گردن گھما کر دیکھا تو چونک پڑا......

جاری ہے

جیون دان

وسیم بن اشرف

کہتے ہیں جتنی جس کی سانس... اتنی اس کی آس مگر ایک دوسرے کے لیے جینے مرنے والے فقط ایک لمحے میں فیصلہ کرلیتے ہیں کہ کسے کس کے لیے جینا اور مرنا ہے... اپنے لیے یا دوسروں کے لیے... اور اسی ایک لمحے پر مشتمل یہ تحریر بھی بہت کچھ سوچنے پر مجبور کررہی ہے۔

جیون دان کرنے والے ایک مخلص دوست کا قصہ

ستمبر کی سہانی شام تھی، آسمان پر بادلوں کے تیرتے ٹکڑوں کا نظارہ بہت دلکش تھا۔ سمندر کی لہریں ہوا کے خوشگوار جھونکوں کے ساتھ محوِ رقص تھیں۔ شاندار بحری جہاز دھیرے دھیرے سمندر کا سینہ چیرتا اپنی منزل کی جانب گامزن تھا۔ مسافروں میں سے کچھ اپنے کیبنوں میں آرام کررہے تھے، کچھ ڈائننگ ہال میں پیٹ پوجا میں مصروف تھے۔ بہت سے ڈیک پر سمندر کے حسین نظاروں سے لطف اندوز ہورہے تھے، ڈیک پر ہی دو نوجوان ریلنگ کا سہارا لیے لہروں کا رقص

دیکھ رہے تھے۔ ایک نوجوان جس کے بال سنہری اور آنکھیں گہرے نیلے رنگ کی تھیں، اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا۔

"جانتے ہو علی یہ لہریں کہاں جارہی ہیں؟"

علی نے دوست کے سرخی مائل حسین وجمیل چہرے پر نظر ڈالی اور جواب دیا۔

"انگلینڈ...... کیونکہ یہ ہمارے جہاز کے ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔"

"کیا یہ لہریں اس بات سے واقف ہیں کہ ان کی منزل کہاں ہے؟" نوجوان نے پھر سوال کیا۔

"شاید نہیں...... لیکن راجر تم ایسے سوال کیوں پوچھ رہے ہو؟" علی بولا، راجر نے گہرا سانس لیا پھر بولا۔

"انسان کی زندگی بھی ان لہروں کی طرح غیر یقینی ہے، کوئی بھی نہیں جانتا کہ اس کی منزل کہاں ہے لیکن پھر بھی سب چل رہے ہیں، جیسے چلتے رہنا ہی ان کی زندگی کا واحد مقصد ہے۔"

علی نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "یہ شاعروں کے سوچنے کی باتیں ہیں، ہم سپاہی ہیں، ہمارے سوچنے کا انداز دوسرا ہونا چاہیے۔"

راجر نے فوری جواب دیا۔ "تم غلط کہتے ہو علی، سپاہی ہونے سے انسان کے جذبات بدل نہیں جاتے۔ مثال کے طور پر سوئی چبھونے سے سپاہی کو بھی اتنا ہی درد ہوگا جتنا کسی شاعر کو ہوگا۔"

علی خلا میں گھورتے ہوئے کہنے لگا۔ "میں تو اتنا جانتا ہوں کہ شاعر ایک خیالی دنیا کا باشندہ ہوتا ہے لیکن زندگی کے بارے میں ایک سپاہی کا نظریہ دوسرا ہی ہوتا ہے، وہ دشمن کو انجام تک پہنچا کر دوست کی بقا کا ذریعہ بنتا ہے، اس کے دل میں دوسروں کے لیے قربانی دینے کے جذبات ہوتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" راجر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن ایسے کتنے سپاہی ہیں جن کے دل میں دوسروں کے لیے قربانی دینے کے جذبات اتنے مستحکم ہو چکے ہیں کہ وہ صرف اپنے ضمیر کی آواز پر اپنا سب کچھ نچھاور کر دیتے ہیں۔ میں خارجی حالات کی بات نہیں کر رہا ہوں جن سے مجبور ہو کر کبھی کبھی انسان کو اپنے جذبات کے خلاف بھی کوئی کام کرنا پڑ جاتا ہے۔ میں تو صرف ایسے لوگوں کی تعداد پوچھ رہا ہوں جو اپنی خوشی سے دوسروں کا جیون روشن کرنے کے لیے اپنے جیون کا دیپ خود ہی بجھا دیتے ہیں۔"

علی نے سر کھجاتے ہوئے جواب دیا۔ "گنتی تو میں بھی نہیں کرسکتا، لیکن اتنا سمجھتا ہوں کہ صرف ایسے ہی لوگ حقیقت میں انسان کہلانے کے مستحق ہیں اور میں ان کی عظمت کے آگے اپنا سر تسلیم خم کرتا ہوں۔"

اسی وقت ماحول میں کھنکتا ہوا قہقہہ گونج اٹھا، دونوں نے پلٹ کر دیکھا تو مسز فروم اپنے شوہر کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلی آرہی تھیں۔ قریب آکر میاں بیوی نے راجر اور علی سے موسم کے بارے میں گفتگو شروع کر دی۔ کچھ ہی دیر بعد مسٹر فروم بولے۔

"اچھا دوستو! پھر ملیں گے، اس وقت ہم ڈاکٹر کے پاس جارہے ہیں۔"

علی نے پوچھا۔ "خیریت تو ہے آپ ڈاکٹر کے پاس جا رہے ہیں؟"

مسز فروم زور سے ہنس پڑیں، پھر بولیں۔ "بدقسمتی سے مجھے دو تین چھینکیں کیا آگئیں کہ انہیں وہم ہو گیا کہ میری طبیعت ناساز ہے، اب زبردستی ڈاکٹر کے پاس لے جارہے ہیں۔"

راجر ہنس پڑا، کہنے لگا۔ "آپ تو بڑی خوش نصیب ہیں کہ اتنی محبت کرنے والا شوہر ملا ہے آپ کو، مجھے تو رشک آتا ہے آپ کی زندگی پر۔"

مسز فروم کے لبوں پر تبسم تھا، کہنے لگیں۔ "ضرورت سے زیادہ محبت بھی کبھی مصیبت بن جاتی ہے۔"

مسٹر فروم نے اس کا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔ "اب چلو گی بھی یا یونہی باتیں بناتی رہو گی۔"

پھر ملنے کا وعدہ کر کے دونوں رخصت ہو گئے، علی آسمان پر تیرتے بادلوں کے رنگین ٹکڑے دیکھنے لگا۔ شام کے ڈوبتے سورج نے فضا کو چمکدار اور دلکش رنگوں سے سجا رکھا تھا۔ علی کی نظریں آسمان سے پھسلتی ہوئی پانی کے چمکیلے تخت پر دور تک پھیلتی چلی گئیں۔ خود کلامی کے انداز میں بولا۔ "دو دن اور دو راتیں، پورے اڑتالیس گھنٹے ابھی پانی میں سفر کرنا ہے۔"

علی نے پوچھا۔ "راجر! تم سیدھے وینٹ ورتھ جاؤ گے، روتھ کے پاس؟"

"اس بھری پری دنیا میں میرا صرف ایک ہی ٹھکانا ہے۔" راجر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ علی نے پھر سوال کیا۔ "تمہیں پورا یقین ہے کہ روتھ تم سے اتنی ہی محبت کرتی ہے جتنی تم اس سے کرتے ہو؟"

راجر پراعتماد لہجے میں بولا۔ "وہ مجھ سے کہیں زیادہ پیار کرتی ہے، اس کی محبت میں بناوٹ نہیں ہے، وہ تصنع سے پاک ہے۔ جب میں انگلینڈ سے رخصت ہو رہا تھا تو میں نے اس کو شادی کی پیشکش کی تھی، پتا ہے اس کا جواب کیا تھا، اس

نے کہا تھا۔ ”راجر شادی دلوں کی ہوتی ہے جسم کی نہیں، یہ تو دو روحوں کے ملاپ کا نام ہے، ہماری شادی ہو چکی ہے، اس وقت تمہیں تمہارا فرض پکار رہا ہے، میں تمہارے راستے میں رکاوٹ نہیں بننا چاہتی۔“

علی دور اس لکیر کو دیکھنے لگا جو آسمان اور سمندر کے ملنے سے بن گئی تھی، سورج کی کرنیں طویل مسافت کے بعد نیا لے پانی کو چھونے آئی تھیں، ماحول کچھ اور نکھر گیا تھا۔

راجر نے.....کھوئے کھوئے لہجے میں.......پوچھا۔

”علی تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟“ علی نے راجر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جواب دیا۔

”دوست، مجھے محبت کرنے کے لیے کبھی فرصت ہی نہیں ملی۔ بچپن میں ہی میرے باپ کی بینائی ختم ہو گئی، جس عمر میں بچے پریوں کی کہانیوں سے دل بہلاتے ہیں، اس عمر میں مجھے پیٹ کا جہنم سرد کرنے کی فکر لگ گئی تھی، تب سے اب تک میری زندگی مشین کے پہیے کی طرح گھوم رہی ہے۔“

راجر کا دل بھر آیا، وہ بولا۔ ”سنو علی! جنگ ختم ہو چکی ہے، طویل عرصے بعد زندگی میں سکون اور فرصت کے لمحات میسر آئے ہیں، تم کچھ دن میرے ساتھ وینٹ ورتھ چلو، تھوڑا گھوم پھر کر اپنے گھر چلے جانا۔“

علی نے راجر کا ہاتھ تھام لیا اور کہنے لگا۔ ”تمہارے اس خلوص کا شکریہ، لیکن میں سیدھا گھر جاؤں گا، میرے بوڑھے ماں باپ میری راہ تک رہے ہوں گے، میں ان کی زندگی کا واحد سہارا ہوں۔“

اسی اثنا میں جہاز تھوڑا سا ڈگمگایا، دونوں بہ مشکل سنبھلے۔ جہاز کے انجن والی جانب سے شور سا سنائی دیا، ابھی وہ اس شور کی وجہ بھی نہ جان پائے تھے کہ خطرے کا الارم چیخ اٹھا، ہر طرف سراسیمگی پھیل گئی، ہل چل مچ گئی، مسافروں کے چہروں کا رنگ اُڑ گیا۔ ہر کوئی پریشانی کے عالم میں تھا، اسی دوران لاؤڈ اسپیکر پر کپتان نے اعلان کیا کہ مشرق کی جانب سے خوفناک طوفان آ رہا ہے، جہاز خطرے میں ہے۔ مسافروں کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو، اوپر آسمان نیچے گہرا سمندر، ابھی مسافر سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ طوفان سر پر آ پہنچا، چھوٹی چھوٹی لہریں پانی کی اونچی دیواروں میں تبدیل ہو کر جہاز سے ٹکرانے لگیں، اچھا خاصا بڑا جہاز کاغذ کی ناؤ کی طرح ڈگمگانے لگا۔ چاروں طرف سے جہاز میں پانی بھرنے لگا۔ عملے کی بھرپور کوششوں کے باوجود صورت حال قابو سے باہر ہو رہی تھی۔ مسافر اس قدرتی افتاد سے گھبرا کر اوپر والی منزل کی جانب بھاگنے لگے، سبھی کو جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔

اسی بھگدڑ میں نہ جانے کتنی عورتیں اور بچے سیڑھی سے پھسل کر کبھی نہ اٹھنے کے لیے نیچے جا گرے، لوگ انہیں کچلتے ہوئے اوپر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جہاز میں قیامت صغریٰ بپا ہو چکی تھی۔ جہاز کے ذمہ دار افسروں نے جان بچانے والی چھوٹی کشتیاں پانی میں اتارنا شروع کر دیں، پہلی کشتی میں ہی اتنے مسافر بھر گئے کہ وہ بوجھ برداشت نہ کر سکی، مسافروں کی ہڑبونگ نے معاملہ اور بھی خراب کر دیا۔ پہلی کشتی نے چند چکر کاٹے اور متعدد مسافروں سمیت غرق آب ہو گئی، جہاز میں کشتیاں کم اور مسافر زیادہ تھے، پہلی کشتی کا بھیانک انجام دیکھ کر جہاز کے افسروں نے فیصلہ کیا کہ جتنے مسافر بچ سکتے ہیں ان کو بچا لیا جائے جو رہ گئے، وہ خدا کے سپرد۔

گویا

○ پیار تو اندھا ہوتا ہے گویا لیکن پیار کرنے والوں کی تو آنکھیں ہوتی ہیں۔

○ پیار کرنے والوں کی ”آنکھیں چار“ ہوتی ہیں گویا لیکن انہیں دیکھنے والی آنکھیں ہزار ہوتی ہیں۔

○ پیار کرنے والے کسی سے نہیں ڈرتے گویا سوائے محبوبہ کے بھائی کے جوتوں سے۔

○ پیار کیا نہیں جاتا، یہ تو بس ہو جاتا ہے گویا تو جب پتا چلے کہ ہو گیا ہے تو کرنا چھوڑ دو۔

○ پیار میں بھوک پیاس اڑ جاتی ہے گویا لیکن عقل گھاس چرنے چلی جاتی ہے۔

○ پیار کرنے والوں کی آنکھوں سے نیند روٹھ جاتی ہے گویا کیونکہ وہ جاگتی آنکھوں سے خواب بننے لگتے ہیں، جو کبھی سچ نہیں ہوتے۔

○ پیار دو دلوں کا سنجوگ ہے گویا دو زندگیوں کا روگ ہے۔

○ پیار آنکھوں کا نور ہے گویا عقل کا فتور ہے۔

○ پیار جینے کا ڈھنگ سکھاتا ہے گویا خودکشی کے طریقے سمجھاتا ہے۔

○ پیار جذبات کی خوبصورتی کا نام ہے گویا اعصاب کی شکستگی کا نام ہے۔

○ پیار میں ہر موسم سہانا لگتا ہے گویا پھر شادی کے چند دنوں بعد ہی اپنی اس سوچ پر پچھتانا پڑتا ہے۔

تبسم ضیا......لاہور

جہاز کٹی پتنگ کی طرح پانی میں چکرا رہا تھا۔ پانی بہت تیزی سے بھر رہا تھا، نکاسِ آب کے راستے کھولنا صورتِ حال کو مزید خراب کرنے کے مترادف تھا۔ مسافروں کو سامنے موت نظر آ رہی تھی، دل بری طرح دھڑک رہے تھے، ہر کسی کو شدت سے اپنی باری کا انتظار تھا۔ انتظامیہ نے فوری فیصلہ کیا کہ قرعہ اندازی کی جائے گی، جن جن کا نام نکلے گا وہ خوش نصیب کشتیوں میں اتارے جائیں گے، چنانچہ کشتیوں میں صرف انہی افراد کو اتارا جا رہا تھا جن کا نام قرعہ اندازی میں نکل رہا تھا۔ نام نکلنے کا مطلب زندگی اور نہ نکلنے کا مطلب گویا خوفناک اور بے بسی کی موت تھا اسی دوران مسٹر فروم کا نام پکارا گیا۔ وہ زندگی کے سفر پر روانہ ہو رہے تھے لیکن بدقسمتی سے مسز فروم کا نام نہیں نکلا تھا۔ فروم نے بیوی کا ہاتھ چھوڑ دیا اور کشتی میں اتر گئے۔ مسز فروم شوہر کی سنگ دلی پر رو پڑیں۔ کہنے لگیں۔

”ڈارلنگ! تم تو مجھے جان سے بھی زیادہ پیار کرتے تھے اب موت کے حوالے کر کے جا رہے ہو۔“ فروم نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کشتی میں اترنے کی جلدی کی۔ اس نے صرف ایک بار اپنی بیوی کی طرف مڑ کر دیکھا تھا۔ وہ یقیناً یہی سوچ رہا تھا کہ بیوی تو اور بھی مل سکتی ہے لیکن زندگی دوبارہ نہیں ملے گی۔

علی اور راجر نے گہری نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان کی قسمت کا فیصلہ بھی ہونے والا تھا کہ اچانک راجر آگے بڑھا اور نائب کپتان سے مخاطب ہوا۔ ”ایکسکیوزمی۔“

”جی فرمائیں۔“ کپتان نے جواب دیا۔

”میں اور علی دیرینہ دوست ہیں، ہم اپنی زندگی اور موت کا فیصلہ بھی خود کرنا چاہتے ہیں۔“ راجر نے جواب دیا۔

”کیا مطلب؟“ کپتان نے استفسار کیا۔

”ہم اپنی پرچی خود نکالیں گے آپ دو پرچیاں اور قلم عنایت کر دیں۔“ راجر بولا۔

نائب کپتان کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا، اس نے فوراً دو پرچیاں اور قلم راجر کو دے دیا۔ راجر نے دونوں پرچیوں پر نام لکھنے کے بعد اچھی طرح تہ کیا اور کپتان کو قلم لوٹانے کے بعد بولا۔ ”پرچی بھی آپ ہی اٹھائیے گا۔“ راجر نے دونوں ہاتھوں میں پرچیوں کو اچھی طرح ہلایا اور مٹھی کھول دی، کپتان نے ایک پرچی اٹھالی۔

”مسٹر علی! تمہیں زندگی مبارک ہو۔“ علی کے نام کی پرچی نکلنے پر وہ بولا۔ ”راجر نے دوسری پرچی مٹھی میں بھینچ لی، علی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے راجر کی طرف غور سے دیکھا، لیکن اس کے چہرے پر موت کی پرچھائیں اسے دور دور تک نظر نہ آئیں۔ علی نے قدم آگے بڑھانا چاہا لیکن جیسے اس کی ٹانگیں کسی نے جکڑ لی ہوں، اس کے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں، اس نے طوفانی موجوں کو دیکھا جو جہاز کو نگلنے کے لیے بے قرار تھیں پھر ایک نظر اس چھوٹی کشتی پر ڈالی جو موت کے اسٹیج پر زندگی کا گیت گنگنا رہی تھی۔ راجر نے علی کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا اور دھیرے سے بولا۔

”علی تم اپنے بوڑھے والدین کا واحد سہارا ہو، اگر تم نہ رہے تو وہ بے موت مر جائیں گے، تمہیں نئی زندگی مبارک ہو، جاؤ اور اپنے والدین کی خوب خدمت کر کے اپنی آخرت سنوار لو۔“

”لیکن...... لیکن روتھ...... وہ تمہارا انتظار کر رہی ہے، میرے دوست۔“ علی نم آنکھوں سے بولا۔

”وہ زندگی بھر میرا انتظار کر سکتی ہے، میں جانتا ہوں اس میں اتنی ہمت ہے۔“ راجر بولا۔ ”کبھی کبھی اسے میری یاد آئے گی مگر وقت بڑے بڑے گھاؤ بھر دیتا ہے، اس کا دکھ بھی وقت کے ساتھ ساتھ کم ہوتا جائے گا پھر کبھی نہ کبھی میں اس کے دل و دماغ سے نکل جاؤں گا۔“ یہ کہتے ہوئے راجر رنجیدہ ہو گیا، علی نے اسے گلے لگا کر زور سے بھینچا، اس کے ماتھے پر الوداعی بوسہ دیا اور پیچھے دیکھے بغیر اپنی کشتی میں اتر گیا۔ وہ کشتی میں بیٹھا ڈوبتے جہاز کو دیکھ رہا تھا، کشتی دھیرے دھیرے دور ہونے لگی، اسے راجر جہاز کی سیڑھی پر کھڑا ہاتھ ہلاتا نظر آیا، اس کے بال ہوا میں اڑ رہے تھے اور وہ لگاتار لگنے والے جھٹکوں سے خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

پانی کی ایک بڑی لہر نے جہاز کو سمندر کا لقمہ بننے پر مجبور کر دیا، جہاز پر چیخ و پکار مچی ہوئی تھی، بے بسی کی موت مرنے والوں کی دل دہلا دینے والی چیخوں سے شاید آسمان کے بھی آنسو نکل پڑے تھے۔ آسمان سے بوندیں برس رہی تھیں۔

راجر ڈیک کے آخری کونے پر ریلنگ تھامے آسمان کو الوداعی نظروں سے دیکھنے لگا، جہاز دھیرے دھیرے ڈوب رہا تھا۔ جہاں راجر کھڑا تھا وہ حصہ بھی تہ آب جانے لگا، راجر نے آنکھیں بند کر لیں اور بند مٹھی والا ہاتھ بلند کر لیا، ڈوبتے ڈوبتے جب مٹھی بھی غرقِ آب ہونے لگی تو اس نے بند مٹھی کھول دی۔ اس کی مٹھی سے ایک پرچی نکلی اور سطحِ آب پر تیرنے لگی، اس دوسری پرچی پر بھی علی کا ہی نام لکھا ہوا تھا۔

تیسری کوشش

تنویر ریاض

جسے جان سے گزرنا ہوتا ہے کتنے ہی جی جان سے اس کی حفاظت کرلی جائے... وہ گزر ہی جاتا ہے اور جسے جینا ہوتا ہے اس کی جان کے دشمن بھی منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ کچھ ایسے ہی اسرار بھرے معاملات یہاں بھی چل رہے تھے جب وہ شریکِ سفر کسی کے ساتھ مجرمانہ سرگرمیوں میں شریک ہوا تو ان کا سفر بھی اپنی سمت بدل گیا۔

قاتل سے مقتول بننے والے ایک مجرم کی کارروائی کا ماجرا

میوزیم میں رکھے ہوئے چھوٹے سے سیاہ رنگ کی بلّی کے مجسمے کو دیکھ کر جینی نے بے ساختہ کہا۔ ''شاید قدیم مصری بلّیوں کو بہت اہمیت دیتے تھے۔'' کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا اس کا شوہر جان مارک اس کی بات نہ سمجھ سکا بولا۔

''کیا کہہ رہی ہو؟''

''کچھ نہیں۔'' جینی نے بے پروائی سے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ مجھے دفتر واپس جانا چاہیے۔ کافی کام کرنا ہے۔''

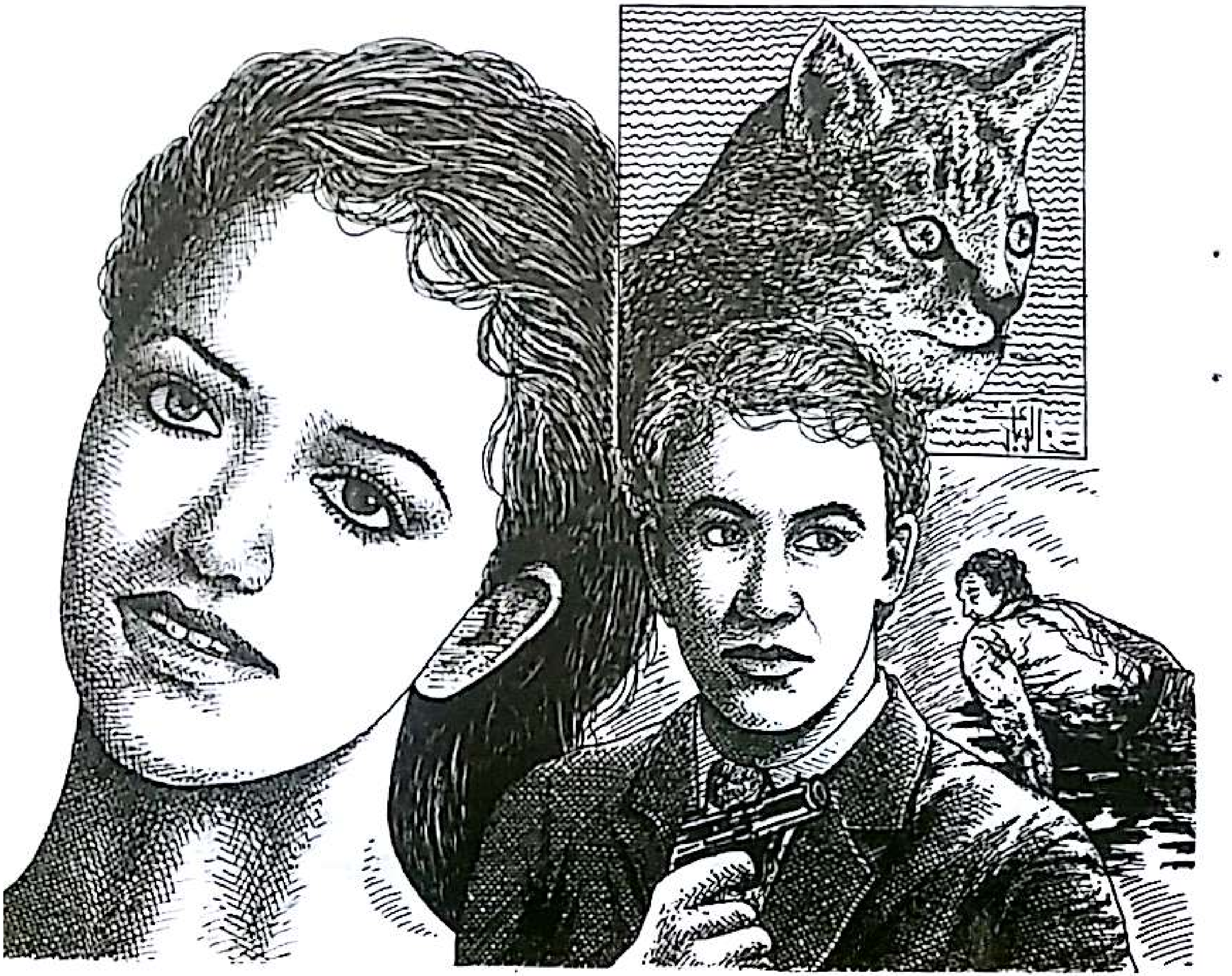

ان کی ملاقات کھانے کے وقفے میں ہوئی تھی اور وہاں سے وہ میوزیم آ گئے تھے۔ ان دنوں وہ قدیم مصریوں پر ایک کتاب کی ایڈیٹنگ کررہی تھی اور بولون کے اس عجائب گھر میں مصری نوادرات کا ایک بڑا ذخیرہ موجود تھا۔

"میں جلدی گھر آ جاؤں گا۔" جان نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا اور گیلری عبور کرتا ہوا باہر چلا گیا۔ ایک عورت اس پر نظریں جمائے ہوئے تھی، جب اس نے دیکھا کہ جینی بھی اسے ہی دیکھ رہی ہے تو اس کی نگاہوں کا زاویہ بدل گیا۔ ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ اکثر کئی عورتیں اس کے شوہر کو دیکھنے لگتیں۔ 'دفع کرو' اس نے سوچا۔ 'وہ میرا ہے صرف میرا۔' اس میں ان عورتوں کا بھی قصور نہیں تھا۔ وہ اتنا خوش شکل اور ہینڈسم تھا کہ سب کی نظریں اس پر جم ہی جاتیں۔

جینی دوبارہ شوکیس کی جانب متوجہ ہوگئی۔ وہاں مٹی سے بنی ہوئی بہت سی چیزیں رکھی ہوئی تھیں لیکن وہ بلی کا مجسمہ اس کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ ابھی وہ اسے دیکھ ہی رہی تھی کہ اسے اپنے قریب کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ یہ وہی عورت تھی جو جان کو دیکھ رہی تھی۔ وہ تقریباً جینی کی ہی ہم عمر تھی۔ اس کا چہرہ پُرکشش اور لمبے سیاہ بال تھے۔

"معاف کرنا میڈم۔ وہ شخص......"

جینی اس کی پوری بات نہیں سمجھ سکی۔ گو کہ اس کی فرانسیسی بہتر ہورہی تھی لیکن اب بھی اسے لوگوں کی بات سمجھنے میں مشکل ہوتی تھی۔

"تم بہت تیز بول رہی ہو۔" جینی نے کہا۔

"اوہ میں سمجھی۔ تم انگریز ہو۔" اس عورت نے کہا۔ "وہ شخص جو ابھی تمہارے پاس سے گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں اسے جانتی ہوں۔ کیا وہ تمہارا دوست ہے؟"

"نہیں۔ وہ میرا شوہر ہے۔"

"تمہارا شوہر۔ کیا وہ وکیل ہے اور اس کا تعلق بینزیرز سے ہے؟"

"نہیں وہ یہیں بولون میں اسٹیٹ ایجنٹ ہے۔"

جان مارک کسی زمانے میں قانونی معاون تھا لیکن وہ لیون کا رہنے والا تھا اور بولون آنے سے پہلے اس نے کچھ عرصے پیرس میں اسٹیٹ ایجنٹ کے طور پر کام کیا تھا۔ بینزیرز نامی قصبہ فرانس کے جنوب میں کہیں واقع تھا اور جینی جانتی تھی کہ وہ کبھی وہاں نہیں رہا۔

"معذرت خواہ ہوں۔" عورت نے کہا۔ "مجھے یقین تھا لیکن ہوسکتا ہے کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہو۔"

یہ کہہ کر وہ مسکرائی اور وہاں سے چلی گئی۔ جینی نے میوزیم کی چھوٹی سی دکان سے وہ بلی کا مجسمہ خریدا اور گھر آ گئی۔ کاٹیج کے دروازے پر ایک اصلی بلا اس کا انتظار کررہا تھا۔ اس کا رنگ سیاہ اور سفید تھا اور وہ اس کے پڑوس میں رہنے والی معمر بیوہ کی ملکیت تھا۔ اسے دیکھ کر وہ اس کی جانب بڑھا تاکہ جینی اس کی کمر پر ہاتھ پھیرے لیکن وہ اسے ہاتھ لگائے بغیر اندر داخل ہوگئی۔ اس نے اپنے لیے چائے بنائی اور اوپر اپنی اسٹڈی میں چلی گئی۔

کاپی ایڈیٹنگ کہیں بھی ہوسکتی تھی اور وہ زیادہ تر کام اپنے ہی گھر میں کرتی۔ کبھی کبھار وہ لندن کا چکر بھی لگا لیتی۔ اس کے والدین کافی دولت مند تھے اور ان کا تعلق ڈاکٹری کے پیشے سے تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ جینی بھی کوئی ایسا ہی کام کرے۔ جینی کو بڑے ہوکر احساس ہوا کہ وہ ٹھیک ہی کہتے تھے۔ اس کا باپ اس وقت مر گیا جب وہ نوعمر تھی اور ماں کا انتقال ایک سال پہلے ہوا تھا۔ ان کی ساری دولت اس کے حصے میں آئی۔ اس کی ملاقات جان سے اس وقت ہوئی جب وہ اپنی ماں کا فرانسیسی مکان فروخت کرنے یہاں آئی۔ چھ ماہ بعد اس نے جان سے شادی کرلی اور فارم ہاؤس فروخت کرنے کے بجائے وہ جان کے ساتھ اس میں منتقل ہوگئی۔

اس نے مجسمے کو کاغذ کے تھیلے سے نکالا اور ہتھیلی پر رکھ کر اسے دیکھنے لگی۔ جب جان کام پر چلا جاتا تو وہ دن بھر گھر میں اکیلی ہوتی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ بھی ایک بلی پالے لیکن جان کو بلیوں سے الرجی تھی لہٰذا وہ اس چھوٹے سے مجسمے سے ہی دل بہلا سکتی تھی۔ قدیم مصری تہذیب میں بلیوں کو بہت مقدس مانا جاتا تھا۔ اس نے اپنا لیپ ٹاپ کھولا اور اس بارے میں مزید جاننے کی کوشش کرنے لگی۔ قدیم مصری تہذیب میں بلی کو اوتار کا درجہ حاصل تھا اور اسے خوشی، محبت اور راحت کی دیوی سمجھا جاتا تھا۔

اس نے ایک جماہی لی۔ دوپہر کے کھانے کے بعد مشروب پینے سے اسے نیند آنے لگتی تھی۔ اس نے سوچا کہ باہر کا ایک چکر لگایا جائے۔ اس نے گھر کو تالا لگایا اور اس سڑک پر جانے لگی جو جنگل کی طرف جاتی تھی پھر اسے میڈلین کا خیال آیا جو ایک چھوٹے سے گھر میں رہتی تھی جو کسی ماہر جنگلات کی ملکیت تھا۔ وہ وہاں سے گزر رہی تھی کہ میڈلین باہر آ گئی۔ وہ ان عمر رسیدہ فرانسیسی عورتوں میں سے تھی جو اپنا خیال رکھتی ہیں۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس نے جنگ کے زمانے میں ایک جرمن سپاہی کو قتل کیا تھا جو فرانسیسی فوج کی سپلائی لائن کو سبوتاژ کررہا تھا گو کہ کبھی اس

نے اس کا اعتراف نہیں کیا لیکن تردید بھی نہیں کی۔

جینی اس کے بارے میں مزید جاننا چاہتی تھی۔ ان کے درمیان ہائے ہیلو ضرور ہوتی لیکن میڈلین نے کبھی اس کے علاوہ کوئی بات نہیں کی حالانکہ اس کا رویہ غیر دوستانہ نہیں تھا۔ وہ پڑوسی ہونے کا حق ادا کر رہی تھی لیکن اس کا رکھ رکھاؤ اکثر خوفزدہ کر دیتا تھا۔ اس روز اس نے جینی کو اشارہ کیا اور فرانسیسی میں کچھ کہا جو وہ نہ سمجھ سکی۔

اس نے جنگل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے جہاں بہت دور سے فائر کی آوازیں آرہی تھیں۔ تب جینی کی سمجھ میں آیا۔ جنگل میں شکاری آگئے تھے۔ وہ جنگلی خنزیر اور خرگوشوں کی تلاش میں تھے۔ وہ یہ بات پہلے سے جانتی تھی کہ شکار کا موسم شروع ہونے کے بعد جنگل کی طرف نہیں جانا چاہیے۔ ہر سال کئی لوگ حادثات کا شکار ہوجاتے تھے لیکن اس کا خیال تھا کہ وہ سڑک پر محفوظ ہے جبکہ میڈلین اسے آگے جانے سے روک رہی تھی۔

جینی نے اس کا شکریہ ادا کیا اور یہ سوچتی ہوئی گھر آگئی کہ اب وہ موسم بہار کی آمد تک جنگل کی طرف چہل قدمی کے لیے نہیں جاسکے گی۔ وہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوئی تو اسے فون کی گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ جان کا فون تھا کہ اسے گھر آنے میں دیر ہوجائے گی۔ ''ایک پارٹی بڑا مکان خریدنا چاہ رہی ہے لیکن وہ لوگ کل صبح یوکے واپس جارہے ہیں۔ اس لیے ہمیں دیر تک کام کرنا ہوگا۔ میں اور آرنلڈ کچھ کھالیں گے۔''

ان دنوں وہ کبھی کبھار دیر تک کام کرتا تھا۔ یہ ایک اچھی بات تھی اور اس کا مطلب تھا کہ جائداد کی خرید وفروخت میں تیزی آگئی ہے۔ جینی نے آملیٹ بنا کر کھالیا اور اسٹڈی میں چلی گئی۔ اس نے نو بجے تک کام کیا اور سونے کے لیے لیٹ گئی۔ بستر پر ہی اس نے نیٹ پر مقامی اخبار کا مطالعہ کیا۔ وہ باقاعدگی سے مقامی خبریں پڑھا کرتی تھی۔ اس سے اسے اپنی فرانسیسی بہتر بنانے میں مدد ملتی تھی۔ زیادہ تر خبریں گھروں میں آتشزدگی اور کار حادثات سے متعلق ہوا کرتی تھیں۔ البتہ بڑی خبر ہالی ڈے ہومز میں ڈکیتیوں کی تازہ لہر کے بارے میں تھی۔

وہ نیم غنودگی کی کیفیت میں تھی جب جان خاموشی سے آکر لیٹ گیا اور اس سے چھیڑ چھاڑ شروع کردی۔ وہ اس کی عادی تھی۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور اپنی آنکھیں بند کرلیں لیکن جان کے ہانپنے کی آواز سے دوبارہ جاگ گئی۔ اس نے اٹھ کر سائڈ بیڈ کا سوئچ آن کیا۔ وہ بیڈ کی دراز میں کچھ ٹٹول رہا تھا۔ جینی نے بستر سے چھلانگ لگائی اور اسے اِن ہیلر لاکر دے دیا۔ اس وقت جان کی حالت ایک ڈوبتے ہوئے شخص جیسی تھی۔ اس نے کبھی اسے اتنا بیمار نہیں دیکھا۔ یہ خطرے کی علامت تھی۔ وہ عجیب سی آوازیں نکال رہا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ اور آنکھیں باہر کو نکل رہی تھیں۔

اس نے اِن ہیلر ناک سے لگایا اور بہ مشکل اتنا کہہ سکا۔ ''بلی...... بستر پر۔''

''میں دیکھتی ہوں۔''

اس نے پورے گھر کا چکر لگایا۔ تمام بتیاں جلادیں اور کرسیوں کے نیچے جھانک کر دیکھا۔ ہوسکتا ہے کہ ہنری کسی طرح اندر آگیا ہو لیکن اسے یقین تھا کہ ایسا نہیں ہوا ہوگا۔

''وہاں کوئی نہیں ہے۔'' اس نے جان کو بتایا۔

جان کا سانس اب اعتدال پر آگیا تھا۔ اس نے کہا۔

''میرے سینے پر ایک بوجھ تھا۔ نرم بالوں سے بھرا ہوا۔''

''شاید تم نے خواب میں ایسا محسوس کیا ہو کیونکہ تمہیں سانس لینے میں دشواری ہورہی تھی۔''

''شاید۔'' اس نے بے یقینی کے انداز میں کہا اور تکیے پر سر رکھ دیا۔

اگلے ویک اینڈ پر موسم خوشگوار تھا۔ وہ پکنک منانے گئے اور شام کو اپنے پسندیدہ ریستوران میں چھوٹی بھیڑ کا نمکین بھنا ہوا گوشت کھایا۔ کار میں بیٹھتے ہی جینی پر غنودگی طاری ہوگئی پھر اچانک ہی ایک دھماکا ہوا اور زور سے بریک لگنے کی آواز آئی۔ وہ آگے کی طرف جھکی لیکن سیٹ بیلٹ نے اسے گرنے نہیں دیا۔

''یہ کیا تھا؟'' وہ متوحش ہوتے ہوئے بولی۔

''معاف کرنا سوئٹی۔'' جان بولا۔ ''سڑک پر کوئی جانور آگیا تھا۔ کیا کہتے ہیں اسے جس کے جسم پر سیاہ اور سفید دھاریاں ہوتی ہیں۔ ہاں بجو۔ وہ نیولے کی نسل کا ہوتا ہے تم ٹھیک تو ہو؟ بس ہم گھر پہنچنے ہی والے ہیں۔'' اس نے کار دوبارہ اسٹارٹ کی اور اپنے گھر کے ڈرائیو وے میں لاکر کھڑی کردی۔

''کیا وہ تمہاری کار سے ٹکرایا تھا؟''

''وہ بھاگ گیا تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ زخمی ہوا ہوگا۔''

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہاں اسٹریٹ لائٹس نہیں تھیں البتہ سیکیورٹی کے لیے بتیاں جل رہی تھیں۔ فٹ پاتھ پر بھی کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔

دو دن بعد صبح کے وقت میڈیلین اس کے دروازے پر آئی۔ جینی اس وقت نیٹ پر مقامی اخبار پڑھ رہی تھی جس میں ایک اور ڈکیتی کا ذکر تھا جو وہاں سے چند میل کے فاصلے پر ہوئی تھی۔ تب ہی گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔ جینی نے دروازہ کھولا تو میڈیلین تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ وہ کافی بے چین نظر آرہی تھی۔ اس نے بتایا کہ ہنری دو دن سے غائب ہے۔ وہ ہمیشہ صبح کو آجاتا تھا۔ اس نے پوچھا کہ وہ شاید کہیں بند ہو کر بیٹھا ہو۔

"ہم دیکھ لیتے ہیں۔" جینی نے کہا۔

وہ گھر سے ہوتی ہوئی باغ میں گئیں اور شیڈ میں دیکھا لیکن وہاں ہنری نہیں تھا۔ وہ پھلوں کے باغ کے آخری کونے تک گئیں اور اس کا نام لے کر پکارا۔ جینی کو امید تھی کہ وہ جنگل کی طرف نہیں گیا ہوگا ورنہ خرگوش کے دھوکے میں کسی شکاری کی گولی کا نشانہ بن جاتا پھر انہیں ایک باڑ سے اس کی دردناک میاؤں سنائی دی۔ جینی نے گھٹنوں کے بل جھک کر شاخوں کو ہٹایا۔ ہنری پلکیں جھپکا کر اسے دیکھ رہا تھا۔

لگتا تھا کہ اس کی ٹانگ میں چوٹ آئی ہے اور وہ شدید تکلیف میں تھا۔ میڈیلین کے پاس کار نہیں تھی اور وہ بس یا اپنی بیٹی پر انحصار کرتی تھی جو اسے ہر ہفتے خریداری کے لیے لے جاتی۔ لہٰذا جینی اسے اور ہنری کو اپنی کار میں جانوروں کے اسپتال لے گئی۔ ڈاکٹر کا خیال تھا کہ اسے کسی کار نے ٹکر ماری ہے اور اس کی ٹانگ کو ٹھیک ہونے میں وقت لگے گا۔ اسے آپریشن کے لیے دو دن اسپتال میں رکنا ہوگا۔

جینی اسے گھر چھوڑنے آئی تو میڈیلین نے اسے خاطر تواضع کے لیے روک لیا۔ اس کا سٹنگ روم جینی کے تصور کے عین مطابق تھا۔ وہاں بھاری فرنیچر، آرائشی چیزیں اور بچوں کی تصاویر آویزاں تھیں۔ جب میڈیلین کچن سے کھانے پینے کا سامان لائی تو جینی اس کی جوانی کی تصویر دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایک مونچھوں والے شخص کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا جس کے دوسرے ہاتھ میں ایک بندوق اور قدموں میں کتا بیٹھا ہوا تھا۔

"یہ میرا شوہر ہے۔" میڈیلین نے بڑے پیار سے کہا۔

جب جینی واپس جانے لگی تو میڈیلین نے گرم جوشی سے اس کا ہاتھ بھینچ لیا۔ جینی نے بھی جواب میں ایسا ہی مظاہرہ کیا۔ اسے ایک دوست مل گئی تھی۔ گھر آکر اس نے غسل کیا اور لباس تبدیل کر کے لنچ کرنے بیٹھ گئی۔ اس دوران وہ یہی سوچتی رہی کہ اس کی گلی میں عام طور پر کاریں نہیں آتیں۔ جان کا کہنا تھا کہ اس کی کار کے آگے ایک بجو آگیا تھا۔ اگر وہ ہنری ہوا تو..... ہوسکتا ہے کہ کم روشنی میں جان کو نظر نہ آیا ہو اور وہ ہنری کو بجو سمجھ بیٹھا۔ اسے یاد آیا کہ جان نے اس جانور کو دیکھنے کے باوجود کار نہیں روکی اور بجو کو ٹکر مارنے کے بعد ہی بریک لگایا، اگر وہ واقعی بجو ہی تھا۔

شام کو اس نے جان کو ہنری کی گمشدگی کے بارے میں بتایا تو اس نے کسی تاثر کا اظہار نہیں کیا تاہم اس نے ہنری اور میڈیلین کو اسپتال لے جانے والی بات گول کر دی اور نہ ہی یہ بتایا کہ جب ہنری ٹھیک ہو جائے گا تو وہ اسے لینے اسپتال جائے گی۔ البتہ اس نے جان سے یہ ضرور پوچھا۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ بجو ہی تھا... کہیں تم نے ہنری کو تو ٹکر نہیں ماردی؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "مجھے پورا یقین ہے ڈارلنگ۔ سیکیورٹی لائٹس روشن تھیں اور میں نے واضح طور پر دیکھا تھا۔ وہ جانور بلی سے بہت بڑا تھا اور اس کی شکل بھی مختلف تھی۔"

وہ غسل کرنے گیا تو جینی بستر پر لیٹ کر مقامی اخبار پڑھنے لگی۔ اس کی شہ سرخی تھی "وسنتٹ میں ایک عورت کا پراسرار قتل" وسنت ساحل کے کنارے ایک چھوٹا سا خوب صورت ریسورٹ تھا۔ وہ کبھی کبھار وہاں جاتے تھے۔ اس نے خبر پڑھنا شروع کی۔ عورت کی لاش ایک خالی کمرے میں پائی گئی۔ اسے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا۔ ابھی لاش کی شناخت نہیں ہوسکی۔ ابھی یہ واضح نہیں ہے کہ اس قتل کا تعلق ڈکیتی کی واردات سے ہے۔

جان غسل کر کے واپس آیا اور بستر میں گھس گیا۔ اس نے معمول کے مطابق چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ جینی نے بھی گرم جوشی سے جواب دیا اور کچھ دیر کے لیے وہ دنیا کو بھول گئے پھر وہ سو گیا اور جینی پہلو میں لیٹی اس کے خراٹوں کی آواز سنتی رہی۔ وہ اس کا شوہر تھا۔ دونوں میں بڑی محبت تھی اور وہ اس پر پورا بھروسا کرتی تھی۔ ٹھیک ہے اسے بلیاں پسند نہیں تھیں لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ ہنری کو ماردے پھر اچانک ہی اسے خیال آیا کہ اگر جان کی گاڑی نے کسی جانور کو ٹکر ماری ہو تو اس کا کوئی نہ کوئی نشان کار پر ضرور ہوگا مثلاً خون یا کھال کے بال۔

وہ خاموشی سے اٹھی اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ سیڑھیاں اتر کر اس نے کوٹ پہنا اور کچن سے ٹارچ لے کر گھر سے باہر چلی گئی جہاں جان کی کار کھڑی تھی۔ اس نے ٹارچ روشن کر کے کار کے اگلے حصے کو غور سے دیکھا۔ اگلے پہیے کے کنارے پر اس کی انگلیاں بالوں کے گچھے سے

ٹکرائیں کو کہ وہ خون آلود نہیں تھا لیکن بالکل سفید، ملائم اور ریشمی تھا۔

اگلے روز وہ اپنی میز پر بیٹھی کام کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ اسے یقین ہوگیا تھا کہ جان کی کار سے ٹکرانے والا ہنری ہی تھا لیکن یقیناً اس نے جان بوجھ کر ہنری کو ٹکر نہیں ماری ہوگی۔ وہ یہ ماننے کو تیار نہیں تھی کہ جان اتنا سنگ دل بھی ہوسکتا ہے۔ اس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے۔ اس نے کافی بنائی اور نیٹ پر اخبار پڑھنے لگی۔ اس عورت کے بارے میں مزید تفصیلات دی گئی تھیں۔ اس کی ابھی تک شناخت نہیں ہوئی تھی اور پولیس نے اس سلسلے میں لوگوں سے مدد کی اپیل کی تھی۔ اس کا جو حلیہ بیان کیا گیا تھا، اس کے مطابق اس کی عمر تیس کے لگ بھگ، لمبے گھرے براؤن بال اور ہونٹوں پر تل کا نشان۔ اس کے دماغ میں گھنٹیاں بجنے لگیں لیکن ٹیلی فون پر آنے والے ایک پیغام سے اس کی توجہ ہٹ گئی۔ ''بولون پہنچ گئی ہوں۔ تم سے جلد ملاقات ہوگی۔ ایچ۔''

ہیریٹ اس کی دوست تھی۔ وہ اس سے لنچ میں ملنا چاہ رہی تھی۔ جینی نے اپنا کوٹ اور بیگ اٹھایا اور اس سے ملنے چلی گئی۔ ان دونوں کی ملاقات یونیورسٹی میں ہوئی جہاں جینی انگریزی اور ہیریٹ فرانسیسی پڑھ رہی تھی۔ اب وہ خود ٹیچر تھی اور ویک اینڈ پر اپنے دوستوں سے ملنے نارمنڈی جارہی تھی۔

''تم جان کے ساتھ خوش تو ہو؟'' ہیریٹ نے پوچھا۔

لمحہ بھر کے لیے جینی الجھ گئی۔ وہ کیا کہتی کہ میرے شوہر نے پڑوسن کے بلے کو جان بوجھ کر ماردیا۔ وہ کسی صورت میں بھی جان کے ساتھ ناانصافی نہیں کرسکتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ہیریٹ اس کے شوہر کو اچھا سمجھے۔ اس کے کچھ دوست یہ سن کر بڑے حیران ہوئے تھے کہ وہ ایک ایسے شخص سے شادی کررہی ہے جسے وہ صرف چند ماہ سے جانتی ہے تاہم ہیریٹ جان کو شروع سے ہی پسند کرتی تھی۔

اسی وقت ایک شخص ان کی میز کے پاس آکر رک گیا۔ ''جینی! کیسی ہو؟''

وہ جان کا پارٹنر آرنلڈ تھا۔ جینی نے ہیریٹ سے اس کا تعارف کروایا۔ انہوں نے مصافحہ کیا اور کچھ رسمی جملے ادا کیے۔ آرنلڈ کو ہیریٹ کے لہجے پر بہت تعجب ہوا تو جینی نے وضاحت کی۔ ''ہیریٹ فرانسیسی پڑھاتی ہے۔''

''تم لوگ باتیں کرو۔ میں کچھ لوگوں کے ساتھ ہوں۔ آج ہمارا ایک سودا ہوگیا ہے۔''

بے ضرر

سرکس کے منیجر نے نوجوان کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آخر اس میں حرج ہی کیا ہے؟ تمہیں نوکری چاہیے تو شیر کے پنجرے میں جاکر کھڑے ہوجاؤ۔ یہ شیر بالکل بے ضرر ہے۔ دودھ پر پلا ہے۔''

نوجوان نے جواب دیا۔ ''میں بھی دودھ پر پلا تھا لیکن اب گوشت کھاتا ہوں۔''

کرن کرن سورج

☆لوگ تو ہماری خوشی میں شریک نہیں ہوتے...... غم میں کون شریک ہوگا۔

☆اگر محبت میں لطف نہیں تو نتیجے کا انتظار تکلف ہے۔

☆دنیا کو ہنسانے والا تنہائیوں میں روتا بھی ہے۔

☆ناپسندیدہ انسان سے پیار کرو، اس کا کردار بدل جائے گا۔

☆اگر کیفیت یا یکسوئی نہ بھی میسر ہو تو نماز ادا کرنی چاہیے۔ نماز فرض ہے۔

☆اس دوست کا گلہ کررہے ہو جو دھوکا دے گیا۔ گلہ اپنی عقل کا کرو کہ دھوکا دینے والے کو دوست سمجھتے رہے۔

☆سب سے پیارا انسان وہ ہوتا ہے جس کو پہلی بار دیکھنے سے دل کہتا ہو، میں نے اسے پہلی بار سے پہلے بھی دیکھا ہوا ہے۔

چند پند سود مند

☆خاموشی بغیر تخت کے بادشاہی ہے۔

☆دعا مانگتے رہو کیونکہ دعا گناہوں کے داغ ایسے مٹاتی ہے جیسے راوآب اپنے نشانات۔

☆روز و شب بامقصد طریقے سے گزارو ورنہ ایسے گرجاؤ گے جیسے سوکھے ہوئے پتے۔

☆اپنا غم کسی دوسرے کو مت سناؤ کیونکہ اس سے دشمن خوش، دوست پریشان اور اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔

☆باتونی لوگوں کی زبان ان کے قابو میں نہیں رہتی، وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بولتے ہیں۔

☆ہماری سب سے بڑی خوبی کبھی نہ گرنے میں نہیں بلکہ ہر دفعہ گرنے کے بعد اٹھنے میں ہے اور یہی کامیابی کا راز ہے۔

مرسلہ: وزیر محمد خان۔ بٹل ہزارہ

"کہیں تم اس بڑے ولا کی بات تو نہیں کر رہے جو ویمروکس میں واقع ہے؟"

"ہاں وہی۔ ہم ابھی رجسٹرار کے یہاں سے آئے ہیں۔ ساری کارروائی بڑی تیزی سے مکمل ہوئی۔ دو مہینے کے اندر۔"

جینی سوچنے لگی کہ اس روز جان کس کو یہ مکان دکھانے گیا تھا، کیا اسے سمجھنے میں غلطی ہوئی تھی؟

آرنلڈ نے ایک میز کی طرف اشارہ کیا جہاں کچھ لوگ اس کا انتظار کر رہے تھے۔ "مجھے چلنا چاہیے۔"

رخصت ہوتے وقت ہربرٹ نے جینی سے کہا۔ "جینی! اگر کوئی مسئلہ ہے تو مجھے ضرور بتانا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

گھر آ کر جینی نے ایجنسی کی ویب سائٹ کھولی۔ وہ ولا جو آج ہی فروخت ہوا، وہ سائٹ سے ہٹا دیا گیا تھا۔ فرانس کا نظام انگلستان سے مختلف ہے۔ اگر فروخت کی کارروائی آج مکمل ہوتی ہے تو معاہدے کی رقم کا دس فیصد بطور ایڈوانس کئی ماہ پہلے جمع کرایا ہوگا اور اس مکان کو مارکیٹ سے ہٹا دیا گیا ہوگا۔ اس کے علاوہ اس علاقے میں کوئی اور ولا برائے فروخت نہیں تھا پھر جان اس رات گاہک کو کون سا مکان دکھانے گیا تھا جب وہ رات گئے دفتر میں کام کرتا رہا؟

اس نے سیاہ بلی کا مجسمہ اٹھایا اور اس کی پشت پر ہاتھ پھیرنے لگی پھر اس نے اپنے سر کو جھٹکا اور کام میں مصروف ہو گئی۔ چھ بجے فارغ ہوئی تو اس نے یہ دیکھنے کے لیے ایک نظر اخبار پر ڈالی کہ شاید اس عورت کے بارے میں کوئی خبر ہو لیکن اس کے بجائے مضافاتی علاقے میں ڈکیتی کی ایک خبر نظر آئی۔ وہ جگہ اس کے گھر سے چند میل کے فاصلے پر تھی اور ڈاکو کسی وقت بھی یہاں آ سکتے تھے۔ وہ دن بھر اکیلی رہتی تھی اور پڑوس میں کچھ فاصلے پر صرف ایک بوڑھی عورت تھی۔ ان دنوں جلدی اندھیرا ہو جاتا تھا۔ اس کے دل میں شدت سے خواہش ابھری کہ جان جلدی گھر آ جائے۔

اس رات جینی کو ٹھیک طرح نیند نہیں آئی۔ یہی حال جان کا بھی تھا۔ وہ سانس کی تکلیف سے ایک سے زائد مرتبہ بیدار ہوا اور اسے اِن ہیلر استعمال کرنا پڑا۔ اگلے روز صبح جان کے جانے کے بعد وہ میڈیلین کو لے کر اسپتال گئی اور ہنری کو ڈسچارج کروا کر واپس لے آئی۔ میڈیلین نے ایک بار پھر اسے گھر میں آنے کے لیے کہا لیکن جینی نے منع کر دیا اور کہا کہ اب وہ شام چھ بجے اس کے گھر آئے گی۔ وہ جانتی تھی کہ جان ساڑھے سات بجے تک گھر آتا ہے۔

سہ پہر میں اس نے مقامی اخبار کی ویب سائٹ کھولی۔ اس عورت کی شناخت ہو گئی تھی جس کی لاش ونسنٹ کے مکان سے ملی تھی۔ خبر کے ساتھ اس کی بڑی سی تصویر بھی تھی، جینی کی نظریں اس پر جم کر رہ گئیں۔ یقیناً یہ وہی عورت تھی جو اسے میوزیم میں ملی اور اس سے جان کے بارے میں پوچھا تھا۔ وہ عورت چھٹیوں پر وہاں آئی تھی۔ اسی وجہ سے اس کی شناخت میں دیر ہوئی۔ دراصل وہ بیزیرز میں رہتی تھی۔ اسے یاد آ گیا کہ اس عورت نے میوزیم میں بھی بیزیرز کا تذکرہ کیا تھا اور وہ غلطی سے جان کو وکیل سمجھ رہی تھی۔

جینی نے گوگل پر بیزیرز کو تلاش کیا۔ وہ جنوبی فرانس میں اسپین کی سرحد کے قریب ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جس کی آبادی پچھتر ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ ایک کونے میں وہاں پیش آنے والے اہم واقعات درج تھے۔ اس کی نظر ایک سرخی پر گئی جو کسی قتل کے بارے میں تھی۔ اس نے وہ لنک کھولا تو ایک مقامی اخبار کی خبر سامنے آ گئی۔ چار سال قبل ایک مقامی وکیل جین مائیکل کیزن گھر پہنچا تو اس نے اپنی بیوی کی لاش دیکھی۔ اس کی شادی صرف چھ ماہ قبل ہوئی تھی۔ بظاہر لگتا تھا کہ وہ ڈکیتی کی مزاحمت کرتے ہوئے ماری گئی۔ خبر کے ساتھ نوبیاہتا جوڑے کی تصویر بھی تھی۔ مرد کی شکل جان سے ملتی تھی۔ البتہ بالوں کا اسٹائل مختلف تھا اور اس نے چشمہ لگایا ہوا تھا لیکن ناک اور چہرہ بالکل ایک جیسا تھا۔ اس نے خبر کو غور سے پڑھا اور اس کا ایک ایک لفظ ذہن میں بٹھا لیا۔

اس نے ایک بار پھر تصویر دیکھی۔ اس عورت کو غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ وہ جان نہیں ہو سکتا۔ اس کا اپنا ایک پس منظر تھا۔ شادی میں آنے والے مہمان اسے جانتے تھے۔

اس نے ان مہمانوں کے بارے میں سوچا۔ وہ اپنی ماں کی موت کی وجہ سے زیادہ لوگوں کو بلانا نہیں چاہتا تھا۔ دونوں کا کوئی بڑا خاندان بھی نہیں تھا۔ جان کے والدین وفات پا چکے تھے اور اس کا کوئی بھائی بہن نہیں تھا۔ صرف ایک کزن امریکا میں رہتی تھی۔ اس نے شادی کے موقع پر ایک تحفہ اور کارڈ بھیجا تھا۔ اب یہ بات جینی کی سمجھ میں آئی کہ شادی میں شریک ہونے والے چند مہمان وہ تھے جن سے اس کی حال ہی میں پیرس میں ملاقات ہوئی تھی۔ انہی میں آرنلڈ اور اس کی بیوی بھی شامل تھی لیکن یہ ایک احمقانہ سوچ تھی۔ پیرس آنے سے پہلے جان کی رہائش لیون میں تھی۔

وہ سیڑھیاں اتر کر اس چھوٹے سے سٹنگ روم میں گئی جو جان اپنے ہوم آفس کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ اس نے

فائل کیبنٹ کھول کر دیکھا۔ اس میں زیادہ تر گھر کے بل تھے۔ وہ سوچنے لگی کہ اس کی ذاتی فائل کہاں ہے۔ اس نے میز کی درازیں کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ مقفل تھیں۔ وہ واپس اوپر چلی گئی۔ باہر اندھیرا پھیل رہا تھا، اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا اور یوں لگا جیسے باغ میں کوئی درختوں کے درمیان کھڑا ہے لیکن شاید یہ اس کا وہم تھا کیونکہ جب اس نے دوبارہ دیکھا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔

اس نے سوچا کہ کیوں نہ اس کے بارے میں آن لائن معلومات حاصل کروں۔ جب وہ پہلی بار جان سے ملی تو اسے یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ سوشل میڈیا کا زیادہ استعمال نہیں کرتا۔ جب اس نے گوگل کھولا تو وہاں فیس بک پر صرف اس کی اسٹیٹ ایجنسی کا پیج تھا لیکن اس نے اپنا ذاتی اکاؤنٹ نہیں بنایا تھا۔ اب اس نے دوبارہ گوگل پر دیکھا لیکن اس کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہوسکا۔

جینی نے جین مائیکل کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرنا چاہیں لیکن اس کے حوالے سے کوئی نئی بات نظر نہیں آئی۔ البتہ جس فرم میں وہ کام کرتا تھا، اس کے کچھ پرانے اشتہارات ضرور موجود تھے۔ اس کا بھی کوئی فیس بک اکاؤنٹ نہیں تھا۔

وہ تھک کر بیٹھ گئی اور اس بارے میں سوچنے لگی لیکن اس کا دماغ صحیح طرح کام نہیں کر رہا تھا۔ وہ کسی پُرسکون جگہ بیٹھ کر غور وفکر کرنا چاہتی تھی، لیکن کہاں جائے؟ اس کا فیصلہ بعد میں بھی ہوسکتا تھا۔ فی الحال تو اسے گھر سے باہر نکلنا تھا۔

جیسے ہی وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی، سٹنگ روم میں روشنی پھیل گئی۔ وہ دم بخود بیرونی دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی جس سے باہر کی سیکیورٹی لائٹس کی روشنی اندر آرہی تھی۔ دروازے کی گھنٹی کی آواز سن کر وہ چونک گئی۔ یہ جان نہیں ہوسکتا، اس کے پاس بیرونی دروازے کی چابی تھی اور نہ ہی جینی نے کار کی آواز سنی تھی۔ جینی نے ایک گہرا سانس لیا اور دروازے کی کھڑکی سے جھانکنے لگی۔ وہاں ہیریٹ کھڑی تھی۔ جینی نے دروازہ کھول دیا اور اس سے لپٹ گئی۔

''مجھے تمہارے پاس آنا تھا۔'' ہیریٹ نے اسے اپنے سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

''میں کل ہی سمجھ گئی تھی کہ تمہارے ساتھ کوئی مسئلہ ہے۔''

''اوہ ہیریٹ۔ میں بتا نہیں سکتی کہ اس وقت تمہیں یہاں دیکھ کر کتنی خوشی ہورہی ہے۔''

''کیا مسئلہ ہے مجھے بتاؤ؟''

جینی نے ہیریٹ کے پُرسکون چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ کیسے کہہ سکتی تھی کہ اس کا شوہر غالباً ایک قاتل ہے۔ یہ ایک احمقانہ بات ہوتی۔ وہ صرف اتنا کہہ سکی۔ ''میرے ساتھ آؤ۔''

وہ دونوں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گئیں اور جینی نے لیپ ٹاپ کھول کر مقامی اخبار کی ویب سائٹ پر جین مائیکل گیزن کی تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔

''کیا اس کی شکل جان سے نہیں ملتی؟''

''ہاں۔ تھوڑی بہت۔''

''جین مائیکل کافی عرصے سے آن لائن نہیں ہے اور مجھے کوئی ایسا ثبوت نہیں ملا کہ جان چار سال سے کہیں گیا ہو۔ تم پوری خبر پڑھو۔''

ہیریٹ نے وہ خبر پڑھی۔ تبھی جینی کو یاد آیا کہ بینر یرز ایک جانا پہچانا نام کیوں لگا۔ ''کیا یہ وہی جگہ نہیں ہے جہاں تم معاون ٹیچر تھیں۔ کیا یہ واقعہ تمہارے ہوتے ہوئے پیش نہیں آیا؟''

''ہاں۔ مجھے یاد ہے لیکن جینی تم یہ مت سوچو کہ.....؟''

''یہ دونوں ایک ہی ہیں ہیریٹ اور مجھے اس کا یقین ہے۔ کیا ہوا اگر جین مائیکل نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا اور جان ہی جین مائیکل ہو؟''

''لیکن شوہر پر بیوی کے قتل کا الزام عائد نہیں ہوا؟''

''اس کا کہنا ہے کہ جب گھر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ گھر میں ڈکیتی ہوئی تھی اور وہاں اس کی بیوی کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ ان دنوں اس علاقے میں ڈکیتی کی وارداتیں ہورہی تھیں اور یہاں بھی یہی ہورہا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے ہیریٹ کو میوزیم میں ملنے والی عورت کے بارے میں بتایا۔

''یہ وہی عورت ہے جس کا خیال تھا کہ اس نے جان کو پہچان لیا ہے۔ وہ بھی قتل کر دی گئی۔''

وہ کہنا چاہ رہی تھی۔ ''ہوسکتا ہے کہ وہ میرے قتل کا منصوبہ بھی بنا رہا ہو۔'' لیکن وہ کہہ نہ سکی۔

''اوہ جینی۔ کیا تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ جو کچھ جین مائیکل کے ساتھ پیش آیا۔ وہ محض حادثہ نہیں؟''

جینی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کمپیوٹر اسکرین پر نوجوان دلہن کی تصویر دیکھ رہی تھی، ہیریٹ نے کہا۔ ''لیکن اس کا شوہر قاتل نہیں ہوسکتا۔ اس کے پاس جائے وقوعہ سے غیر موجودگی کا ثبوت موجود ہے۔ اس نے دفتر سے اپنی بیوی کو اس کی موت سے کچھ دیر پہلے فون کیا تھا۔ کیوں نہ ہم ایک کپ چائے پی لیں۔ اس پر بعد میں سوچیں گے۔''

جب وہ دونوں سیڑھیاں اتر کر نیچے آئیں تو جینی نے

کہا۔ ''تم نے اپنی کار کہاں چھوڑی ہے؟ میں نے گاڑی کی آواز نہیں سنی۔''

''وہ کچھ تنگ کر رہی تھی۔ اسے میں نے لین کے باہر ہی چھوڑ دیا۔''

وہ دونوں کچن میں گئیں اور جینی نے چائے کا پانی ابالنے کے لیے رکھ دیا لیکن کوئی بات اسے پریشان کر رہی تھی۔ اس نے ہیریٹ کی طرف دیکھا جس نے ابھی تک باہر نکلنے کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ یہاں تک کہ دستانے بھی نہیں اتارے تھے۔

''کیا تم کوٹ نہیں اتارو گی؟'' جینی نے پوچھا۔

''میں یونہی ٹھیک ہوں۔''

جینی کے ذہن میں سوال ابھرا۔ ''کیا وجہ ہے کہ ہیریٹ دستانے نہیں اتار رہی؟'' پھر اسے اخبار میں شائع ہونے والی خبر کا خیال آیا جس میں جین مائیکل کی جائے وقوعہ سے غیر موجودگی کی تفصیلات بیان نہیں کی گئی تھیں پھر ہیریٹ کو یہ سب کیسے معلوم ہوا؟ یہ دونوں باتیں ایک ساتھ اس کے ذہن میں آئیں۔ ایسا کیوں ہوا۔ یہ واضح نہیں تھا۔ اس کی سوچ کا دائرہ پھیلتا چلا گیا اور پھر جو منظر نامہ ابھرا، وہ ناقابلِ یقین تھا۔

اسے جان کے بارے میں سوچ کر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ وہ اس کے بارے میں پہلے سے سب کچھ جانتا تھا اور جینی سے ملنے سے پہلے ہی اسے معلوم تھا کہ وہ ایک دولت مند عورت ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ جان نہیں بلکہ ہیریٹ اسے قتل کرنے آئی ہے۔

چائے کا پانی گرم ہو گیا تو بجلی کی کیتلی سے ایک سیٹی نما آواز نکلی جس نے خاموشی کا سینہ چیر دیا۔ ہیریٹ کا ہاتھ بے اختیار کوٹ کی جیب میں گیا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے کچن کے سلیب پر رکھی ہوئی جینی کی کار کی چابی اور اس کا موبائل اٹھا لیا۔

''میرا پاؤں پھسل گیا تھا۔'' اس نے وضاحت پیش کی۔ اس کا چہرہ پہلے کی طرح پُرسکون تھا لیکن اب وہ ایک مختلف عورت تھی۔

اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی۔ ''یہ کون آ گیا؟'' ہیریٹ نے کہا۔

ایک لمحے کے لیے جینی بھی نہ سمجھ سکی پھر اسے یاد آ گیا۔ ''یہ پڑوس میں رہنے والی میڈیلین ہو گی۔ میں نے اسے مدعو کیا تھا۔''

''اس کو بھی اسی وقت آنا تھا۔ تم دروازے پر جا کر اس سے معذرت کر و اور کہو کہ آج تمہاری طبیعت خراب ہے۔ اس لیے اس کی خاطر تواضع نہیں کر سکتیں۔ بھاگنے یا ہوشیاری دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔ میں اس کے ساتھ تمہیں بھی گولی مار دوں گی۔''

گھنٹی دوبارہ بجی تو ہیریٹ نے سختی سے کہا۔ ''جاؤ اور اس سے جان چھڑاؤ۔''

جینی کو اس کے رویّے پر بڑی حیرت ہوئی لیکن اسے ہیریٹ کے کہے الفاظ پر کوئی شبہ نہیں تھا۔ اس نے کبھی ایسی بات نہیں کہی جس کا کوئی مطلب نہ ہو۔ دروازے کی طرف جاتے ہوئے اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ کیا وہ کسی طرح میڈیلین کو ممکنہ خطرے کے بارے میں کوئی اشارہ دے سکتی ہے؟

میڈیلین دروازے کے باہر کھڑی ہمیشہ کی طرح پُرسکون نظر آ رہی تھی۔ ''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' جینی نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ''سر میں درد ہے۔''

میڈیلین نے اس سے ہمدردی کا اظہار کیا اور جب جینی نے دوسرے دن آنے کی تجویز پیش کی تو اس نے تائید میں سر ہلا دیا۔ ایک لمحے کے لیے دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ جینی نے اسے آنکھوں کے ذریعے پیغام دینے کی کوشش کی لیکن میڈیلین کی آنکھوں میں اس کے لیے صرف ہمدردی تھی۔ وہ جانے کے لیے مڑی اور جینی نے دروازہ بند کر دیا۔ اس نے آخری موقع بھی گنوا دیا تھا۔

ہیریٹ کچن سے باہر آتے ہوئے بولی۔ ''آؤ بیٹھ جائیں۔'' پھر اس نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''دس منٹ میں فون کی گھنٹی بجے گی۔ جان کا اسسٹنٹ یہ بتانے کے لیے فون کرے گا کہ تمہارا شوہر کسی پارٹی کو مکان دکھانے گیا ہے اور دیر سے گھر آئے گا۔ میڈیلین کی گواہی بھی بہت اہم ہو گی۔ وہ تصدیق کرے گی کہ جب وہ آئی تو تم اس وقت زندہ تھیں۔''

وہ دونوں کافی کی میز پر آمنے سامنے بیٹھی ہوئی تھیں اور درمیان میں فون رکھا ہوا تھا۔ ہیریٹ نے ابھی تک کوٹ کی جیب سے ہاتھ نہیں نکالا تھا۔ شاید وہ نہیں چاہتی تھی کہ جینی کی نظر ریوالور پر جائے۔

''تم نے مجھے کب سے نظروں میں رکھا ہوا تھا؟'' جینی نے پوچھا۔ ''یقیناً جان اس ارادے سے بولون نہیں آیا ہو گا۔''

ہیریٹ نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''یہ محض ایک اتفاق تھا لیکن تمہاری ماں کی موت کے بعد ہمیں اس

منصوبے پر عمل کرنے کا موقع مل گیا۔‘‘

فرانسیسی قانونِ وراثت کے تحت والدین کے مرنے کے بعد بچے اس کے ترکے میں پچیس فیصد کے حق دار ہوتے ہیں۔ جینی کے والدین مر چکے تھے اور اب اس کا سارا ترکہ جان کے حصے میں آتا۔

جینی کی کپکپی چھوٹ گئی۔ یہ محض خوف کی وجہ سے نہیں تھا۔ کمرے میں اچانک ہی خنکی کی لہر دوڑ گئی۔ ہبریٹ نے بھی یقیناً اسے محسوس کیا ہوگا اور اس نے اپنے کوٹ کا کالر بند کرلیا تاہم اس نے جیب سے ہاتھ نہیں نکالا۔ کیا کمرے کی کوئی کھڑکی کھلی رہ گئی تھی؟

ہبریٹ کی پشت کچن کے دروازے کی طرف تھی۔ لہٰذا جو کچھ جینی نے دیکھا، وہ اسے نظر نہیں آیا۔ کچن کا دروازہ دھیرے دھیرے کھل رہا تھا۔ اسے جینی کے چہرے پر حیرت کے آثار محسوس ہوئے۔ مڑ کر دیکھا تو میڈیلین ایک شکاری بندوق لیے کھڑی ہوئی تھی اور اس کی نال کا رخ ہبریٹ کی جانب تھا۔

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ جینی نے لپک کر ریسیور اٹھا لیا اور ہذیانی انداز میں چلاتے ہوئے بولی۔ ’’ہبریٹ...... یہاں ہبریٹ موجود ہے۔‘‘

ہبریٹ کا ہاتھ جیب سے باہر آیا تو میڈیلین نے ٹریگر دبا دیا۔ ایک زوردار دھماکا ہوا اور ہبریٹ کے ہاتھ سے ریوالور نیچے گر گیا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے اپنا بازو پکڑ لیا۔ ریوالور جینی کے قریب پڑا ہوا تھا۔ میڈیلین جینی کو اشارہ کر کے چلا رہی تھی لیکن جینی ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکی اور اسے اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ آگے کی طرف جھکی اور اس نے ریوالور اٹھا لیا۔

ہبریٹ شدید تکلیف میں مبتلا تھی۔ اس نے میڈیلین کی طرف دیکھا اب اس کے پاس اپنے بچاؤ کا کوئی موقع نہیں تھا۔ میڈیلین کی آنکھوں میں سفاکی دیکھ کر اس نے پسپا ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بیرونی دروازے تک گئی اور اس نے شکست تسلیم کرنے کے انداز میں اپنا بازو اوپر اٹھا لیا۔

اس سے پہلے کہ جینی کچھ سمجھ سکتی، ہبریٹ دروازے سے باہر جا چکی تھی۔ دروازہ بند ہونے کی آواز آئی تو جینی اس جانب لپکی۔ ایک گاڑی کا انجن غرایا اور وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ چند لمحوں میں اس کی عقبی روشنیاں نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ ہبریٹ اس کی کار میں فرار ہوئی تھی۔

اگلے ہفتے جب جینی اپنا سامان باندھ رہی تھی تو اس پر انکشاف ہوا کہ جان بلیوں سے ڈرنے میں حق بجانب تھا۔ وہ ہبریٹ کی شکر گزار تھی جس کی وجہ سے جان کی موت واقع ہوئی۔

ہبریٹ گاڑی چلاتی ہوئی اس مکان تک گئی جہاں جان جائے وقوعہ سے اپنی غیر موجودگی کا ثبوت دینے کے لیے ایک گاہک کو لے کر گیا تھا۔ ہبریٹ کے بازو سے بری طرح خون بہہ رہا تھا۔ لہٰذا جان نے اسٹیئرنگ وہیل سنبھال لیا۔ وہ پیرس کی جانب جا رہے تھے کہ جینی کی کار میں رہ جانے والے ہنری کے بالوں کی موجودگی محسوس کر کے جان کو دمے کا دورہ پڑ گیا۔ گاڑی اس کے قابو سے باہر ہوگئی اور وہ موقع پر ہی جاں بحق ہوگیا۔ ہبریٹ کو نسبتاً کم چوٹیں آئیں لیکن اسے کافی عرصہ اسپتال میں رہنا ہوگا۔ اس کے بعد اس کی بقیہ عمر جیل میں گزرے گی کیونکہ اس نے پولیس کو بیان دیتے ہوئے اعتراف کیا کہ جان کی پہلی بیوی اور میوزیم میں جینی سے ملنے والی عورت کو اسی نے جان کے کہنے پر قتل کیا تھا کیونکہ اس نے جان کو پہچان لیا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ اس کی اصلیت ظاہر نہ کر دے۔ ہبریٹ نے یہ بھی اعتراف کیا کہ وہ شروع دن سے ہی جان کو چاہتی تھی اور جان نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ جینی کی دولت ہاتھ آنے کے بعد وہ اس سے شادی کر لے گا۔

جینی نے سوٹ کیس بند کیا۔ وہ واپس لندن جا رہی تھی۔ اس نے آرنلڈ سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس مکان کی فروخت کا بندوبست کرے۔ دروازے کی گھنٹی بجی۔ وہ سیڑھیاں اترنے ہی والی تھی کہ اسے خیال آیا کہ وہ کچھ بھول گئی ہے۔ وہ واپس اسٹڈی میں گئی اور مصری بلی کا مجسمہ اٹھا لیا جو عورتوں کی محافظ ہی نہیں بلکہ محبت اور خوشی کی دیوی بھی ہے۔ اس وقت جینی اپنے آپ کو اس مریضہ کی طرح کمزور محسوس کر رہی تھی جو طویل بیماری سے اٹھی ہو اور اسے صحت یاب ہونے میں وقت لگے گا لیکن اسے یقین تھا کہ ایک دن وہ نئے سرے سے اپنی زندگی شروع کر سکے گی۔

اس نے وہ مجسمہ اپنے کوٹ کی جیب میں رکھا اور سیڑھیاں اترتی ہوئی نیچے گئی جہاں دروازے پر آرنلڈ اور میڈیلین اسے ائرپورٹ لے جانے کے لیے کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں میڈیلین کا شکریہ ادا کیا جس کی بروقت مداخلت سے ہبریٹ تیسری بار اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکی۔

ناک تلے

ملک صفدر حیات

زن، زر، زمین کو ازل سے فتنہ و فساد کی جڑ تصور کیا جاتا رہا ہے اور شاید ابد تک ایسا ہی سمجھا جاتا رہے گا... کیونکہ ان کا تعلق انسان کے جذبات و احساسات اور ضمیر سے بہت گہرا ہوتا ہے اور جانے کب جذبات کے دریا میں طغیانی آجائے، جانے کب احساسات اپنی سمت بدل ڈالیں اور جانے کب ضمیر نیند کے ہلکورے لیتا لیتا سو جائے مگر... قدرت اپنا کام مخصوص رفتار سے جاری رکھتی ہے اور جہاں کسی کے قدم لڑکھڑائے... اسے درست سمت چلانے کے لیے ایسا عبرتناک سبق ترتیب دیتی ہے کہ ساری دلفریب خوش گمانیاں ایک بھیانک فریب میں ڈھل کر مجرم کو دنیا کے سامنے عبرت کا نشان بنا دیتی ہے... وہ جو ناک تلے جذبات کے طوفان میں بہے جا رہے تھے اچانک بھنور میں پھنسے تو احساس ہوا کہ مردہ ضمیری نے انہیں کس مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔

عشق کے نام پر دیوانگی میں بھٹکنے والوں کی لرزہ خیز روداد

گندم کی کٹائی چل رہی تھی۔ جو لوگ کاشت کاری کے حوالے سے معلومات رکھتے ہیں، ایسے واقفانِ حال بہ خوبی جانتے ہیں کہ گندم کی کٹائی کے وقت موسمِ گرما شباب پر ہوتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسا ہی تپتا ہوا دن تھا۔

ان دنوں میری تعیناتی نوشہرہ ورکاں کے تھانے میں تھی۔ میرا تھانہ مذکورہ موضع سے باہر تھوڑے فاصلے پر سڑک کے کنارے واقع تھا۔ رہائش حسبِ معمول تھانے کے عقبی حصے میں بنے ہوئے سرکاری کوارٹر میں تھی۔ جب میں تیار ہو کر اپنے کمرے میں پہنچا تو تیز چمکیلی دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اگرچہ وہ صبح کا وقت تھا لیکن دھوپ کی حدت اور موسم کی شدت سے ایسا محسوس ہوتا تھا گویا سورج سوا نیزے پر اتر آیا ہو......!

میں نے اپنی کرسی پر بیٹھنے کے بعد مشکور حسین سے پوچھا۔ ”کیا خبریں ہیں؟“

مشکور حسین اے ایس آئی تھا۔ اس تھانے میں مجھے مشکور سب سے زیادہ کام کا بندہ لگا تھا لہٰذا تھوڑے ہی عرصے میں اس کے ساتھ میری اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی تھی۔ وہ ایک باشعور، ذہین اور محنتی پولیس افسر تھا۔ میرے سوال کے جواب میں اس نے بتایا۔

”ملک صاحب! خبر بڑی سنسنی خیز ہے۔“

اس کے انداز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے اس کے چہرے پر نظر جما کر سوال کیا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

اس سے پہلے کہ مشکور میرے سوال کا جواب دیتا، ایک کانسٹیبل ٹھنڈے پانی سے بھرا ہوا جگ لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ مشکور سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔

”آپ ٹھنڈا پانی پئیں، پھر بتاتا ہوں۔“

اے ایس آئی کا انداز میرے اندر تجسس جگا چکا تھا۔ جب میں اپنے کمرے کی طرف آرہا تھا تو میں نے تھانے کے برآمدے میں چند افراد کو بیٹھے دیکھا تھا۔ ابھی مشکور حسین نے جس سنسنی خیز خبر کا ذکر کیا تھا، اس کا تعلق یقیناً انہی افراد سے تھا۔

میں نے صرف ایک گلاس پانی پر اکتفا کیا اور مشکور کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"اب بتاؤ، کیا معاملہ ہے؟"

"معاملہ کافی سنگین ہے ملک صاحب۔" وہ گمبھیر انداز میں بولا۔ "نوشہرہ ورکاں گاؤں میں قتل کی ایک واردات ہو گئی ہے۔ مقتول کا باپ اور گاؤں کے دو افراد اسی سلسلے میں باہر بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔ ہمیں موقع واردات پر فوراً پہنچنا ہوگا۔"

"تو سمجھو، تمہارا انتظار ختم ہو گیا۔" میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "باقی باتیں راستے میں ہوں گی۔"

نوشہرہ ورکاں جانے کے لیے مشکور حسین نے ایک تانگے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ جو لوگ اس واقعے کی رپورٹ درج کرانے آئے تھے، ہم نے انہیں بھی تانگے پر سوار کیا اور فوراً سے پیشتر موضع نوشہرہ ورکاں کی جانب روانہ ہو گئے۔ راستے میں ہمارے بیچ جو گفتگو ہوئی، اس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔

مقتول کا نام آفتاب تھا۔ مقتول، فیاض علی کا بڑا بیٹا تھا۔ آفتاب سے چھوٹا ذوالفقار تھا جس کی عمر بیس سال تھی۔ مقتول آفتاب اپنے بھائی سے دو سال بڑا تھا۔ آفتاب کی شادی ایک ماہ پہلے ہوئی تھی۔ مقتول کا باپ فیاض علی ایک چھوٹا زمیندار تھا۔ نوشہرہ ورکاں میں اس کے پاس دس ایکڑ اراضی تھی۔ دونوں بیٹے کاشتکاری میں باپ کی مدد کرتے تھے۔ میرا تھانہ گاؤں کے نزدیک ہی واقع تھا لہٰذا چند منٹ میں ہم جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔

وہ دو کمروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا ڈیرا تھا جو کھیتوں کے اندر بنا ہوا تھا۔ مذکورہ ڈیرا فیاض کی اراضی کا ہی حصہ تھا۔ دونوں کمروں کے آگے ایک کشادہ صحن تھا جس کے ایک حصے میں کٹی ہوئی گندم کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس ڈیرے کا کل رقبہ بیس سے پچیس مرلے ہوگا۔ کراچی کے رہائشی چار سو گز سمجھ لیں۔ یہ نسبتاً ایک چھوٹا ڈیرا تھا مگر دس ایکڑ اراضی کی ضرورت کے عین مطابق تھا۔ فیاض علی کی راہنمائی میں، میں ڈیرے کے عقبی حصے میں بنے ہوئے کمروں میں سے ایک کے اندر پہنچ گیا۔ مقتول آفتاب کی لاش اسی کمرے کے اندر موجود تھی۔ کمرے کے ایک حصے میں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ آفتاب کی لاش مذکورہ چارپائی کی پائینتی کی طرف کمرے کے فرش پر پڑی تھی۔

میں نے اکڑوں بیٹھ کر بہ غور لاش کا جائزہ لیا۔ اس امر میں کسی شک و شبے کی گنجائش تلاش نہیں کی جا سکتی تھی کہ آفتاب اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا تھا۔ وہ منہ کے بل کمرے کے کچے فرش پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس کے منہ کے نیچے اور سر کے نزدیک نیم دائرے کی شکل میں خون کا ایک ننھا سا تالاب بنا ہوا تھا۔ لاش کی حالت کو دیکھ کر مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ مذکورہ خون مقتول کی کھوپڑی میں سے نکل کر نیم دائرے کی شکل میں فرش پر پھیل گیا تھا۔ مقتول کی کھوپڑی کا عقبی حصہ بری طرح زخمی تھا۔ بادی النظر میں یہی سمجھ میں آتا تھا کہ کسی شقی القلب شخص نے کسی آہنی چیز کی مدد سے مقتول کے سر کے عقبی حصے کو نشانہ بنایا تھا۔ یہ وار اتنا کاری ثابت ہوا کہ مقتول آن واحد میں منہ کے بل زمیں بوس ہو گیا اور پھر اسے ہلکی سی جنبش کا بھی موقع نہ مل سکا۔ زمین پر گرتے ہی وہ اس جہان سے اس جہان میں منتقل ہو گیا تھا۔

میں نے مقتول کے سر کے عقبی حصے کا بڑی توجہ سے معائنہ کیا۔ کھوپڑی بری طرح چٹخ گئی تھی۔ قاتل جو کوئی بھی تھا، وہ اپنے دل میں مقتول سے شدید نوعیت کی نفرت رکھتا تھا۔ کمرے کے فرش پر پھیلے ہوئے خون کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس خونچکاں واقعے کو پیش آئے چار پانچ گھنٹے ہی گزرے تھے۔ اس وقت دس بج رہے تھے۔ گویا میرے محتاط اندازے کے مطابق، مقتول آفتاب کو صبح پانچ اور چھ بجے کے درمیان موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔

میں نے لاش والے کمرے کی تسلی بخش تلاشی لی لیکن مجھے کہیں بھی آلۂ قتل یا کوئی بھی ایسی اہم چیز نہیں ملی جو اس واردات پر روشنی ڈالتی یا قاتل تک میری راہنمائی کا وسیلہ بنتی ہو۔ میں نے اس کمرے سے ملحقہ دوسرے کمرے کا بھی تفصیلی جائزہ لیا۔ اس کمرے میں مختلف نوعیت کے زرعی آلات رکھے ہوئے تھے اور ایک کونے میں بیج والی بوریاں بھی پڑی ہوئی تھیں۔

میں نے جائے وقوعہ کا نقشہ تیار کیا پھر جائے واردات کی ضروری کارروائی کے بعد مقتول آفتاب کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے ضلعی اسپتال روانہ کر دیا۔ اے ایس آئی مشکور حسین کو میں نے لاش کے ساتھ اسپتال بھیج دیا تھا۔

جب ہم اس ڈیرے پر پہنچے تھے تو ڈیرے کے باہر درجن بھر افراد جمع تھے۔ ان سب کے چہروں پر خوف و ہراس کو بہ آسانی دیکھا اور پڑھا جا سکتا تھا۔ ظاہر ہے، قتل کی واردات کوئی معمولی واقعہ نہیں ہوتا۔ گاؤں والوں کا پریشان ہونا عین فطری تھا۔ لاش کو سب سے پہلے مقتول کے باپ فیاض علی نے دیکھا تھا لہٰذا میں نے تفتیش کا آغاز بھی اسی سے کیا۔

"فیاض علی! مجھے تمہارے جوان بیٹے کی المناک موت کا افسوس ہے۔" میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ "یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ میں بہت جلد آفتاب کے قاتل کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچادوں گا لیکن اس سلسلے میں تمہیں مجھ سے تعاون کرنا ہوگا۔"

"میں تعاون کروں گا جی۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "میرا بیٹا جان سے گیا ہے۔ جب تک آفتاب کا قاتل پکڑا نہیں جاتا، میں سکون کی سانس نہیں لے سکوں گا۔"

"میں تمہاری کیفیت کو سمجھ سکتا ہوں فیاض علی۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مجھے بتاؤ، آفتاب کو موت کے گھاٹ اتارنے میں کس کا ہاتھ ہوسکتا ہے؟"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا تھانیدار صاحب۔" وہ روہانسا ہوگیا۔

میں نے پوچھا۔ "آفتاب کی کسی سے کوئی دشمنی وغیرہ تھی؟"

"تھانیدار صاحب! آفتاب تو بڑا ہی بھلے مانس انسان تھا۔" وہ گلوگیر آواز میں بولا۔ "دشمنی تو بہت دور کی بات ہے جی۔ اس کا تو آج تک کسی سے جھگڑا بھی نہیں ہوا تھا۔"

"فیاض علی! تم نے اپنے بیٹے کی لاش دیکھی ہے نا......"

میں نے اس کی اداس آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ "آفتاب کو جس بے دردی سے فنا کے گھاٹ اتارا گیا ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ قاتل کو تمہارے بیٹے سے بہت سخت بیر تھا۔"

"میں اس کے کسی دشمن کو نہیں جانتا جناب۔" وہ بے بسی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "آپ میری بات کا یقین کریں۔ میں نے آپ سے کوئی غلط بیانی نہیں کی۔"

اس کے لہجے سے سچائی کی مہک آرہی تھی۔ میں نے گمبھیر سنجیدگی سے کہا۔ "فیاض علی! مجھے قاتل کی تلاش کے لیے کسی نہ کسی اشارے کی ضرورت ہے۔ میں نے قانون کا جو سبق پڑھ رکھا ہے اس کی روشنی میں کوئی کسی کو خوامخواہ ہی قتل نہیں کردیتا۔ اگر تمہیں کسی پر شک ہے تو بتادو تاکہ میں جلد از جلد تمہارے بیٹے کے قاتل تک رسائی حاصل کرسکوں۔"

"اگر مجھے کسی پر شک ہوتا تو میں آپ کو ضرور بتادیتا۔" وہ بے کسی سے بولا۔ "میں تو خود بھی چاہتا ہوں کہ آپ آفتاب کے قاتل کو گرفتار کرکے عبرت ناک سزا دلوائیں۔"

"یہ تو مجھے کرنا ہی ہے......" میں نے پُرخیال انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "تم نے کتنے بجے آفتاب کی لاش دریافت کی تھی؟"

اس نے میرے سوال کے جواب میں بتایا کہ وہ روزانہ صبح آٹھ بجے تک کھیتوں میں جاتا تھا۔ اس کے دونوں بیٹے اس سے کافی پہلے گھر سے نکل جاتے تھے۔ آفتاب عموماً صبح پانچ بجے اور اس کا چھوٹا بھائی ذوالفقار عرف زلفی چھ بجے تک کھیتوں میں پہنچ جایا کرتے تھے۔ جب وہ خود گھر سے نکلتا تو بیٹوں کا ناشتا بھی اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ وہ خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔

"کیا آج بھی تم آٹھ بجے ہی گھر سے نکلے تھے؟"

"جی......!" اس نے اثبات میں جواب دیا۔

"اور تمہارے دونوں بیٹے اس سے پہلے کھیتوں کی جانب روانہ ہوچکے تھے؟" میں نے استفسار کیا۔

"دونوں نہیں، آج صرف آفتاب ہی کھیتوں کی طرف گیا تھا۔" اس نے جواب دیا۔

"اور زلفی......؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"زلفی کی رات سے طبیعت خراب ہے۔" فیاض علی نے بتایا۔ "جب میں کھیتوں کی طرف آرہا تھا تو زلفی گھر میں پڑا سو رہا تھا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ میں جس آفتاب کے لیے ناشتا لے کر جارہا ہوں وہ مجھ سے بہت دور جاچکا ہے......"

اس کی آواز بھیگ گئی۔ میں نے چند لمحات کے لیے اسے آزاد چھوڑ دیا۔ جوان بیٹے کی موت نے اس کے اعصاب کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ان لمحات میں، میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس عورت کی کیا حالت ہوگی جو ایک ماہ پہلے اس گھر میں بہو بن کر آئی تھی۔ مقتول آفتاب کی نوبیاہتا بیوی کا نام خالدہ معلوم ہوا تھا۔ خالدہ، آفتاب کے تایا کی بیٹی تھی۔

میں نے مشکور کو لاش کے ساتھ روانہ کرتے وقت ہدایت کردی تھی کہ وہ تھانے سے کسی کانسٹیبل کو میرے پاس بھیج دے۔ سرکاری اسپتال کا راستہ میرے تھانے کے سامنے سے گزرتا تھا۔ اے ایس آئی نے میرے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے کانسٹیبل ساجد کو جائے وقوعہ پر بھیج دیا تھا۔ میں نے آتے ہی ساجد کو کام پر لگادیا۔

"تم اس ڈیرے کے اندر اور باہر اچھی طرح گھوم پھر کر ایک ایک چیز کا جائزہ لو۔" میں نے ساجد سے کہا۔ "اور اگر کچھ بھی اہم اور غیرمعمولی نظر آئے تو فوراً مجھے رپورٹ کرو۔"

"او کے سر......" ساجد نے فرماں برداری سے کہا اور کام میں جت گیا۔

فیاض علی کی حالت قدرے بہتر ہوئی تو میں نے تفتیش کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔ "آج آٹھ بجے صبح جب تم ناشتا لے کر ڈیرے پر پہنچے تو تم نے اپنے بیٹے کو خون میں بھر رکھے بے حس و حرکت پایا۔ کسی نے آفتاب کو قتل کردیا تھا۔

پھر تم اس واقعے کی رپورٹ درج کرانے تھانے چلے آئے تھے...... ہیں نا؟"

"آپ کی بات کافی حد تک درست ہے لیکن......!"

اس نے جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے پوچھا۔ "لیکن کیا فیاض علی؟"

"بات دراصل یہ ہے جناب کہ میں گھر سے سیدھا کھیتوں کی طرف جاتا ہوں۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "کیونکہ دونوں بھائی کھیتوں ہی میں مصروف ہوتے ہیں۔ آج بھی میں نے کھیتوں ہی کا رخ کیا تھا۔ ہم نے کل جہاں پر کٹائی کا کام چھوڑا تھا، آفتاب کو وہیں سے آج کام شروع کرنا تھا لیکن جب میں مذکورہ مقام پر پہنچا تو آفتاب مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ میں نے کھیتوں میں ہر طرف نگاہ دوڑائی مگر وہ کہیں بھی نہیں تھا۔ اس کے بعد ہی میں ڈیرے کی طرف آیا تھا اور پھر......"

وہ ایک مرتبہ پھر روہانسا ہوگیا۔ بیٹے کی موت کا ذکر کرتے ہوئے اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئی تھیں۔ میں نے اپنائیت بھرے انداز میں کہا۔

"ہوسکتا ہے، آفتاب کسی ضروری کام سے ڈیرے کی طرف آ گیا ہو۔"

"نہیں جناب......" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور استفسار کیا۔ "کس چیز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا فیاض علی؟"

"جناب! آپ نے آفتاب کے جسم پر جو لباس دیکھا ہے نا، یہ وہی کپڑے ہیں جو وہ گھر سے پہن کر نکلا تھا......" اس نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔

"تو......" میں نے الجھن زدہ نظر سے اسے دیکھا۔ "اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟"

"تھانیدار صاحب! میرا آفتاب دوسرے لوگوں سے بہت مختلف تھا۔" وہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "کھیتوں کے اندر اس کا لباس عام کھیت مزدوروں والا ہوا کرتا تھا لیکن کھیتوں کے باہر وہ اپنے پہناوے کا بہت زیادہ خیال رکھتا تھا۔ وہ جب بھی کھیتوں کا رخ کرتا تو سب سے پہلے اس ڈیرے پر آتا تھا۔ یہاں وہ لباس تبدیل کرتا اور پھر کھیتوں میں جا کر اپنے کام میں جت جاتا تھا۔ شام کو جب ہم کام کو ختم کرتے تو وہ ایک بار پھر ڈیرے پر آ کر لباس تبدیل کرتا تھا۔ یہ اس کا معمول تھا تھانیدار صاحب۔"

میں نے اس کی بات کی تہ میں اترتے ہوئے کہا۔ "تو تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ آج آفتاب کھیتوں کی طرف جا ہی نہیں سکا تھا۔ قبل اس کے کہ وہ لباس تبدیل کر کے اپنے کام میں مصروف ہوتا، کسی نے اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا......"

"جی......جی......" وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "آپ میرے نکتے کو سمجھ گئے ہیں تھانیدار صاحب۔"

فیاض علی کی بات کو میں نے اس لیے بھی درست مان لیا کہ مقتول آفتاب کے بدن پر میں نے صاف ستھرا لباس دیکھا تھا۔ علاوہ ازیں کمرے کی ایک دیوار پر مجھے آفتاب کا کھیت مزدوروں والا لباس ایک کھونٹی پر لٹکا دکھائی دیا تھا۔

"ہوں......" میں گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر گمبھیر انداز میں کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ قاتل، آفتاب کی آمد سے پہلے اس ڈیرے پر موجود تھا......!"

"یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ بدبخت آفتاب کے ساتھ ہی یہاں پہنچا ہو۔" وہ قیاس آرائی کرنے والے انداز میں بولا۔

"نہیں۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔" میں نے قطعی انداز میں کہا۔ "میں نے لاش کا بہ غور جائزہ لیا ہے۔ قاتل نے آفتاب کی بے خبری میں عقب سے اس پر وار کیا تھا اور ایسا کاری وار کہ آفتاب کو اپنے بچاؤ کے لیے ایک لمحے کی مہلت نہ مل سکی۔ اگر قاتل، آفتاب کے ساتھ اس ڈیرے پر پہنچا ہوتا تو پھر وہ اتنی آسانی سے آفتاب کی جان نہیں لے سکتا تھا۔ مجھے شک نہیں بلکہ یقین ہے کہ قاتل کمرے میں پہلے سے موجود تھا۔ قبل اس کے کہ آفتاب لباس تبدیل کرتا، قاتل کا داؤ چل گیا۔"

"لیکن ڈیرے کے دونوں کمرے اور داخلی دروازے ہم بند کر کے گھر جاتے ہیں اور تینوں دروازوں پر تالے بھی لگاتے ہیں۔" وہ بے یقینی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "کوئی بند کمرے میں پہلے سے کیسے گھس کر بیٹھ سکتا ہے؟ زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی ڈیرے کی دیوار پھلانگ کر اندر صحن میں کود جائے......بس!"

میں فیاض علی کو حیران و پریشان چھوڑ کر دوبارہ اس کمرے میں آ گیا جہاں آفتاب کو بڑی سفاکی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ ان لمحات میں میرا ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ میں دراصل یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کمرے میں داخلے کے لیے دروازے کے سوا اور کوئی راستہ بھی تھا یا نہیں۔

کمرے کے اندر پہنچتے ہی میری نگاہ ایک کھڑکی پر پڑی۔ مذکورہ کھڑکی کا سائز تین بائی تین فٹ رہا ہوگا۔ یہ دو پٹ والی ایک عام سی چوبی کھڑکی تھی جو اندر کی جانب کھلتی تھی۔ اس وقت کھڑکی کے پٹ بھڑے ہوئے تھے لیکن اس میں کنڈی یا تالا وغیرہ

نہیں لگا ہوا تھا۔

فیاض علی بھی میرے پیچھے ہی کمرے میں آ گیا تھا۔ میں نے کمرے کی عقبی دیوار میں واقع واحد کھڑکی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے استفساریہ انداز میں کہا۔

"اگر آپ لوگ کمرے کے دروازے پر تالا لگا کر جاتے ہو تو کوئی بندہ اس کھڑکی کے راستے بھی تو کمرے کے اندر داخل ہو سکتا ہے...... اور یہ کھڑکی کھلی ہوئی بھی ہے...... اس پر کنڈی نہیں لگی ہوئی؟"

"حیرت ہے......" وہ بے یقینی سے کھڑکی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "ایسی کھڑکیاں دونوں کمروں میں موجود ہیں لیکن ہم ڈیرے سے رخصت ہوتے وقت کھڑکیوں کو کنڈی لگانا کبھی نہیں بھولتے، خاص طور پر یہ کھڑکی کیونکہ دوسرے کمرے کی کھڑکی عموماً بند ہی رہتی ہے۔ وہاں زرعی آلات اور دوسرا قیمتی سامان رکھا ہوا ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس کمرے کی کھڑکی کھلی کیسے رہ گئی۔"

"ہو سکتا ہے، کل تم لوگ یہ کھڑکی بند کرنا بھول گئے ہو۔" میں نے مذکورہ کھڑکی کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اور قاتل کھلی ہوئی کھڑکی کے راستے اندر آ گیا۔"

میں نے کھڑکی کے پٹ کھول کر باہر جھانکا۔ دور تک کھیت نظر آئے۔ میں نے گردن باہر نکال کر کھڑکی کے زیریں حصے کا جائزہ لیا۔ زمین سے کھڑکی کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ کوئی بھی شخص بہ آسانی کھڑکی کے راستے کمرے تک رسائی حاصل کر سکتا تھا۔ کھڑکی میں کسی بھی نوعیت کی سلاخیں یا کوئی جالی وغیرہ لگی ہوئی نہیں تھی۔ ڈیرے کی عقبی دیوار اور کھیتوں کے بیچ میں پانچ چھ فٹ چوڑا ایک نالا گزرتا تھا جس کے اندر مٹیالا پانی رواں دواں تھا۔ یہ نالا کھیتوں کی سیرابی کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس نالے کے کنارے اور کھڑکی والی دیوار کے درمیان لگ بھگ ڈیڑھ فٹ کا فاصلہ تھا۔ اس مقام پر کھڑے ہو کر کھڑکی پر چڑھنا اور پھر کمرے کے اندر کودنا کوئی مشکل کام نہیں تھا بہ شرط یہ کہ مذکورہ کھڑکی کو اندر سے کنڈی نہ لگائی گئی ہو۔

میں نے کھڑکی کو بند کر کے اندر سے کنڈی لگا دی پھر مقتول کے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "فیاض علی! اب میں تمہارے گھر چلوں گا۔"

"گھر...... وہ کس لیے جناب؟" وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

"وہ اس لیے فیاض علی کہ تم تو اس واردات کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہو سکتا ہے، تمہارے گھر کے افراد میں سے کوئی قاتل کے بارے میں کچھ جانتا ہو۔ تمہارے گھر میں کل کتنے افراد ہیں؟"

"میرے علاوہ میری گھر والی سلطانہ ہے، آفتاب کی بیوی...... میرا مطلب ہے، بیوہ خالدہ اور میرا چھوٹا بیٹا ذوالفقار عرف زلفی۔" وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں بولا۔ "لیکن میرا خیال ہے، وہ لوگ بھی اس بارے میں کچھ نہیں جانتے ہوں گے۔"

"مجھے تمہارے اس خیال پر کوئی اعتراض نہیں فیاض علی۔" میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں قانون کے تقاضے پورے کیے بغیر سکون سے نہیں بیٹھ سکتا۔ کیا تم اس بات میں کوئی قباحت محسوس کر رہے ہو کہ میں تمہارے افرادِ خانہ سے چند سوالات کروں؟"

"ہرگز نہیں جناب......" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "آپ ضرور میرے ساتھ گھر چلیں۔ میری تو یہی خواہش ہے کہ آفتاب کا قاتل جلد از جلد گرفتار ہو جائے۔"

فیاض علی کے تعاون بھرے انداز کے بعد میں نے ڈیرے کے دونوں کمروں کی کھڑکیوں کو اچھی طرح چیک کر کے اندر سے کنڈی لگائی پھر جائے وقوعہ والے کمرے کے دروازے پر سرکاری تالا لگانے کے بعد فیاض کے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔ زرعی آلات والے کمرے پر جو تالا لگا ہوا تھا، میں نے اسے تبدیل کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ میں نے اس کے اندر موجود کھیتی باڑی کے آلات کو اچھی طرح چیک کر لیا تھا۔ خصوصاً آلۂ قتل کی تلاش کے سلسلے میں، میں نے بڑی باریک بینی سے وہاں کا جائزہ لیا تھا اور کوئی بھی مشکوک چیز میری نگاہ سے نہیں گزری تھی۔ میں نے اس بات کی بھی تسلی کر لی تھی کہ دونوں کمروں کے بیچ آمد و رفت کا بھی کوئی ذریعہ موجود نہیں تھا۔

☆☆☆

مقتول کے گھر کے اندر کافی لوگ جمع تھے جن میں غالب تعداد خواتین کی تھی۔ وہاں کا ماحول انتہائی بوجھل اور سوگوار تھا۔ مقتول کی بیوہ خالدہ اور ماں سلطانہ عورتوں میں گھری ہوئی تھیں۔ مجھے وہاں پر مقتول کا چھوٹا بھائی ذوالفقار عرف زلفی کہیں دکھائی نہیں دیا۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں قطعاً کوئی وقت محسوس نہیں ہوئی کہ اس فضا میں، میں اہلِ خانہ سے کوئی کام کی بات اگلوا نہیں سکوں گا۔

"فیاض علی!" میں نے مقتول کے باپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارے گھر پر آناً فاناً میں جو قیامت ٹوٹی ہے اس

نے سب کچھ بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ تم افرادِ خانہ کو سنبھالو۔ میں پھر کسی وقت یہاں آ کر پوچھ تاچھ کرلوں گا۔"

"جیسی آپ کی مرضی جناب۔" وہ آبدیدہ ہو گیا۔

"آپ کا اپنا گھر ہے۔ جب جی چاہے، آپ تشریف لائیں۔ میرے گھر کا دروازہ آپ کو ہمیشہ کھلا ملے گا۔"

میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے پوچھا۔ "تمہارا چھوٹا بیٹا کہیں نظر نہیں آ رہا......؟"

"زلفی کو اس واقعے کی اطلاع دینے کے لیے دوڑایا ہوا ہے۔" اس نے بتایا۔ "بے چارے کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں لیکن یہ کام بھی تو کرنا ہے نا۔"

میں فیاض علی کو تسلی دلاسا دے کر اس کے گھر سے نکل آیا۔ ابھی تک مجھے آفتاب کے قتل کے حوالے سے کوئی اہم بات معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ میں کانسٹیبل ساجد کے ساتھ اس تانگے کی جانب قدم بڑھانے لگا جس پر سوار ہو کر ہم تھانے سے یہاں تک آئے تھے۔ مذکورہ تانگا کوچوان کے ساتھ تھوڑے فاصلے پر میرا انتظار کر رہا تھا۔ جیسے ہی ہم گلی کے نکڑ پر پہنچے، میرے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔ یہ خیال ایک دکان کو دیکھ کر آیا تھا۔

وہ کریانے کی ایک چھوٹی سی دکان تھی جس پر ایک ادھیڑ عمر شخص بیٹھا دکانداری کر رہا تھا۔ کسی بھی علاقے میں کریانے کی دکان کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ ایسا دکاندار علاقے کے تمام افراد اور ان کے معاملات سے اچھی طرح آگاہ ہوتا ہے۔ میں نے اس دکاندار سے آفتاب کے قتل کے حوالے سے کچھ معلومات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے پاس چلا گیا۔

دکاندار مجھے اپنی سمت بڑھتے دیکھ کر چوکنا ہو گیا تھا پھر جب میں اس کے نزدیک پہنچا تو وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور خیر مقدمی انداز میں بولا۔ "آئیں جی تھانیدار صاحب...... بسم اللہ......"

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے بتایا۔ "میرا نام رب نواز ہے تھانیدار صاحب لیکن پنڈ والے مجھے نواجا کہہ کر پکارتے ہیں مگر ٹھہریں......" وہ دکان کے اندرونی حصے کی سمت مڑا۔ اس کی زبان اپنے کام میں مصروف رہی۔ "آج بہت زیادہ گرمی ہے۔ میں ٹھنڈی بوتلوں سے آپ کی تواضع کرتا ہوں۔"

میرے دیکھتے ہی دیکھتے نواجا نے لکڑی کی ایک پیٹی کا ڈھکن اٹھایا پھر برف میں دبی ہوئی دو ٹھنڈی بوتلیں نکال کر ہماری جانب بڑھا دیں اور بولا۔ "لیں جی...... ٹھنڈی بوتلیں پئیں اور اپنی پیاس بجھائیں۔"

میں نے اور کانسٹیبل ساجد نے اس کے ہاتھ سے بوتلیں لے لیں پھر میں نے اس سے پوچھا۔

"چاچا! تم کتنے عرصے سے یہ دکان چلا رہے ہو؟"

"ساری عمر نوشہرہ ورکاں ہی میں گزری ہے سرکار۔" وہ معتدل انداز میں بولا۔ "پہلے میرا باپ حق نواز یہ دکان چلاتا تھا اور اب میں چلاتا ہوں۔"

"یہ خبر تم تک تو پہنچ ہی گئی ہوگی کہ آج صبح کسی نے فیاض علی کے بیٹے آفتاب کو ادھر ڈیرے پر قتل کر دیا ہے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"کیا بات کرتے ہیں جناب۔" وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ "اس واردات کی خبر تو پورے نوشہرہ ورکاں میں گردش کر رہی ہے۔ یہ علاقہ ہے ہی کتنا بڑا......!"

رب نواز عرف نواجا بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ جس زمانے کا یہ واقعہ ہے تب نوشہرہ ورکاں ایک چھوٹا سا پنڈ ہوا کرتا تھا۔ میں نے ٹھنڈی بوتل کے گھونٹ سے حلق کو تر کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"تمہارا اس واردات کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"بہت برا ہوا جناب۔" وہ افسوسناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "آفتاب بڑا گبرو جوان تھا۔ بزرگوں کا بڑا احترام کرتا تھا۔ وہ بہت خوب صورت کھلاڑی تھا۔"

"کھلاڑی......" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "آفتاب کس چیز کا کھلاڑی تھا؟"

"کبڈی کا۔" اس نے بتایا۔ "نوشہرہ ورکاں نے کبڈی کے بہت سے نامور کھلاڑی پیدا کیے ہیں۔ آفتاب انہی میں سے ایک تھا۔ پتا نہیں، اس جوان کو کس نامراد کی نظر لگ گئی۔ ابھی ایک ماہ پہلے ہی تو اس کی شادی ہوئی تھی۔"

بات کے اختتام پر نواجا اداس ہو گیا۔ "چاچا! میں نے آفتاب کی لاش کا تفصیلی معائنہ کیا ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ کسی سفاک شخص نے بڑی بے دردی سے اسے قتل کیا ہے۔ کیا تم اس واقعے پر کوئی روشنی ڈال سکتے ہو؟"

"جی کیا......؟" وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

"میرا مطلب ہے، آفتاب کو کس نے موت کے گھاٹ اتارا ہوگا۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارے خیال میں اس کا قاتل کون ہو سکتا ہے؟"

"یہ تو سوہنا رب ہی جانتا ہے سرکار۔" وہ محتاط انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں کیا کہہ سکتا ہوں اس بارے میں!"

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ مجھے کچھ بتانا چاہ رہا ہو مگر پھر کسی خیال کے تحت رک گیا تھا۔ میں نے ذرا زاویہ بدل کر سوال کیا۔

"میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا آفتاب کی کسی سے کوئی دشمنی وغیرہ بھی تھی؟"

"نہیں جی۔ آفتاب تو بڑا ہی بابندہ تھا۔" نواجا نے جواب دیا۔ "اس کا مزاج لڑائی جھگڑے والا نہیں تھا۔ دشمن بنانا تو بہت دور کی بات ہے۔"

"چاچا! دشمن بنائے نہیں جاتے، بن جاتے ہیں۔" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ "اور شہ زوری کے کھیلوں میں تو یہ بڑی عام سی بات ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں سرکار مگر میں نے بتایا ہے نا، آفتاب بڑے دھیمے مزاج کا جوان تھا۔" اس نے بتایا۔ "اگر کبھی بدمزگی کی صورت حال پیدا ہو بھی جاتی تو وہ ہمیشہ تحمل مزاجی سے کام لیتا تھا۔ چند روز پہلے کبڈی کے ایک مقابلے میں اچھی خاصی ہنگامہ آرائی ہو گئی تھی۔ اگر اس موقع پر آفتاب سمجھ داری سے کام نہ لیتا تو پھر خون خرابا لازمی تھا۔"

نواجا کی بات سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔ "ہنگامہ آرائی کس بات پر ہوئی تھی۔ مجھے اس واقعے کے بارے میں تفصیل سے بتاؤ؟"

"بس جی، پنڈ کے جوانوں کا آپس میں کبڈی کا مقابلہ ہو رہا تھا۔" وہ بتانے لگا۔ "کسی بات پر دونوں ٹیموں میں تلخ کلامی ہو گئی۔ آفتاب کی مخالف ٹیم میں سے کسی کھلاڑی نے بے ایمانی کی تھی۔ جب آفتاب نے اس پر احتجاج کیا تو دونوں طرف کی فضا گرم ہو گئی۔ بے ایمانی کرنے والے کھلاڑی کا نام فیضی تھا اور فیضی کا ایک ساتھی جیدا اس کی حمایت میں بڑھ چڑھ کر بول رہا تھا۔ یہ چوری اور سینہ زوری والا معاملہ تھا تھانیدار صاحب......" لحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"فیضی اور جیدا خاصے پھڈے باز قسم کے جوان ہیں۔ جیدا، آفتاب کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ فیضی سے اپنی دوستی کا حق نبھاتے ہوئے خوں خوار لہجے میں بولا۔

"فیضی نے کوئی بے ایمانی نہیں کی، تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ تمہاری شادی کیا ہو گئی کہ تم نے خود کو نوشہرہ ورکاں کا ہیرو سمجھنا شروع کر دیا ہے لیکن کبڈی کے کھیل میں فیصلہ میدان میں ہوتا ہے۔"

"بالکل، کبڈی کا فیصلہ میدان ہی میں ہوتا ہے۔" آفتاب نے تحمل لہجے میں کہا۔ "مگر ہر کھیل کے کچھ قاعدے اور قانون ہوتے ہیں جن کی پاس داری ہر کھلاڑی کو کرنا پڑتی ہے۔ دنیا کے کسی کھیل میں بے ایمانی کی کوئی گنجائش نہیں۔"

"تمہارے دماغ پر بے ایمانی کا بھوت سوار ہو گیا ہے۔" جاوید عرف جیدا نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "لیکن تم فکر نہیں کرو، بہت جلد ہم تمہارا یہ بھوت اتار دیں گے......"

"تم زیادتی کر رہے ہو جیدا!" آفتاب نے ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

جیدا بپھرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں حق سچ کی بات کر رہا ہوں۔ اگر تمہیں یہ زیادتی نظر آ رہی ہے تو جا کر اپنی آنکھوں کا علاج کراؤ۔"

"جیدا نے جس تحقیر آمیز انداز میں یہ بات کی تھی، اگر آفتاب کے بجائے اس کے سامنے کوئی گرم دماغ والا ہوتا تو ادھر ہی خطرناک جنگ ہو جاتا تھی۔" نواجا نے اپنی بات کو اختتام کی طرف لاتے ہوئے کہا۔ "مگر آفتاب نے کمال برداشت کا مظاہرہ کیا اور چپ چاپ گھر آ گیا۔ اس کے بعد بھی گاؤں میں کبڈی کا کھیل جاری رہا مگر آفتاب نے پھر کبھی اس کھیل میں حصہ نہیں لیا۔"

"یہ واقعہ کتنا عرصہ پہلے کا ہے؟" نواجا کے خاموش ہونے پر میں نے پوچھا۔

نواجا کی باتوں نے مجھے تشویش میں ڈال دیا تھا۔ اگر سب کچھ ویسے ہی پیش آیا تھا جیسا نواجا نے بیان کیا تھا تو پھر اس کیس میں جیدا سے بھی تفتیش ہونا لازمی تھی۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ فیاض علی نے اس واقعے کا ذکر کیوں نہیں کیا تھا۔

"یہ واقعہ آفتاب کی شادی کے چند روز بعد کا ہے جناب۔" نواجا نے بتایا۔

"لیکن فیاض علی نے مجھے اس بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا۔" میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔

"تھانیدار صاحب! فیاض کا جوان بیٹا قتل ہوا ہے۔" اس نے کہا۔ "ایسے واقعات تو بڑے بڑوں کی مت مار دیتے ہیں۔"

نواجا کی بات میں وزن تھا۔ عین ممکن ہے، اپنی پریشانی میں فیاض علی کا اس واقعے کی طرف دھیان نہ گیا ہو یا اگر اس کے ذہن میں یہ بات آئی بھی تو اس نے اسے اہم نہ سمجھا ہو۔ وہ جس نوعیت کے حالات سے گزر رہا تھا، اس میں اس سے صد فیصد ہوش مندی کی توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی۔

میں چند منٹ مزید نواجا سے بات کرتا رہا پھر واپس تھانے آ گیا۔ نواجا نے جیدا کے حوالے سے کافی فکرانگیز

معلومات فراہم کی تھیں۔ تھانے پہنچ کر میں نے ایک آدمی کو جاوید عرف جیدا کی جانب روانہ کر دیا۔ میں چاہتا تو گاؤں کے اندر اپنی موجودگی کے دوران ہی میں جیدا کو تلاش کروا کر اس سے پوچھ تاچھ کر لیتا لیکن میں نے یہ مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اس وقت پورے گاؤں پر ماتمی فضا نے پنجے گاڑ رکھے تھے اور گرمی تھی کہ وہ انسان کے صبر اور برداشت کو چیلنج کر رہی تھی۔ نواجا نے جو باتیں مجھے بتائی تھیں ان کی روشنی میں، میں جیدا سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا تھا اور اس مقصد کے لیے تھانے کا ماحول زیادہ موزوں تھا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد میرا بھیجا ہوا آدمی واپس آ گیا۔ میں نے اسے اکیلا دیکھا تو پوچھا۔ ''وہ کہاں ہے؟''

''جیدا گاؤں میں موجود نہیں ہے ملک صاحب۔'' اس نے بتایا۔

کانسٹیبل کے جواب نے مجھے چونکا دیا۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔ ''اگر وہ گاؤں میں نہیں تو پھر کہاں گیا ہے؟''

ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں یہ بھی آیا کہ ہوسکتا ہے، آفتاب کے قتل میں جیدا کا کوئی ہاتھ ہو اور وہ اسی وجہ سے کہیں غائب ہو گیا ہے لیکن کانسٹیبل کے جواب نے میرے اس خیال کی تردید کر دی۔

''جناب! وہ کسی کام سے غلہ منڈی گیا ہوا ہے۔'' کانسٹیبل نے بتایا۔ ''اس کے گھر سے پتا چلا ہے کہ جیدا شام سے پہلے واپس آ جائے گا۔ میں نے اس کے گھر والوں سے کہہ دیا ہے کہ وہ جیسے ہی واپس آئے، اسے تھانے بھیج دیں۔''

''یہ تم نے بہت اچھا کیا۔'' میں نے ستائشی نظر سے کانسٹیبل کی طرف دیکھا۔ ''لیکن ہم جیدا کے گھر والوں پر بھروسا کر کے نہیں بیٹھ سکتے۔ کسی بندے کو سادہ لباس میں گاؤں کی طرف روانہ کرنا ہوگا تاکہ وہ گاؤں کے داخلی راستے پر نظر رکھے اور جیسے ہی اسے جیدا دکھائی دے، وہ اسے پکڑ کر تھانے لے آئے۔''

''جی ملک صاحب۔'' کانسٹیبل نے فرماں برداری سے کہا۔ ''میں ابھی اس کا بندوبست کر دیتا ہوں۔''

سہ پہر میں اے ایس آئی مشکور حسین اسپتال سے واپس آ گیا۔ اس نے بتایا کہ آئندہ روز کسی وقت آفتاب کی لاش واپس کر دی جائے گی۔

مشکور حسین اس تھانے میں کافی عرصے سے کام کر رہا تھا اور نوشہرہ ورکاں کے تقریباً تمام لوگوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔ میں نے تازہ ترین حالات سے آگاہ کرنے کے بعد اس سے پوچھا۔

''تم نوشہرہ ورکاں میں بسنے والے افراد سے بہ خوبی واقف ہو۔ کیا تمہیں اس گاؤں کے حالات کی بھی کچھ خبر ہے؟''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''جی ملک صاحب! مجھے گاؤں کے حالات سے کافی حد تک آگاہی حاصل ہے لیکن میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ آپ کے پوچھنے کا مقصد کیا ہے۔ اگر میں غلطی پر نہیں تو......''

اس نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''اگر تم غلطی پر نہیں تو پھر کیا؟''

''میں محسوس کر رہا ہوں کہ آفتاب کے قتل کے حوالے سے آپ کے ہاتھ کچھ لگ گیا ہے......!'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہاں...... کچھ ہاتھ لگا تو ہے......'' میں نے پرسوچ انداز میں کہا۔ ''مگر اس کی اہمیت پر روشنی تم ڈالو گے۔''

''آپ حکم کریں ملک صاحب۔'' وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''جاوید عرف جیدا کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''کبڈی کا اچھا کھلاڑی ہے۔'' اس نے بتایا۔

''کبڈی کا کھلاڑی تو آفتاب بھی تھا!'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''جی ملک صاحب۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ بات مجھے معلوم ہے۔''

''مجھے پتا چلا ہے کہ چند روز پہلے جیدا اور آفتاب کے بیچ کبڈی کے میدان میں اچھی خاصی تلخ کلامی ہوگئی تھی؟''

''جی، میں نے بھی اس ناخوشگوار واقعے کے بارے میں سنا تھا۔''

''تو کیا تم ایسا نہیں سوچتے کہ آفتاب کے قتل میں اس واقعے کا کوئی ہاتھ ہو؟'' میں نے کہا۔ ''ہم ان دونوں کے جھگڑے کو نظرانداز تو نہیں کر سکتے۔''

''آپ نے بالکل بجا فرمایا کہ ہم اس کیس میں معمولی سے معمولی بات کو بھی نظرانداز نہیں کر سکتے۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن مجھے ایسا نہیں لگتا۔''

''کیا مطلب...... تمہیں کیا نہیں لگتا؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ نے جس واقعے کا ذکر کیا ہے اس جھگڑے میں اگر غلطی آفتاب کی ہوتی اور آفتاب نے جیدا کے ساتھ کوئی زیادتی کی ہوتی تو ہم سوچ سکتے تھے کہ جیدا نے

انتقاماً آفتاب کی جان لے لی۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "لیکن میری معلومات کے مطابق، معاملہ اس کے برعکس تھا۔"

"تمہاری بات میں وزن ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نے جیدا کی طرف بندہ دوڑایا تھا مگر مجھے پتا چلا ہے کہ وہ گاؤں میں موجود نہیں۔ وہ کسی کام سے غلہ منڈی گیا ہوا ہے اور شام سے پہلے لوٹ آئے گا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جیدا بڑا گرم دماغ کا ہے۔"

"جی...... واقعی وہ خاصا غصہ ور ہے۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "اور آفتاب کے حوالے سے تو اس کا غصہ اور بھی تیز ہو جاتا ہے۔"

"ایسا کیوں......" میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ "کیا آفتاب نے اس سے کوئی قرض لے رکھا ہے؟"

"قرض لے نہیں رکھا بلکہ قرض چڑھا رکھا ہے۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" میں نے پوچھا۔

مشکور نے بتایا۔ "میری معلومات کے مطابق، جیدا کی بہن فریدہ کی آفتاب کے ساتھ شادی ہونے والی تھی۔ ان کی منگنی تقریباً ایک سال تک رہی پھر آفتاب کے گھر والوں نے منگنی توڑ دی۔ اس کے کچھ عرصے بعد آفتاب کی شادی اس کے تایا کی بیٹی خالدہ سے ہو گئی تھی......" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"بہن کی منگنی ٹوٹ جانے کے سبب وہ آفتاب کو ناپسند کرتا تھا لیکن آپ نے جس واقعے کا ذکر کیا، وہ خالصتاً کبڈی کے کھیل کا جھگڑا تھا۔"

"میرے لیے کبڈی کے کھیل والے جھگڑے سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ جیدا کے دل میں مقتول کے لیے ناپسندیدگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اب تو اس کا انٹرویو اور بھی ضروری ہو گیا ہے......"

پھر میرے اور اے ایس آئی کے بیچ مختلف زاویوں سے آفتاب مرڈر کیس پر بات چیت کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔

☆☆☆

اگلے روز میں نے اے ایس آئی مشکور کو ضروری ہدایات دیں اور خود فیاض علی سے ملنے نوشہرہ ورکاں روانہ ہو گیا۔ میری غیر موجودگی میں تھانے کی کمان مشکور کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ وہ امورِ تھانیداری سے بہ خوبی آگاہ تھا۔ ایک بات بتاتا چلوں کہ گزشتہ روز جیدا تھانے نہیں آیا تھا۔

فیاض علی کی طرف جاتے ہوئے میں جیدا ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مشکور نے مجھے جیدا کی بہن کی منگنی ٹوٹنے کے حوالے سے جو کچھ بتایا تھا، اس کی روشنی میں جیدا کی ذات شک کی دبیز چادر میں لپٹی نظر آتی تھی اور پھر کبڈی کے میدان میں ہونے والا جھگڑا بھی اہمیت کا حامل تھا۔

فیاض علی کے گھر میں سوگواری کی فضا جوں کی توں تھی تاہم لوگوں کا اس وقت رش نہیں تھا۔ میں نے سب سے پہلے مقتول کی بیوہ سے اظہارِ تعزیت کیا۔ انسان کی زندگی کا زیاں اتنا بڑا صدمہ ہوتا ہے کہ اس کی تلافی کے لیے الفاظ بہت حقیر اور چھوٹے پڑ جاتے ہیں۔ بہرحال، متاثرہ شخص کی اشک شوئی کے لیے کسی نہ کسی طرح رسمِ دنیا نبھانا ہی پڑتی ہے۔ خالدہ ایک خوب صورت اور دلکش نقوش کی مالک لڑکی تھی۔ اس واقعے نے اس کے حسن اور رعنائی کو نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ ایک بت کے مانند گم صم بیٹھی تھی۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ بہت جلد میں اس کے شوہر کے قاتل کو گرفتار کر لوں گا۔ اس کے بعد میں فیاض علی اور اس کی بیوی سلطانہ کو لے کر ایک طرف بیٹھ گیا۔

"تھانیدار صاحب! آفتاب کی لاش کب تک ہمیں مل جائے گی؟" سلطانہ نے پوچھا۔

"آج شام تک اسپتال سے آپ کے بیٹے کی لاش آ جائے گی۔" میں نے سلطانہ کو بتایا پھر فیاض علی سے پوچھا۔ "تم نے تو کہا تھا کہ آفتاب کی کسی سے کوئی دشمنی وغیرہ نہیں تھی لیکن میں نے تو کچھ اور ہی سنا ہے......!"

"کیا سنا ہے آپ نے؟" وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔

"مجھے پتا چلا ہے، شادی کے فوراً بعد کبڈی کے میدان میں آفتاب کا جیدا نامی ایک کھلاڑی سے جھگڑا ہو گیا تھا؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"جناب! آپ کو پتا ہی ہے، کھیل کود میں لڑائی جھگڑے کا امکان تو رہتا ہی ہے۔" اس نے سادگی سے کہا۔ "میرا خیال ہے، بات ادھر میدان ہی میں ختم ہو گئی تھی۔ مجھے نہیں لگتا، اس معمولی سے واقعے کی وجہ سے جیدا کوئی سنگین قدم اٹھائے۔"

"تم آپ بہت سیدھے ہو اس لیے آپ کو دوسرے لوگ بھی معصوم اور بے ضرر نظر آتے ہیں۔" سلطانہ نے فیاض علی کو گھورتے ہوئے کہا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"تھانیدار صاحب! آپ درست سمت میں سوچ رہے ہیں۔ ہمارے دشمنوں میں اکا ہو گیا ہے۔ جیدا نے اس دن آفتاب سے جو جھگڑا کیا، اس کے پیچھے فیضی کا دماغ تھا۔"

فیضی کا نام میں نے تو آج ہی کی زبانی سنا تھا۔ اس جھگڑے

کا اصل کردار فیضی ہی تھا۔ فیضی نے کبڈی کے کھیل میں بے ایمانی کی تھی اور ... جیدا اپنے دوست فیضی کی حمایت میں آفتاب کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔

فیاض علی کی بہ نسبت اس کی بیوی مجھے زیادہ ہوشیار اور سمجھدار لگی تو میں نے اسی سے پوچھ تاچھ شروع کر دی۔

''ہاں...... میں نے فیضی کا ذکر بھی سنا ہے۔ جیدا سے اس کی بڑی گہری دوستی ہے۔ ایک بات پوچھوں۔ اس کا بالکل درست جواب دینا......''

''جی پوچھیں۔'' سلطانہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''میں آپ کے ہر سوال کا جواب دوں گی۔''

''مجھے پتا چلا ہے خالدہ سے شادی سے پہلے آفتاب کی جیدا کی بہن فریدہ سے منگنی ہوئی تھی۔'' میں نے سلطانہ کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''یہ منگنی سال بھر رہی پھر آپ لوگوں کی طرف سے منگنی توڑ دی گئی۔ اس واقعے کی بنا پر بھی جیدا آفتاب سے نفرت کر سکتا ہے۔''

''جی، آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''واقعی یہ منگنی ہم نے ہی ختم کی تھی۔''

''منگنی توڑنے کی کوئی خاص وجہ؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے آپ سے سچ بولنے کا وعدہ کیا ہے تھانیدار صاحب اس لیے آپ کو سب کچھ کھول کر بتاؤں گی۔'' سلطانہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ آفتاب کی ایک سال تک فریدہ کے ساتھ منگنی رہی لیکن اس دوران میں ہمیں فریدہ کے کردار کے حوالے سے چند ایسی شرمناک باتیں پتا چلیں کہ کوئی بھی عزت دار انسان فریدہ کو اپنے گھر کی بہو بنانے کا فیصلہ نہیں کر سکتا تھا۔ ہم نے منگنی توڑ دی۔''

''چھوڑو سلطانہ۔ ہر انسان اپنے اعمال کا خود ذمے دار ہے۔'' فیاض علی نے سرزنش کرنے والے انداز میں کہا پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''تھانیدار صاحب! منگنی توڑنے کے چھ ماہ بعد ہم نے آفتاب کی شادی خالدہ سے کی تھی۔ اگر جیدا کے دل میں آفتاب سے انتقام لینے کا خیال ہوتا تو وہ ان چھ ماہ میں کوئی نہ کوئی اوچھی حرکت ضرور کرتا۔''

''آپ یہ بات نہیں سمجھ سکتے کہ شاطر دشمن وقت اور موقع کا انتظار کرتے ہیں۔'' سلطانہ نے اپنے شوہر سے کہا۔ ''اور اب تو اس بدبخت جیدا کے ساتھ ایک اور خبیث بھی جڑ گیا ہے۔''

''کون خبیث؟'' میں نے بے اختیار سوال کیا۔

''میں فیضی کی بات کر رہی ہوں تھانیدار صاحب۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مجھے تو فیضی پر پکا شک ہے۔ جیدا کی بہن کی تو صرف منگنی ہی ٹوٹی تھی، آفتاب کی شادی نے تو فیضی کی گردن جھکا دی ہے۔''

مجھے نواجا کی بتائی ہوئی باتیں یاد آنے لگیں۔ اس نے کبڈی والے جھگڑے کی تفصیل بتاتے ہوئے جیدا اور آفتاب کے مکالمے بھی شامل کیے تھے۔ جب آفتاب نے فیضی کی بے ایمانی پر آواز اٹھائی تھی تو جیدا نے اس کی شادی کا حوالہ دے کر کہا تھا...... تمہاری شادی کیا ہوئی کہ تم نے خود کو تو شہرہ ورکاں کا ہیرو سمجھنا شروع کر دیا ہے...... وغیرہ وغیرہ...... اور اب سلطانہ بھی کچھ اسی نوعیت کی بات کر رہی تھی۔

''آفتاب کی شادی سے فیضی کی گردن کیسے جھک گئی تھی؟'' میں نے سلطانہ سے سوال کیا۔

''کبڈی کے میدان میں تو میرا بیٹا فیضی کو ہمیشہ ٹاڑتا ہی تھا۔'' وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔ ''لیکن خالدہ سے جب آفتاب کی شادی ہوئی تو یہ فیضی کے لیے ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ آفتاب نے کبڈی کے میدان سے باہر اسے شکستِ فاش دی تھی تھانیدار صاحب......''

''میں اس شکستِ فاش کی تفصیلات جاننا چاہتا ہوں۔'' میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''مجھے ایک ایک بات بتاؤ۔''

''میں آپ کو بتاتا ہوں جی۔'' فیاض علی گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''خالدہ میرے بڑے بھائی کی بیٹی ہے۔ بھائی فدا حسین گوجرانوالہ شہر میں رہتا ہے۔ وہاں اس کا پیتل کے برتنوں کا کارخانہ ہے۔ کسی زمانے میں بھائی فدا بھی ادھر شہرہ ورکاں ہی میں رہتا تھا۔ پھر اس نے ساری اراضی فروخت کر دی اور بیوی بچوں کو لے کر گوجرانوالہ منتقل ہو گیا۔ اب وہ ایک طویل عرصے سے ادھر گوجرانوالہ شہر میں ہے۔ شہر جا کر اس نے خوب ترقی کی اور زمیندار سے کارخانے دار بن گیا۔ اس کی صرف دو اولادیں ہیں۔ ایک خالدہ اور خالدہ سے تین سال چھوٹا ایک بھائی جس کا نام سعید ہے......''

''یہ آپ تھانیدار صاحب کو فضول کہانی سنا رہے ہو۔'' سلطانہ نے اپنے شوہر کو ٹوکتے ہوئے کہا۔ ''وہ فیضی اور آفتاب والے معاملے کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں......!''

''تو پھر تم خود ہی تھانیدار صاحب کو سب کچھ بتا دو۔'' فیاض علی خفگی آمیز لہجے میں بولا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے اس نے اضافہ کیا۔ ''تھانیدار صاحب! میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔ آپ سلطانہ سے سوال جواب کریں۔''

اپنی بات کے اختتام پر وہ اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ سلطانہ نے کہا۔ ''لو جی...... میں نے تو کوئی غلط بات

نہیں کی۔ یہ تو خوامخواہ ہی ناراض ہو رہے ہیں۔"

"جوان بیٹے کی موت کوئی معمولی حادثہ نہیں ہوتی سلطانہ۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "فیاض علی کی ذہنی حالت کو میں اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔"

"آفتاب صرف فیاض ہی کا بیٹا نہیں تھا تھانیدار صاحب۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "وہ میرا بھی لختِ جگر تھا۔ اس کی جدائی نے مجھے اندر سے مار دیا ہے....." وہ نم ہوتی ہوئی آنکھوں کو دوپٹے کے پلو سے خشک کرتے ہوئے بولی۔ "لیکن کیا کریں..... مرنے والے کے ساتھ مرا تو نہیں جاتا نا..... اگر ہم ہمت ہار کر بیٹھ گئے تو پھر قاتل کی گرفتاری کے سلسلے میں آپ کی مدد کون کرے گا.....!"

"تم بڑی بہادر اور حوصلے والی عورت ہو سلطانہ!" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے بتاؤ، اصل کہانی کیا ہے؟ آفتاب کے قتل کے حوالے سے تمہیں کس پر شک ہے؟"

اب تک کی گفتگو سے میں نے بہ خوبی یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ فیاض علی کی بہ نسبت سلطانہ سے کوئی کام کی بات اگلوائی جاسکتی تھی۔ وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

"تھانیدار صاحب! میں نے اپنے بیٹے کا خون ہوتے نہیں دیکھا اس لیے قسم اٹھا کر تو میں قاتل کی نشاندہی نہیں کرسکتی لیکن میرا شک صرف اور صرف فیضی پر جاتا ہے۔"

"اس شک کا سبب کیا ہے؟" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "میں ان ٹھوس وجوہات سے آگاہی حاصل کرنا چاہتا ہوں جن کی بنا پر تم فیضی کو اپنے بیٹے کی موت کا ذمے دار سمجھتی ہو۔"

"تھانیدار صاحب....." وہ گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "اس معاملے کو سمجھنے کے لیے آپ کو تین گھرانوں کی آپس کی رشتے داریوں سے آگاہ ہونا پڑے گا۔ یعنی ہمارا گھرانا، خالدہ کا گھرانا اور فیضی کا گھرانا۔"

"ابھی تمہارے سامنے فیاض علی نے بتایا تو ہے کہ خالدہ اس کے بڑے بھائی فدا کی بیٹی ہے۔" میں نے کہا۔ "اس طرح دو گھرانوں کا رشتہ تو واضح ہوگیا۔"

"ہاں۔ دو گھرانوں کی رشتے داری آپ کے علم میں آچکی ہے۔" وہ بڑی رسان سے بولی۔ "لیکن تیسرا گھرانا ابھی باقی ہے اور اس کی رشتے داری بڑی ٹیڑھی ہے۔ میرا اشارہ فیضی کے گھرانے کی طرف ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم مجھے فیضی کے گھرانے کے بارے میں بتاؤ۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اس کی ٹیڑھیں نکالنے کا کام تم مجھ پر چھوڑ دو۔"

"فیضی کے گھرانے کی ہم سے کوئی رشتے داری نہیں مطلب براہ راست ہمارے بیچ کوئی رشتہ نہیں ہے۔" اس نے بتایا۔ "لیکن ان کی فدا حسین کے گھرانے سے بڑی گہری رشتے داری تھی۔"

"رشتے داری تھی..... سے تمہاری کیا مراد ہے؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"مطلب یہ کہ آج کل شدید نوعیت کی ناراضی چل رہی ہے۔" اس نے بتایا۔ "رشتے داری تو اپنی جگہ پر موجود ہے مگر دلوں کی رنجشیں اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ دونوں گھرانوں کے افراد ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے روادار نہیں ہیں۔"

"اس نفرت آمیز بائیکاٹ کی کیا وجہ ہے؟" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے سوال کیا۔

"فیضی اور آفتاب کا رشتہ۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔

"میں سمجھا نہیں.....؟" میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"خالدہ کی ماں شاہدہ، فیضی کی خالہ ہے یعنی فیضی کی ماں زاہدہ کی چھوٹی بہن۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "زاہدہ کی خواہش تھی کہ وہ فیضی کی شادی اپنی چھوٹی بہن کی بیٹی خالدہ سے کرے لیکن دوسری جانب سے صاف انکار ہوگیا۔"

"اوہ..... اب بات کچھ کچھ سمجھ میں آرہی ہے۔" میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "ظاہر ہے، یہ انکار خالدہ کے باپ نے کیا ہوگا کیونکہ وہ خالدہ کی شادی اپنے چھوٹے بھائی کے بیٹے آفتاب سے کرنا چاہتا تھا۔"

"نہیں جناب! آپ بالکل بھی نہیں سمجھے۔" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "میں نے بتایا ہے نا، ان دونوں خاندانوں کی رشتے داری بہت ٹیڑھی ہے۔"

"تو پھر تم ہی بتاؤ....." میں نے ٹٹولنے والی نظر سے اسے دیکھا۔ "اس رشتے سے کس نے انکار کیا تھا؟"

"شاہدہ نے!" وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولی۔

"یعنی چھوٹی بہن نے بڑی بہن کو انکار کردیا.....؟"

"جی بالکل چٹا انکار۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔ "ورنہ فدا حسین کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ شاہدہ کسی بات پر زاہدہ سے ناراض ہوگی ورنہ انکار کی کوئی وجہ بہ ظاہر دکھائی نہیں دیتی۔"

"آپ کی اس بات سے پورا نوشہرہ ورکاں اتفاق کرے گا کہ بہ ظاہر رشتے سے انکار کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی

کیونکہ اس انکار سے پہلے دونوں بہنوں میں بڑے گہرے تعلقات تھے اور ان کا ایک دوسرے کے گھر میں آنا جانا بھی تھا۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "لیکن فیضی کے رشتے سے انکار کے بعد سے زاہدہ کا دل ایسا کھٹا ہوا ہے کہ وہ شاہدہ کا نام لینا بھی پسند نہیں کرتی اور...... زاہدہ کے گھر والے شوکت علی کو تو ایسا صدمہ پہنچا کہ بے چارے کو فالج...... ہو گیا ہے۔"

"اوہ......" میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ "آپ لوگوں نے بتایا کہ خالدہ کا میکا گوجرانوالہ شہر میں ہے۔ کیا فیضی ادھر ہی رہتا ہے یا یہ لوگ بھی گوجرانوالہ ہی کے وسنیک ہیں؟"

"صرف فدا حسین اپنے بیوی بچوں کو لے کر گوجرانوالہ چلا گیا تھا اور وہ بھی کئی سال پہلے جب خالدہ اور سعید بہت چھوٹے تھے۔" سلطانہ نے بتایا۔ "باقی سب لوگ ادھر نوشہرہ ورکاں ہی میں ہیں۔ زاہدہ کا گھرانا بھی اسی گاؤں میں آباد ہے۔"

"تو تمہارا یہ خیال ہے کہ فیضی کو اس بات کا بہت غصہ تھا کہ جس لڑکی کی شادی اس سے نہ ہو سکی وہ آفتاب کی بیوی بن کر نوشہرہ ورکاں آ گئی؟" میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔ "لہٰذا تمہیں شک ہے کہ آفتاب کے قتل میں فیضی کا ہاتھ ہو سکتا ہے......؟"

"اگر میں ایسا سوچتی ہوں تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھانیدار صاحب۔" وہ مستحکم لہجے میں بولی۔ "آپ پورے پنڈ میں گھوم پھر کر فیضی کے بارے میں معلومات اکٹھی کر لیں۔ آپ کو خود ہی اندازہ ہو جائے گا کہ وہ کتنا کینہ اور کینہ پرور ہے۔"

"اس بات کا مجھے کافی حد تک اندازہ ہو چکا ہے۔" میں نے کہا۔ "باقی ماندہ میں اس کے گھر جا کر معلوم کر لوں گا۔ ان لوگوں سے ملنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔"

"آپ ضرور ملیں ان سے بھی اور دوسرے لوگوں سے بھی۔" وہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ "میرے کلیجے میں تو اس وقت ٹھنڈ پڑے گی جب آفتاب کا قاتل پھانسی کے پھندے میں لٹکا ہوا نظر آئے گا۔"

"یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ میں بہت جلد تمہارے کلیجے کی ٹھنڈک کا بندوبست کر دوں گا۔" میں نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ "اس سلسلے میں تمہیں مایوسی کا منہ نہیں دیکھنا پڑے گا۔"

"اللہ آپ کی زبان مبارک کرے تھانیدار صاحب!" وہ خواب ناک لہجے میں بولی۔

میں مزید چند منٹ سلطانہ کے پاس بیٹھا پھر جانے کے لیے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور سرسری انداز میں پوچھا۔ "تمہارا چھوٹا بیٹا کہاں ہے؟ ابھی تک اس سے میری ملاقات نہیں ہو سکی......!"

"زلفی آپ کے آنے سے پہلے تو ادھر گھر ہی میں تھا۔" وہ چاروں جانب نگاہ دوڑاتے ہوئے بولی۔ "ٹھہریں، میں باہر گلی میں دیکھتی ہوں۔ بھائی کی موت نے اسے بھی بہت متاثر کیا ہے۔ وہ اپنی بیماری کو بھول کر مارا مارا پھر رہا ہے۔"

"تم آرام کرو سلطانہ۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "زلفی سے ملنا ضروری نہیں۔ میں نے تو بس ایسے ہی رواروی میں پوچھ لیا تھا۔"

مجھے اپنی تفتیش کو آگے بڑھانے کے لیے اچھا خاصا مواد مل گیا تھا۔ سلطانہ سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں بہ آسانی میں قاتل تک رسائی کے راستے کا تعین کر سکتا تھا۔ میں نے دو افراد کے ناموں پر دائرہ لگایا اور فیاض علی کے گھر سے باہر نکل آیا۔ یہ دو نام تھے...... جاوید عرف جیدا اور فیض عرف فیضی۔ یہ دونوں مقتول کو سخت ناپسند کرتے تھے اور ان دونوں کے پاس مقتول کو نقصان پہنچانے کا بہانہ بھی موجود تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ جیدا اور فیضی کے بیچ گہری دوستی بھی تھی۔

جب میں باہر گلی میں آیا تو مجھے فیاض علی نظر آ گیا۔ اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر شخص اور ایک نوعمر لڑکا بھی موجود تھا۔ ادھیڑ عمر شخص کے چہرے میں فیاض علی کی شباہت پائی جاتی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی فیاض علی تعارف کرانے والے انداز میں بولا۔

"یہ فدا بھائی ہیں۔ آفتاب کی موت کا سن کر گوجرانوالہ سے آئے ہیں۔" پھر وہ نوجوان لڑکے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہ سعید ہے، خالدہ کا چھوٹا بھائی۔"

میں فدا حسین اور اس کی فیملی سے غائبانہ طور پر متعارف ہو چکا تھا۔ میں نے فدا حسین سے مصافحہ کیا اور آفتاب کو پیش آنے والے واقعے پر اظہارِ افسوس بھی کیا۔

فدا ایک دبنگ شخص تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے مجھ سے کہا۔ "تھانیدار صاحب! آفتاب مجھے بہت عزیز تھا۔ میں نے خالدہ کو اس کے نکاح میں دے کر اسے اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔ اس کی موت میرے لیے ایک عظیم جذباتی نقصان ہے اور اس نقصان کی تلافی صرف اور صرف آپ کر سکتے ہیں...!" ...... لمحاتی توقف کر کے اس نے میری آنکھوں میں دیکھا پھر گمبھیر لہجے میں مستفسر ہوا۔

''آپ میری بات تو سمجھ گئے ہیں نا؟''

''میں آپ کی بات کی تہ میں اتر گیا ہوں جناب۔'' میں نے پُراعتماد انداز میں کہا۔ ''آپ فکر ہی نہ کریں۔ آپ بہت جلد آفتاب کے قاتل کو قانون کے کٹہرے میں دیکھیں گے۔''

''بس...... میں یہی چاہتا ہوں۔'' وہ مطمئن انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس سلسلے میں اگر کسی بھی نوعیت کے تعاون کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔''

''اگر ضرورت محسوس ہوئی تو میں آپ کو زحمت دینے میں کسی سوچ بچار سے کام نہیں لوں گا۔'' میں نے کہا۔

''شکریہ تھانیدار صاحب۔'' وہ ممنونیت بھرے انداز میں بولا پھر پوچھا۔ ''آفتاب کی لاش کب تک ہمارے حوالے کر دی جائے گی؟''

''آپ لوگ تدفین کی تیاری کر لیں۔'' میں نے مغموم لہجے میں کہا۔ ''شام سے پہلے کسی وقت بھی آفتاب کی لاش اسپتال سے تھانے پہنچ جائے گی۔ کاغذی کارروائی پوری کرنے کے بعد میں لاش کو آپ کے سپرد کر دوں گا۔''

فدا حسین نے میرا شکریہ ادا کیا پھر اپنے بھائی فیاض کے ساتھ گھر کے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ میں تانگے کی سمت قدم اٹھانے لگا۔ میں جس تانگے پر سوار ہو کر نوشہرہ ورکاں آیا تھا، وہ نواجا کریانہ فروش کی دکان کے قریب ہی کھڑا تھا۔ مجھ پر نظر پڑی تو نواجا نے مجھے سلام کیا اور انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔

''تھانیدار صاحب! آخر آپ نے نوشہرہ ورکاں میں گرفتاری ڈال ہی دی......''

فوری طور پر میں اس کی بات کو سمجھ نہیں پایا۔ میں نے قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔ ''چاچا! تم کس گرفتاری کی بات کر رہے ہو؟''

''وہ جی...... ابھی آپ کے تھانے کا ایک بندہ جیدا کو اپنے ساتھ لے کر گیا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اوہ اچھا......'' میں نواجا کی بات سمجھ گیا اور کہا۔ ''یہ سب تفتیش کا حصہ ہے چاچا۔ اگر ضرورت پڑی تو تمہاری گرفتاری بھی عمل میں لائی جا سکتی ہے!''

آخری جملہ میں نے ایسے ہی ٹانک دیا تھا۔ میری بات سن کر وہ سہم گیا اور خوفزدہ لہجے میں بولا۔ ''جناب! میں نے کون سا جرم کیا ہے؟''

''جیدا نے بھی میرے بندے سے یہ سوال ضرور پوچھا ہوگا۔'' میں نے نواجا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ہم یوں چلتے پھرتے گلی کوچوں میں لوگوں کو ان کے جرائم کی تفصیلات پڑھ کر نہیں سنایا کرتے۔ ایسے کاموں کے لیے تھانہ ہے نا......!''

''معافی چاہتا ہوں سرکار۔'' وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا جس کے لیے مجھے گرفتار ہو کر تھانے میں پیش ہونا پڑے۔''

''بس تو پھر تمہیں فکرمند ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا اور تانگے پر سوار ہو گیا۔

نواجا نے جیدا کی گرفتاری کی بات کر کے مجھے بے چین کر دیا تھا۔ میں تو کل شام ہی کو جیدا کی تھانے میں آمد کی توقع کر رہا تھا لیکن کل کی تاریخ میں میری یہ توقع پوری نہیں ہو پائی تھی۔ خیر...... دیر آید، درست آید!

☆☆☆

جاوید عرف جیدا میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے عقب میں ایک پھرتیلا کانسٹیبل بھی موجود تھا تاکہ میرے سوالات کے دوران میں اگر جیدا کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کرے تو وہ اسے اپنے مخصوص ہتھکنڈوں سے ''سیدھی راہ'' دکھا سکے۔

جیدا کی عمر لگ بھگ پچیس سال رہی ہوگی۔ وہ ایک قد آور اور صحت مند جوان تھا۔ رنگت گندمی اور سر کے بال گھنگریالے...... اس کے چہرے پر ایک خاص نوعیت کی کرختگی پائی جاتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اگر اس سے بات کی جائے تو وہ فوراً لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ اس کی شخصیت سے ایک جھگڑالو انسان کا تاثر ابھرتا تھا۔

میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ ''بہت دیر کی مہرباں آتے آتے...... ہوں؟''

''میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ مجھے پکڑ کر یہاں کیوں لایا گیا ہے؟'' وہ بیزاری سے بولا۔ ''آخر میرا قصور کیا ہے؟''

''ہم تمہارے سوالوں کے جواب دینے کے لیے تھانہ سجا کر نہیں بیٹھے ہوئے۔'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تمہیں یہاں ضروری پوچھ گچھ کے لیے لایا گیا ہے۔ سوال ہم کریں گے اور جواب تم دو گے۔ اس سوال و جواب میں تمہارا قصور کھل کر سامنے آ جائے گا۔ بات آئی سمجھ میں یا...... کسی دوسرے طریقے سے سمجھاؤں؟''

جیدے کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک پائی جاتی تھی۔ میرے جارحانہ انداز نے اسے محسوس کرا دیا کہ اکھڑپن سے کام نہیں چلے گا لہٰذا اس نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔

''آخر آپ مجھ سے کس قسم کی پوچھ گچھ کرنا چاہتے ہیں؟''

ادھر جیدا کی بات ختم ہوئی، ادھر اس کے پیچھے کھڑے ہوئے توی الجثہ کانسٹیبل نے نہایت ہی پھرتی کے ساتھ جیدا کی گردن پر ایک دوہتڑ رسید کیا اور خوں خوار لہجے میں بولا۔

''ملک صاحب کے سامنے سوال نہیں....صرف جواب!''

''یہ تو آپ میرے ساتھ زیادتی کررہے ہیں۔'' وہ نیم احتجاجی انداز میں چلایا۔

کانسٹیبل نے ایک مرتبہ پھر مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جیدا کی کمر پر سرکاری بوٹ کی ٹھوکر جمائی اور غراہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ''ملک صاحب کے سامنے آواز نیچی......!''

کانسٹیبل کے اس خیر مقدمی سلوک نے جیدا کے کس بل کافی حد تک نکال دیے۔ میں نے تھانیدارانہ انداز میں کہا۔

''ابھی تو میں نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی جیدا لیکن اگر تم نے میرے سوالات کے سیدھے اور سچے جوابات نہ دیے تو پھر تمہیں زیادتی کے مفہوم سے آشنا کرنے کے لیے مجھے مجبوراً تمہیں دو چار گھنٹوں کے لیے ڈرائنگ روم کی سیر کرانا پڑے گی۔ ہمارے ڈرائنگ روم کی ضیافت بڑے بڑوں کو کھایا پیا سب اگلنے پر آمادہ کردیتی ہے......!''

وہ خوفزدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ پوچھیں جی......میں آپ سے کوئی غلط بیانی نہیں کروں گا۔''

''تم نے آفتاب کو کیوں قتل کیا؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''م......میں نے......'' وہ اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے الجھن زدہ انداز میں بولا۔ ''میں نے کسی کو قتل نہیں کیا......تھانیدار صاحب۔''

''میں نے تم سے کسی کو قتل کرنے کے بارے میں نہیں پوچھا۔'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''میں آفتاب کی بات کررہا ہوں۔''

''جناب! میں آفتاب کے قتل کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' وہ منت ریز انداز میں بولا۔ ''مجھے تو خود کل رات کو اس واقعے کا پتا چلا ہے۔ میں تو کل کا پورا دن ادھر نوشہرہ ورکاں میں تھا ہی نہیں اور......پھر میں آفتاب کو کیوں قتل کروں گا؟ میری اس سے کیا دشمنی؟''

''ملک صاحب! اس بدبخت کو تھوڑی دیر کے لیے آپ میرے حوالے کردیں۔'' کانسٹیبل نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''میری بات اس کی سمجھ میں بیٹھ نہیں رہی۔ یہ آپ سے سوال پر سوال کیے جارہا ہے۔''

''اب اگر یہ کوئی سوال کرے تو پھر تم اسے اپنے ساتھ ٹرائل روم میں لے جانا۔ تمہیں اس کی خاطر مدارات کی کھلی اجازت ہوگی۔'' میں نے کانسٹیبل کو فری ہینڈ دیتے ہوئے کہا پھر جیدا کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''تمہارے دونوں سوالوں کا جواب میں بعد میں دوں گا۔ یہ تو کل ہی مجھے پتا چل گیا تھا کہ تم نوشہرہ ورکاں میں موجود نہیں ہو اور مجھے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ تم شام سے پہلے واپس آجاؤ گے مگر تم نہیں آئے۔ آخر تم اس دوران میں تھے کہاں اور کیا کرتے پھر رہے تھے؟''

''جناب! مجھے پروگرام کے مطابق، شام سے پہلے واپس آنا تھا۔ بس پھر دیر ہوگئی اور میں رات کو کافی دیر سے گھر پہنچا ہوں اور صبح ہوتے ہی آپ کا بندہ پکڑ کر مجھے تھانے لے آیا ہے۔'' وہ فریادی لہجے میں بولا۔

''میرے بندے نے جو کچھ بھی کیا اس میں میری مرضی شامل تھی۔'' میں نے سپاٹ انداز میں کہا۔ ''مجھے بتاؤ، تم گئے کہاں تھے؟''

اگرچہ جیدا کے گھر والوں سے یہ معلومات مجھ تک پہنچ چکی تھیں کہ وہ کسی کام سے غلہ منڈی گیا ہوا تھا لیکن میں تفتیشی تقاضے پورے کرتے ہوئے یہ سب اس کی زبان سے سننا چاہتا تھا۔ جیدا نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

''میں غلہ منڈی گیا ہوا تھا جی۔''

''کون سی غلہ منڈی۔'' میں نے پوچھا۔ ''پرانی یا نئی؟''

''پرانی غلہ منڈی جناب۔''

''وہاں کس کام سے گئے تھے تم؟'' میں نے سوال کیا۔

''سبزیوں کے بیج لانا تھے۔'' اس نے بتایا۔ ''اس کے علاوہ گندم وغیرہ کی مارکیٹ بھی چیک کرنا تھی۔ آج کل گندم کا سیزن چل رہا ہے۔ کاشت کار کو ہر چیز کی خبر رکھنا پڑتی ہے جناب۔''

''تم کل صبح کتنے بجے گھر سے روانہ ہوئے تھے؟'' میں نے سوالات کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے پوچھا۔

''لگ بھگ سات بجے میں گھر سے نکلا تھا۔'' اس نے بتایا۔

میرے اندازے کے مطابق، آفتاب کی موت صبح پانچ اور چھ بجے کے درمیان ہوئی تھی اور اس کی خونچکاں لاش کو آٹھ بجے فیاض علی نے ڈیرے کے ایک کمرے میں دریافت کیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب جیدا اپنے گھر سے روانہ ہوا تو اس سے پہلے آفتاب کا قتل ہوچکا تھا اور جب آفتاب کی موت کی خبر منظرِ عام پر آئی تو تب تک جیدا گاؤں سے جاچکا تھا۔ اس تناظر میں جیدا کسی بھی صورت آفتاب

کے قتل میں ملوث نظر نہیں آتا تھا لیکن یہ تو جیدا کا بیان تھا کہ گزشتہ روز وہ صبح سات بجے گھر سے نکلا تھا اور میں آنکھیں بند کر کے اس کے بیان پر یقین نہیں کر سکتا تھا لہٰذا حقیقت کا سراغ لگانے کے لیے جیدا کی زبانی کلامی اور ضرورت پڑنے پر ہاتھ پاؤں کے موثر استعمال سے رگڑائی منجھائی کرنے میں مجھے عار نہیں تھی۔

''جب تم گھر سے روانہ ہوئے تو تمہیں پتا نہیں تھا کہ آفتاب کو کسی نے بے دردی سے قتل کر دیا ہے؟'' میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں گزشتہ رات اس واقعے کی خبر ہوئی تھی...... ایسا ہی ہے نا؟''

''جی!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''بالکل ایسا ہی ہے۔''

''تم نے پرانی غلہ منڈی کی کس دکان سے سبزیوں کے بیج وغیرہ خریدے تھے؟'' میں نے معتدل انداز میں استفسار کیا۔

''چودھری نوازش علی اینڈ سنز سے۔'' اس نے جواب دیا۔

''چودھری نوازش علی اینڈ سنز تو کافی مشہور دکان ہے۔'' میں نے کہا۔ ''غلہ منڈی میں ان کا ایک نام ہے اور وہ اپنی دکان سے خریدی ہوئی ہر چیز کی رسید ضرور دیتے ہیں۔ کیا تم نے ان سے سبزیوں کے جو بیج خریدے تھے اس کی رسید لی تھی؟''

''جی بالکل لی تھی۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''وہ رسید اس وقت بھی میری ڈب میں موجود ہے۔''

''لاؤ...... وہ رسید مجھے دکھاؤ۔'' میں نے کہا۔

جیدا نے پاپلین کا کرتہ اور تہ بند پہن رکھا تھا۔ میرے رسید کے مطالبے پر اس نے اپنی دھوتی کی ڈب میں سے ایک مڑا تڑا کاغذ نکال کر میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ لیں جناب۔ دیکھ لیں رسید۔''

تہ بند یا دھوتی کے پلوؤں کو گھما کر کمر کی دونوں جانب ایک مخصوص انداز میں اڑس لیا جاتا ہے جو کہ ''ڈب'' کہلاتی ہے۔ اکثر دیہاتی ہلکی پھلکی چیزیں اپنی ڈب میں رکھ لیتے ہیں۔ ڈب ایک طرح سے جیب کا کام دیتی ہے۔

میں نے جیدا کی فراہم کردہ رسید کا بغور جائزہ لیا۔ ''وہ چودھری نوازش علی اینڈ سنز'' کی ہی پرنٹڈ رسید تھی۔ رسید کے بالائی حصے میں جلی حروف میں ''چودھری نوازش علی اینڈ سنز'' چھپا ہوا تھا۔ نیچے خریدے گئے سامان کی تفصیل تھی۔ میں نے وہ تفصیل پڑھی۔ رسید کے مطابق، متذکرہ بالا دکان سے مختلف سبزیوں کے بیجوں کی خریداری کی گئی تھی۔ میرے لیے اس رسید میں سب سے زیادہ اہمیت کی حامل وہ تاریخ تھی جس روز یہ خریداری کی گئی تھی۔ رسید پر گزشتہ روز کی تاریخ درج تھی یعنی رواں مہینے کی اٹھارہ تاریخ۔ یہ کیش میمو اس امر کا بین ثبوت تھا کہ گزشتہ روز یعنی اٹھارہ تاریخ کو جیدا نے چودھری نوازش علی اینڈ سنز سے مختلف سبزیوں کے بیج خریدے تھے۔ اس رسید کی رو سے جیدا کی جائے واردات سے عدم موجودگی ثابت ہوتی تھی مگر میرا شک ابھی تک دور نہیں ہوا تھا۔ میری تسلی اس وقت ہوتی جب میں اس رسید کی تصدیق کر لیتا۔

میں نے مذکورہ رسید کو اپنی میز کی دراز میں ڈالا اور جیدا کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''تو تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ تم نے آفتاب کو قتل نہیں کیا اور نہ ہی اس واقعے سے تمہارا دور دور کا واسطہ ہے......؟''

''جی۔ میں نے یہی کہا ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اور میں اپنے اس بیان پر کھڑا ہوں۔''

''تمہارے خیال میں آفتاب کو کس نے قتل کیا ہے؟'' میں نے ایک دوسرے زاویے سے سوال کیا۔

''مجھے کیا پتا جی۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''آفتاب کے قاتل کو ڈھونڈنا تو آپ کا کام ہے۔''

''ٹھیک کہا تم نے۔'' میں نے بہ دستور اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ میرا ہی کام ہے اور میں اپنے کام میں مصروف ہوں لیکن اس کام میں ایک رکاوٹ پیدا ہو گئی ہے۔''

''کیسی رکاوٹ تھانیدار صاحب؟'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''اس رکاوٹ کا نام ہے جاوید عرف جیدا۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تھانیدار صاحب۔'' وہ حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ ''میں بھلا آپ کے راستے کی رکاوٹ کیسے بن سکتا ہوں......؟''

''وہ اس طرح کہ میں اپنی تفتیش کے گھوڑے کو جس بھی سمت دوڑاتا ہوں، سامنے تم ہی کھڑے دکھائی دیتے ہو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ سچ ہے کہ خالدہ سے شادی سے پہلے آفتاب کی تمہاری بہن فریدہ کے ساتھ منگنی ہوئی تھی؟''

''جی۔ یہ بات بالکل درست ہے۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ایک سال تک یہ منگنی برقرار رہی پھر ٹوٹ گئی۔''

اپنے جملے کے آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کے

چہرے پر تلخی کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ میں نے پوچھا۔

"یہ منگنی کیسے ٹوٹ گئی؟"

"آفتاب کے گھر والوں نے منگنی توڑ دی تھی۔" اس نے بتایا۔

"منگنی ٹوٹنے کا سبب کوئی بھی رہا ہو، میں اس بحث میں نہیں جاؤں گا۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن یہ بات تو تم مانو گے نا کہ اس منگنی کے ٹوٹنے سے تمہیں دلی صدمہ پہنچا تھا؟"

"ظاہر سی بات ہے جناب۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "فریدہ میری اکلوتی چھوٹی بہن ہے۔ اگر کسی لڑکی کی منگنی ٹوٹ جائے تو اس کی ذات پر ایک طرح کا دھبا سا لگ جاتا ہے۔ بعض لوگ اسے منحوس بھی سمجھنے لگتے ہیں اور اس کا رشتہ ڈالنے والے یہ تحقیق بھی کرنا لازمی سمجھتے ہیں کہ پہلی منگنی کیوں ٹوٹی تھی۔" لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر افسردہ لہجے میں بولا۔

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب۔ فریدہ کی منگنی ٹوٹنے کا مجھے بہت دکھ ہوا تھا۔ اس واقعے کو لگ بھگ ایک سال ہونے کو آیا ہے لیکن ابھی تک ہم راہ دیکھ رہے ہیں...... کہ اس کا کوئی رشتہ آئے......!"

بات کے اختتام پر وہ اچھا خاصا مغموم ہوگیا تھا۔ میں اس کے درد کو سمجھ سکتا تھا اور اس دکھ سے اتفاق کرتا تھا۔ اس کا مسئلہ واقعی جینوئن تھا۔ محبت کرنے والے بھائی اپنی بہنوں کے رشتوں کے لیے اسی انداز میں پریشان اور فکرمند ہوا کرتے ہیں۔ سلطانہ نے مجھے اس منگنی کو توڑنے کا جو سبب بتایا تھا، میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا تھا کیونکہ اس بحث میں فریدہ کی کردارکشی کا پہلو اجاگر ہوتا تھا۔ بیٹیاں اور بہنیں سب کی سانجھی ہوتی ہیں۔ کسی کی بیٹی یا بہن کے بارے میں لب کشائی کرنے سے پہلے ایک لمحے کے لیے اپنے گریبان میں ضرور جھانک لینا چاہیے۔ کسی سیانے کا بڑا خوب صورت اور معنی آفریں قول ہے...... باحیا کو حیا مارتی ہے اور بے حیا زہر سے بھی نہیں مرتے!

عین ممکن تھا کہ سلطانہ کے بیان میں کوئی حقیقت نہ ہو۔ یہ اس کا وہم یا گمان یا غلط فہمی بھی ہوسکتی تھی۔ میں نے جیدا سے کہا۔

"بہن کی منگنی ٹوٹنے سے تمہیں جو اذیت پہنچی تھی تم اس تکلیف کا اظہار گاہے بہ گاہے کرتے رہتے تھے۔"

"جی، ایسا ہی ہے۔" اس نے تائیدی انداز میں کہا۔

"تم اپنی تکلیف کے اظہار کے لیے آفتاب کے خلاف بھی باتیں کرتے رہتے ہو۔" میں نے غیرمحسوس انداز میں جیدا کو ایک خاص مقام کی طرف دھکیلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تمہاری باتوں سے آفتاب کے لیے نفرت ٹپکتی ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

"تھانیدار صاحب! آفتاب اور اس کے گھر والوں نے میری بہن کے ساتھ جو سلوک کیا اس کے بعد میں ان لوگوں کو پھولوں کے ہار تو پہنا نہیں سکتا۔" وہ کڑواہٹ بھرے لہجے میں بولا۔ "ہاں...... آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں آفتاب اور اس کے گھر والوں سے شدید نفرت کرتا ہوں۔"

"اور تمہاری یہ نفرت حقِ دوستی کی انجام دہی کے سبب دو آتشہ ہو چکی ہے......!" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"حقِ دوستی؟" اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

"آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھانیدار صاحب!"

"فیضی سے تمہاری دوستی ہے نا؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"جی، جی...... فیضی میرا جگری یار ہے۔" وہ جلدی سے بولا۔

"اگر جگری یار پریشان ہو تو تمہارے جگر میں بھی درد ہوگا نا...... یا نہیں؟"

"ہوگا جی۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

"فیضی کی تکلیف میری تکلیف ہے۔"

"اور تم دونوں کا درد بھی مشترک ہے۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "آفتاب نے ایک طرف تمہاری بہن کو مسترد کرکے تمہارے دل میں خنجر گھونپا ہے تو دوسری جانب اس نے خالدہ سے شادی کرکے فیضی کی انا اور غیرت کو للکارا تھا۔ فیضی اپنی خالہ کی بیٹی خالدہ سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن اسے اس مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اس رشتے سے انکار کی وجہ چاہے کچھ بھی رہی ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ خالدہ، فیضی سے چھن گئی تھی...... ہیں نا؟"

"جی...... آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "ایسا ہی ہوا تھا۔"

"موت جب ہمارے کسی پیارے کو ہم سے چھین لیتی ہے تو ہمیں بہت گہرا صدمہ پہنچتا ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "ہم کئی دنوں تک بجھے ہوئے دل اور ویران آنکھوں کے ساتھ بولائے بولائے پھرتے ہیں۔ ہماری آنکھوں کے سمندر میں جتنا بھی پانی ہوتا ہے، اسے ہم آنسوؤں کی صورت بہا دیتے ہیں حتیٰ کہ ہماری آنکھوں کے سوتے خشک ہوجاتے ہیں لیکن پھر وقت کا ہمارے دل و جگر کے زخموں پر مرہم رکھتا ہے اور رفتہ رفتہ ہم نارمل زندگی کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ ایسا

ہوتا ہے نا؟''

''جی۔ ایسا ہوتا ہے۔'' اس نے میری بات کی تائید کر دی۔

''اور اگر ہم سے چھن جانے والا جیتا جاگتا شخص، ہمارے آس پاس، ہماری نظروں کے سامنے، کسی دوسرے انسان کے تصرف اور اختیار میں ہو تو پھر ہمیں کیسا محسوس ہوتا ہے؟'' بات ختم کر کے میں نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے جیدا کو دیکھا۔

''بہت برا محسوس ہوتا ہے۔'' وہ زہر خند لہجے میں بولا۔

''دل چاہتا ہے، ہماری پسندیدہ ہستی کو چھیننے والے کی ایسی کم تیسی کر دیں...... اس کا وہ حشر نشر کریں کہ آئندہ کسی کو ایسی چھینا جھپٹی کی جرأت نہ ہو سکے......''

''مطلب، اس نوعیت کی ذہنی کیفیت میں انسان اپنے رقیبِ روسیاہ کی جان بھی لے سکتا ہے؟''

''جی...... یہ ناممکن نہیں۔'' وہ بڑی سادگی سے بولا۔

''تمہارا اپنے دوست کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' میں نے تیکھے لہجے میں استفسار کیا۔

''کون دوست جناب؟'' وہ بے ساختہ بولا۔

فوری طور پر میری بات جیدا کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''میں فیضی کی بات کر رہا ہوں۔ آفتاب کی شادی ایک ایسی لڑکی سے ہوئی تھی جس سے فیضی شادی کا خواہاں تھا۔ اپنی پسندیدہ چیز چھن جانے کے غم میں وہ انتقاماً آفتاب کی جان بھی تو لے سکتا ہے......!''

''آپ...... یہ کہنا...... چاہتے ہیں کہ...... آفتاب کو فیضی نے قتل کیا ہے......؟'' وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''منطقی طور پر ایسا سوچنے میں مجھے تو کوئی قباحت نظر نہیں آ رہی۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم کیا کہتے ہو؟''

''م...... میں کیا کہوں جناب۔'' وہ فکرمندی سے بولا۔ ''آپ نے تو مجھے الجھا کر رکھ دیا ہے۔''

''سردست نوشہرہ ورکاں میں صرف دو افراد ایسے ہیں جن کے دل و دماغ میں مقتول کے لیے نفرت ہی نفرت بھری ہوئی تھی۔ ان میں سے کوئی بھی آفتاب کو موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکنے کے بعد سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ان دو افراد میں ایک کا نام ہے، جاوید عرف جیدا اور دوسرے کا نام ہے، فیض عرف فیضی...... اور اتفاق سے یہ دونوں افراد آپس میں گہرے دوست بھی ہیں۔ میرے محتاط تجزیے کے مطابق ان دونوں ہی میں سے کسی نے آفتاب کو بے دردی سے قتل کیا ہے......''

''میں نے آفتاب کو قتل نہیں کیا۔'' وہ احتجاجی انداز میں بولا۔ ''آپ مجھ سے بڑی سے بڑی قسم لے لیں۔ آفتاب کے قتل کے معاملے سے میرا کوئی واسطہ نہیں ہے......!''

''بیٹا جی! پولیس ڈیپارٹمنٹ میں قسمیں کھانے سے معاملات حل نہیں ہوا کرتے۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''ہمارا تفتیش اور تحقیق کا اپنا ایک طریقۂ کار ہے اور میری ریسرچ یہ بتاتی ہے کہ اگر آفتاب کو تم نے قتل نہیں کیا تو پھر اس کا قاتل فیضی کے سوا اور کوئی ہو نہیں سکتا۔''

''میں یہ مانتا ہوں کہ میرے اور فیضی کے دل میں آفتاب کے لیے بہت زہر بھرا ہوا ہے۔'' وہ راست گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''لیکن میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر آپ کو بتا رہا ہوں کہ میں نے آفتاب کی جان نہیں لی۔ باقی جہاں تک فیضی کا تعلق ہے تو اس کے حوالے سے بھی میرے پاس معلومات نہیں ہیں۔ میں صرف اپنی ذات کی قسم کھا سکتا ہوں، کسی دوسرے کی نہیں۔ آپ فیضی کو بلا کر پوچھ تاچھ کر لیں پھر آپ کی تسلی ہو جائے گی۔''

''برخوردار! میں اپنی تسلی کے لیے محض پوچھ تاچھ تک ہی محدود نہیں رہتا۔'' میں نے قدرے دھیمے مگر سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ ''تم تصور نہیں کر سکتے کہ اس سلسلے میں، میں کہاں تک جا سکتا ہوں......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہارے لیے میرا ایک مشورہ ہے۔''

وہ ہمہ تن گوش ہوتے ہوئے بولا۔ ''جی بتائیں......!''

''تمہاری ذات بھی شک کے دائرے سے باہر نہیں نکلی۔'' میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔ ''تم نے مجھے جتنی بھی کہانیاں سنائی ہیں میں ان پر آنکھیں بند کر کے یقین نہیں کروں گا۔ جہاں جہاں بھی تصدیق کی ضرورت محسوس ہو گی، میں اس کام میں ذرا سی غفلت یا کوتاہی نہیں برتوں گا لہٰذا......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ جب تک اس کیس کی تفتیش مکمل نہیں ہو جاتی، تم نوشہرہ ورکاں سے باہر قدم نہیں نکالو گے اور اگر تمہارا گاؤں سے باہر جانا ناگزیر ہو تو پھر تم اس مقصد کے لیے پیشگی تھانے میں اطلاع دو گے۔''

''جو حکم تھانیدار صاحب۔'' وہ فرماں برداری سے بولا۔

میں نے کہا۔ ''اور میں جب بھی تمہیں تھانے میں طلب کروں، تم فوراً سے پیشتر یہاں پہنچو گے۔''

"جی...... میں آپ کے حکم کی تعمیل کے لیے ہمہ وقت تیار رہوں گا۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

میں نے اسے چند ہدایات دینے کے بعد رخصت کر دیا۔

اسی روز سہ پہر کے بعد اسپتال سے آفتاب کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش آ گئی۔ لاش کے ساتھ ہی پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ بھی آئی تھی۔ مذکورہ رپورٹ کے مطابق، آفتاب کو اٹھارہ تاریخ کی صبح پانچ اور چھ بجے کے درمیان موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ موت کا سبب وہ کاری وار بتایا گیا تھا جو اس کی کھوپڑی کے عقبی حصے پر کیا گیا تھا۔ اس وار نے مقتول کی کھوپڑی کو بری طرح چٹخا کر اسے موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں بڑے واضح الفاظ میں لکھا گیا تھا کہ مقتول کے سر کے عقبی حصے پر کسی بھاری آہنی چیز سے مہلک ضرب لگائی گئی تھی اور یہ وار مقتول پر اس کی بے خبری میں کیا گیا تھا۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میرے اندازے کی تصدیق کرتی تھی۔ میں نے کاغذی کارروائی مکمل کرنے کے بعد آفتاب کی لاش کو فیاض علی کے گھر بھجوانے کا بندوبست کر دیا۔

معاملہ خاصا گمبھیر اور پیچیدہ ہو گیا تھا۔ قاتل کے حوالے سے ابھی تک کوئی حتمی اور دوٹوک بات سامنے نہیں آئی تھی۔ اب تک کی تفتیش سے میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ آفتاب کے متوقع قاتلوں کے حوالے سے جیدا یا فیضی میں سے کوئی ایک ہو سکتا تھا۔ جیدا کو تھانے بلا کر میں نے اس کا بھرپور "انٹرویو" کر لیا تھا لیکن اس عمل سے کوئی کام کی بات سامنے نہیں آ سکی تھی تاہم جیدا کے دورۂ غلہ منڈی کی چیکنگ ابھی باقی تھی۔ اب مجھے فیضی کا ایکسرے کرنا تھا۔ اس کے بعد ہی کسی حتمی نتیجے پر پہنچا جا سکتا تھا۔

جیدا کو میں نے آسانی سے جانے کی اجازت دے دی تھی تاہم میں نے ایک سادہ لباس پولیس اہلکار کو اس کی نگرانی پر متعین بھی کر دیا تھا۔ مذکورہ اہلکار جیدا کے رخصت ہوتے ہی تھوڑا وقفہ دے کر تھانے سے روانہ ہو گیا۔ اگر جیدا واقعی آفتاب کے قتل میں ملوث تھا تو وہ کوئی ایسی غلطی ضرور کرتا جس سے مجھے اس کی گردن ناپنے کا موقع مل جاتا۔ میں ابھی تک بند گلی میں کھڑا تھا لیکن مایوس نہیں تھا۔

☆☆☆

اٹھارہ تاریخ کی صبح آفتاب کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور انیس تاریخ کی شام اس کی تدفین ہو گئی۔ بیس تاریخ کی صبح میں نے دو اہم کام کیے۔ اول، میں نے اے ایس آئی مشکور حسین کو پرانی غلہ منڈی روانہ کر دیا تا کہ وہ "چودھری نوازش علی اینڈ سنز" جا کر جیدا کے بیان کی تصدیق کر سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے میں نے وہ رسید بھی اے ایس آئی کے حوالے کر دی تھی جو جیدا نے اپنے تہ بند کی ڈب سے نکال کر مجھے دی تھی۔ دوم، میں نے ایک اہلکار کو شوکت علی کے گھر کی جانب دوڑا دیا تا کہ وہ فیضی کو پکڑ کر تھانے لے آئے۔

میرے تھانے سے غلہ منڈی کا فاصلہ اچھا خاصا تھا تاہم نوشہرہ ورکاں چند منٹ کی دوری پر تھا چنانچہ اے ایس آئی کی واپسی سے بہت پہلے فیضی کو تھانے پہنچا دیا گیا۔ وہ میرے سامنے حاضر ہوا تو میں نے تنقیدی نظر سے اس کا جائزہ لیا۔

فیض عرف فیضی کی عمر تئیس چوبیس سال رہی ہو گی۔ وہ اپنے حلیے اور جثے سے ایک فتنہ پرور اور پھڈے باز قسم کا شخص لگتا تھا۔ اس کے چہرے پر برہمی کے آثار بڑے واضح طور پر دیکھے جا سکتے تھے۔ میرے بھیجے ہوئے پولیس اہلکار نے اسے باقاعدہ ہتھکڑی پہنا کر یہاں تک نہیں پہنچایا تھا تاہم وہ غصیلے لہجے میں مستفسر ہوا۔

"تھانیدار صاحب! مجھے کس سلسلے میں گرفتار کیا گیا ہے؟"

"مذاکرات کے لیے......" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ "میں نے ایک نہایت ہی اہم اور ہنگامی مسئلے پر مذاکرات کے لیے تمہیں تھانے بلایا ہے۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ کو تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"میری مدد کی ضرورت......" وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "اور وہ بھی پولیس کو...... میں کچھ سمجھا نہیں......؟"

"میں نے سنا ہے کہ تم نے بدمعاشی اور غنڈا گردی کی دنیا میں نیا نیا قدم رکھا ہے اور پورے نوشہرہ ورکاں میں تم نے تھرتھلی مچا رکھی ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ "یہاں کا ہر چھوٹا بڑا بدمعاش اور لچا لفنگا تمہارے سامنے ہاتھ باندھے ایک ٹانگ پر کھڑا رہتا ہے......!"

"پتا نہیں، آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں؟" وہ شک زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "میرے تو کچھ پلے نہیں پڑ رہا۔"

"تمہارے پلّے میں تو میں اتنے وزنی باٹ ڈال دوں گا کہ تمہارے لیے کمر سیدھی رکھ کر اور گردن کو اٹھا کر چلنا بھی ممکن نہیں رہے گا۔" میں نے درشت لہجے میں کہا۔ "بتاؤ...... تم نے آفتاب کو کیوں قتل کیا؟"

میرے آخری سوالیہ جملے پر وہ اس طرح اچھلا جیسے اس

نے غلطی سے بجلی کے ننگے تار کو چھولیا ہو۔ پھر حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے لکنت زدہ انداز میں بولا۔

''م...... میں نے...... آفتاب کو...... قتل کیا ہے...... یہ آپ...... کیا کہہ رہے ہیں......؟''

''جو تم نے سنا، میں نے وہی کہا ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''بات آئی سمجھ میں یا تو چار کا لتر منگوا کر تمہاری لترول کرواؤں؟''

ہمارے زمانے میں ابتدائی تفتیش کے لیے تو ضرب چار انچ کا ایک چمڑے کا جوتا نما ہتھیار استعمال کیا جاتا تھا۔ جوتے سے مشابہت کی بنا پر اسے چھتر یا لتر کہا جاتا تھا۔ جب بھی کسی مجرم کو گرفتار کر کے تھانے لایا جاتا، پہلے مرحلے پر اسے مرغا بنا کر اس کی تشریف مبارک پر اسی چھتر یا لتر کی سلامی دی جاتی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ہر چیز تبدیل ہوگئی ہے۔ تفتیش کے نئے طریقے اور انداز وضع کر لیے گئے ہیں لیکن میری معلومات کے مطابق اب بھی بعض تھانوں میں اس روایتی تفتیشی ہتھیار ''چھتر'' کا استعمال کیا جاتا ہے۔

''میں نے آفتاب کو قتل نہیں کیا۔'' وہ احتجاجی لہجے میں بولا۔

''تو کیا تمہارے باپ نے کیا ہے......؟'' میں نے کڑک دار آواز میں کہا۔ ''تمہارا باپ تو مفلوج ہے۔ وہ اتنا بڑا کارنامہ انجام نہیں دے سکتا اور پھر اس کے پاس اس کام کا کوئی جواز بھی نہیں ہے۔''

میرے جارحانہ رویے کو دیکھ کر اس نے اندازہ لگالیا کہ معاملہ اتنا سیدھا نہیں جتنا وہ سمجھ رہا تھا۔ قدرے نرم پڑتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''تو میرے پاس آفتاب کو قتل کرنے کا کیا جواز ہے؟''

''تم آفتاب سے نفرت کرتے تھے، اسے اپنا رقیب سمجھتے تھے، اسے غاصب اور خود کو محروم تصور کرتے تھے۔'' میں نے اس کے کان کے کیڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری خالہ شاہدہ نے تمہیں رشتہ دینے سے انکار کر دیا تھا اور پھر اسی لڑکی کی شادی آفتاب کے ساتھ ہوگئی۔ یہ تمہاری ہار اور آفتاب کی جیت تھی۔ وہ کبڈی کے میدان میں تو اکثر تمہاری درگت بناتا ہی رہتا تھا، زندگی کی بساط پر بھی اس نے تمہیں مات دے دی تھی۔ تم اسے فاتح اور خود کو مفتوح سمجھنے کے لیے مجبور ہو گئے تھے۔ تمہارے پاس اپنی ہزیمت، اپنی ناکامی اور اپنی شکست کا بدلہ لینے کا ایک ہی راستہ تھا کہ اس پتھر کو راستے سے ہٹا دو جس نے تمہیں خود تمہاری نظر سے گرا دیا تھا اور پھر...... تم نے اپنی مجروح انا کی مرہم پٹی کے لیے آفتاب کی زندگی کا چراغ گل کر دیا......!''

وہ حیرت اور الجھن کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ آنکھیں پھیلائے میری بات سنتا رہا اور جیسے ہی میں خاموش ہوا، اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تھانیدار صاحب! آپ کی زیادہ تر باتیں درست ہیں۔ میں واقعی آفتاب سے شدید نفرت کرتا تھا۔ کئی مرتبہ میں نے جذبات سے مغلوب ہو کر اس کی جان لینے کے بارے میں بھی سوچا لیکن کبھی بھی میں اپنی اس خواہش کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔''

''تو گویا تم مجھے یہ بتا رہے ہو......'' میں نے کاٹ دار آواز میں کہا۔ ''کہ تم نے آفتاب کو قتل نہیں کیا...... ہوں؟''

''جی، میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہی حقیقت ہے۔''

''اگر تم نے آفتاب کے خون میں ہاتھ نہیں رنگے تو پھر اس کا قاتل کون ہے؟'' میں نے کڑے لہجے میں استفسار کیا۔

وہ بے بسی سے بولا۔ ''میں نہیں جانتا۔''

''تو جاننے کی کوشش کرو اور سوچو کہ آفتاب کو کس نے موت کے گھاٹ اتارا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مجھے جواب چاہیے...... دوٹوک اور حتمی جواب...... اور جب تک مجھے اس سوال کا جواب نہیں مل جاتا، تم میرے تھانے کی حوالات میں بند رہو گے!''

وہ بہت تلملایا اور اس نے رسی تڑانے کی بھی حتی الامکان کوشش کی لیکن میں نے اس کی ایک نہیں سنی اور ایک کانسٹیبل کو بلا کر فیضی کو حوالات میں بند کروا دیا۔

یہ حقیقت ہے کہ فیضی پر پکا ہاتھ ڈالنے کے لیے میرے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا لہٰذا میں نے اس کی زبان کھلوانے کے لیے مار پیٹ سے گریز کیا تاہم اسے زیر حراست رکھنے کا میرا ایک مقصد تھا۔ حوالات میں بیٹھ کر وہ موجودہ صورت حال پر غور و فکر ضرور کرتا اور اگر اس کے ذہن میں اس کیس کے حوالے سے کوئی اہم اور مفید معلومات تھیں تو وہ انہیں میرے سامنے اگلنے کے لیے ضرور تیار ہو جاتا۔ فیضی کی زبان کھلوانے کے لیے یہ ایک نفسیاتی حربہ تھا۔ اس نوعیت کے تجربات اکثر کامیاب رہتے ہیں۔

فیضی کی گرفتاری کی خبر پورے گاؤں میں پھیل گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد فیضی کی ماں زاہدہ دو تین گاؤں والوں کے ہمراہ تھانے پہنچ گئی۔ میں نے باقی لوگوں کو برآمدے میں روک کر زاہدہ کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ وہ اپنے بیٹے کے لیے مجھ سے احتجاج کرنے لگی۔

"تھانیدار صاحب! آپ نے میرے بیٹے کو خوامخواہ بند کر دیا ہے۔ آخر اس کا قصور کیا ہے؟"

"یہی سب جاننے کے لیے تو میں تمہارے بیٹے کو یہاں لایا ہوں کہ اس کا قصور کیا ہے۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "تمہیں اس کے لیے زیادہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ معمول کی پوچھ گچھ ہے۔ میں آج کی تاریخ میں اسے فارغ کر دوں گا۔"

"مجھے پتا چلا ہے کہ آپ نے فیضی کو آفتاب کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا ہے؟" وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

"کچھ ایسا ہی سلسلہ ہے۔" میں نے گول مول جواب دیا۔

"نہ...... ہمارا آفتاب کے قتل سے کیا لینا دینا۔" وہ ہاتھ نچا کر بولی۔ "ضرور سلطانہ نے آپ کو ہمارے خلاف بھڑکایا ہوگا......"

مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ زاہدہ، مقتول کی ماں کے لیے اپنے دل میں شدید نوعیت کا غم و غصہ رکھتی تھی۔

"زاہدہ بی بی! میری بات غور سے سنو۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "میں تھانیدار ہوں ذرا وکھری ٹائپ کا۔ میں کسی کے بہکانے اور بھڑکانے میں نہیں آتا۔ میں اپنے دماغ کو استعمال کر کے قانونی تقاضوں کے اندر رہ کر کام کرتا ہوں۔ فیضی کی گرفتاری تفتیشی عمل کا حصہ ہے۔ اگر وہ بے گناہ ہے تو اس کا ایک بال بھی بیکا نہیں ہوگا، میں تمہیں اس بات کا اطمینان دلاتا ہوں۔"

"میں نے سلطانہ کا نام اس لیے لیا کہ وہ ہر وقت ہمارے خلاف ادھر ادھر زہر اگلتی رہتی ہے۔" وہ قدرے نرم پڑتے ہوئے بولی۔ "پتا نہیں، ہم نے اس کا کیا بگاڑا ہے۔ اس نے ہمیں نشانے پر کیوں رکھا ہوا ہے......؟ پر کسی کو کیا دوش دیں جب......"

وہ بولتے بولتے رک گئی۔ اس نے ڈرامائی انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"جب کیا......؟"

"جب اپنی کتی چوروں کے ساتھ مل جائے تو پھر گھر کا خدا ہی حافظ ہوتا ہے!" اس نے زہریلے لہجے میں جواب دیا۔

زاہدہ کا اشارہ اپنی چھوٹی بہن شاہدہ کی طرف تھا۔ میں اب تنازع کے پس منظر سے اچھی طرح آگاہ ہو چکا تھا۔ شاہدہ نے فیضی کے لیے اپنی بیٹی خالدہ کا رشتہ دینے سے انکار کر دیا تھا اور پھر خالدہ کی شادی مقتول آفتاب سے ہو گئی تھی۔ جب میری سلطانہ سے بات ہوئی تھی تو اس نے اپنے بیٹے کے قتل کے حوالے سے فیضی پر بڑے قوی شک کا اظہار کیا تھا۔ گویا زاہدہ کا یہ اندازہ بالکل درست تھا کہ سلطانہ اس کے لیے اپنے دل میں ناپسندیدگی کے جذبات رکھتی تھی۔ دوسری جانب زاہدہ بھی سلطانہ کو ایک شرانگیز اور فتنہ پرور عورت سمجھتی تھی بلکہ ابھی اس نے ایک محاورے میں سلطانہ کے لیے چوروں کا لفظ استعمال کیا تھا۔ یہ معما ابھی تک میری بھی سمجھ میں نہیں آسکا تھا کہ چھوٹی بہن نے اپنی بیٹی کے لیے بڑی بہن کے بیٹے کا رشتہ کیوں ٹھکرا دیا تھا......؟

جب کوئی شے کسی سمجھ دار انسان کی سمجھ میں ٹھیک طرح نہ بیٹھے تو وہ اندر سے مضطرب ہو جاتا ہے۔ ان لمحات میں، میں بھی کچھ اسی قسم کی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ اندرونی تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے زاہدہ کو غیر محسوس انداز میں گھسنا شروع کیا۔

"زاہدہ بی بی!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گمبھیر انداز میں کہا۔ "تم نے تھوڑی دیر پہلے اپنی چھوٹی بہن شاہدہ کے لیے کتی (کتیا) اور سلطانہ کے گھرانے کے لیے چوروں کے الفاظ کا استعمال کیا ہے کہ ان لوگوں کی ملی بھگت سے آفتاب کی شادی خالدہ سے ہو گئی اور تمہارا بیٹا فیضی دیکھتا اور ہاتھ ملتا رہ گیا......" میں نے چند سیکنڈ کے توقف کے بعد ان الفاظ میں اپنی بات مکمل کر دی۔

"تم نے شاہدہ کو جو ٹائٹل دیا ہے اس کی مناسبت سے میں تمہارے بہنوئی کے لیے کتے کا لفظ تو استعمال نہیں کروں گا لیکن اگر تمہیں توفیق ہو تو چند لمحات کے لیے یہ ضرور سوچنا کہ ممکن ہے، اس سارے کھڑاگ میں شاہدہ کا کہیں کوئی قصور نہ ہو۔ فدا حسین نے چھوٹے بھائی کی محبت کے جھکاؤ میں اپنی بیٹی کا رشتہ فیاض کے بیٹے آفتاب کو دے دیا ہو......!"

"سب جائیں جہنم میں۔" وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔ "میں تو یہ جانتی ہوں، شاہدہ کو شہر کی ہوا نے خراب کر دیا ہے۔ جب وہ گاؤں میں تھی تو ایسی نہیں تھی۔"

"اگر شہر کی ہوا نے شاہدہ کا دماغ خراب کیا ہوتا تو وہ خالدہ کو نوشہرہ ورکاں بیاہنے کے بجائے ادھر گوجرانوالہ میں یا پھر لاہور میں اس کا رشتہ طے کرتی۔" میں نے زاہدہ کی بے تکی بات کے جواب میں ایک منطقی دلیل دی۔

"بہرحال......" وہ اکتاہٹ آمیز انداز میں بولی۔ "مجھے کسی اپنے پرائے، ایرے غیرے، نتھو خیرے کی پروا نہیں ہے۔ میں صرف اور صرف اپنے خاوند کے لیے پریشان ہوں۔

میرا سارا دھیان شوکت علی میں لگا ہوا ہے۔"

یہ بات میرے علم میں آچکی تھی کہ فیضی کے باپ پر فالج کا اٹیک ہوا تھا۔ اس کے بدن کا دایاں حصہ بے جان ہوکر رہ گیا تھا۔ صرف اوپر کے دھڑ میں جان تھی۔ حکیمی علاج جاری تھا مگر وہی بات کہ فالج کا مرض گھوڑے کی رفتار سے آتا ہے اور جوں کی رفتار سے جاتا ہے، حکیمی علاج سے ابھی تک شوکت علی کو خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا تھا۔

"کیا ہوا تمہارے خاوند کو؟" زاہدہ کی بات کے جواب میں، میں نے استفسار کیا۔

"آپ کو یہ بات پتا ہی ہوگی کہ شوکت کو فالج کا اٹیک ہوا تھا۔" وہ غمزدہ لہجے میں بولی۔ "جب شاہدہ نے فیضی کو خالدہ کا رشتہ دینے سے انکار کیا تو اس کے فوراً بعد ہی شوکت پر فالج گرا تھا۔ شروع میں وہ بات چیت کرتا تھا۔ بولنے کی طاقت اب بھی ہے اس میں لیکن خالدہ کی شادی کے بعد اس نے زبان پر تالا ڈال دیا ہے، ہونٹ سی لیے ہیں۔ بس ہر وقت بیٹھا آنسو بہاتا رہتا ہے۔ میں تو شوکت کی اس کسمپرسی اور بے بسی کی ذمے دار شاہدہ کو سمجھتی ہوں۔ اس کی ہٹ دھرمی اور عاقبت نااندیشی نے ہمارے ہنستے بستے گھر کو اجاڑ کر رکھ دیا ہے۔"

زاہدہ نے بات ختم کی تو اس کی حالت کو دیکھ کر مجھے اس پر ترس آیا۔ میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔

"زاہدہ! تم مطمئن ہوکر گھر جاؤ۔ اگر فیضی نے کچھ نہیں کیا تو میں اسے چھوڑ دوں گا۔ تم گھر جاکر شوکت علی کی دیکھ بھال کرو۔ میں بھی آج کسی وقت تمہارے گھر آکر شوکت کی خیریت دریافت کروں گا۔"

میری تسلی بھری باتوں نے اس کی آنکھوں میں بے فکری کے دیے روشن کردیے۔ اس نے امید افزا نظر سے مجھے دیکھا اور میرا شکریہ ادا کرکے تھانے سے رخصت ہوگئی۔

اس کیس کے مختلف کرداروں نے مجھے جذباتی کشمکش سے دوچار کردیا تھا۔ ہر کردار ایک لمحے قصوروار اور دوسرے لمحے بے گناہ دکھائی دیتا تھا۔ میں کھل کر کسی پر سختی کرنے کے بارے میں سوچتا تو اس کی ذات کا مظلوم پہلو میری نگاہ میں اجاگر ہوجاتا اور جب میں کسی کو رعایت دینے کا فیصلہ کرتا تو اس کے اندر کوئی نہ کوئی خرابی جلوہ افروز ہوجاتی۔

یہ ٹھیک ہے کہ میں الجھ کر رہ گیا تھا لیکن میں مایوس ہرگز نہیں تھا۔ میں مایوسی کو گناہِ کبیرہ تصور کرتا تھا۔ میرا یہ ماننا تھا اور عملی زندگی کا تجربہ بھی یہی تھا کہ انسان کی کامیابی اور ناکامی کے بیچ میں ایک پل صراط کے مانند پتلی لکیر کا فاصلہ ہوتا ہے۔ انسان جس لمحے مایوس ہوکر ہمت ہار بیٹھے، وہ ناکام ہوجاتا ہے۔ اگر وہ تھوڑی سی ہمت اور کرکے امید کے دامن کو تھام کر صرف ایک قدم آگے بڑھ کر اس لکیر کو عبور کرلے تو لکیر کی دوسری جانب کامیابی باہیں وا کیے اسے گلے لگانے کے لیے تیار کھڑی ہوتی ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے...... ہمت مرداں، مدد خدا!

میں نے بھی امید کے دامن کو تھامے رکھا اور سہ پہر میں میری مراد برآئی۔ اے ایس آئی منظور حسین کی واپسی نے اس کیس کو ایک نئی سمت سے روشناس کردیا تھا۔

منظور حسین میرے کمرے میں داخل ہوا تو مجھے اس کے چہرے پر دبا دبا سا جوش نظر آیا جیسے اس نے کوئی اہم نکتہ دریافت کرلیا ہو۔ وہ میرے سامنے آکر بیٹھا تو میں نے پوچھا۔

"کیا تمہیں چودھری نوازش علی اینڈ سنز آسانی سے مل گئی تھی؟"

"جی ملک صاحب! یہ غلہ منڈی کی بہت مشہور دکان ہے۔" اس نے جواب دیا پھر قدرے آگے کو جھک کر انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ "ہمیں فوری طور پر جیدا کو گرفتار کرنا ہوگا۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "تم پرانی غلہ منڈی سے کون سی خاص خبر لائے ہو؟"

اے ایس آئی نے اپنی جیب میں سے تہ شدہ کاغذات نکال کر میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "آپ خود دیکھ لیں۔ میں کیسی سنسنی خیز خبر لے کر آیا ہوں......!"

میں نے وہ تہ شدہ کاغذات اس کے ہاتھ سے لے کر انہیں کھول کر دیکھا۔ ان میں سے ایک تو وہی مختلف بیجوں کی خریداری کی رسید تھی جس کی تصدیق کے لیے میں نے اے ایس آئی کو پرانی غلہ منڈی روانہ کیا تھا اور دوسرا کاغذ اسی کیش میمو کی کاربن کاپی تھی۔ رسید بک میں سے جب کوئی رسید کاٹ کر گاہک کو دی جاتی ہے تو اس کی کاربن کاپی اسی رسید بک کے اندر محفوظ رہ جاتی ہے۔

میں نے سوالیہ نظر سے اے ایس آئی کو دیکھا اور پوچھا۔ "اس میں ایسی کون سی خاص بات ہے؟ ایک رسید ہے اور دوسری اس کی کاربن کاپی......!"

"ملک صاحب!" وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے معنی خیز انداز میں بولا۔ "آپ ذرا اس رسید پر درج خریداری کی تاریخ تو دیکھیں!"

"رسید پر اس ماہ کی اٹھارہ تاریخ ڈلی ہوئی ہے۔" میں نے سرسری لہجے میں کہا۔" جب جیدا سبزیوں کے بیج کی خریداری کے لیے پرانی غلہ منڈی گیا تھا اور اسی روز صبح پانچ اور چھ بجے کے درمیان آفتاب کو بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔"

"بالکل ٹھیک۔" اے ایس آئی کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ اس نے رسید کی کاربن کاپی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔" اب ذرا آپ اس پر درج تاریخ کو پڑھیں۔"

میں نے پڑھا اور چونک اٹھا۔ کاربن کاپی پر خریداری کی تاریخ اسی ماہ کی تین ڈلی ہوئی تھی۔ جب میں نے اصل رسید اور اس کی کاپی کو پہلو بہ پہلو رکھ کر بہ غور جائزہ لیا تو مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ کسی نے رسید کے تاریخ والے حصے میں کاریگری کر کے تین کے ہندسے کو آٹھ بنا ڈالا تھا اور پھر اس آٹھ کے بائیں پہلو میں ایک کا اضافہ کر کے اس تاریخ کو تین سے اٹھارہ میں بدل دیا تھا اور یہ "کسی" جیدا کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

"جیدا تو بڑا فنکار نکلا ملک صاحب۔" اے ایس آئی نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

"اس کی ساری فنکاری تو میں پتا نہیں، کہاں کہاں سے نکالوں گا۔" میں نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔" تم ابھی نوشہرہ ورکاں جاؤ اور جیدا کو گرفتار کر کے یہاں لے آؤ۔"

اے ایس آئی فی الفور میرے حکم کی تعمیل میں نوشہرہ ورکاں روانہ ہو گیا۔

اس امر میں تو کسی شک وشبے کی گنجائش باقی نہیں تھی کہ مذکورہ رسید میں جعل سازی جاوید عرف جیدا نے ہی کی تھی گویا اس نے حقیقت کو ڈھانپنے کے لیے یہ کارنامہ انجام دیا تھا۔ ایسی کون سی بات تھی جو وہ چھپانا چاہتا تھا۔ فی الحال میرے پیش نظر تو صرف ایک ہی اہم معاملہ تھا اور وہ تھا، آفتاب کے قاتل تک رسائی حاصل کرنا۔

پرانی غلہ منڈی سے اس بات کی تصدیق ہو گئی تھی کہ وقوعہ کے روز یعنی اٹھارہ تاریخ کو نہ تو جیدا وہاں گیا تھا اور نہ ہی اس نے چودھری نوازش علی اینڈ سنز سے کوئی چیز خریدی تھی۔ یہ سارا چکر اس نے جائے واردات سے اپنی غیر موجودگی کو ثابت کرنے کے لیے چلایا تھا...... آخر کیوں؟

جب کوئی شخص دروغ گوئی یا تحریری جعل سازی یا غلط بیانی سے کام لیتا ہے تو دراصل وہ اپنے کسی جرم پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے۔ تو کیا...... آفتاب کو جیدا نے قتل کیا تھا؟

دل

دل اور آنکھوں میں کس قدر گہرا رشتہ ہے۔ آنکھیں دل کی ترجمان ہوتی ہیں۔ دل پر چوٹ پڑے تو آنکھوں کا پیمانہ چھلک پڑتا ہے۔ اگر دل میں جذبات موجود ہیں تو آنکھیں خوشی سے مہک اٹھتی ہیں، کرنیں پھوٹ پڑتی ہیں۔ محبت سے خالی دل اس غار کے مانند ہے جس میں جانور بھی داخل ہونے سے خوف کھاتے ہیں۔ حقیقی خوبصورتی کا سرچشمہ دل ہے۔ اگر دل سیاہ ہو تو چمکتی آنکھیں کچھ کام نہیں دیتیں۔

مسکراہٹ

☆روح کا دروازہ کھول دیتی ہے۔

☆یقین دلاتی ہے کہ مسکرانے والے کا دل کدورتوں سے پاک ہے۔

☆مایوسی کے تاریک بادلوں میں امید کی کرن ہے۔

☆ایک ایسا تحفہ ہے جو دینے والے کو مفلس کیے بغیر پانے والے کو بہت کچھ دیتا ہے۔

☆ایک ایسا نذرانہ جو ٹھکرایا نہیں جا سکتا۔

☆ایک ایسا پردہ ہے جس کے پیچھے ہزار راز پنہاں ہوتے ہیں۔

☆دینے والے کو بھی مسرور کرتی ہے اور سامنے والے کو بھی سرشار کر دیتی ہے۔

☆زندگی جینے کی ہر آن نئی امنگ پیدا کرتی ہے۔

مرسلہ: عبدالجبار رومی انصاری۔ قصور سٹی

یادیں

یادیں بھی کتنی ظالم ہوتی ہیں۔ دل کی گہرائیوں سے کھرچنے کی کوشش کرو تو درد کی خراشیں پڑ جاتی ہیں۔ بھلا یاد بھی کبھی مٹ سکتی ہے وہ تو چاند کے کبھی نہ مٹنے والے داغ کی طرح ہے جو سدا نمایاں رہتا ہے...... زندگی بیت جاتی ہے لیکن زندگی کی راہ گزر پر بیتا ہوا کوئی لمحہ صدیوں پر بھاری ہوتا ہے۔ پانے کی خواہش تو صرف ایک لمحے کی ہوتی ہے لیکن پا کر کھو دینے کا غم جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔ ہر غم اسی طرح تازہ رہتا ہے جیسے کل ہی کی بات ہو۔

مرسلہ: وزیر محمد خان۔ بٹل ہزارہ

اس سوال کا جواب "ہاں" یا "نہ" میں حاصل کرنے کے لیے مجھے اے ایس آئی کی واپسی کا انتظار کرنا تھا اور ...... یہ انتظار آدھے گھنٹے میں ختم ہوگیا۔

جیدا ایک مرتبہ پھر میرے کمرے میں موجود تھا لیکن اس بار میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ بات شروع کرنے سے پہلے ہی میں نے اس کے گال پر ایک زناٹے دار طمانچہ رسید کیا پھر اصل اور کاپی دونوں اس کو دکھاتے ہوئے خوں خوار لہجے میں پوچھا۔

"اس کی ضرورت کیوں پیش آئی تمہیں......؟"

"م...... میں نے آفتاب کو قتل نہیں کیا......" وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔ "آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"اوئے غلط فہمی کی اولاد......!" میں نے کھا جانے والی نظر سے اسے گھورا اور سخت انداز میں کہا۔ "میں آفتاب کے قتل کے بارے میں نہیں، اس رسید کی تاریخ میں تبدیلی کے حوالے سے پوچھ رہا ہوں۔ تم نے تاریخ میں ردوبدل کیوں کیا؟"

میرے کڑے سوال پر اس کا رنگ اڑ گیا، وہ لڑکھڑاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ "میں نے تو کچھ نہیں کیا جناب۔ یہ رسید مجھے پھانسنے کے لیے......"

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی میں نے اس کے دوسرے گال کو بھی "شرف" بخش دیا پھر خوفناک لہجے میں دریافت کیا۔ "اٹھارہ تاریخ کا پورا دن تم نے کہاں گزارا تھا؟"

"جی...... میں نے آپ کو...... بتایا تو تھا کہ...... میں سبزیوں کے بیج...... لینے پرانی غلہ منڈی گیا تھا......" وہ اپنے جھوٹ کو طاقت کا انجکشن لگاتے ہوئے بولا۔ "میں پرانی غلہ منڈی......"

اس کی ہٹ دھرمی کو دیکھتے ہوئے میں نے باقاعدہ اس کی دھلائی شروع کردی۔ اس دوران میں اسے میں "تبدیلیِ تاریخ" والے اس کے کارنامے سے بھی آگاہ کرتا جارہا تھا۔ وہ میرے ہاتھوں پٹتا رہا اور اس کے "علم" میں خاطر خواہ "اضافہ" بھی ہوتا گیا۔ جب اس کے پاس کوئی راہِ فرار نہ رہی تو ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

"تھانیدار صاحب! میں آپ کو بتاتا ہوں کہ میں نے رسید کی تاریخ کیوں تبدیل کی تھی لیکن آپ میری بات کا یقین کریں کہ میں نے آفتاب کو قتل نہیں کیا۔ آپ اگر مار مار کر مجھے ادھ مرا کردیں گے یا میری جان بھی لے لیں گے تو میرا بیان تبدیل نہیں ہوگا کیونکہ حقیقت یہی ہے کہ آفتاب کی موت سے میرا کوئی تعلق واسطہ نہیں۔"

جیدا نے اتنی بڑی بات کہہ دی تھی کہ چند لمحات کے لیے میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے لہجے سے بے پناہ اعتماد جھلکتا تھا۔ مجھے بھی محسوس ہوا کہ وہ غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں دریافت کیا۔

"اگر آفتاب کے قتل میں تمہارا کوئی ہاتھ نہیں تو پھر تم نے اپنی جعل سازی سے تین تاریخ والی رسید کو اٹھارہ تاریخ والی رسید کیوں بنایا۔ وہ بھی عین اس روز جب آفتاب کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ تمہارے اس عمل کے پیچھے کون سا مقصد چھپا ہوا تھا؟"

وہ اپنی قمیص کی آستین سے ہونٹوں سے رسنے والے خون کو صاف کرتے ہوئے بولا۔ "میں اپنے باپ کو دھوکا دے کر کچھ رقم حاصل کرنا چاہتا تھا۔"

میں نے غصے میں اس کی اچھی خاصی درگت بناڈالی تھی۔ میرے چانٹوں اور گھونسوں نے اس کے چہرے کی کھال کو کئی جگہ سے بری طرح مجروح کردیا تھا اور بعض مقامات سے باقاعدہ لہو بھی رس رہا تھا۔ اس ذیل میں اس کے ہونٹ سرفہرست تھے۔ مجھے اس کی حالتِ زار پر ترس بھی آیا۔ اس نے میرے سوال کے جواب میں جو کچھ بتایا، اس کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔

تین تاریخ کو جیدا پرانی غلہ منڈی سے مختلف سبزیوں کے بیج خرید کر لایا تھا اور ان کی اصل رسید بھی اس کے پاس تھی۔ جیدا کے باپ کی یادداشت گڑبڑ کا شکار تھی۔ اسے پیسوں کی ضرورت تھی۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے اس کے ذہن میں ایک شیطانی منصوبہ آ گیا۔ اس نے سبزیوں کے بیج والے تھیلوں کو کہیں چھپادیا اور باپ سے کہا کہ بیج لانا ہیں اس لیے وہ اسے پیسے دے۔ باپ نے اس ذیل میں جیدا کو کچھ رقم دے دی۔ جیدا نے اپنے منصوبے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے تین تاریخ .... کو اٹھارہ تاریخ کی رسید بنادیا۔ گھر پہنچ کر اس نے چھپائے ہوئے تھیلے باہر نکال لیے اور اپنے باپ کو مطمئن کردیا کہ وہ غلہ منڈی سے سبزیوں کے بیج خرید کر لے آیا ہے۔ اس کی بدقسمتی کہ اس نے اس کام کے لیے جو دن چنا اسی روز آفتاب کا قتل ہوگیا اور جیدا اس کیس کی تفتیش کی لپیٹ میں آ گیا۔

میں نے جیدا کی کتھا کو گہری سنجیدگی سے سنا اور جب وہ خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔ "تم نے اپنے باپ کو دھوکا دے کر جو رقم حاصل کی اس کا تم نے کیا کیا؟"

میرے سوال پر وہ تذبذب کا شکار ہوگیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ مجھے کچھ بتانا چاہ رہا ہے لیکن کسی اندرونی

ہچکچاہٹ کے باعث وہ اپنے ارادے پر عمل نہیں کر پا رہا۔ میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''جیدا! اس خوش فہمی میں نہیں رہنا کہ میں آنکھیں بند کر کے تمہاری کہانی پر یقین کرلوں گا اور بہ فرضِ محال میں ایک لمحے کے لیے تمہاری داستان کو سچ مان بھی لوں تو تمہیں بتانا ہوگا...... تم نے کس مقصد کو پورا کرنے کے لیے دھوکا دہی سے رقم حاصل کی تھی؟''

''تھانیدار صاحب! میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔'' بالآخر وہ ایک فیصلے پر پہنچ گیا اور گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''بات یہ ہے جناب کہ مجھے جوا کھیلنے کی لت لگی ہوئی ہے۔ میں نے یہ رقم جوا کھیلنے کے لیے حاصل کی تھی۔ ادھر پرانی غلہ منڈی کے نزدیک میرا ایک دوست رہتا ہے۔ میں اپنے اس دوست کے ساتھ جوئے کے ایک اڈے پر جا کر بازی لگاتا ہوں۔ ہار جیت اس کھیل کا حصہ ہے لیکن اٹھارہ تاریخ والا دن میرے لیے بہت منحوس ثابت ہوا۔ ایک تو میں ساری رقم جوئے میں ہار گیا اور جب نوشہرہ ورکاں واپس آیا تو مجھے آفتاب کے قتل کے الزام میں دھر لیا گیا۔''

میرا اندازہ تو یہی کہہ رہا تھا کہ جیدا دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہا لیکن میں نے اپنے اس اندازے کو چہرے کے تاثرات سے جھلکنے نہیں دیا اور جیدا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے حتمی لہجے میں کہا۔

''جب تک تمہارے بیان کی تصدیق نہیں ہوجاتی، تم تھانے کی حوالات میں میرے مہمان رہو گے۔ مجھے اپنے اس دوست کا نام بتاؤ جو پرانی غلہ منڈی میں رہتا ہے۔ میں تمہارے بیان کی پرکھ کے لیے صبح اپنے کسی بندے کو پرانی غلہ منڈی روانہ کروں گا۔''

''اس کا نام حنیف ہے۔'' جیدا نے بتایا۔ ''حنیف غلہ منڈی میں پلے داری (مزدوری) کرتا ہے۔''

''اور تم لوگ جوا کھیلنے کس اڈے پر جاتے ہو......؟''

''بدر منیر کے اڈے پر۔'' اس نے جواب دیا۔

''اس اڈے کا اتا پتا بھی بتاؤ؟''

اس نے میرے حکم کی تعمیل کر دی۔

میں نے ایک کاغذ پر یہ تمام معلومات نوٹ کیں پھر ایک کانسٹیبل کو بلا کر جیدا کو اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''اس کو حوالات میں بند کردو۔ آج کی رات یہ ہمارا مہمان ہے۔''

کانسٹیبل نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''کیا اسی حوالات میں یا......؟''

میں فوراً سے پیشتر اس کا اشارہ سمجھ گیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''نہیں...... دوسرے کمرے میں۔ یہ تھانہ ہے۔ باہر کے رشتوں اور تعلقات کی یہاں کوئی حیثیت نہیں ہے۔ دوستی نبھانے کے لیے نوشہرہ ورکاں کی فضا ہی کافی ہے......!''

جیدا کے کان کھڑے ہوگئے۔ خاصا ہوشیار دماغ پایا تھا اس نے۔ پلک جھپکتے میں وہ میری بات کی تہ میں پہنچ گیا اور سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔

''کیا...... آپ نے فیضی کو بھی...... بند کر رکھا ہے......؟''

میں نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

☆☆☆

اکیس تاریخ کی صبح میں نے ایک چیتا چال باز قسم کے کائیاں کانسٹیبل کو پرانی غلہ منڈی روانہ کر دیا تاکہ وہ حنیف اور بدر منیر سے ملاقات کر کے جیدا کے بیان کی تصدیق کر سکے۔ یہ جیدا کے لیے آخری موقع تھا۔ اگر اس مرحلے پر وہ جھوٹا ثابت ہوجاتا تو پھر اس کی بچت کے امکانات معدوم ہوجاتے تھے۔

گزشتہ شب میں نے فیضی کو نہیں چھوڑا تھا بلکہ شام سے تھوڑی دیر پہلے میں خود اس کے گھر چلا گیا تھا۔ زاہدہ کی زبانی شوکت علی کے جو حالات مجھ تک پہنچے تھے، انہوں نے مجھے بے چین کر رکھا تھا۔ میں شوکت علی کی اشک شوئی کی غرض سے اس سے ملنے گیا تھا۔

شوکت علی سے یہ مختصر سی ملاقات نہایت ہی اہم، سنسنی خیز اور نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔ وہ اپنے گھر کے صحن میں ایک چارپائی پر موٹے تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ جب زاہدہ نے اسے میری آمد کی اطلاع دی تو وہ جلدی سے اپنے آنسو پونچھنے لگا۔ زاہدہ نے میرے بیٹھنے کے لیے شوکت علی کے نزدیک ایک کرسی رکھ دی تھی۔ میں شوکت علی سے مصافحہ کرنے کے بعد اس کرسی پر بیٹھ گیا مگر اس نے میرا ہاتھ نہیں چھوڑا اور زاہدہ کی جانب دیکھتے ہوئے نگاہوں ہی نگاہوں میں اپنی بیوی کو وہاں سے جانے کا اشارہ کر دیا۔

جب زاہدہ رخصت ہوگئی تو شوکت علی نے میرے ہاتھ کو تھامے تھامے آنکھیں بند کر لیں۔ اگلے ہی لمحے اس کی بند آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔ اس نے بہ دستور میرے ہاتھ کو تھام رکھا تھا جس کے سبب مجھے اس کے بدن پر طاری دھیمے لرزے کا احساس ہو رہا تھا۔ میں توقع کر رہا تھا کہ وہ چھوٹتے ہی مجھ سے فیضی کو چھوڑنے کی بات کرے گا لیکن اس نے میرے سلام کا جواب دینے کے بعد بند آنکھوں کی چپ سادھ لی تھی۔

وہ زبان سے خاموش تھا لیکن بہ زبانِ خاموشی اس کا پورا

جسم محوِ کلام تھا اور بند آنکھیں آنسوؤں کی تحریر میں باقاعدہ گفتگو کر رہی تھیں۔ میں تشفی آمیز انداز میں اس کا ہاتھ تھپکنے لگا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا شوکت علی۔" میں نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔ "اللہ نے ایسی کوئی بیماری پیدا نہیں کی جس کا علاج بیماری سے پہلے زمین پر نہ اتارا ہو۔ دیکھ لینا، تم بہت جلد تندرست ہو جاؤ گے۔"

"موت بھی ایک بیماری ہے تھانیدار صاحب......" وہ بند آنکھوں کے پیچھے سے بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "جس کا کوئی علاج نہیں۔ میں بھی چند دن کا مہمان ہوں۔ بہت جلد موت مجھے گلے لگا لے گی۔"

"حوصلہ رکھو شوکت علی۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "واقعی، موت کا کوئی علاج نہیں لیکن میری نظر میں موت کو بیماری سے تعبیر کرنا مناسب نہیں۔ موت تو ایک ایسی ٹرین ہے جس پر سوار ہو کر انسان اپنے خالق کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اس ٹرین کو اپنے ٹریک پر رواں دواں رہنا چاہیے تاکہ خالق اور مخلوق کی ملاقات کا سلسلہ جاری و ساری رہے۔"

شوکت علی کے بدن کی تھرتھراہٹ ہاتھ کے راستے میرے وجود میں منتقل ہو رہی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ صرف آنکھیں ہی نہیں بلکہ اس کا دل، جگر حتیٰ کہ جسم کا رواں رواں محوِ گریہ و زاری تھا۔ وہ آنکھوں کو بدستور بند رکھتے ہوئے نمناک آواز میں بولا۔

"لوگ سمجھتے ہیں، فیضی کی خالدہ سے شادی نہ ہو سکنے کے سبب مجھے پہنچنے والے صدمے سے میں مفلوج ہو گیا ہوں۔ یہ لوگوں کی غلط فہمی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں شاہدہ کے اس فیصلے سے بہت خوش ہوں۔ اگر شاہدہ اس رشتے کے لیے راضی ہو بھی جاتی تو میں انکار کر دیتا۔ یہ زاہدہ کی خواہش تھی کہ وہ خالدہ کو اس گھر کی بہو بنا کر لائے۔ میں ہرگز اس کے حق میں نہیں تھا......"

شوکت علی نے لمحاتی توقف کیا تو میں نے اس سے کوئی سوال پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ حالانکہ اس نے جس انداز کی بات کی تھی، اس پر سو استفسارات بنتے تھے۔ اس کی آنکھیں اپنا کام جاری رکھتے ہوئے اس کے گالوں کو بھگو رہی تھیں۔ وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"انسان خطا کا پتلا ہے تھانیدار صاحب۔ کوئی چاہے کتنا بھی عقل مند ہو، اس سے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ شاہدہ نے بھی ایک سنگین غلطی کی تھی۔ والدین کو اپنی اولاد کی پسند و ناپسند کا خیال رکھنا چاہیے۔ اگر وہ خالدہ کا رشتہ آفتاب کے بجائے ذلفی کو دیتی تو یہ زیادہ مناسب ہوتا۔"

شوکت علی کے ایک ایک لفظ میں سو سو بھید چھپے ہوئے تھے۔ قبل اس کے کہ میں اس سے اس کے آخری جملے کی وضاحت مانگتا، وہ بند آنکھوں کے پیچھے سے کربناک آواز میں بولا۔

"تھانیدار صاحب! میں زیادہ دن تک جی نہیں سکوں گا۔ مجھے نہیں امید کہ ہماری دوبارہ بھی ملاقات ہو پائے، اس لیے میں آپ کو اپنی زندگی کے سب سے اہم راز سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں...... وہ راز جو صرف میرے، شاہدہ اور اللہ کے بیچ میں ہے اور اب آپ اس راز میں شریک ہو رہے ہیں۔ اپنا کان ادھر لائیں......"

میں نے بے ساختہ اپنا کان اس کے ہونٹوں کے نزدیک کر دیا پھر بہ زبانِ سرگوشی شوکت علی نے میری سماعت میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیل دیا تھا۔

میں گزشتہ شام سے اب تک شوکت علی کے الفاظ کے سحر میں گرفتار تھا۔ سچ بہت کڑوا ہوتا ہے اور سچ بولنے والا بہت بہادر۔ میری نظر میں شوکت علی ایک بہادر انسان تھا۔

میں شوکت علی اور اس کی جرأت کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ کانسٹیبل ساجد میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر پریشانی نے ڈیرا جما رکھا تھا۔ میرے قریب پہنچ کر وہ گردن جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "کیا ہوا ساجد! تمہاری شکل پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟"

"مجھ سے ایک سنگین غلطی ہو گئی ہے ملک صاحب!" وہ ملتجیانہ انداز میں بولا۔ "آپ مجھے معاف کر دیں سر......"

"معاف کرنا یا سزا دینا تو بعد کی بات ہے، پہلے مجھے یہ تو پتا چلے کہ تم نے کون سا چاند چڑھا دیا ہے۔" میں نے اسے گھورتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔ "اور اس بات کا فیصلہ بھی میں ہی کروں گا کہ تمہاری غلطی سنگین ہے یا نہیں...... اس لیے شروع ہو جاؤ...... شاباش!"

اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک انگوٹھی برآمد کی پھر مذکورہ انگوٹھی کو میری جانب بڑھاتے ہوئے ندامت آمیز لہجے میں بولا۔

"مجھ سے یہ غلطی ہوئی ہے ملک صاحب!"

میں نے اس کے ہاتھ سے انگوٹھی لے کر بغور جائزہ لیا۔ وہ چاندی کی ایک خوب صورت انگوٹھی تھی جس کے اندر ایک دلکش مانک جڑا ہوا تھا۔ مانک کا وزن لگ بھگ دس قیراط ہوگا۔ مانک کے گرد بیضوی شکل میں ننھے ننھے فیروزے جڑے ہوئے تھے۔ فیروزی اور سرخ رنگ کے نگینوں کے امتزاج نے اس انگوٹھی کے حسن میں چار چاند لگا دیے تھے۔ مانک کو فیروزوں

کے درمیان براجمان دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ستاروں کے جھرمٹ میں چاند مسکرا رہا ہو۔

ساجد نے اس انگوٹھی کی نسبت سے اپنی کسی غلطی کا ذکر کیا تھا لہٰذا میں نے کڑے لہجے میں سوال کیا۔ ''یہ انگوٹھی تم نے کہاں سے چرائی ہے؟''

''میں نے یہ انگوٹھی چرائی نہیں ملک صاحب۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے پڑی ہوئی ملی تھی۔''

''کہاں پڑی ہوئی ملی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ میں نے اضطراری انداز میں ساجد سے استفسار کیا۔ ''کمرے کی عقبی کھڑکی کے نیچے سے؟''

''جی جی.....'' وہ گردن کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''بالکل وہیں سے۔''

میری چھٹی حس نے سگنل دیا، اس انگوٹھی کا آفتاب کے قتل سے گہرا تعلق ہوسکتا ہے۔ میں نے سرزنش کرنے والے انداز میں ساجد سے کہا۔

''اور..... تم تین دن کے بعد یہ انگوٹھی مجھے دکھا رہے ہو۔ تم نے اس انگوٹھی کے بچے نکالنے کے لیے کسی مرغی کے نیچے تو نہیں رکھ دیا تھا.....؟''

''نہیں ملک صاحب۔'' وہ سر کو نفی میں حرکت دیتے ہوئے بتانے لگا۔ ''میں نے اس خیال سے یہ انگوٹھی اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لی تھی کہ اندر جا کر آپ کو دوں گا پھر پتا نہیں، کس طرح یہ بات میرے ذہن سے نکل گئی اور انگوٹھی میری جیب کے اندر ہی پڑی رہ گئی۔ یہ تو کل جب گھر میں میری یونیفارم دھوئی گئی تو اس کی جیب سے انگوٹھی برآمد ہوئی.....'' لمحاتی توقف کر کے اس نے لجاجت آمیز نظر سے مجھے دیکھا اور بولا۔

''مجھے معاف کردیں ملک صاحب!''

ان لمحات میں میرا ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ میں نے آفتاب کے قتل کے شبے میں اس وقت دو افراد کو تھانے کی حوالات میں، الگ الگ کمروں میں بند کر رکھا تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق، اگر جیدا یا فیضی میں سے کسی نے آفتاب کو موت کے گھاٹ اتارا تھا تو اس انگوٹھی کا تعلق اسی سے ہونا چاہیے تھا اور اس بات کو چیک کرنا بہت آسان تھا کیونکہ وہ دونوں میری تحویل میں تھے۔

''ٹھیک ہے ساجد! میں تمہاری اس کوتاہی کو نظرانداز کرتا ہوں۔'' میں نے کانسٹیبل کی جانب دیکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔ ''آئندہ ایسی غلطی نہیں ہونا چاہیے۔''

''جی ملک صاحب! میں وعدہ کرتا ہوں۔'' وہ فرماں برداری سے بولا۔

''جاؤ..... فیضی کو حوالات سے نکال کر یہاں لے آؤ۔'' میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

ساجد نے فی الفور میرے حکم کی تعمیل کردی۔ جب فیضی میرے سامنے آ کر کھڑا ہوا تو میں نے بہ غور اس کے ہاتھوں کا جائزہ لیا۔ وہ بے چینی سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے کڑے لہجے میں استفسار کیا۔

''تمہاری انگوٹھی کہاں ہے؟''

''کون سی انگوٹھی تھانیدار صاحب!'' اس نے حیرت اور الجھن کی ملی جلی کیفیت سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''میں نے تو کبھی کوئی انگوٹھی پہنی ہی نہیں.....''

وہ غلط بیانی نہیں کر رہا تھا۔ اگر وہ کوئی انگوٹھی پہننے کا عادی ہوتا تو اس کی کسی نہ کسی انگلی پر انگوٹھی کی بیٹھک کا مخصوص نشان ضرور بن گیا ہوتا۔

میں نے ساجد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جیدا کو بھی یہاں لے آؤ۔''

تھوڑی دیر کے بعد جیدا بھی لائن حاضر ہوگیا۔ میں نے وہی سوالات جیدا سے بھی کیے جو اس سے پہلے فیضی سے پوچھ چکا تھا اور حسب معمول جیدا کے جوابات بھی وہی تھے۔ جیدا کے ہاتھوں کی تمام انگلیاں بھی اس بات کی گواہی دے رہی تھیں کہ وہ انگوٹھی پہننے کا شوق نہیں رکھتا۔ اس صورتِ حال نے مجھے گہری سوچ میں ڈال دیا۔

فیضی نے مجھ سے پوچھا۔ ''تھانیدار صاحب! یہ انگوٹھی کا کیا معاملہ ہے؟''

میں چند لمحات تک ٹٹولنے والی نگاہ سے باری باری ان دونوں کے چہروں کا جائزہ لیتا رہا پھر اپنی میز کی دراز میں سے مذکورہ انگوٹھی کو نکال کر میز کے اوپر رکھتے ہوئے ان سے سوال کیا۔

''کیا تم اس انگوٹھی کو پہچانتے ہو؟''

وہ بہ یک زبان ہو کر بولے۔ ''یہ تو زلفی کی ہے.....!''

☆☆☆

کچا واردا تیا جب پکے ہاتھوں کی گرفت میں آتا ہے تو صرف دو زناٹے دار طمانچے اور دو سلگتے ہوئے سوال اس کا پتا پانی کرنے کے لیے مفید ثابت ہوتے ہیں۔ ذوالفقار عرف زلفی کو جب گرفتار کر کے میرے سامنے لایا گیا تو میں نے اس کے گال پر ایک زوردار تھپڑ رسید کیا پھر مانک جڑی انگوٹھی اس کی

آنکھوں کے سامنے لاتے ہوئے پوچھا۔
’’یہ تمہاری ہے نا......؟‘‘
انگوٹھی پر نگاہ پڑتے ہی اس کا رنگ اڑ گیا، حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز میں اس نے استفسار کیا۔
’’یہ آپ کو کہاں سے ملی......؟‘‘
’’جہاں سے تم کھڑکی کے راستے کمرے کے اندر پہنچے تھے۔‘‘ میں نے اس کے دوسرے گال کو نشانہ بناتے ہوئے زہر خند لہجے میں کہا۔
وہ ہکا بکا ہو کر میری صورت دیکھنے لگا۔ شوکت علی کے نم ناک الفاظ میری سماعت میں گردش کرنے لگے...... کوئی چاہے کتنا بھی عقل مند ہو، اس سے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ شاہدہ نے بھی ایک سنگین غلطی کی تھی۔ والدین کو اپنی اولاد کی پسند و ناپسند کا خیال رکھنا چاہیے۔ اگر وہ آفتاب کے بجائے خالدہ کا رشتہ زلفی سے کرتی تو یہ زیادہ مناسب ہوتا۔
’’کیا خالدہ تمہیں پسند کرتی ہے؟‘‘ میں نے زاہدہ کے خیالات کی روشنی میں زلفی سے استفسار کیا۔
’’جی...... یہ سچ ہے۔‘‘ وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ’’میں بھی خالدہ کو بہت چاہتا ہوں۔‘‘
’’تو کیا اپنی پسند اور چاہت کے حصول کے لیے تم نے سگے بھائی کی جان لے لی؟‘‘ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نفرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ’’خودغرضی اور سفاکی کی اس سے زیادہ بدترین اور کوئی مثال نہیں ہو سکتی۔‘‘
اس نے مجرمانہ انداز میں گردن جھکا دی۔
اگلے ایک گھنٹے کے اندر میں نے اس کا اقبالی بیان ریکارڈ کر لیا۔ واقعات کے مطابق، خالدہ اور زلفی ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے لیکن آفتاب کی شادی کے موقع پر دونوں نے اپنی زبانیں بند رکھیں۔ خالدہ بیاہ کر گوجرانوالہ شہر سے زلفی کی بھابی کی حیثیت سے نوشہرہ ورکاں آ گئی۔ اس صورتِ حال نے زلفی کا دماغ خراب کر دیا۔ وہ ہمہ وقت خالدہ کے حصول کے بارے میں سوچنے لگا۔ پھر اس نے ایک شیطانی منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا...... سگے بھائی کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ!
اپنے منصوبے کے مطابق، وقوعہ سے ایک روز پہلے اس نے اپنی بیماری کا بڑا کامیاب ڈراما رچایا اور اٹھارہ تاریخ کی صبح وہ بہ ظاہر کھیتوں کی طرف نہیں گیا۔ وہ رات کو چھت پر سوتا تھا۔ اس لیے کسی کو اس کی کارکردگی کا پتا نہ چل سکا۔ کسی کو کانوں کان خبر کیے بغیر وہ مقتول سے پہلے چپکے سے ڈیرے پر پہنچ گیا۔ اپنے مقصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ گزشتہ روز کمرے کی عقبی کھڑکی کو بھیڑ آیا تھا مگر اس کی کنڈی بند نہیں کی تھی۔ وہ دروازے کی اوٹ میں چھپ کر آفتاب کا انتظار کرنے لگا۔
تھوڑی ہی دیر کے بعد اس کا انتظار ختم ہو گیا۔ آفتاب جیسے ہی کمرے کا دروازہ کھول کر لباس تبدیل کرنے کی غرض سے اندر آیا، زلفی نے ایک آہنی وزنی رینچ پانے سے اس کے سر کے عقبی حصے پر ایک خوفناک وار کر دیا۔ اگلے ہی لمحے آفتاب کسی کٹے ہوئے شہتیر کے مانند دھڑام سے زمیں بوس ہو گیا۔
کھڑکی کے راستے کمرے کے اندر کودتے وقت اس کی انگلی سے مانک والی انگوٹھی نکل کر کھال (نالے) کے کنارے جا گری تھی۔ اگر مذکورہ انگوٹھی ساجد کے ہتھے نہ چڑھتی تو شاید اس کیس کو حل کرنے میں مجھے مزید جوکھم اٹھانا پڑتے۔ دیر آید، درست آید کے مصداق میں آفتاب کے اصل قاتل تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔
’’زن، زر، زمین‘‘ کو ازل سے فتنہ و فساد کی جڑ تصور کیا جاتا ہے اور میرے خیال میں ابد تک ایسا ہی سمجھا جاتا رہے گا۔ زندگی کے ننانوے فیصد تنازعات کے پیچھے انہی تینوں میں سے کسی ایک یا ایک سے زیادہ کا عمل دخل ہوتا ہے۔
میں جانتا ہوں، آپ کے ذہن میں یہ سوال بڑی بے قراری سے کروٹیں بدل رہا ہوگا کہ اس شام شوکت علی نے میرے کان میں کون سی رازدارانہ سرگوشی کی تھی!
اب اس واقعے کو اتنا زیادہ عرصہ گزر چکا ہے کہ اس وقت متعلقہ کرداروں میں سے کوئی بھی بہ قیدِ حیات نہیں ہے لہٰذا آپ سے شیئر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میں شوکت علی کے الفاظ دہرا رہا ہوں۔
’’تھانیدار صاحب! میں زیادہ دن تک جی نہیں سکوں گا اس لیے میں آپ کو اپنی زندگی کے ایک اہم راز سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ راز جو صرف میرے، شاہدہ اور اللہ کے بیچ میں ہے اور اب آپ اس راز میں شریک ہو رہے ہیں...... میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ خالدہ، میری اور شاہدہ کی سگی مگر ناجائز اولاد ہے۔ جب شاہدہ کی فدا حسین سے شادی ہوئی تو خالدہ اس کے پیٹ میں اپنی زندگی کا سفر شروع کر چکی تھی......‘‘
یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میں نے جیدا اور فیضی کو اسی روز رہا کر دیا تھا۔

(تحریر: حُسام بٹ)

تنہائی کا شکار ہونے والے چدرن کے مہمان کا انداز بیان

داستان گو

خیالوں میں گم رہنے والا ہو یا خیالات کو لفظوں کا پیراہن پہنانے کا ماہر ہو... اکثر ایسی ہی دلفریب کہانیاں تراش کر بیان کرتا ہے کہ سننے والا گرویدہ ہو جائے... یہی حال اس کا بھی تھا جس نے دل کے کسی گوشے میں چھپی نا آسودہ خواہشات کو داستان میں ڈھال کر من کا بوجھ اتارنے کا عجیب طریقہ اختیار کیا۔

علی اختر

وہ بڑی مشکل سے ہاتھ میں پکڑی ہوئی لاٹھی ٹیکتا ہوا آگے بڑھتا، پاؤں آگے رکھتا اور اپنے کانپتے ڈولتے وجود کو لاٹھی کے سہارے متوازن کرتا اور پھر قدم قدم آگے بڑھتا۔ چہرے پر کہن زدگی کی چغلی کھاتی جھریاں، کچھ بے ترتیب سفید داڑھی...... جو حجام تک عدم رسائی کی چغلی کھا رہی تھی۔ وہ اپنے رعشہ زدہ وجود کو سنبھالتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ یوں جیسے اس کا کوئی قدم غلط پڑا تو جسم کی ساری ترتیب بگڑ کر رہ جائے گی۔ گلی کے درمیان ٹمن کی وکٹیں بنائے لڑکے ربر کی گیند سے کرکٹ

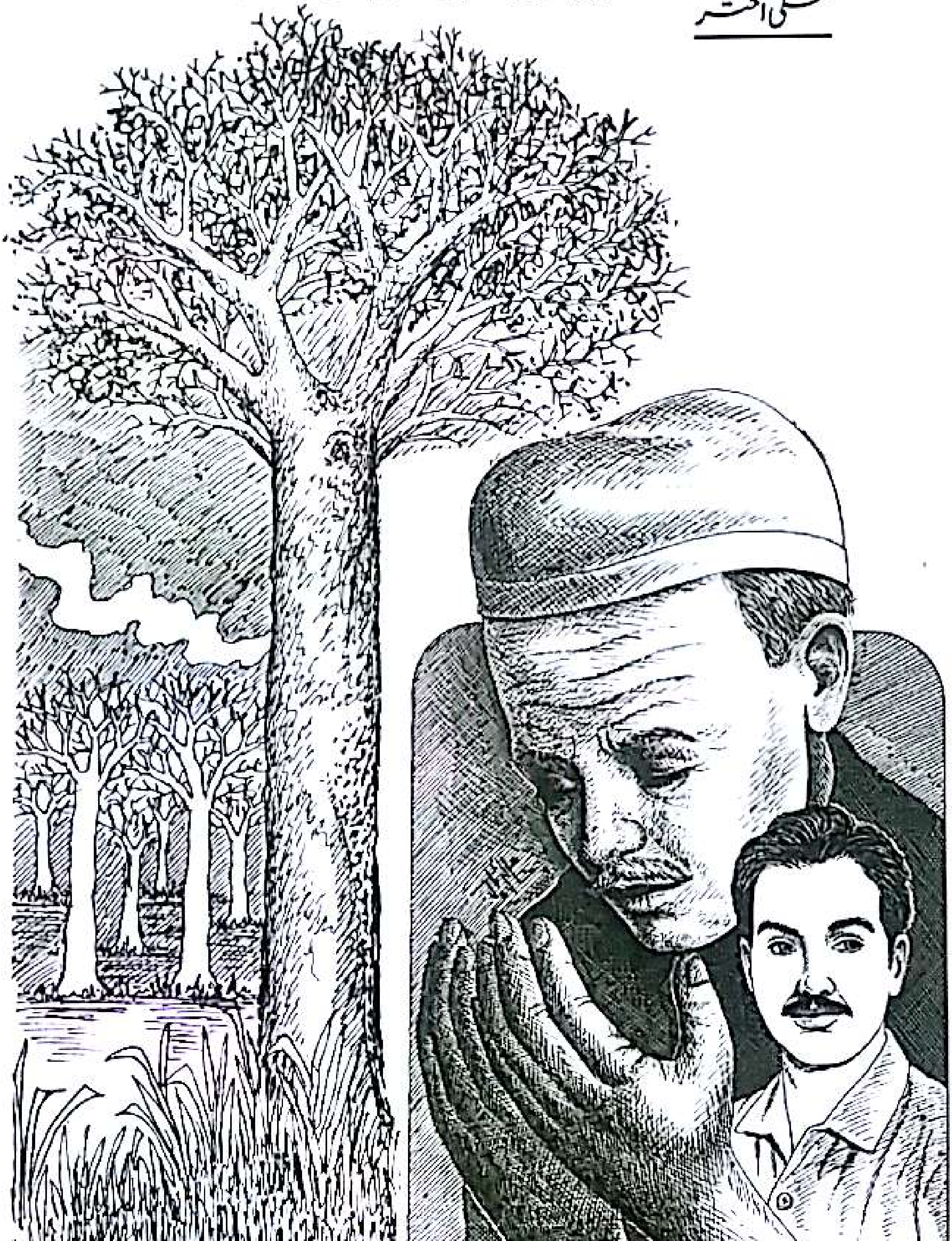

کھیل رہے تھے۔ وہ ہولے ہولے چلتا ہوا ان کے درمیان آ گیا۔ لڑکے اپنا کھیل روک کر اس کے اِدھر اُدھر ہونے کے منتظر تھے مگر وہ خاصی دیر میں بہ مشکل دو یا تین قدم آگے بڑھا پایا ہوگا کہ اسی دوران ...... میں بھی وہاں پہنچ گیا۔ مجھے دیکھ کر اس کے قدم رک گئے۔ اس نے بے بسی کے ساتھ مجھے مخاطب کر کے کہا۔

''بیٹا۔ ذرا مجھے آگے کر دینا۔''

میں نے اس کی لاٹھی پکڑنا چاہی تو وہ ایک بار پھر سے بولا۔

''نہیں میرے بچے! ایسے نہیں۔ تم مجھے صرف اپنا کندھا دو۔ اس لاٹھی کی مدد سے میں ایک قدم خود آگے بڑھاتا رہوں گا اور تمہارا کندھا مجھے دوسرا قدم اٹھانے میں مددگار ثابت ہوگا!''

تب میں نے خاموشی سے اپنا کندھا اس کے آگے کر دیا۔

''اللہ تمہارا بھلا کرے۔'' اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دعا دی۔

''کہاں جاؤ گے؟'' میں نے اپنی چال کو بہت آہستہ کر کے اس کے قدموں کے ساتھ قدم ملائے۔

''وہ سامنے جو برگد کا درخت ہے، وہاں تک جانا ہے مجھے۔'' بوڑھے نے آہستگی سے جواب دیا۔

''اس ویرانے میں اور اس قدر گرمی میں...... صبح ہی صبح وہاں جانے کی کیا ضرورت پڑ گئی......؟ گھر والوں نے آپ کو نہیں روکا!'' میں نے استفسار کیا۔

''روکا تھا۔ بہت روکتے ہیں مگر ایک عادت سی پڑ گئی ہے۔ جب تک وہاں نہ جاؤں، بے چینی سی رہتی ہے۔ تم تو دفتر جا رہے ہوگے۔ بڑی تکلیف دی ہے تمہیں۔'' بابا نے بات بدلتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں لیکن ابھی بڑا وقت پڑا ہے۔ اس لیے آپ کو وہاں پہنچا کر آگے نکل جاؤں گا۔'' میں نے جواب دیا۔

''اللہ تمہارا بھلا کرے اور تمہیں جزا دے۔'' اس نے اسی لہجے میں کہا۔

''تمہارا کوئی نہیں ہے بابا؟ جو تمہیں میرا مطلب ہے...... وہاں تک پہنچا جایا کرے۔'' میں نے اگلا سوال کیا تو وہ بولا۔

''کیوں نہیں .... بیٹے ہیں جو تمہاری طرح ملازم ہیں۔ پوتے پوتیاں ہیں جو اسکول جاتے ہیں۔ انہیں صبح صبح اسکول جانے کی جلدی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ میرا ساتھ نہیں دے پاتے اور پھر اگر آ بھی جائیں تو ان کی مائیں انہیں برا بھلا کہتی ہیں۔ وہ میرے لیے کہاں اتنا تردد کریں گے۔ میں خود ہی اپنی عادت نبھائے چلا جا رہا ہوں۔ اگر نہ آؤں، وہاں تک تو وہ بہت گلہ کرتا ہے۔ بڑی شکایت ہوتی ہے اسے مجھ سے!'' وہ ذرا سا رکا تو میری رگِ تجسس پھڑک اٹھی۔

''تو کیا وہاں کوئی اور بھی ہوتا ہے...... آپ کے علاوہ بھی؟''

''ہاں ہاں۔ وہ مجھ سے پہلے وہاں موجود ہوتا ہے۔ ہر بار مجھ سے پہلے وہاں پہنچ کر مجھے شرمندہ کر دیتا ہے!'' وہ بولا۔

''مگر میں نے تو سنا ہے برگد کا یہ بوڑھا اور پرانا درخت بڑا بھاری ہے۔ تبھی تو وہاں جاتے ہوئے لوگ گھبراتے ہیں۔ وہاں کوئی آسیب یا ہوائی مخلوق موجود ہے۔ کیا واقعی وہاں ایسی چیزیں موجود ہیں۔ آپ نے تو ضرور دیکھی ہوں گی۔'' میں نے اپنے اندر کا خدشہ اس پر ظاہر کیا۔

میری بات سن کر اس کے بوڑھے کانپتے ہونٹوں پر لحہ بھر کے لیے مسکراہٹ کی چاندنی اتری۔

''ارے نہیں بیٹا۔ جن کو لوگ بھوت اور چڑیلیں سمجھتے ہیں، وہ تو سب میری پرانی یادوں اور کہانیوں کے وہ کردار ہیں جو یہ روپ دھارے بیٹھے ہیں۔ وہ مجھے کچھ نہیں کہتے۔ میں وہاں جاتا ہوں تو وہ سارے میرے اردگرد اکٹھے ہو جاتے ہیں اور پھر مجھے یوں لگتا ہے جیسے ان کے آنے سے میری برسوں کی تنہائی دور ہو گئی ہو۔ یہ جو درخت تم دیکھ رہے ہو نا۔ یہ میرا بڑا پرانا یار ہے اور اگر میں اس کے پاس نہ آؤں تو شکوے شکایت لے کر بیٹھ جاتا ہے۔''

اس کی باتیں بڑی دلچسپ تھیں مگر مجھے دفتر جانے کی جلدی تھی۔ اس لیے میں اسے وہاں چھوڑ کر اپنے آفس چلا آیا۔ دفتر آ کر اپنے کاموں میں اس قدر الجھ گیا کہ مجھے اس کی یاد ہی نہ رہی۔ البتہ جب شام کو میں ادھر سے گزرا تو اچانک میری نظریں اس جانب اٹھ گئیں مگر اس وقت وہاں کوئی نہ تھا۔

میں اس راستے سے روزانہ گزرتا تھا اور جب سے میرا اس بوڑھے سے تعارف ہوا تھا، میں اب نہ چاہتے ہوئے بھی اس طرف ضرور دیکھنے لگا تھا جہاں اس روز میں نے اسے چھوڑا تھا مگر اب کتنے روز سے میرا اس سے ٹکراؤ نہیں ہوا تھا پھر ایک دن میں نے اسے دیکھا بھی مگر میں اس روز جلدی میں تھا۔ وہ اس وقت درخت کے تنے سے لگا بیٹھا تھا اور اس کی بوڑھی اور لمبی رگوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا جو زمین کے سینے سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔

اسے مصروف دیکھ کر میں بھی مسکرا کر آگے نکل گیا حالانکہ اس کی باتیں میرے ذہن میں ابھی تک گونج رہی تھیں بلکہ اب تو یہ عالم ہو گیا تھا کہ میں جب بھی کہیں تنہا بیٹھتا، وہ میری آنکھوں کے سامنے آجاتا۔ دفتر میں میرے ساتھی مجھے یوں مراقبے میں بیٹھے دیکھ کر ہنسنے لگے تھے۔ اس روز بھی میں آنکھیں بند کر کے اپنی سیٹ سے ٹیک لگائے ذرا فارغ بیٹھا تھا کہ مجھے اس کی باتیں یاد آگئیں اور میں خود بخود مسکرانے لگا۔ میرے قریب بیٹھنے والے میرے ساتھی نے اپنی میز کو زور سے بجا کر مجھے مخاطب کیا۔

''نثار صاحب! کہاں پہنچے ہوئے ہیں اور یہ لبوں پر پھیلنے والی مسکراہٹ آپ کے اندر کی چھپی کہانی بیان کر رہی ہے!''

''نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تو بس یونہی ذرا!'' میں نے پورے طور پر اپنے حواس بحال کرتے ہوئے جواب دیا۔

''ہم جانتے ہیں۔ آپ چاہے بتائیں یا نہ بتائیں۔ پیار کے ابتدائی دنوں میں۔ چاہتوں کے وصل لمحوں میں اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔'' اس نے جیسے مجھ سے کچھ اگلوانا چاہا مگر کچھ تھا ہی کیا جو میں انہیں بتاتا لیکن وہ بضد تھے۔

''ارے۔ تم یہ کیا بکھیڑا لے بیٹھے ہو۔ قسم لے لو۔ ایسی کوئی بات نہیں۔'' میں نے اپنی صفائی پیش کی۔

''ہم سے بھی قسم لے لیں۔ ہم آپ کے ہمدرد ہیں۔ آپ کے دوست اور ساتھی ہیں۔ ہم پر اعتماد کر کے تو دیکھیں۔ ہم یہ معاملہ بھابی سے بھی چھپا کر رکھیں گے۔'' وہ سارے بیک زبان ہو کر بولے۔

میں نے بڑی مشکل سے جان چھڑائی۔ اگرچہ میں انہیں مطمئن نہ کر سکا۔ میری یہی حالت گھر میں بھی تھی۔ گھر میں بھی جب کبھی میں اکیلا ہوتا تو مجھے وہ بابا اور اس کی باتیں یاد آجاتیں اور پھر میرے لبوں پر بکھرتی مسکراہٹ نے تو کئی بار میری بیگم کو بھی شک میں مبتلا کر ڈالا تھا۔ یہ الگ بات کہ میں اس سے کس طرح جان چھڑاتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اس روز بھی میں بیٹھا نہ جانے خیالوں کے کن راستوں سے بھٹکتا ہوا اس بوڑھے پر آرکا تھا اس روز مجھے یوں تنہائی میں اکیلے مسکراتے دیکھ کر میری بیگم نے قدرے غصے سے مجھ سے کہا۔

''میں کتنے دنوں سے آپ کی حالت دیکھ رہی ہوں۔ کیا یاد آجاتا ہے کہ یکایک خاموش اور چپ رہنے کے باوجود خود بخود آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی بکھرنے لگتی ہے۔ کہیں کوئی معاملہ گڑبڑ تو نہیں ہو گیا؟''

تب میں نے فوراً جواب دیا۔

''نہیں عاصمہ! جو تم سوچ رہی ہو ایسی بات نہیں ہے اور ویسے بھی اب ایسے معاملات سے ہماری عمریں آگے نکل چکی ہیں!''

''گھوڑے اور مرد کے پھسلنے میں وقت ہی کتنا لگتا ہے!'' اس نے جواب دیا۔

تب میں نے اس روز والا سارا واقعہ اور بابے کی باتیں اسے سنا ڈالیں۔ اس نے ساری باتیں سننے کے بعد پوچھا۔

''تو آپ خود کہیں اس برگد کے نیچے تک تو نہیں گئے؟''

''ہوں!'' میں نے آنکھیں بند کر کے کرسی کی پشت سے سر لگاتے ہوئے کہا۔

''تو نثار...... مجھے لگتا ہے کہ برگد پر رہنے والے سائے کا اثر آپ پر بھی ہو گیا ہے۔ کیا بتایا تھا آپ نے کہ اس درخت پر ہوائی چیزوں کا بسیرا ہے!'' اس نے پریشانی سے کہا۔

''ارے نہیں عاصمی۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ اس بابے کی باتیں ہی اس قدر دلچسپ تھیں کہ مجھے جب بھی یاد آتی ہیں تو مسکراہٹ میرے لبوں پر خود بخود آجاتی ہے۔'' میں نے اسے مطمئن کرتے ہوئے کہا۔

''دوبارہ نہیں ملے اس سے؟'' اس نے پوچھا۔

''جی تو چاہتا ہے مگر وقت ہی نہیں ملا'' میں نے مختصراً جواب دیا

اور واقعی میری یہ خواہش دن بہ دن میری سوچوں کو جکڑنے لگی تھی کہ میں اس سے دوبارہ ملوں۔ مجھے وہ خاصا دلچسپ لگنے لگا تھا لیکن صبح آفس جانے کی جلدی اور شام گھر آنے کی پھرتی پھر رفتہ رفتہ یہ باتیں میرے ذہن سے محو ہونے لگیں۔ اس روز اتوار تھا۔ آفس سے چھٹی تھی۔ میں نے اپنے پروگرام پہلے سے طے کر رکھے تھے مگر اچانک جیسے ایک کوندا سا ذہن میں لپکا۔ کیوں نہ آج بابا سے ملاقات کر لی جائے۔

اس روز بھی صبح ہی سے سورج نے سلگانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے اپنے دوسرے سارے پروگرام ادھورے چھوڑ دیے اور گھر سے نکل کر اس جگہ پہنچ گیا جہاں برگد کا یہ بوڑھا اور پرانا درخت کھڑا تھا۔ یہ ہماری نئی بنی ہوئی کالونی سے ذرا ہٹ کر قدرے ویران جگہ تھی اسے میری خوش قسمتی جانیے کہ وہ مجھے اسی درخت کے نیچے بنی ہوئی صاف ستھری سی جگہ پر بیٹھا مل گیا۔

میں پیچھے کی جانب سے چلتا ہوا اس کے قریب پہنچا تو مجھے اس کی باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ یوں جیسے وہ کسی

سے ہمکلام ہو مگر وہاں دوسرا کوئی نہ تھا۔ میں اس کے اور نزدیک ہو گیا۔ وہ اپنی ہی دھن میں باتیں کر رہا تھا۔

''اوہ۔ یار غصہ تھوک دے۔ کہا نا۔ بیمار ہو گیا تھا میں نہیں چلا جا رہا تھا مجھ سے۔ آج بھی بڑی مشکل سے اٹھ کر آیا ہوں۔ اعتبار کر میرے پر اور تمہارا منہ ابھی تک بنا ہوا ہے۔ معاف کر دے نا مجھ نمانے کو۔ تیرے سوا اب ہے بھی میرا کون جس سے اپنا دکھ درد کہہ سکوں۔ وہ تو سارے اپنے اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کے پاس مجھ سے باتیں کرنے کا وقت ہی نہیں!'' ابھی نہ جانے وہ اور کیا کیا باتیں کرتا کہ میں بیچ میں ہی بول اٹھا۔

''جوگیا...... بیٹھے کس سے باتیں کر رہے ہو؟''

اس نے فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا اور اپنے ایک ہاتھ کی اوک بنا پر اپنی آنکھوں کے اوپر رکھ کر تقریباً مجھے پہچانتے ہوئے بولا۔

''آ گئے ہوئے پتر۔ میں بڑے دنوں سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔''

اس کی یہ بات سن کر مجھے یوں لگا جیسے اسے واقعی میرا انتظار رہا ہو۔

''جوگیا......'' میں نے اسے دوبارہ مخاطب کیا۔

''نہ پتر۔ میں نے یہاں کونسا جوگ لیا ہے۔ نہ میں سنیاسی ہوں اور نہ جوگی۔ سیدھا سادہ بندہ ہوں۔ اس ہمدرد کے پاس آ جاتا ہوں اپنا دکھڑا سنانے مگر یہ بھی ناراض ہو گیا ہے۔ ترلے کر رہا ہوں دیکھو کب مانتا ہے! بیٹھو۔ اور تمہیں بتا دوں۔ میرا نام جوگیا نہیں، علم دین ہے!''

میں اس کے نزدیک ہی برگد کی چھدری چھاؤں تلے بیٹھ گیا۔

''یہ برگد کا درخت میرا یار ہے۔ اس نے میرے جسم پر اترتے سارے موسم دیکھے ہیں۔ یہ میری ساری باتوں کا سانجھی ہے۔ یہ جگہ جہاں آج کل نئی کالونی بنی ہے، یہاں کبھی غلہ منڈی ہوا کرتی تھی اور برگد کا یہ درخت اس کے درمیان میں ہوا کرتا تھا۔ میں یہاں بڑی مدت سے آیا کرتا تھا۔ گرمیوں کی سفید دودھ دوپہریں جب سانولی ہونے لگتی تھیں، ہم اس کے نیچے بیٹھا کرتے تھے۔ میری طرح اور بھی بہت سے لوگ اپنے اپنے گھروں کے حبس سے تنگ آ کر یہاں آ جاتے تھے۔

''یہ ان دنوں کی بات ہے، جب میری شادی نہیں ہوئی تھی۔ میں ایک روز یہاں آیا تو مجھ سے پہلے یہاں دو چار بڑی عمروں کے لوگ بیٹھے تھے۔ درمیان میں رکھے ہوئے حقے کی نے گھومتی ہوئی کبھی کسی کے اور کبھی کسی کے ہاتھ آ جاتی۔ وہ سارے کسی اور کے منتظر تھے۔ جب وہ کتنی دیر تک نہ پہنچا اور ان کی تعداد بڑھتی چلی گئی تو ان میں سے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی مجھے مخاطب کر کے بولا۔

''پتر! پڑھے لکھے ہو؟''

''ہاں جی۔ اللہ کا کرم ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''تو پتر! ادھر آ ؤ، اگر فارغ ہو۔ جب تک رحماں نہیں آتا تو ہمیں یہ کتاب ہی پڑھ کر سنا دو۔''

''میں ہچکچاتا ہوا آگے بڑھ کر ان کے درمیان آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور کتاب اٹھا لی۔ یہ بوسیدہ اوراق والی ایک بڑی سی کتاب تھی۔ شاید امیر حمزہ کی داستان تھی۔ میں نے پڑھنا شروع کی۔ وہ سارے بڑی خاموشی کے ساتھ اسے سن رہے تھے۔ درمیان میں کبھی کبھی حقہ گڑگڑانے کی آواز آنے لگتی۔ جوں جوں میں اسے پڑھتا جا رہا تھا، میری اپنی دلچسپی اس میں بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ شام کی سانولی رنگت دھیرے دھیرے رات کی گہری سیاہی میں بدلنے لگی تب انہوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

''بس پتر! یہاں نشانی رکھ کر اسے بند کر دے۔ اللہ تمہیں حیاتی دے۔ باقی کل پھر سہی۔ شاید کل رحماں بھی آ جائے۔ وہ آگے سے شروع کر دے گا۔''

''بس اسی روز سے میرا شوق بڑھتا چلا گیا۔ میں اب روزانہ وہاں آنے لگا تھا اور جس روز رحماں نہ ہوتا اس روز میں کتاب پڑھتا تھا اور یوں میرا نام داستان گو رکھ دیا گیا حالانکہ میں صرف پڑھنے والا ہوتا تھا۔ ایک روز میں جب وہاں پہنچا تو میری طرح دو تین بندے اور آ کر ادھر ادھر کی باتوں میں مشغول ہو گئے۔ ابھی چوپال جمنے میں دیر تھی کہ ان میں سے ایک بولا۔

''داستان گو پتر! تمہیں پتا ہے رحمے کے بیٹے نے اپنا مکان بیچ دیا ہے۔ وہ کل یہاں سے کسی دوسرے شہر چلے گئے ہیں۔ اس لیے کہانی سنانے کی ڈیوٹی آج سے تمہارے حصے میں آ گئی ہے۔ لہٰذا آئندہ سے تم ہمارے لیے یہ کام سرانجام دو گے۔ تمہیں علم ہے کہ ہم یہاں صرف اسی خاطر آتے ہیں۔ گھر والے ویسے ہی ہماری شکلوں اور باتوں سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ہم سب یہاں آ جاتے ہیں۔ کچھ ایک دوسرے کے دکھ درد سمیٹنے اور کچھ اپنا دل بہلانے۔''

''میں ابھی اس سوچ میں تھا کہ انہیں کیا جواب دوں کہ دور سے ایک چھ سات سال کا بچہ ہماری طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ ہمارے قریب آ کر رک گیا اور پھر اس نے

ہاتھ میں پکڑا ہوا روپے کا نوٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ لو!“
میں نے نوٹ پکڑ کر بچے سے پوچھا۔ ”یہ کیا ہے پتر!“
”یہ میری باجی نے بھیجا ہے۔ وہ ادھر کھڑی ہے۔“ اس نے دور کھڑی لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔
”کس لیے؟“ میں نے دوبارہ پوچھا۔
”آپ مانگنے والے نہیں ہو!“ لڑکے نے جواب دیا تو ایک بوڑھے نے جواب دیا۔
”ہم بھکاری نہیں ہیں پتر۔ جاؤ واپس لے جاؤ۔“
”اس نے وہ نوٹ میرے ہاتھ سے تقریباً کھینچتے ہوئے اسے دوبارہ پکڑا دیا۔ وہ نوٹ لے کر واپس پلٹ گیا۔ میری نظریں اس کے تعاقب میں تھیں۔ جب وہ لڑکی کے قریب پہنچا تو چند لمحے ان کے درمیان کچھ باتیں ہوئیں پھر اس نے مسکراتے ہوئے نوٹ واپس لیا اور آگے چلی گئی۔
”پتا نہیں کیوں اس لمحے میرا اس لڑکی سے ملنے اور باتیں کرنے کو دل چاہنے لگا تھا۔ پتر! شاید سیانے لوگوں نے اسی کا نام خواہش رکھا ہو۔ بہرحال کچھ تھا ضرور جو اس دن اور اس لمحے سے میرے دل میں کہیں اپنا گھر بنانے لگا تھا۔
”پھر میں نے بھی روزانہ شام کو یہاں آنے کی ہامی بھر لی۔ اب میں روزانہ ان کے درمیان آ کر بیٹھ جایا کرتا اور داستان سنانے لگتا۔ بزرگوں کا وہ ٹولہ جو رحمے کے جانے کی وجہ سے بکھر گیا تھا، دھیرے دھیرے دوبارہ جمع ہونے لگا۔ میں ان کے درمیان روزانہ آ کر بیٹھ جایا کرتا۔ یہ اب میرا روزانہ کا معمول بن چکا تھا۔ میں ان دنوں محنت مزدوری کر کے یہاں ایک قریبی کوارٹر میں آ جایا کرتا جہاں میں رہائش پذیر تھا۔ میرے والدین گاؤں میں رہتے تھے اور یہاں میں اکیلا۔ اس وقت یہ برگد بھی میری طرح جوان تھا۔ ہم اس کے نیچے اس وقت تک بیٹھے رہتے جب تک مکمل اندھیرا نہ ہو جاتا۔“
”پھر اس لڑکی کا کیا ہوا؟“ میں نے اس کی کہانی کا سب سے دلچسپ ٹکڑا اٹھایا۔
”وہ لڑکی تو جیسے میری سوچوں کا ایک حصہ بن کر رہ گئی تھی۔ میں وہاں جاتا تو مجھے اس کا انتظار شروع ہو جاتا کہ کبھی تو وہ دوبارہ یہاں سے گزرے گی۔ اس کے ذہن میں تو شاید یہ بات ہو گی بھی نہیں کہ کوئی اس کا اس طرح شدت سے انتظار کرتا ہو گا۔
”اس برگد کے قریب سے گزرنے والا واحد رستہ تھا جو اردگرد کی آبادیوں کے لیے شہر پہنچنے کا واحد... ذریعہ تھا۔ اسی لیے لوگ عموماً اسے استعمال کرتے تھے۔ میں اپنے کام سے فارغ ہو کر یہاں آ جاتا پھر ہولے ہولے دوسرے بھی آ جاتے۔
”اس روز بھی حسب عادت میں ہی وہاں پہلے پہنچا تھا۔ ان میں سے ایک ادھیڑ عمر شخص جو ہر روز برگد کے نیچے وہ زمین پر پانی کا چھڑکاؤ کرتا تھا، ابھی آیا ہی تھا اور وہ سرکاری نلکے سے پانی لینے گیا تھا۔ میں نہ جانے کن خیالوں میں تھا کہ مجھے وہ آتی ہوئی دکھائی دی۔
”اس بات کا احساس میرے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں نے مجھے دلا دیا تھا۔ یقیناً وہ اور اس کے ساتھ آنے والا چھوٹا لڑکا وہی تھے۔ میں برگد کی چھاؤں تلے بیٹھا اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے اکیلا دیکھ کر وہ رک گئی اور پھر اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا نوٹ اس لڑکے کو دے کر میری طرف اشارہ کر کے بھیجا اور خود وہیں کھڑی رہی۔ لڑکا روپیہ لے کر میری طرف آیا اور میرے نزدیک روپیہ پھینک کر واپس مڑنے والا تھا کہ میں نے آواز دی۔“
”سنو بیٹے......!“
وہ رک کر میری طرف پلٹا۔
”یہ روپیہ کس لیے؟“ میں نے پوچھا۔
”میری باجی نے بھیجا ہے۔ آپ مانگنے والے ہو نا۔“ لڑکے نے حیرانی سے میری طرف دیکھ کر پوچھا اور واپس مڑنے لگا کہ میں نے پھر اس سے پوچھا۔
”بیٹے۔ میں تمہیں مانگنے والا لگتا ہوں؟ اور سنو، کیا نام ہے تمہارا؟“
وہ دوبارہ ٹھہر گیا اور بولا۔ ”پتا نہیں۔ میرا نام جبار ہے!“
”پڑھتے ہو؟“ میں نے دوسرا سوال کیا۔
”ہوں۔ چوتھی کلاس میں پڑھتا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔
”اور وہ تمہاری باجی، اس کا کیا نام ہے؟ وہ بھی پڑھتی ہے کیا؟“ میں نے تیزی سے پوچھا۔
”شبینہ باجی...... وہ پڑھنے سے اٹھ گئی ہے؟ ابا کہتے ہیں بیٹیاں زیادہ نہیں پڑھا کرتیں۔“ جبار نے بتایا۔
”اس کے منہ سے اس کا نام سن کر میرے دل میں جیسے گھنٹیاں سی بجنے لگی تھیں۔ میں نے اپنے دل میں سر اٹھاتی بے شمار خواہشوں کو سمیٹتے ہوئے کہا۔
”چلو میں تمہاری باجی کو بتا آؤں کہ میں بھیک مانگنے والا نہیں ہوں۔“ میں نے اس کا پھینکا ہوا روپیہ اٹھایا اور اس کے ساتھ ادھر چل دیا۔
”وہ تقریباً میری ہم عمر ہی تھی۔ اس قدر خوب صورت

بھی نہ تھی کہ اس کی تعریف میں زمین و آسمان ملائے جاسکیں۔ بس جوانی کی چڑھتی دھوپ نے اس کے جسم کے سارے زاویے کچھ اس طرح خوب صورت کردیے تھے کہ دیکھنے والے کے دل میں خوامخواہ گدگدی سی ہونے لگتی......

میں اس کے قریب پہنچا تو وہ تھوڑا سا مسکرائی۔

''میں آپ کو بھیک مانگنے والا لگتا ہوں؟'' میں نے نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''ان کے ماتھے پر بھی نہیں لکھا ہوتا۔ ان میں اور تم میں اتنا ہی فرق ہے۔ وہ فٹ پاتھوں اور سڑکوں پر بیٹھتے ہیں اور تم درخت کے نیچے دھرنا دے کر بیٹھے ہو۔ وہ آتے جاتے لوگوں کا راستہ روک کر مانگتے ہیں مگر تم آتے جاتے لوگوں کو تنگ نہیں کرتے۔'' اس نے شریر آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہوں۔ کہاں رہتی ہو؟'' میں نے بات بدل کر کہا۔

''پیچھے پڑنے کا ارادہ ہے۔'' وہ ایک بار پھر چہکی۔

''ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ سوچا تھا باتیں کرنے والی گڑیا کا کوئی تو ٹھکانا ہوگا مگر لگا تم بھی میری طرح ہی ہو!'' میں نے بھی باتوں کو گھمانے کا فن آزمانے کا فیصلہ کرلیا۔

''ادھر غلہ منڈی کی اس طرف۔'' وہ سنجیدہ ہوکر بولی۔

''کیا کرتی ہو؟'' میں نے ایک لایعنی سا سوال کیا۔

''گھر میں رہتی ہوں۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''بڑے دن بعد آئی ہو۔ ادھر سے روزانہ نہیں گزرتیں؟'' میں نے پوچھا تو وہ میرے سوال پر ہنس دی۔

''جب شہر کام ہوتا ہے تو آتی ہوں، روز روز کام تھوڑا ہوتا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اب آیا کروگی؟'' میں نے دوبارہ پوچھا۔

''کس لیے؟'' اس نے استفسار کیا۔

''میرے لیے۔'' میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

''چلو بھی باجی۔'' جبار نے مداخلت کی تو مجھے بہت ناگوار لگا۔

''سوچیں گے۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔

''جوگیا! تمہاری داستان خاصی رنگین لگتی ہے مگر مجھے جلدی ہے۔ کیوں نہ ایسا کریں کہ آج ہم کہانی یہیں ختم کردیں۔ اگلی ملاقات پر دوبارہ یہیں سے شروع کریں؟'' میں نے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''پتا نہیں پتر! دوبارہ ملن ہوتا ہے یا نہیں۔ کون جانے!'' اس نے مایوسی سے کہا۔

میں جانتا تھا کہ اس کا ارادہ مجھے مزید بٹھائے رکھنے کا تھا مگر میں بیٹھے بیٹھے اکتا گیا تھا۔ اگرچہ تی میرا ابھی چاہتا تھا کہ میں اس کی پوری کہانی سن لوں لیکن نہ جانے کیوں میں نے اسے اگلی ملاقات کے لیے کہا تو وہ بولا۔

''پتر! آج برسوں بعد دل پر رکھا ہوا کچھ بوجھ ہلکا ہوا تھا۔ آج یوں لگا جیسے مدتوں بعد میری باتیں سننے کے لیے کسی نے وقت نکالا ہے۔''

میں اٹھنے لگا تو میں نے دوبارہ پوچھا۔

''جوگیا! ابھی اٹھنے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟''

''یہ تو نے مجھے جوگی بنا دیا ہے۔ کہا ہے ناکہ میرا نام علم دین ہے۔ میں ابھی اس کمینے کو مناؤں گا۔ تم جاؤ۔ اگر وقت مل جایا کرے تو آجایا کرو۔'' اس نے بڑی حسرت سے کہا۔

''کیوں نہیں جوگیا۔'' میں نے کہا تو وہ ہنس دیا۔

میری اور اس کی ملاقات میں تقریباً دو ڈیڑھ ہفتے کا وقت گزر گیا۔ اس دوران نہ تو مجھے فرصت ملی اور نہ ہی سرِراہ اس سے ملاقات ہو پائی۔

اس دوران دو تین چھٹیاں اتفاقاً ایک ساتھ مل گئیں۔ میری بیوی، بچوں کو ساتھ لے کر والدین کے پاس چلی گئی اور مجھے فرصت مل گئی۔ اس روز میں سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اس سے ملنے وہاں گیا تھا اور وہ مجھے وہیں مل بھی گیا۔ میں حسبِ سابق آہستگی سے چلتا ہوا اس کے قریب جا پہنچا۔

''جوگیا......!'' میں نے آہستگی سے پکارا۔

''ارے پتر! آگئے ہو۔ آؤ آؤ، دیکھ لو۔ میں نے اپنے دوست کو منا لیا ہے۔''

اس نے یہ بات کہی تھی کہ گرم لو کا تھپیڑا آیا تو برگد کے سارے پتے کھڑکھڑا اٹھے۔

''دیکھو، اب کمینہ تالیاں بجا رہا ہے۔'' اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

میں ایک بار پھر اس کے قریب آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ ''ہاں تو جوگیا......''

''مزے لیتے ہو نا میرا نام بگاڑ کے۔ چلو اگر تمہیں اچھا لگتا ہے تو یونہی سہی!'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں تو پھر کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہوں......'' اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا اور ایک ماہر داستان گو کی طرح سلسلہ وہیں سے جوڑا۔ ''شینہ اور میری ملاقاتیں آہستہ آہستہ ہونے لگی تھیں لیکن میرا یہاں سے رابطہ بھی قائم تھا۔ میں روزانہ شام ہوتے ہی یہاں آکر داستان سناتا اور اب تو داستان سننے والے بڑے بوڑھوں

کی ایک بڑی تعداد یہاں جمع ہونے لگی تھی۔ تنہائی کے بوجھ تلے دبے ہوئے اور اپنوں کے دیے دکھوں سے نجات حاصل کرنے والوں کی تعداد بڑھتی چلی جارہی تھی۔ اب تو ان میں سے ایک اپنے گھر سے مٹی کے تیل کا گیس لیمپ بھی اٹھالایا تھا جس کی روشنی میں ہم یہاں اب خاصی رات تک بیٹھے رہتے تھے۔

''شبینہ کبھی یہاں سے گزرتے ہوئے مجھے مل جاتی یا پھر میں اس کے گھر کے اردگرد اسے ملنے چلا جاتا۔ ہم دونوں کے درمیان رابطہ جبار ہوتا تھا۔ ایک انجانا جذبہ تھا جو دھیرے دھیرے میری اور شبینہ کی سوچوں کے اردگرد اپنا حصار بناتا چلا جارہا تھا۔ لوگ شاید اسی کو محبت کہتے ہیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس کا نام سنتے ہی میری سوچوں میں ایک انجانا سا خوف اور دل کی دھڑکنوں میں بکھراؤ سا کیوں پیدا ہونے لگا تھا۔ میں اگر اسے کسی دن نہ دیکھتا تب میرے اردگرد نامعلوم سی اداسی اپنا گھیرا تنگ کرنے لگتی تھی۔ وقت کو تو جیسے پر لگ چکے تھے۔

''ان ہی دنوں مجھے گاؤں سے پیغام ملا کہ گھر والوں نے مجھے جلدی بلایا ہے۔ بس معاملہ اسی روز سے بگڑ گیا۔ میں گھر گیا تو مجھے پتا چلا کہ میری شادی کے معاملات طے کیے جارہے ہیں۔ میں نے انکار کیا تو میری والدہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے انہیں بہت سمجھایا مگر والدہ کی التجائیں اور زیادہ ہوتی چلی گئیں۔ اور پھر میرے والد نے مجھے الگ ڈرانا دھمکانا شروع کردیا۔ کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کیا ہورہا ہے۔ انہوں نے کچھ اس طور مجھے گھیرا کہ میں جب گاؤں سے واپس آیا تو میری شادی ہوچکی تھی۔

''میں اس رات اسی برگد کے نیچے پہنچا تو یہاں کی محفلیں بھی اجڑ چکی تھیں۔ وہ سارے اِدھر اُدھر بکھر چکے تھے۔ البتہ ان میں سے ایک ابھی تک یہاں آتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ سارے میرا بڑی دیر تک انتظار کرتے رہے۔ وہ روزانہ سرِشام یہاں آتے لیکن پھر میرے نہ ہونے پر آہستہ آہستہ مایوس ہوتے چلے گئے۔''

''ارے ہاں۔ دو ایک بار ایک بچہ تمہارا یہاں پوچھنے ضرور آیا تھا۔ بھلا سا نام تھا اس کا۔ شاید میں بھول گیا ہوں۔''

''اس نے مجھے بتایا۔ میں سمجھ گیا۔ وہ یقیناً جبار ہوگا۔ میرے دل کی دھڑکنیں ایک بار پھر سے بے ترتیب ہونے لگیں۔ میں اس سے اجازت لے کر شبینہ کے گھر کی طرف چلا گیا۔

گزارہ

فیملی ڈاکٹر ایک گھنٹے سے کمرے کے اندر مریض کے معائنے میں معروف تھا۔ بیوی بچے دوسرے کمرے میں بے چینی سے انتظار کررہے تھے کہ ڈاکٹر کیا خبر لے کر آتا ہے۔ آخر ڈاکٹر کمرے سے برآمد ہوا اور مریض کی بیوی کے پاس پہنچ کر بولا۔ ''میں اس وقت آپ کے شوہر کو جس حالت میں دیکھ کر آرہا ہوں مجھے وہ ٹھیک نہیں لگ رہے۔''

''مجھے تو وہ کبھی بھی ٹھیک نہیں لگے لیکن کیا کروں بچوں کی خاطر گزارہ کررہی ہوں۔'' بیوی نے غمزدہ لہجے میں جواب دیا۔

زندگی

زندگی اس جزیرے کے مانند ہے جہاں پر خوابوں اور عذابوں کے بہت سے درخت ہوتے ہیں۔ دھوپ لگے تو سایہ نہیں دیتے اور بھوک لگے تو پھل دور ہوتا ہے۔ زندگی نہ جانے کس کا انتظار کرتی ہے اور موت بن بلائے مہمان کی طرح اچانک آجاتی ہے۔ دولت کمانا مشکل ہے مگر اپنی محنت حاصل کرنا اس سے زیادہ مشکل ہے۔ پل دو پل کی زندگی میں اگر کسی کا انتظار شامل ہوجائے تو یہ پل بھی نہیں گزرتے۔

''کتنی دیر تک اِدھر اُدھر چکر لگانے کے بعد میں مایوس ہوکر وہاں سے مڑنے والا تھا جب مجھے جبار نظر آگیا۔''

''ارے جبار! تو......'' میں نے آگے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔

''کہاں تھے آپ۔ میں نے آپ کو بڑا تلاش کیا۔ باجی روز مجھے ادھر بھیجا کرتی تھی مگر آپ وہاں تھے ہی نہیں۔ کہیں گئے ہوئے تھے آپ؟'' اس نے ایک ہی سانس میں بہت سے سوال کرڈالے۔

''اب کہاں ہے شبینہ؟ اسے بتاؤ۔'' میں نے دھڑکتے دل سے کہا۔

''وہ ...... وہ تو اپنی سسرال چلی گئی ہیں۔ بھائی جان سے صلح ہوگئی ہے نا!''

''کون بھائی جان۔'' میں نے ڈوبتے دل سے پوچھا۔

"تو کیا آپ کو نہیں پتا...... ان کے خاوند۔ وہ سارے اکٹھے ہو کر آئے تھے۔ کتنے دن یہاں خاصی گرما گرمی رہی۔ باجی تو مان ہی نہیں رہی تھی مگر ان کے آگے نہ چل سکی۔ اس لیے مجبوراً پھر باجی کو ان کے ساتھ بھجوا دیا گیا۔"

"وہ مجھے نہ جانے کیا کیا بتا رہا تھا مگر میں تو کہیں اور پہنچا ہوا تھا۔"

"تو کیا وہ پہلے سے ہی شادی شدہ تھی؟" میرے دل کے کسی گوشے نے تصدیق چاہی۔

"ہاں تو اور کیا۔ آپ کو نہیں بتایا تھا باجی نے۔ وہ تو یہاں روٹھ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اب صلح ہو گئی ہے تو اسے جانا ہی تھا۔"

"میں وہاں سے بڑا مایوس ہو کر واپس آ گیا تھا۔ اس سے اگلی شام جب میں دوبارہ اس کے پاس آیا تو یہ کمینہ بچوں کی طرح تالیاں بجا کر مجھ پر ہنستا تھا۔ میں یہاں آنے لگا تو رفتہ رفتہ یہاں دوسرے بھی آنے لگے مگر نہ تو پھر یہاں ویسی چوپال جم سکی اور نہ ہی ویسی محفل۔ ان میں سے کبھی کوئی آ جاتا اور کبھی کوئی۔ میں نے بڑی کوشش کی مگر ناکام رہا۔"

"پھر میں نے بھی اپنی بیوی کو یہیں شہر میں اپنے اسی کوارٹر میں بلا لیا۔ ان ہی دنوں یہاں سے منڈی اٹھنے لگی۔ رفتہ رفتہ پتا چلا کہ اب یہاں الاٹمنٹ کے بعد دوبارہ پکی دکانیں بنیں گی۔ درمیان والا رستہ جو کہ اس منڈی سے شہر تک آنے کا مختصر راستہ تھا، بند کر دیا گیا۔ لوگوں نے الاٹ منٹس لے کر یہاں دکانیں بنانا شروع کر دیں مگر یہ درخت یہیں کا یہیں رہا۔ میرے بھی بچے ہو گئے۔ میں نے بھی ادھر ہی چھوٹا موٹا کام شروع کر دیا۔ اللہ نے برکت دی اور پھر میں ہمیشہ کے لیے یہیں کا ہو رہا۔"

"پھر نہ جانے کیا ہوا کہ ایک بار پھر سے افواہ پھیلی کہ یہاں منڈی کی جگہ کالونی بنے گی۔ اب تو میرے بچے بھی بڑے ہو چکے تھے۔ ان میں سے میں نے ایک کی شادی بھی کر ڈالی۔ جب مجھے اسی کالونی میں ایک مکان مل گیا۔ وقت بدل گیا۔ لوگوں کی سوچیں بدل گئیں۔ اب یاریاں جیب، عہدہ اور رتبہ دیکھ کر کی جانے لگی تھیں۔ لوگوں کے رویے تبدیل ہو گئے۔ وقت میں ایک تناؤ اور تیزی آ گئی لیکن نہیں بدلا تو یہ درخت نہیں بدلا اور یا پھر میری بوسیدہ اور پرانی باتیں۔ جنھیں اب کوئی سننے والا نہیں رہا۔"

"میں نے کئی بار اپنے پوتوں اور پوتیوں کو کہانی سنانے کا سوچا۔ کئی جاگتی راتوں کو ان کے من کہانی سنا کر بہلانے کی کوشش کی مگر انہوں نے ہر بار مجھے ٹوک دیا۔"

"میں نے ایک بار زبردستی اپنی پوتی کو کہانی سنانا چاہی۔ میں نے کہانی شروع کی۔"

"ایک تھی شہزادی! تو اس نے فوراً مجھ سے پوچھا۔

"ڈیانا کی طرح تھی۔ کبھی دادا مجھے ڈیانا بڑی اچھی لگتی تھی۔ کیا بالوں کا اسٹائل تھا اس کا!"

"اس کی یہ بات سن کر میں شرمسار سا ہو گیا اور پتا ہے، اگلے دن میں نے اپنے چھوٹے پوتے کو اپنے پاس لٹاتے ہوئے کہا۔

"گڈو۔ آؤ میں تمہیں کہانی سناؤں۔"

"وہ میرے قریب آ کر لیٹ گیا۔ میں نے ابھی کہانی شروع کی کہ ایک تھا بادشاہ...... اس نے فوراً اپنا ننھا سا ہاتھ میرے ہونٹوں پر رکھا اور کہنے لگا۔

"چھوڑو دادا۔ اس وقت کیبل پر میرا پسندیدہ ڈراما لگا ہے۔ ان کہانیوں سے زیادہ خوب صورت اور دلچسپ ہے۔ کہانی پھر سن لوں گا۔ اب مجھے جانے دو۔" یہ کہہ کر وہ میری گرفت سے نکل کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ جہاں ٹی وی پڑا ہے۔

"میں اسی روز سے دوبارہ یہاں آنے لگا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میرے وجود کو تنہائی کی دیمک جلد ہی چاٹ جائے گی۔

"یقین کرو۔ تنہائی کا یہ خوف مجھے اندر ہی اندر سے کھانے لگا تھا۔ میں ان لوگوں سے دور ہو جانا چاہتا تھا جو میری سننا نہیں چاہتے اور مجھے اب فالتو شے سمجھنے لگے تھے۔

"میں نے بچوں کے اس رویّے کی اپنے پتر بشیر اور اپنی بہو سے شکایت کی تو انہوں نے انہیں ڈانٹنے کے بجائے مجھے کہا۔

"ابا۔ یہ نئی نسل کے بچے ہیں اور سائنس کا دور ہے۔ بھلا وہ آپ کی دقیانوسی باتوں کو کہاں سمجھیں گے۔"

"اس لیے میں نے انہیں چھوڑ دیا ہے۔" اس نے اپنے اندر کے دکھوں کو کھولتے ہوئے بتایا۔

"یہ سب وقت کی بات ہے جو گیا۔ ایسا ہوتا ہی چلا آیا ہے۔" میں نے دوبارہ اس کی ڈھارس بندھائی۔

"پتر! یہ سمجھتے کیوں نہیں کہ بڑے بوڑھے اور مادی اشیا میں بہت فرق ہے۔ اشیا کونے میں پڑی بھی رہیں تو فرق نہیں پڑتا مگر بوڑھے...... ان کے نحیف جسموں میں اللہ نے دل نام کی ایک چیز رکھ دی ہے جو کسی عمر اور کسی وقت بھی اپنے ہونے کا اظہار گم نہیں ہونے دیتا۔ بوڑھوں کو کسی کونے کھدرے میں ڈال کر یہ لوگ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ان لوگوں کا بھی باتیں کرنے اور اپنا دکھ سکھ کہنے کو جی چاہتا ہے۔ ان کا بھی دل کرتا ہے کوئی ان کی سنے۔ کوئی ان سے

کے مگر اب وقت کس کے پاس ہے۔ کون ہے جو ہم ایسے بوڑھوں کو پسند کرے گا۔''

اس کی بوڑھی ویران آنکھوں میں اداسی کی گہری ٹوپ گھٹا ٹوٹ کر برسنے کو تیار تھی اور اس کی ابتدا بھی ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے بوڑھے کانپتے ہاتھ کی پوروں سے آنکھوں کے بھیگے کونوں کو صاف کیا اور کہنے لگا۔

''میں یہاں نہ آؤں تو کہاں جاؤں مگر اب یہ کمینہ بھی نخرے دکھانے لگا ہے۔ جب ناراض ہو جاتا ہے تو بڑے ترلے اور منتیں کراتا ہے۔''

اس روز میں وہاں سے اداسی کا ایک بہت بڑا بوجھ لے کر واپس آیا تھا۔ شاید میں بھی اب وہاں کبھی نہ جاتا کہ ایک روز میں نے دیکھا، برگد کے اس پرانے اور بوڑھے درخت کے نیچے اسی طرح کا ایک اور بوڑھا بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے جانا کہ شاید وہ بھی اسی طرح کا ہوگا۔ ویسے بھی اس روز میں کسی کام کے سلسلے میں جلدی گھر آ گیا تھا۔ اس لیے میں سیدھا چلا آیا۔

اس سے اگلے کئی دن تک میں اپنے کاموں میں الجھا رہا۔ ایک روز اچانک پھر مجھے وہی بوڑھا نظر آیا تو میں تصدیق کے لیے ادھر چلا گیا۔ وہ یقیناً کوئی اور ہی تھا۔ میرا شک یقین میں بدل گیا تھا۔ میں اس کے نزدیک پہنچا۔ مجھے دیکھ کر اس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔

''وہ یہاں علم دین آتا تھا۔ تمہیں پتا ہے، کہاں ہوگا؟''

''وہ...... لیکن آپ اسے کیسے جانتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''بڑی مدت سے وہ اسی برگد کے درخت کے نیچے بیٹھ کر کبھی داستانیں سنایا کرتا تھا۔ اس وقت سے میں اسے جانتا ہوں۔ بلکہ میں تو اس کا مدتوں سے بھیدی اور ساتھی رہا ہوں۔ ابھی پرسوں ترسوں اس سے ملاقات ہوئی تھی تو اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ یہاں ہر روز آتا ہے۔'' اس نے ٹھہر ٹھہر کر بتایا۔

''ہاں۔ آتا تو ہے۔ شاید آج نہ آیا ہو۔ اچھا تو آپ بھی......'' میں نے اس سے باتیں کرنا شروع کیں تو مجھے لگا جیسے وہ بھی جوگیا بابا کی طرح تنہائی کا ڈسا ہوا ہے۔

''پھر تو آپ ایک دوسرے سے اچھے خاصے واقف ہوں گے؟'' میں نے دوبارہ پوچھا۔

''ہاں ایک دوسرے کی رگ رگ سے واقف۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا آپ اس سے بھی واقف ہیں جو یہاں اس سے ملنے آیا کرتی تھی؟'' میں نے پانسا پھینکا۔

کون...... جہاں تک مجھے یقین ہے، میں نے تو یہاں کسی کو آتے کبھی نہیں دیکھا۔ میں بھی ان دنوں یہاں تقریباً ہر روز آیا کرتا تھا۔''

''شاید اس کا نام شبینہ تھا۔ مجھے خود بابا نے بتایا تھا جو کبھی کبھی اس سے یہاں ملنے کی خاطر آیا کرتی تھی اور بابا اس سے بڑی شدید محبت کرتا تھا۔'' میں نے وضاحت سے پوچھا۔

میری بات سن کر وہ بڑے زور سے ہنسا۔ ایسے کہ اس کی بوڑھی ہڈیاں بھی بجنے لگیں۔ اس کی ہنسی سے برگد کے درخت پر بیٹھے پرندے بھی اڑنے لگے۔ تب اس نے اپنی ہنسی لی کھانسی کو قابو کرتے ہوئے کہا۔

''ارے میرے بچے! تو بھی کس قدر سادہ اور بھولا ہے۔ نہیں جانتا۔ ارے اس نے یہاں برسوں ہم جیسے بوڑھوں کو داستانیں سنائی ہیں۔ بڑی ہی دلفریب اور خوب صورت داستانیں۔ اپنے سے بڑے لوگوں کو۔ ایسے کئی کردار تو اب وہ خود بھی بنا لیتا تھا۔ اس نے یقیناً کوئی اپنی گھڑی ہوئی کہانی تمہیں سنائی ہوگی۔ خود سے منسوب کر کے۔ بہت بڑا فنکار بن گیا تھا وہ۔ اس کا مطلب ہے کہ تم نے اس کی باتوں پر اعتبار کر لیا، یقین کر لیا اس کی کہانی پر۔ ارے وہ تو ساری عمر تر ستا رہا بلکہ اس بات کا اکثر تذکرہ بھی کیا مجھ سے کہ بھائی رشید! کیا ہم سے کوئی اس طرح ٹوٹ کر محبت نہیں کر سکتی جیسے داستان امیر حمزہ کے شہزادے سے لڑکیاں کرتی تھیں۔ بڑا ہوشیار ہو گیا ہے یہ داستان گو۔ آنے دے اسے۔ پوچھوں گا ضرور پوچھوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ پھر ہنسنے لگا۔

اس کی یہ باتیں سن کر میں ششدر رہ گیا تھا اور پھر میں خفت کے مارے وہاں سے بھاگ آیا تھا۔

کتنے دنوں کے بعد اس شام میرا گزر وہاں سے ہوا تو میں نے دیکھا۔ کارپوریشن کے کتنے ہی مزدور اس بوڑھے برگد کو گرانے کے لیے کوشاں ہیں اور علم دین جسے میں جوگیا بابا کہا کرتا تھا، ان سب سے نقاہت بھری آواز میں جھگڑ رہا تھا۔ وہ انہیں برگد کے درخت کو کاٹنے سے روک رہا تھا لیکن اس کے باوجود انہوں نے برگد کے اس درخت کو کاٹ ڈالا۔ اس پر بسیرا کرنے والے سارے پرندے درخت کے گرتے ہی ادھر اُدھر اڑنے اور چیخنے لگے تھے۔ بے گھر پرندے اور بے گھر بے چارے بوڑھے...... ایک جیسے ہی تو ہوتے ہیں۔

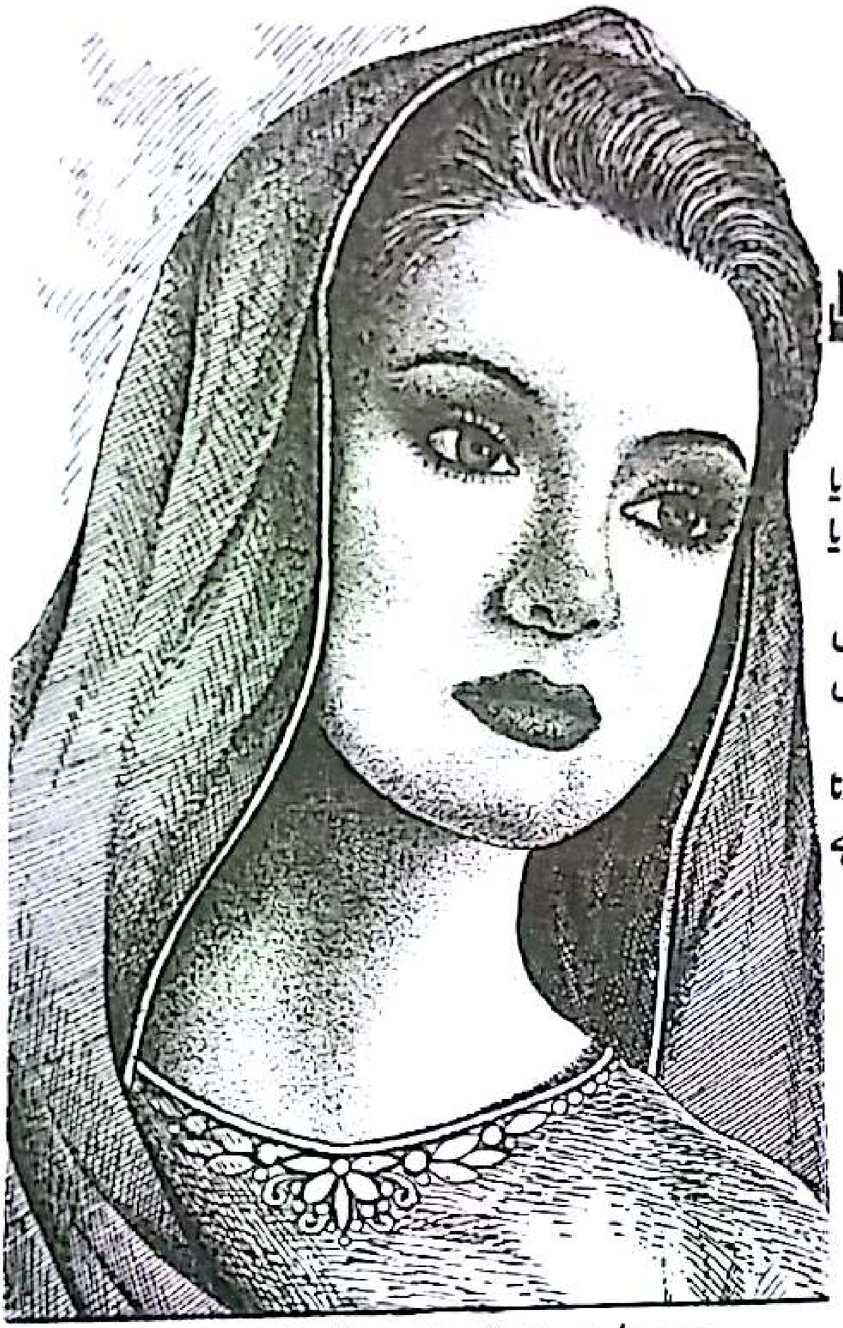

محفلِ شعر و سخن

❁ ایم سخاوت کرناہی ......آزاد کشمیر
مجھے اس سے کچھ گلہ نہیں سو میں نے جیون ہار دیا
اے کاش کبھی تم جان سکو جو عشق نے ہمیں آزار دیا

❁ اوشا راٹھی ......مٹھی، سندھ
جہاں عشق میں گو پیکرِ وفا ہوں میں
تیرہ نگاہ میں جب کچھ نہیں تو کیا ہوں میں

❁ شبانہ حسن ......لاہور
اچھا بن کر کیا ملنا جو بُرا بنا تو کیا کھونا
دنیا کھیل تماشا ہے ہر شخص پہ تالی بجتی ہے

❁ زرین خان آفریدی ......حیدرآباد
الجھنیں میں نے کئی جھک کے بھی سلجھائی ہیں
لوگ سارے تو نہیں......قد کے برابر ہوتے

❁ محمد شفیق حسین ......نیو کراچی
میری خوبی پہ رہتے ہیں یہاں اہلِ زباں خاموش
میرے عیوب پہ چرچا ہو تو گونگے بھی بول پڑتے ہیں

❁ عرفان شاہ، عتیق الرحمٰن ......فیصل آباد
زمانے میں کون کرتا ہے وفا ایک سے ایک
دل کے دو حروف ہیں وہ بھی جدا ایک سے ایک

❁ ماہین فاطمہ ......حجرہ شاہ مقیم
دے دیا تپتی ہوئی دھوپ کے صحرا کا سفر
میں نے خوشبو کی رفاقت کا سفر مانگا تھا

❁ داؤد اشفاق ......حجرہ شاہ مقیم
ہے اُدھر شہرِ نگاراں تو اِدھر دشتِ جنوں
آج کس موڑ پر قسمت ہمیں لے آئی ہے

❁ ملائکہ حریم ......حجرہ شاہ مقیم
پلٹ سکوں نہ میں آگے ہی بڑھ سکوں جس پر
مجھے یہ کون سے رستے لگا گیا اک شخص

❁ عبدالجبار رومی انصاری ......قصور سٹی
گہرائی الگ لہروں کا پھیلاؤ الگ ہے
ساحل سے مگر موجوں کا ٹکراؤ الگ ہے
جو خود کو سمیٹے ہوئے بیٹھا ہے بظاہر
اس ٹوٹے ہوئے شخص کا بکھراؤ الگ ہے

❁ نعیم احمد ......بہاولپور
اپنا جلوہ تم دکھا دو سب کو تا معلوم ہو
ہم جو کہتے ہیں تمہیں رشکِ قمر سچ ہے کہ جھوٹ
کھینچتے ہیں آج اے دل ان کو ہم اپنی طرف
دیکھتے ہیں جذبِ الفت میں اثر سچ ہے کہ جھوٹ

❁ وزیر محمد خان ......بٹل ہزارہ
پوچھا تھا حال اس نے بڑی مدتوں کے بعد
کچھ پڑ گیا ہے آنکھ میں یہ کہہ کے رو پڑے

❁ شائلہ سلیمان......کورنگی، کراچی

کمی نہیں تھی کسی چیز کی مگر اکثر
اکیلے بیٹھ کے رویا ہوں زار زار بہت

❁ باسط ولید الرحمٰن ......تلہ گنگ، سکھر

میرے حجرے میں نہیں، اور کہیں پہ رکھ دو
آسماں لائے ہو، لے آؤ، زمیں پہ رکھ دو

❁ مظہر بلال......تلہ گنگ، سکھر

گھر کی وحشت سے لرزتا ہوں پر نہ جانے کیوں
شام ہوتی ہے تو گھر جانے کو جی چاہتا ہے

❁ محمد رشید سیال......سکھر

اس غیرتِ ناہید کی ہرتان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

❁ نوشتہ گلزار ......بھکر

ہم ایسے نہیں ہیں کہ جو آنکھ اپنی جھپک جائے
گو برق سی ہر دم تری شمشیر سے چمکے
یہ آگ نہیں وہ کہ بجھادے جسے پانی
عشق اور برے گریہ کی تاثیر سے چمکے

❁ جاوید اختر رانا......پاکپتن شریف

نہیں ہم کو شکایت اب کسی سے
بس اپنے آپ سے روٹھے ہوئے ہیں
بظاہر خوش ہیں لیکن سچ بتائیں
ہم اندر سے بہت ٹوٹے ہوئے ہیں

❁ ریاض بٹ ......حسن ابدال

کس کو اپنے پاس بٹھا کر اپنے درد سناتے ہم
ساری دنیا چھانی ہم نے اک نہ ایسا فرد ملا

❁ ثمینہ کمال......لاہور

بن تیرے عجب حال مری جان ہے میرا
بیٹھا ہوں کہیں اور کہیں دھیان ہے میرا
حالِ دل غمگین نہ کہا میں نے کسی سے
اے حضرتِ غم تم پہ یہ احسان ہے میرا

❁ اشفاق شاہین......لاہور

گر بتادیں گے بادشاہی کے
ہم فقیروں سے دوستی کرلو

❁ محمد صفدر معاویہ......خانیوال

دنیا نے مالِ غنیمت سمجھ لیا ہے مجھے
جس کے ہاتھ جتنا لگا اڑا لیا ہے مجھے

❁ ادریس احمد خان ......ناظم آباد، کراچی

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

❁ حکیم سید محمد رضا شاہ ......میانوالی

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
خاک ہوجائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

❁ حمزہ آریان......تلہ گنگ، سکھر

میرے گھر کی ساری روشنیاں تیرے ساتھ تھیں
دکھ کی راتیں سکھ کی گھڑیاں تیرے ساتھ تھیں

❁ عنبرین ناز...... جھنگ سٹی

اگر میں آؤں گا صدیوں کی عمر لاؤں گا
کہ تیرے پاس مجھے مختصر نہیں رہنا

❁ انعم کمال......حیدرآباد

جس کی طلب میں اس قدر آگے نکل گئے
دنیا، ارے یہ دنیا تو برباد ہووے گی

❁ میمونہ اصغر ......گلستان جوہر کراچی

اسے دیکھوں تو بس اس کو دیکھتا جاؤں
وہ حسنِ خاص بڑے کروفر میں رہتا ہے
تمہارے خواب مرے رتجگوں میں جاگتے ہیں
تمہارا چہرہ مری چشمِ تر میں رہتا ہے

❁ سائرہ نواب......پشاور

رات بھر سڑکوں پہ اب تاریکیاں چلتے پھرو
سوگئے سب لوگ دروازہ کھلا کوئی نہیں
ہم سفر سے لوٹ کر آئے تو یہ عقدہ کھلا
اپنی بستی میں ہمیں پہچانتا کوئی نہیں

❁ شاہین تبسم......ٹنڈوالہ یار

دیکھنا دشتِ نظر میں وہ بھی منظر آئے گا
شام کی دہلیز پر دن کا گداگر آئے گا
سونپ دو اک دوسرے کو اپنے چہروں کے نقوش
بے حسی کا دور چل نکلا ہے گھر گھر آئے گا

❁ اسلم احمد......سکھر

دل میں ہیں سو طرح کے ڈر دیکھیے ہوتا ہے کیا
لے کے واں مجھ کو مری تقدیر پھر پہنچی تو ہے

❁ ممنون حسین ......چنیوٹ

شب فرقت میں جی لگتا نہ تھا اپنا کہانی میں
پڑے چپکے سر بستر سنا کرتے تو ہم بھی تھے

❁ شاہد علی ...... فیصل آباد
گلی سے یار کی جائیں کہاں ہم اے واعظ
کہے ہے تو جسے خلدِ بریں یہی تو ہے

❁ خیام خان ...... پشاور
جی لگے کیونکر مرا تجھ بن کہ نظروں میں مری
گھر ہے ویرانہ سا بھی اور شہر اک جنگل سا ہے

❁ فیاض احمد ...... اوکاڑہ
جہاں سنسان اب جنگل ہے اور ہے شہر خاموشاں
کبھی کیا کیا تھے ہنگامے یہاں اور شور شریاں تھے

❁ شیزا کاشان ...... کراچی
لہو میں شوق کا اک رقص تھا جو جاری تھا
پر ان کے سامنے لب بستہ ہم رہے یونہی

❁ ناہید یوسف ...... اسلام آباد
کیسے سنبھال رکھی ہے تو نے یہ کائنات
ہم سے تو ایک دل بھی سنبھالا نہ جاسکا

❁ صبا سحر ...... کراچی
سر اٹھاتی ہے خواہش تعمیر
جب بھی گرتے مکاں کو دیکھتا ہوں

❁ اسد خان ...... مانسہرہ
نا امیدی ہے دیدنی اس کی
جس کو اپنا بھی انتظار نہ ہو

❁ مہتاب احمد ...... حیدر آباد
اک دوسرے کے کتنے مزاج آشنا تھے ہم
اور پھر بھی اختلاف کی راہیں نکل پڑیں

❁ امتیاز احمد ...... پھالیہ
نکالا تو نے ہم کو تو گئے ہم تیرے کوچے سے
وگرنہ جیتے جی کب جاتے مرجاتے تو ہم جاتے

❁ محمد راحیل ...... وہاڑی
تری اس بے وفائی پر فدا ہوتی ہے جان اپنی
خدا جانے اگر تجھ میں وفا ہوتی تو کیا ہوتا

❁ خالد خان ...... ٹوبہ ٹیک سنگھ
دوست اچھے ہو تو پورے دوستی کے ہو رہو
یا کسی کو کر رکھو تم یا کسی کے ہو رہو

❁ شاہدہ جنید ...... کراچی
کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

❁ فرحانہ عاصم ...... سکھر
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے اس کا دشمن آسماں کیوں ہو

❁ جنید ملک ...... کراچی
از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

❁ اسد علی ...... ملتان
صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے

❁ ذاکر خان ...... لاڑکانہ
مرے دل میں ہے غالب شوق وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

❁ اویس احمد ...... حیدر آباد
ہے بزمِ بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے
تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

❁ ایشا طارق ...... ڈیرہ اسماعیل خان
غم دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

❁ وجاہت علی ...... بھکر
چلو کہ کوچۂ قاتل سے ہم ہی ہو آئیں
کہ نخلِ دار پہ کب سے ثمر نہیں آیا!

❁ ثانیہ خورشید ...... منڈی بہاؤالدین
دلوں میں اور ستاروں میں اچانک جاگ اٹھتی ہے
عجب ہلچل، عجب جھل مل چراغِ شام سے پہلے

کوپن
برائے شمارہ
جنوری
2018

محفلِ شعر و سخن

نام : --

پتا : --

دکان کی مالکن نے کاؤنٹر سے نظریں اٹھا کر دیکھا اور اپنی جگہ پر ساکت ہوگئی۔ دو افراد سیاہ کوٹ پہنے اور چہرے پر ماسک لگائے اسٹور میں داخل ہو رہے تھے۔ ان کے کندھوں پر بڑے بڑے بیگ لٹکے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے تھیلوں سے شاٹ گنیں نکالیں اور ان کا رخ اس کی طرف کردیا۔

"کیش رجسٹر کھولو اور ساری رقم میرے حوالے کردو۔" ان میں سے ایک نے کہا۔ "جلدی کرو۔ ورنہ میں تمہاری کھوپڑی اڑادوں گا۔"

اس نے کانپتے ہوئے دراز کھولی۔ ہر روز صبح وہ بینک سے چھوٹے نوٹ اور سکے لے کر آتی تھی تاکہ نقد خریداری کرنے والوں کو بقیہ رقم واپس کرسکے۔ ویسے تو آج کل زیادہ تر لوگ کریڈٹ کارڈ ہی استعمال کرتے تھے۔ اس وقت دراز میں صرف دو سو ساٹھ ڈالر ہی تھے۔

تیزی سے گزرتے حالات کی ڈوری تھامے ایک حسینہ کی ذہانت

جس طرح بعض اوقات بغیر منزل کے سفر کرنا ضروری ہو جاتا ہے اسی طرح بغیر اختتام کے کسی موڑ پر کہانی کو روک دینا لازم ہوتا ہے کیونکہ... نئے موڑ کے بغیر اس کا مکمل ہونا ممکن نہیں ہوتا... اس کی زندگی میں بھی ایک ایسا ہی موڑ آنے والا تھا جس کے بارے میں خود اسے بھی ادراک نہیں تھا۔

نیا موڑ

فخر عباس

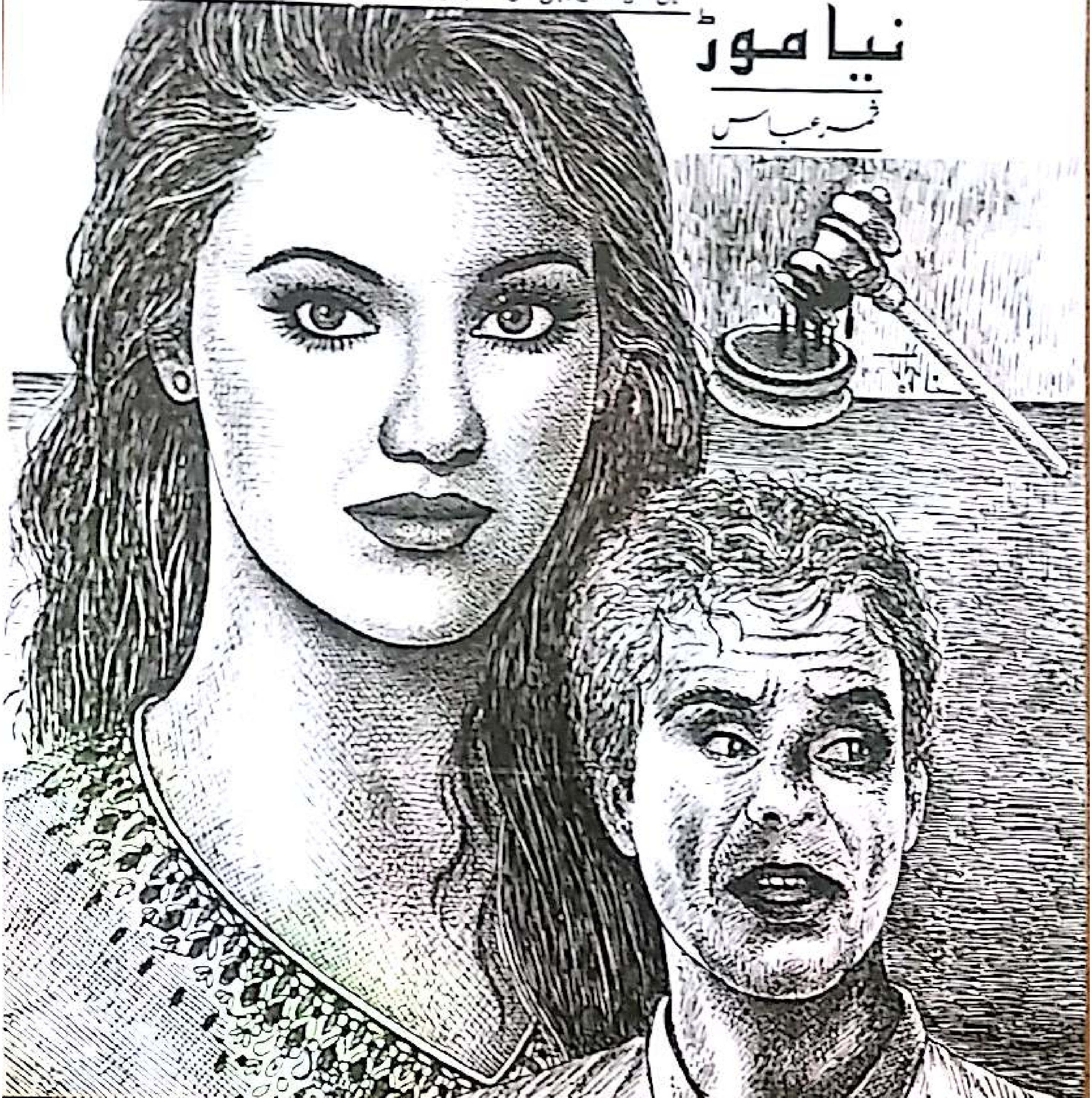

''بس؟'' پہلے نقاب پوش نے کہا۔
وہ بری طرح خوفزدہ تھی۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں اتنا ہی کہا۔ ''پلیز مجھے گولی مت مارو، میرے پاس بس یہی رقم ہے۔''
''ہم کچھ ملبوسات لے لیتے ہیں۔'' پہلے نقاب پوش نے اپنے ساتھی سے کہا۔
دوسرا نقاب پوش کپڑوں کی الماری پر گیا اور اس نے الٹ پلٹ کر دو لباس نکالے ان میں سے ایک بغیر آستینوں والا سیاہ اور دوسرا سلک کا تھا۔ دوسرے نقاب پوش نے وہ دونوں لباس اپنے بیگ میں رکھ لیے۔
پہلے نقاب پوش نے الٹے ہاتھ سے مالکن کے بال پکڑے اور اسے اسٹور کے عقبی حصے میں دھکے دیتا ہوا لے گیا جہاں ڈریسنگ روم تھا۔ دوسرا نقاب پوش بھی اس کے ہمراہ تھا۔
''فرش پر بیٹھ جاؤ۔'' پہلے نقاب پوش نے حکم دیا اور وہ بیٹھ گئی۔
''میں تمہیں دکھانا چاہتا ہوں کہ اگر تم نے ہمارے بارے میں پولیس کو بتایا تو ہم تمہارا کیا حشر کریں گے۔'' پہلے نقاب پوش نے کہا۔
انہوں نے اپنی گنوں کا رخ ڈریسنگ روم کی عقبی دیوار کی جانب کیا اور ہر ایک نے دو فائر کر کے دیوار میں سوراخ کر دیے۔
''تمہارے ساتھ بھی یہی ہوگا۔'' پہلے نقاب پوش نے کہا۔ ''یہاں بیٹھی رہو اور دس منٹ تک حرکت نہ کرنا ورنہ ہم واپس آ کر تمہارے سر میں سوراخ کر دیں گے۔''
وہ خوف سے اپنی جگہ پر بیٹھی کانپتی رہی۔ دس منٹ بعد وہ اٹھی۔ اسٹور کو تالا لگایا اور گھر جا کر لیٹ گئی۔ اس نے کسی کو نہیں بتایا کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آ گیا ہے۔ ایک ہفتے بعد وہ اس قابل ہوسکی کہ دوبارہ دکان کھول سکے۔ اس نے ڈریسنگ روم کی عقبی دیوار میں سوراخ والی جگہ پر سیاہ ویلویٹ کا پردہ لٹکا دیا اور دوبارہ ملبوسات فروخت کرنے لگی۔ اس نے اس واقعے کی اطلاع کسی کو نہیں دی۔ اسے یقین تھا کہ ایسی صورت میں وہ نقاب پوش اپنی دھمکی پر عمل کرتے ہوئے اس کے سر میں سوراخ کر دیں گے۔ جب گاہکوں نے پوچھا کہ وہ ایک ہفتہ کہاں رہی تو اس نے انہیں مطمئن کرنے کے لیے کہہ دیا کہ وہ چھٹیوں پر تھی۔ البتہ کھڑکی میں اطلاعی بورڈ لگانا بھول گئی۔
☆☆☆
میرا اندازہ ہے کہ اس عورت کی عمر پچیس کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ بہت خوب صورت تھی اور اس نے اپنی براؤن آنکھوں میں گہرا آئی لائنر لگایا ہوا تھا گو کہ مجھے ان باتوں کا تجربہ نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ اس کی مصنوعی پلکیں ضرورت سے زیادہ لمبی تھیں۔ اس نے اپنے سیاہ بالوں کو مضبوطی سے باندھ رکھا تھا لیکن میرے خیال میں یہ اسٹائل کافی عرصہ پہلے متروک ہو چکا تھا۔ بہر حال میں کوئی ہیئر ڈریسر نہیں ہوں جو اس بارے میں کوئی حتمی رائے دے سکوں۔ وہ دبلی پتلی لیکن جسمانی لحاظ سے پُرکشش تھی پھر اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تو یوں لگا جیسے کسی ٹرک کا پچھلا پائپ سڑک پر رگڑ کھا رہا ہے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ اتنی خوب صورت عورت کی آواز ایسی خوفناک ہو سکتی ہے۔
''مسٹر وان! تمہیں معلوم ہے کہ میں یہاں کیوں آئی ہوں؟'' اس نے کہا۔ ''میں اپنے سابق منگیتر کو امریکا کی بدترین جیل میں بھیجنا چاہتی ہوں۔''
ہم عمارت کے استقبالیہ حصے میں کھڑے ہوئے تھے جس میں اپنے دفتر کے لیے میں نے ایک کیبن کرائے پر لے رکھا تھا۔ میں اسی وقت ایک پرانے دوست کے ساتھ لنچ کر کے واپس آیا تھا جس کے اخبار میں کئی برسوں تک لکھتا رہا پھر ایڈیٹر سے تلخ کلامی ہوگئی اور میں نے گھونسا مار کر اس کی ناک توڑ دی۔ اس طرح میرے صحافیانہ کیریئر کا خاتمہ ہو گیا پھر میں نے نیا کام شروع کیا جسے خود ہی حساس معلوماتی ریسرچ کا نام دے ڈالا۔ مجھے اعتراف ہے کہ یہ غیر لائسنس یافتہ پرائیویٹ سراغ رساں کی دوسری شکل تھی۔
''اسے کانفرنس روم میں لے جاؤ۔'' ہماری استقبالیہ کلرک کرسٹینا نے حکم دیا۔
''میں اپنے بوائے فرینڈ سے بہت بے زار ہوں۔ اب اس کے منگیتر کی کہانی دوبارہ نہیں سننا چاہتی۔ تم تین بجے تک کانفرنس روم میں بیٹھ سکتے ہو۔''
''اس کا بھی کوئی بوائے فرینڈ ہے؟'' میں نے جاننا چاہا۔
''اسی سے پوچھو۔'' کرسٹینا بولی۔ اس نے میری مہمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ پہلے ہی مجھے پوری کہانی تین مرتبہ سنا چکی ہے۔''
ضروری نہیں کہ کرسٹینا ہر گاہک سے اچھا برتاؤ کرے۔ ویسے بھی میں اس کیبن کا صرف چار سو پچھتر ڈالر کرایہ ادا کرتا ہوں جو نیویارک جیسے شہر کے لحاظ سے نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس لیے میں اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھتا ہوں اور کرسٹینا جیسی بدمزاج استقبالیہ کلرک کو برداشت کرنا میری مجبوری ہے۔ چنانچہ میں اپنی مہمان کو لے کر کانفرنس روم کی طرف بڑھ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ

دوبارہ اس کی شکایت کرتی۔

آنے والی مہمان کا نام لینا مائیک تھا۔ اس نے کرسی پر بیٹھتے ہی اپنی بات دہرائی کہ وہ اپنے سابق منگیتر کو جیل بھجوانا چاہتی ہے۔

''ٹھیک ہے میں سمجھ گیا۔'' میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''تم غصے میں ہو۔ بہتر ہوگا کہ مجھے اس شخص کے بارے میں شروع سے بتاؤ۔'' میں نے اپنا پیڈ اور قلم اٹھاتے ہوئے کہا۔

''وہ بہت شاندار ہے۔'' لینا نے کہا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی میں اس کی بات سن کر حیران رہ گیا۔ چند لمحے قبل کہہ رہی تھی کہ وہ اس شخص کو جیل بھجوانا چاہتی ہے اور اب وہ نم آنکھوں سے اس کی تعریف کر رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ ضرور کوئی پیچیدہ مسئلہ ہے۔

''اوہ۔ یعنی وہ خوش شکل ہے۔'' میں نے کہا۔

''نہیں۔ وہ خوش شکل نہیں بلکہ دلکش ہے۔'' اس نے اصرار کیا۔ ''میں تمہیں دکھاتی ہوں۔'' اس نے پرس سے اسمارٹ فون نکالا اور اس کا اسکرین میرے سامنے کر دیا۔

''تمہیں یہ اشتہار یاد ہے؟'' اس کے اسکرین پر ہائی وے بل بورڈ کا ایک اسنیپ شاٹ نظر آیا جس میں چار خوش شکل مرد ایک قالین پر لیٹے ہوئے تھے انہوں نے سوتی بنیان اور نیکر پہنا ہوا تھا۔

''یہ ہے سب سے دائیں طرف۔'' اس نے زوم کے ذریعے تصویر کو بڑا کیا۔ وہ شخص واقعی خوش شکل تھا۔ سوائے اس کے کہ اس کے چہرے پر تین دن کی بڑھی ہوئی ڈاڑھی نظر آ رہی تھی۔ نیلی آنکھیں، سرخ بال اور کسرتی جسم تصویر میں نمایاں تھا۔

''ایک اور تصویر دیکھو۔ یہ پال اسٹوبٹ کا اشتہار ہے... تمہیں معلوم ہے کہ یہ میڈیسن ایونیو پر مردوں کا سب سے بڑا مہنگا اسٹور ہے۔''

اس اشتہار میں اس نے بہت عمدہ سرمئی سوٹ پہن رکھا تھا لیکن اس میں بھی تین دن کی بڑھی ہوئی ڈاڑھی تھی۔

''میں سمجھ گیا۔ یہ کوئی ماڈل ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں اور یہ کیلون کلین کا اشتہار ہے۔'' اس نے لمحہ بھر توقف کیا پھر غصے سے بولی۔ ''یہ عورت اس پر چڑھی جا رہی ہے۔''

وہ محض ایک تصویر تھی جو اشتہار کے لیے بنائی گئی تھی لیکن لینا ابھی تک اس سے حسد محسوس کر رہی تھی۔ اس شخص کا سینہ کھلا ہوا تھا اور عورت اس کے پیچھے کھڑی ہوئی تھی اس کے ہاتھ مرد کی کمر کے گرد تھے اور وہ سرگوشی کے انداز میں اس کے کان میں کچھ کہہ رہی تھی۔ اس اشتہار میں بھی وہ تین دن کی بڑھی ہوئی ڈاڑھی کے ساتھ نظر آ رہا تھا۔ میں نے بالآخر پوچھ ہی لیا۔

''یہ کیسے ممکن ہے کہ ہر اشتہار میں اس کی تین دن کی بڑھی ہوئی ڈاڑھی نظر آتی ہے؟''

''بڑی آسان سی بات ہے۔'' وہ بولی۔ ''وہ اسے ماڈلنگ کے لیے پیشگی اطلاع دیتے ہیں اور وہ شوٹنگ سے تین دن پہلے ڈاڑھی بڑھانا شروع کر دیتا ہے۔ یہ اس کا ٹریڈ مارک بن گیا ہے جب اس کے پاس کام نہیں ہوتا تو وہ روزانہ شیو بناتا ہے۔ میں تمہیں دکھاتی ہوں۔''

اس نے اسکرین پر ہاتھ پھیرا۔ اس میں وہ پیار بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی جبکہ مرد خلا میں گھور رہا تھا اور بظاہر اکتایا ہوا لگ رہا تھا اور اس نے کلین شیو کیا ہوا تھا۔

''جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تو فوراً ہی اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔'' اس نے کہا۔ ''وہ میرے گھر کے سامنے سڑک کے اس پار رہتا تھا۔ مکان کی مالکن نے تہ خانہ اسے کرائے پر دے رکھا تھا۔''

''تم کہاں رہتی ہو...؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''ایونیو آر، یہ بروکلین کے علاقے میں میرین پارک میں ہے لیکن اب وہ وہاں سے چلا گیا ہے۔''

''پھر کیا مسئلہ ہے؟''

''ہماری منگنی ہو گئی تھی۔''

''میرا خیال ہے کہ ایک مرتبہ پھر دہراتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''وہ تمہارے گھر کے سامنے سڑک کے پار رہتا تھا اور تمہیں اس سے پہلی نظر میں محبت ہو گئی تھی......''

''ہاں۔ وہ بہت شاندار ہے۔'' اس نے دہرایا۔ ''پھر وہ مجھے اپنے ساتھ باہر لے جانے لگا۔ شروع میں سب کچھ بہت رومانٹک لگا۔ اس نے مجھے تحفے دینا شروع کر دیے۔ جن میں ایک فر کا کوٹ، سونے کا بریسلیٹ اور ایسی کئی دوسری چیزیں شامل تھیں اور میں ان کی عادی ہوتی چلی گئی پھر ایک وقت ایسا آیا کہ میرے لیے اس کی بات ٹالنا ممکن نہ رہا۔''

''میں سمجھ گیا۔ تمہارا اشارہ اس جانب ہے جس کی طلب عام طور پر مردوں کو ہوتی ہے۔''

''نہیں۔ اگر وہ اس کے لیے کہتا تو میں انکار نہ کرتی لیکن وہ کچھ اور چاہتا تھا۔ اسے خطرات پسند تھے اور وہ مواقع سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے بھی اس پاگل پن کے لیے مجبور کیا۔ میری نظر میں وہ پاگل پن ہی تھا۔''

''مثلاً وہ تم سے کیا چاہتا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

"میں نہیں جانتی کہ تم پر بھروسا کرسکتی ہوں یا نہیں۔" اس نے کہا۔

"پھر یہاں کیوں آئی ہو اگر میں اس طرح گاہکوں سے بات کرنے بیٹھ جاؤں تو زیادہ دیر اس کاروبار میں نہیں رہ سکتا۔"

وہ کچھ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "دراصل میں یہ بتانا چاہ رہی ہوں کہ ہم نے مل کر ایک اسٹور میں ڈکیتی کی تھی۔"

میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔ "کہاں بروکلین میں؟ جہاں تم رہتی ہو۔ میرین پارک کے علاقے میں؟"

"بروکلین میں نہیں۔ وہ اسٹور مین ہٹن میں ہے۔ ہم دس بجے کے قریب اس ڈریس شاپ میں داخل ہوئے۔ ہمارے ہاتھوں میں شاٹ گنیں تھیں۔ دکان اسی وقت کھلی تھی اور مالکن کے علاوہ وہاں کوئی اور نہ تھا۔ اردگرد کا علاقہ بھی سنسان تھا۔ دراصل وہاں سفید پوش رہتے ہیں۔ مرد اپنے کام پر جاچکے تھے اور خواتین گھر کے کاموں میں مصروف تھیں۔ ہم نے وہاں سے تقریباً دو سو ڈالرز اور دو قیمتی ملبوسات اٹھالیے۔"

"تم دونوں گرفتار نہیں ہوئے؟"

"ہم نے اسٹور کے عقب میں واقع ڈریسنگ روم میں فائر کیے اور ٹمی نے اس عورت کو تنبیہ کی کہ وہ پولیس کو اطلاع نہ کرے۔"

"ٹمی تمہارا بوائے فرینڈ ہے؟"

اس نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ٹمی نے اس عورت کو خبردار کیا کہ اگر اس نے پولیس کو اطلاع دی تو ہم واپس آکر اس کی کھوپڑی میں سوراخ کردیں گے۔"

"اور اس نے تمہارے جانے کے بعد بھی پولیس کو فون نہیں کیا؟"

"میرا نہیں خیال کہ اس نے ایسا کیا ہوگا۔ میں نے باقاعدگی سے ٹی وی کی خبریں دیکھیں اور دو دن تک اخبارات بھی خریدتی رہی لیکن کہیں بھی اس ڈکیتی کا ذکر نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ واقعی خوفزدہ ہوگئی تھی۔"

"میں نے بھی اس بارے میں کچھ نہیں سنا۔" میں نے اسے بتایا۔ "لیکن وہ ایک کامیاب ماڈل ہے پھر اسے ڈریس شاپ میں ڈاکا ڈالنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ میرا مطلب ہے کہ اس کے پاس پیسوں کی کمی نہیں۔ تبھی تو اس نے تمہیں فر کا کوٹ اور سونے کا بریسلیٹ تحفے میں دیا۔"

"تم وہ انگوٹھی دیکھتے جو اس نے منگنی کے موقع پر میری انگلی میں پہنائی تھی۔ وہ انتہائی اعلیٰ درجے کی تھی۔"

"یہی میں بھی کہہ رہا ہوں۔ وہ بڑے بڑے اشتہاروں میں آچکا ہے۔ اس نے یقیناً اچھے پیسے کمائے ہوں گے۔"

"جب وہ کام کرتا ہے تو پیسے بھی اچھے ملتے ہیں لیکن ہمیشہ اس کی اتنی کمائی نہیں ہوتی جس کی توقع تم کسی سپر ماڈل سے کرسکتے ہو۔ کبھی کبھی وہ ایک دن میں پندرہ سو ڈالرز بھی کمالیتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ وہ ایک دن میں ہی اس کی سو تصویریں اتار لیتے ہیں جو سارا سال مختلف اشتہاروں میں کام آتی ہیں۔ اس لیے اسے سال کے بقیہ دنوں میں کام نہیں ملتا اور یہی وجہ ہے کہ اس نے بہت زیادہ پیسے نہیں بنائے جبکہ اس کے پاس کافی وقت ہوتا ہے۔"

"لیکن تم نے تو کہا تھا کہ اس نے تحفے میں تمہیں فر کا کوٹ، سونے کا بریسلیٹ اور ہیرے کی انگوٹھی دی تھی۔ یہ چیزیں کہاں سے آئیں؟"

"تم سچ جاننا چاہتے ہو؟ میرا خیال ہے کہ اس نے یہ چیزیں چرائی تھیں۔"

"اور تم یہ بات جانتی تھیں؟"

"پہلے میں جاننا نہیں چاہتی تھی لیکن جب اس کے قریب ہوئی تو مجھے یہ جاننے میں دیر نہیں لگی۔"

"میری مدد کرو۔" میں نے کہا۔ "تم نے جو کچھ بتایا ہے' میں اسے دہراتا ہوں۔ تم اس سے محبت کرتی تھیں۔"

"ہاں۔ یقیناً۔ اب بھی کرتی ہوں اس کے باوجود کہ مجھے اس سے نفرت ہوگئی ہے۔ میں ہر روز صبح اٹھ کر اس کے بارے میں سوچتی ہوں جو مجھ سے دور چلا گیا۔ بعض اوقات میں بڑی مشکل سے اپنے آنسو ضبط کرپاتی ہوں اور کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ ہتھوڑے سے اس کا چہرہ کچل دوں۔"

"یقیناً تم اس میں کشش محسوس کرتی... ہوگی۔"

"وہ انتہائی پُرکشش ہے۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں ایسا شاندار شخص نہیں دیکھا۔"

"یہ بات تم پہلے بھی بتاچکی ہو۔ تم اس کے پیار میں اتنا ڈوب گئیں کہ اس کی ہر بات ماننے لگیں اور اس کے ساتھ مل کر ڈریس شاپ میں مسلح ڈکیتی بھی کی؟"

"وہ مجھ سے سب کچھ کرواسکتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ زندگی بہت مختصر ہے۔ اس لیے ہمیں کوئی انوکھے کام کرنا چاہئیں۔ ہم ہمیشہ ایسے ہی پاگلوں والے کام کیا کرتے تھے ایک دفعہ ہم مین ہٹن میں ایک اونچی عمارت کے پاس سے گزر رہے تھے کہ چوکیدار کی نظر بچا کر لفٹ کے ذریعے سب سے اونچی منزل پر چلے گئے اور چھت پر رقص کرنے لگے۔ بعض اوقات مجھے ڈر بھی لگتا لیکن ٹمی چاہتا تھا کہ میں یہ کام کروں۔ لہٰذا میں اس کے ساتھ مل کر یہ سب کرتی۔ جیسا

کہ میں نے بتایا کہ اس سے محبت کرتی تھی اور جب تک اس کے ساتھ رہی، میں نے اپنے آپ کو محفوظ سمجھا۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟"

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا سوائے اس کے کہ وہ اس کے پیار میں اتنی پاگل ہو گئی تھی کہ جان کی پروا نہ کرتے ہوئے اس کے ہمراہ چھت کے کنارے ناچتی رہی یا اس کے ہمراہ اسٹور میں ڈکیتی کرنے چلی گئی۔

"اب تمہیں کس بات کا غصہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس نے مجھ سے شادی کرنے کے لیے کہا تھا۔"

"اور اس پر تم ناراض ہو گئیں؟"

اس نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے میرے دماغ کا کوئی اسکرو ڈھیلا ہو۔ "کیا تم مجھ سے مذاق کر رہے ہو۔ اس وقت میں اپنے آپ کو میرین پارک کی خوش قسمت ترین عورت سمجھ رہی تھی۔ پھر اس نے مجھے ایک ہیرے کی انگوٹھی دی۔ اس کی قیمت ایک لاکھ ڈالرز تھی لیکن وہ اتنی قیمتی انگوٹھی نہیں خرید سکتا تھا۔ میں نہیں سمجھتی کہ کبھی اس کے پاس ایک لاکھ ڈالرز جمع ہوئے ہوں گے ورنہ وہ ایک تہ خانے میں کرائے پر نہ رہ رہا ہوتا۔"

"تمہارا خیال ہے کہ اس نے وہ انگوٹھی چرائی تھی؟"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"

"ظاہر ہے تم خود اس کے ساتھ ایک ڈکیتی میں شریک رہی ہو۔ اس لیے تمہیں یہ فکر نہیں ہونی چاہیے کہ یہ انگوٹھی کہاں سے آئی؟ پھر تم اس پر کیوں ناراض ہو رہی ہو؟"

"میں بتاتی ہوں۔ منگنی کے بعد شادی کی تاریخ بھی طے ہو گئی اور ہم نے شادی کے کارڈ بھی تقسیم کر دیے۔ ہمارا جون میں شادی کرنے کا ارادہ تھا اور چرچ سے اس کا اعلان بھی ہو گیا۔ اس طرح سب لوگ اس شادی کے بارے میں جان گئے۔ اس کے بعد تحائف آنا شروع ہو گئے۔ تمہیں معلوم ہے کہ ان چیزوں کی قیمت کیا ہو گی؟"

مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ اس کا کوئی اندازہ نہیں۔

"میں نے انٹرنیٹ پر دیکھا تھا۔ فوڈ پروسیسر پانچ سو ڈالرز۔ ڈیکیوم کلینر ساڑھے چار سو ڈالرز اور دوسری کئی چیزوں کے علاوہ کچھ لوگوں نے نقد رقم بھی دی۔ جب میں نے حساب لگایا تو ان کی مالیت تقریباً پچیس ہزار ڈالرز بنتی تھی۔ منگنی کی انگوٹھی اور تحائف اس کے علاوہ تھے۔ جو سب چوری ہو گئے۔"

"انہیں کس نے چرایا؟"

"ٹمی۔" وہ بولی۔ "یہ حرکت ٹمی کی ہے۔ میں ایک دن کام سے واپس آ کر اس سے ملنے گئی۔ اس کے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہ خود اپنے سامان سمیت غائب تھا۔ کپڑے، جوتے، ٹوتھ برش، شیو کا سامان یہاں تک کنگھا بھی ساتھ لے گیا۔ تمام تحفے بھی غائب تھے۔ میں نے ایک رات پہلے اپنی انگوٹھی اتار کر بیڈ کی سائیڈ پر رکھی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ اس انگوٹھی کا انشورنس کرانا چاہتا ہے۔ لہٰذا ایجنٹ کو دکھانا ہو گی۔ وہ انگوٹھی غائب ہے۔ البتہ وہاں سے یہ خط ضرور ملا۔ تم بھی پڑھ لو۔"

اس خط میں لکھا تھا۔ "لینا! مجھے افسوس ہے کہ ہماری شادی کامیاب نہیں ہو گی۔ میری خواہش ہے کہ تم ایک اچھی زندگی گزارو۔ میں تمہیں ان سب چیزوں کی قیمت ادا کر دوں گا۔ ٹمی۔"

"وہ مجھے کیا واپس کرے گا۔" لینا اونچی آواز میں بولی۔ "میں اسے واپس کرنا چاہتی ہوں۔ پادری نے چرچ میں اس منگنی کا اعلان کیا تھا۔ سب لوگوں کی موجودگی میں..... خدا کے سامنے۔"

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے جس سے اس کا میک اپ خراب ہو رہا تھا۔ اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "مجھے اپنے دوستوں کا سامنا کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اگر منگنی ٹوٹ جائے تو تحائف واپس کرنا ہوتے ہیں لیکن میں کیسے وہ تحائف واپس کر سکتی ہوں، وہ تو سب چرا کر لے گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے۔ میں یہ سب چیزیں واپس کرنے کے لیے پچیس ہزار ڈالرز کہاں سے لاؤں گی۔ اگر میرے پاس وہ انگوٹھی ہی ہوتی تو اسے بیچ کر سب لوگوں کی چیزیں واپس کر دیتی۔ اب میں اپنے کسی دوست کا سامنا نہیں کر سکتی یہاں تک کہ سڑک پر لوگوں کو بھی منہ نہیں دکھا سکتی۔ پورا علاقہ یہ بات جانتا ہے میرے لیے تو یہ زندگی عذاب بن گئی ہے۔"

اگر میں اس چوڑی میز کے دوسری طرف نہ بیٹھا ہوتا تو ضرور اس کے کندھے پر تھپکی دیتا یا اسے گلے لگا کر کہتا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں اس کی شرمندگی اور غصے کو محسوس کر رہا تھا لیکن مجھے اپنا کاروبار بھی دیکھنا تھا۔ لہٰذا خالص پیشہ ورانہ انداز میں پوچھا۔ "مجھ سے ملنے کیوں آئی ہو؟"

"میں چاہتی ہوں کہ تم اسے تلاش کرو۔" اس نے کہا۔ "اور اس سے شادی کے تحائف لے کر مجھے واپس کرو تاکہ میں انہیں دوستوں اور رشتے داروں کو لوٹا سکوں۔ اسی طرح یہ شرمندگی دور ہو سکے گی۔ اس کے بعد وہ یہاں کہیں بھی رہ رہا ہو گا میں وہاں جا کر اس کے چہرے پر ہتھوڑے برساؤں گی۔ اسے تو جیل میں ہونا چاہیے۔"

"کیا تم نے پولیس میں رپورٹ درج کروائی ہے؟"

میں نے پوچھا۔

اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''پولیس والے نکمے ہیں۔ وہ کوئی کام نہیں کرتے۔ میں پہلے ہی ان کے پاس جا چکی ہوں۔ وہاں ایک احمقانہ قانون کے بارے میں معلوم ہوا کہ شادی اور منگنی کے تحائف فریقین کی مشترکہ ملکیت ہوتے ہیں اور ہم میں سے کوئی بھی دوسرے فریق کو بتائے بغیر اپنے مصرف میں لاسکتا ہے یا فروخت کرسکتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر کوئی ایک فریق تمام تحائف اپنے پاس رکھ لے تو یہ خلافِ قانون نہیں ہے۔ اس لیے میں اس کا چہرہ ہتھوڑے سے کچلنا چاہتی ہوں۔''

مجھے اس کی حالت پر افسوس ہونے لگا اور سوچنے لگا کہ اس سے اخراجات کے نام پر کچھ رقم اینٹھ لوں یا اسے سچ بتادوں۔ میں نے اسے دھوکے میں رکھنا مناسب نہ سمجھا اور کہا۔ ''میں نہیں سمجھتا کہ تمہیں اپنی چیزیں یا پیسے ملنے کا کوئی امکان ہے۔''

اس نے میری طرف اس طرح دیکھا جیسے اسے شدید صدمہ ہوا ہو یا مایوسی ہوئی ہو۔

''کیا تم مجھ سے مذاق کررہے ہو؟ تمہیں صرف وہ تحفے تلاش کرنا ہیں اور......!''

''دیکھو۔ میں بھی پولیس والوں کی طرح ہی انہیں تلاش کرتا اگر یہ چوری ہونے والے دلہا کے بجائے کسی اور نے کی ہوتی۔ میں نیویارک میں تمام کباڑیوں، پرانے سامان کی خرید وفروخت کرنے والوں، لانگ آئی لینڈ اور نیوجرسی کی خاک چھانتا۔ تمام متعلقہ ویب سائٹ دیکھتا ایک دوسری ویب سائٹ پر اس گمشدہ سامان کی فہرست بنا کر ڈال دیتا۔ نائن الیون کو فون کرتا اور زیورات کی دکانوں پر جا کر معلوم کرتا کہ حالیہ دنوں میں کسی نے ڈائمنڈ کی انگوٹھی بیچنے کی کوشش کی ہے۔ میں ففتھ اور سکستھ ایونیو کے درمیان سینتالیسویں اسٹریٹ پر جاتا۔ یہ جگہ ڈائمنڈ ڈسٹرکٹ کہلاتی ہے۔ وہاں بے شمار جیولرز ڈائمنڈ کا کاروبار کررہے ہیں۔ ان سے بات کرکے کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ میری فیس پندرہ سو ڈالرز فی گھنٹا ہے۔ سو گھنٹے کے بعد میری تلاش ختم ہوجاتی، چاہے تمہارا سامان ملتا یا نہیں لیکن تمہیں پندرہ ہزار ڈالرز دینا پڑتے۔''

''کیا کوئی ایسا طریقہ ہے کہ میں اس سامان خاص طور سے ڈائمنڈ کی انگوٹھی کی تلاش کے لیے پولیس والوں کی خدمات حاصل کرسکوں؟''

''مجھے نہیں معلوم کہ ڈائمنڈ کی انگوٹھی مشترکہ ملکیت تصور کی جاتی ہے یا نہیں لیکن وہ اس کے بارے میں اطلاع مشتہر کرسکتے ہیں۔ شاید وہ مل جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے ہی اینٹ ورپ بھیج دی گئی ہو۔''

''یہ کہاں پر ہے؟''

''یہ بلجیم کا ایک شہر ہے۔ وہاں ہیرے کے جوہریوں کی لاتعداد دکانیں ہیں۔ جہاں تک نقد رقم کا تعلق ہے تو اسے بھول جاؤ۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ خرچ ہوگئی ہوگی۔''

''وہ میرے ساتھ یہ کیسے کرسکتا ہے۔'' وہ سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔

''تم پہلی عورت نہیں ہو جس نے ایک چور بوائے فرینڈ سے دھوکا کھایا ہو۔''

''یعنی تم میری مدد نہیں کرسکتے؟''

''فرض کرو میں چھ ہفتوں کی دوڑ دھوپ کے بعد پرانے سامان کی دکانوں، جیولری اسٹور اور مختلف ویب سائٹ کی خاک چھان کر کچھ چیزیں تلاش کرلیتا ہوں تب بھی تم یہ کیسے ثابت کروگی کہ وہ تمہاری چیزیں ہیں۔ کیا تمہارے پاس فوڈ پروسیسر کا سیریل نمبر یا اس کی خریداری کی رسید ہے۔ اسی طرح تمہیں ہر چیز کا ثبوت دینا ہوگا کہ وہ تمہاری ہیں۔ ورنہ یہ چیزیں تمہیں بھی واپس نہیں مل سکیں گی۔ میرا مشورہ ہے کہ اپنے رشتے داروں اور دوستوں سے بات کرو۔ انہیں بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہاری بات سمجھ جائیں گے۔''

''ممکن ہے کہ تم ٹمی کو تلاش کرسکو۔'' لینا نے کہا۔ ''اگر تم نے اسے تلاش کرلیا تو کچھ چیزیں بھی مل جائیں گی اور میں اس کو سبق بھی سکھا سکوں گی۔''

''اس میں کچھ مسائل ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں شاید شادی کے تحائف کے مقابلے میں ٹمی کو زیادہ آسانی سے تلاش کرسکتا ہوں تب بھی میرا معاوضہ دس سے پندرہ ہزار ڈالرز کے درمیان ہوگا۔ یہ اس پر منحصر ہے کہ میں اسے کہاں تلاش کرتا ہوں۔ بروکلین، برازیل یا کسی اور جگہ۔ کیا تم اتنی رقم خرچ کرنے کے لیے تیار ہو؟''

مجھے یہ بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔ اب وہ بری طرح رو رہی تھی اور اس کے پورے جسم پر لرزہ طاری تھا۔ اس وقت میں نے اپنے آپ کو قصوروار محسوس کیا۔

''دیکھو روؤ مت۔ میں بتاتا ہوں کہ کیا کرنا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میرا ایک بہت اچھا دوست سراغ رساں ہے......''

''یہاں میرین پارک میں؟'' اس نے کہا۔

''نہیں۔ وہ مین ہٹن کے مشرقی حصے میں ہوتا ہے لیکن

اس کے پورے نیویارک میں تعلقات ہیں۔ وہ کئی سال نیویارک پولیس ڈیپارٹمنٹ میں رہ چکا ہے اور بہت سے لوگوں کو جانتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کو تلاش کرے جو مالِ مسروقہ کے خریدار کو جانتا ہو یا اسے اس بارے میں معلومات ہوں۔''

''اس میں کتنا خرچہ آئے گا؟'' اس نے پوچھا۔

''میں تم سے کچھ نہیں لوں گا اور اگر وہ تمہاری مدد کرتا ہے تو صرف اس لیے کہ وہ مدد کرنا چاہتا ہے۔''

اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ بات کر کے دیکھ لو۔''

چنانچہ میں نے اپنے پرانے دوست اور سراغ رساں بل موریسن کو فون کیا اور اسے پورا قصہ سنایا۔ اس نے بڑے غور سے پوری بات سنی پھر بولا۔ ''میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ٹمی نے ساری رقم کو کین یا جوئے میں اڑا دی یا پھر اس کی زندگی میں کوئی نئی عورت آگئی ہے اور وہ اس پر خرچ کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ کون جانتا ہے کہ وہ اس وقت کہاں ہوگا۔ وہ میکسیکو یا مونا کو میں ہو سکتا ہے۔''

''کیا میں یہ سمجھوں کہ تم ان چیزوں کے واپس ملنے کے امکانات کے بارے میں زیادہ پُرامید نہیں ہو...؟''

''بالکل بھی نہیں۔ اس سے کہو کہ وہ گھر جا کر اپنے زخم چاٹے اور اگلی بار کوئی اچھا سالڑکا تلاش کرے۔''

''دیکھو بل، وہ صرف سامان کے لیے پریشان نہیں ہے بلکہ وہ شرمندگی محسوس کر رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ جب وہ گھر سے باہر نکلتی ہے تو لوگوں کا سامنا نہیں کر پاتی۔ شاید تم اسے کچھ بتا سکو۔ اسے کوئی امید دلا سکو۔ کم از کم انگوٹھی ہی مل جائے۔''

''دوسرے لفظوں میں تم چاہتے ہو کہ میں اس سے جھوٹ بولوں۔'' موریسن نے کہا۔

''یہ جھوٹ نہیں ہوگا بلکہ تم اسے بتاؤ گے کہ اس کی چیزیں کسی پرانے سامان کی دکان سے مل سکتی ہیں یا کوئی چوری کا مال خریدنے والا پکڑا جائے۔ اس سے ان چیزوں کی تفصیل معلوم کر لو۔ اس کام میں زیادہ سے زیادہ بیس منٹ لگیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں دیکھوں گا کہ کیا کر سکتا ہوں۔ اس سے کہو کہ مجھے فون کرے۔''

میں نے ایسا ہی کیا اور اس کے غیر متوقع نتائج برآمد ہوئے۔

تین دن بعد مجھے موریسن کی وائس میل موصول ہوئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''رچی، مجھے فون کرو۔ تم پر ایک ڈرنک ادھار ہوگئی۔ ہو سکتا ہے کہ لنچ دینا پڑ جائے۔''

میں نے اسے اسی وقت فون کیا۔ ''یعنی تمہیں وہ شخص مل گیا۔'' میں نے بل سے کہا۔ ''مبارک ہو۔ کہاں سے تلاش کیا؟''

''وہ سیٹل میں ہے۔ ہم نے اسے کریڈٹ کارڈ استعمال کرتے ہوئے پکڑا۔ وہاں کی پولیس نے اسے تلاش کر کے گرفتار کر لیا۔ ڈسٹرکٹ اٹارنی اس سلسلے میں ضروری کارروائی کر رہا ہے۔''

''یہ تو بڑی خوشی کی خبر ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ یہ سن کر خوش ہو جائے گی۔''

''اتنا زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں۔'' موریسن نے کہا۔ ''اسے اصلاحی مرکز میں رہنا ہوگا جب تک وہ ضمانت نہ کروا لے یا اس کا مقدمہ شروع نہ ہو جائے۔''

''کیسا مقدمہ؟''

''اسی جرم میں جس کا سامنا ٹمی کو ہے۔ مسلح ڈکیتی۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ ان دونوں نے مل کر یہ جرم کیا تھا۔ وہ لیکزنگٹن ایونیو میں واقع ایک ڈریس شاپ میں گئے دونوں کے پاس پستولیں تھیں۔ انہوں نے اسلحے کے زور پر نقد رقم چھینی۔ دو قیمتی جوڑے اپنے بیگ میں ڈالے اور مالکن کو ہراساں کرنے کے لیے ڈریسنگ روم کی دیوار میں کئی فائر کیے۔''

''تمہیں یہ سب کس نے بتایا؟'' میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''تمہاری کلائنٹ نے۔ رضاکارانہ طور پر۔''

''یہ پاگل پن ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ تمہیں کیوں بتائے گی؟''

''انتقام میرے دوست، انتقام۔'' موریسن نے کہا۔

''وہ میرے پاس آئی اور ان چیزوں کی فہرست گنوانے لگی جو ٹمی نے چرائی تھیں۔ ساتھ ساتھ وہ ہر ایک کی قیمت بھی بتاتی جا رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ اس بات کی بہت کم امید ہے کہ ان میں سے کوئی چیز مل سکے کیونکہ یہ رقم دونوں کی مشترکہ ملکیت ہیں اگر ہمیں معلوم ہو جائے تب بھی اسے گرفتار نہیں کر سکتے۔''

''پھر وہ کیا بولی؟'' میں نے پوچھا۔

''اس نے کہا۔ فرض کرو کہ اس نے کوئی مسلح ڈکیتی کی ہو۔ تب تو تم اسے گرفتار کر سکتے ہو؟''

''ہاں۔ اس صورت میں یہ ممکن ہے۔''

میں خوفزدہ ہو گیا کیونکہ جانتا تھا کہ وہ کیا کہنے والا ہے۔

''تب اس نے کہا کہ وہ جانتی ہے۔ اپنے لیے بھی

مشکلات پیدا کررہی ہے لیکن اب وہ اپنے سابق منگیتر کو کسی دوسری عورت کی زندگی تباہ کرنے کی اجازت نہیں دے گی پھر اس نے پورا قصہ بتایا کہ کس طرح وہ اور ٹمی شاٹ گنوں سمیت اس اسٹور میں گئے اور ڈکیتی کے علاوہ دیوار میں فائر بھی کیے۔ میں نے پولیس ریکارڈ چیک کیا لیکن کسی نے اس واقعے کی رپورٹ درج نہیں کروائی تھی پھر میں خود اس اسٹور میں گیا اور وہاں دیوار میں سوراخ دیکھے۔ اسٹور کی مالکن نے ان پر سیاہ پردہ ڈال دیا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ بہت خوفزدہ تھی۔ اس لیے اس نے ڈکیتی کی رپورٹ درج نہیں کروائی کیونکہ ڈاکوؤں نے دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے ایسا کیا تو وہ اس کی کھوپڑی اڑادیں گے۔ جب میں نے اسے بتایا کہ لینا اس وقت پولیس کی تحویل میں ہے تو اس نے سکھ کا سانس لیا۔''

موریسن نے مزید بتایا کہ دو دن بعد سیئٹل پولیس نے ٹمی کو ایک مالدار مطلقہ عورت کے گھر سے گرفتار کرلیا۔ اس کے لیے یہ ضرور کہوں گا کہ وہ بہت تیزی سے کام کرتا ہے۔ دس روز قبل وہ میرین پارک کے ایک تہ خانے میں رہ رہا تھا اور جب پولیس نے اسے تلاش کیا تو وہ ایک شاندار بیڈروم میں لیٹا ہوا سمندر کا نظارہ کررہا تھا۔ جب وہ اسے مکان سے باہر لائے تو اس کے عیاشی کے دن ختم ہوگئے۔ اس نے ایک قیمتی شب خوابی کا لباس پہن رکھا تھا اور اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔

موریسن نے چند ماہ بعد مجھے مقدمے کی کارروائی سے آگاہ کیا۔ لینا اور ٹمی دونوں نے التجا کی کہ انہیں قصوروار نہ ٹھہرایا جائے۔ ٹمی کے وکیل نے اعتراض کیا کہ لینا جھوٹ بول رہی ہے۔ دکان کی مالکن دونوں میں سے کسی کو بھی شناخت نہ کرسکی کیونکہ انہوں نے اپنے چہروں پر نقاب چڑھایا ہوا تھا۔ اس نے پولیس کو اپنے بیان میں کہا کہ وہ ان دونوں کو مرد سمجھ رہی تھی۔

لینا نے بھی اپنے بیان میں یہی کہا کہ ٹمی نے بھی اسے یہی بتایا تھا کہ یہ واردات اس نے اپنے ایک مرد ساتھی کی مدد سے کی تھی اور اس نے موریسن کے سامنے صرف اس لیے اعتراف کیا کہ وہ اپنے سابق منگیتر سے انتقام لینا چاہ رہی تھی پھر اچانک ہی بازی اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ جب لینا سارا الزام ٹمی پر ڈال رہی تھی۔ وہ کمرائے عدالت میں کھڑے ہوکر چلایا۔ ''یہ جھوٹی ہے۔''

لینا نے نفرت سے اسے دیکھا پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور جج کے سامنے جاکر اس کا ہتھوڑا اٹھالیا۔ اس نے اتنی تیزی سے غیر متوقع طور پر حرکت کی کہ محافظ اسے بروقت نہ روک سکے، وہ دوڑتی ہوئی ٹمی کے پاس گئی اور اس کے چہرے پر ہتھوڑے سے دو مرتبہ وار کیا۔ محافظوں نے بڑی مشکل سے اسے قابو کیا اور اس سے ہتھوڑا چھین لیا۔ سماعت کے خاتمے پر اسے ہتھکڑیاں لگا کر واپس لے جایا گیا جبکہ ٹمی کو اسپتال جانا پڑگیا۔ اس کی ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور آنکھ کو بھی نقصان پہنچا تھا۔

کمرائے عدالت میں ہونے والے اس ڈرامے کے بعد جیوری نے متفقہ فیصلہ دیا کہ لینا اور ٹمی دونوں کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہونا چاہیے۔ اب ٹمی سنگ سنگ اور لینا بیڈفورڈ کے اصلاحی مرکز میں سزا کے دن پورے کررہی ہے۔

''لیکن میں نے تمہیں اس کہانی کا دلچسپ حصہ نہیں بتایا۔'' موریسن نے دو سال بعد مجھ سے کہا۔

''کیا اب بھی کچھ بتانا باقی ہے؟'' میں نے کہا۔

''اس نے اپنے سابق محبوب کا کھلی عدالت میں چہرہ بگاڑ دیا جس سے وہ کبھی شدید محبت کرتی تھی۔ کیا اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات کوئی ہوسکتی ہے؟''

''تم سنوگے تو خود حیران رہ جاؤ گے۔'' موریسن نے کہا۔ ''میرا ایک سراغ رساں دوست بیڈفورڈ ہلز میں تعینات ایک خاتون محافظ سے ڈیٹنگ کررہا ہے جہاں لینا کو رکھا گیا ہے۔ لگتا ہے کہ ان دونوں نے آپس میں خط کتابت شروع کردی ہے۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

''میں نے یہی سنا ہے۔ یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ پہل کس نے کی لیکن وہ دونوں ہرروز خط لکھ رہے ہیں۔''

''دفع ہوجاؤ۔'' میں چلایا۔ بارٹینڈر بھی چونک کر ہمیں دیکھنے لگا۔

''اور انہوں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ پیرول پر رہا ہونے کے بعد وہ دونوں شادی کرلیں گے۔''

میں بہ مشکل بیئر کا گھونٹ لے سکا۔ ''اور اس طرح یہ کہانی اپنے انجام تک پہنچے گی۔'' موریسن نے کہا۔ ''منگنی بذریعہ ڈاک۔''

میرا خیال ہے کہ موریسن غلط کہہ رہا ہے۔ اگر ان کا رویہ بہتر رہا تو شاید دس سال یا اس سے کچھ پہلے وہ دونوں جیل سے باہر آجائیں۔ تب یہ کہانی اپنے انجام کو پہنچے گی۔

اب میرے ذہن میں ایک ہی سوال ہے کہ کیا وہ دونوں شادی کرلیں گے یا ایک دوسرے کو جان سے ماردیں گے، محبت اور نفرت کا یہ امتزاج کیا رنگ لائے گا اس کا فیصلہ وقت آنے پر ہی ہوگا۔

تلاش

بابر نعیم

انسان کے دل میں اگر جستجو کا جذبہ نہ ہوتا تو شاید آج دنیا اس طرح تسخیر نہ ہوتی اور نہ ہی دریافت کا سلسلہ جاری رہتا۔ اس پر بھی نہ صرف دنیا بلکہ بالخصوص سمندر دیکھنے کا جنون کچھ اس طرح سوار تھا کہ وسائل نہ ہونے کے باوجود مسائل کے انبار کی جانب محوِ سفر ہوگیا۔

ایک مضطرب انسان کے عجیب سفر کی منفرد روداد

”مجھے آج لازمی سمندر دیکھنا ہے اور میں سمندر دیکھے بغیر گھر واپس نہیں آؤں گا۔“ اس نے اپنے آپ سے گویا عہد کیا اور صبح سویرے اپنے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ وہ کئی دنوں سے اس مہم کے لیے تیاری کر رہا تھا۔ اس نے پوری رات جاگ کر گزاری اور وہ تمام ضروری چیزیں اپنے بیگ میں ڈال لیں جن کی اسے اس طویل سفر میں ضرورت پڑ سکتی تھی۔ اس سے پہلے اس نے کبھی سمندر نہ دیکھا تھا۔ اس کی طبیعت کا ضدی پن، اس کے والدین کے لیے ہمیشہ پریشانی کا باعث بنتا آیا تھا اور آج یہی ضد اسے سب کچھ چھوڑ کر سمندر دیکھنے کے لیے گھر سے باہر لے جا رہی تھی۔

صبح پانچ بجے اس نے آہستگی سے اپنا بھاری بیگ کندھے پر اٹھایا اور خاموشی سے باہر نکل آیا۔ اس کے والدین ابھی سو رہے تھے اور وہ جانتا تھا کہ وہ دونوں سات بجے سے پہلے نہیں جاگیں گے۔ تب تک یقیناً وہ بہت دور جا چکا ہوگا اور اسے تلاش نہیں کیا جا سکے گا۔

اس کا گھر ایک چھوٹے سے ٹیلے پر واقع تھا۔ گھر

سے باہر نکل کر اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ سمندر کس سمت میں ہوسکتا ہے؟ اس نے سوچا۔ اسے یاد آیا کہ اس نے اپنی کتاب میں پڑھا تھا کہ سورج سمندر میں غروب ہوتا ہے، اس لیے اس نے مغرب کی سمت میں چلنے کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ اس لیے بھی بہتر تھا کہ سورج طلوع ہونے کے بعد، سورج کی طرف اس کی پشت رہتی اور وہ سورج کی براہِ راست تمازت سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ لڑکے نے فیصلہ کرنے کے انداز میں ایک گہرا سانس لیا اور مغرب کی سمت میں تیزی سے چلنا شروع کردیا۔

اس کی عمر صرف آٹھ سال تھی لیکن اس کی آنکھوں میں ایک نوجوان کا سا عزم صاف جھلکتا تھا۔ اس نے اپنی کتاب میں سمندر کی صرف تصویریں دیکھی تھیں۔ ان تصویروں کے مطابق، سمندر نیلے پانی کا ایسا بڑا ذخیرہ تھا جس کا دوسرا کنارہ نظر نہیں آتا تھا۔ اس کے شفاف پانی میں وہیل اور شارک جیسی دیوہیکل مچھلیاں گھومتی تھیں۔ اس نے سمندر میں تیرتے آکٹوپس اور رنگ برنگی ننھی مچھلیوں کے غول کی تصویریں بھی دیکھی تھیں۔ اس نے سمندر کی تہ میں موجود مونگے اور مرجان کی خوبصورت چٹانوں اور سمندر کے اوپر اڑتے سفید رنگ کے خوبصورت پرندوں کی تصویریں بھی دیکھی تھیں۔ ان تصویروں میں اس نے سمندر میں تیرتے ایسے بڑے بڑے بحری جہاز بھی دیکھے تھے جن پر ہزاروں افراد سوار ہوتے تھے۔ وہ سوچتا تھا کہ حدِ نگاہ تک پھیلا ہوا پانی ہی پانی، اٹھکیلیاں کرتی موجیں اور ساحل پر بکھری ہوئی خوبصورت سیپیاں، کیسا خوبصورت منظر پیش کرتی ہوں گی۔ وہ اکثر خواب دیکھتا تھا کہ وہ سمندر کے ساحل پر کھڑا ہے اور سمندر کی موجیں اس کے پاؤں میں گدگدی کررہی ہیں۔ وہ اکثر یہی سوچتا تھا کہ ساحل پر کھڑے ہوکر حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے سمندر کو دیکھنا کیسا دلکش احساس پیدا کرتا ہوگا۔ اس کا ننھا دماغ اتنے زیادہ پانی کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اپنے دماغ میں نیلے وسیع سمندر کا یہ تصور لیے، وہ ایک پختہ عزم کے ساتھ آگے بڑھتا چلا جارہا تھا۔

جب وہ قصبے کی حدود سے باہر نکلا تو اس وقت صبح کا ہلکا اجالا پھیل چکا تھا لیکن ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔ قصبے کے باہر اس نے ایک بوڑھے آدمی کو دیکھا۔ یہ بوڑھا آدمی ہمیشہ سڑک کے کنارے پھرتا تھا اور ہر وقت آسمان کو تکتا رہتا تھا۔ اس بوڑھے آدمی کو دیکھتے ہی لڑکے کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ ’’شاید یہ مجھے روکنے کی کوشش کرے۔‘‘ لڑکے نے دل میں سوچا اور اپنے قدموں کی رفتار کچھ تیز کرلی لیکن اس وقت بوڑھے نے بھی اسے دیکھ لیا۔

’’اے لڑکے! اتنی صبح کہاں جارہے ہو؟‘‘ بوڑھے نے سخت لہجے میں پوچھا۔

’’سمندر دیکھنے۔‘‘ لڑکے نے خشک لہجے میں جواب دیا لیکن اس دوران اس نے اپنی رفتار میں کمی نہ کی تھی۔

’’سمندر؟‘‘ بوڑھے آدمی نے اپنا پوپلا منہ کھولا اور ہنس پڑا۔ ’’اچھا خیال ہے۔‘‘ بوڑھے نے تیزی سے آگے بڑھ کر لڑکے کا بازو پکڑا اور اسے روک لیا۔ ’’تم سمندر دیکھنے جارہے ہو۔ ٹھیک ہے، لیکن اس کے لیے تمہیں پہلے اوپر جانا ہوگا۔‘‘ بوڑھے آدمی نے اپنی کپکپاتی انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ’’سمندر وہاں ہے، تمہارے سر کے عین اوپر۔‘‘

لڑکے نے اوپر دیکھا۔ صاف آسمان پر اس وقت ستارے غائب ہوچکے تھے اور سورج کی روشنی پھیل رہی تھی۔ لڑکے نے بوڑھے آدمی کی بے معنی بات کا جواب دینے کے بجائے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا اور دوڑ لگا دی۔ ’’اس بوڑھے کا دماغ واقعی خراب ہوگیا ہے۔ سمندر آسمان پر کیسے ہوسکتا ہے۔‘‘ اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

کچھ دور جاکر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ بوڑھا آدمی آسمان کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ ’یہ واقعی سٹھیا گیا ہے۔‘ لڑکے نے سوچا۔

تیز دوڑنے کی وجہ سے اس کا سانس پھول رہا تھا اور زبان خشک ہورہی تھی۔ اس نے رک کر بیگ میں سے پانی کی بوتل نکالی اور چند گھونٹ پانی پی لیا۔ اسے بھوک بھی محسوس ہورہی تھی لیکن وہ اپنا کھانا بچا کر رکھنا چاہتا تھا۔ ’نہ جانے سمندر کتنی دور ہو۔ مجھے اپنی غذا احتیاط کے ساتھ استعمال کرنا ہوگی۔‘ لڑکے نے سوچا۔

جلد ہی وہ ایک چھوٹی پہاڑی تک پہنچ گیا۔ پہاڑی کی چوٹی پر کھڑے ہوکر اس نے چاروں طرف دیکھا لیکن کسی بھی سمت میں سمندر کی موجودگی کی کوئی علامت نظر نہ آرہی تھی۔ اب سورج خاصا بلند ہوچکا تھا اور لڑکے کو شدید بھوک محسوس ہورہی تھی۔ اس نے پشت پر لدا بیگ اتارا اور تھوڑا سا کھانا کھالیا۔ پہاڑی سے اترنے کے بعد، اس کے سامنے ایک وسیع چٹیل میدان تھا اور اس کے دوسری طرف پہاڑیوں کا ایک اور سلسلہ نظر آرہا تھا۔ جب وہ وسیع چٹیل میدان عبور کرکے ان پہاڑیوں کے قریب پہنچا تو اس وقت سورج ڈھلنے لگا تھا۔ اب سورج اس کی آنکھوں کے سامنے آگیا تھا۔ ’یقیناً ان پہاڑیوں کے پیچھے سمندر ہوگا جس میں یہ سورج غروب ہوتا ہے۔‘ اس نے سوچا۔ اس خیال سے اس

کے جسم میں توانائی کی نئی لہر دوڑ گئی اور اس نے تیزی سے یہ پہاڑی سلسلہ عبور کرنا شروع کر دیا۔ جب وہ آخری پہاڑی کی چوٹی پر پہنچا تو یہ دیکھ کر اس کے ہونٹ سکڑ گئے کہ سامنے ایک اور وسیع و عریض چٹیل میدان موجود تھا۔ غروب ہوتے سورج کی سرخ روشنی میں اسے اس چٹیل میدان کے دوسرے کنارے پر پہاڑیوں کا ایک اور سلسلہ نظر آ رہا تھا۔

اس نے اپنا سفر جاری رکھا۔ وہ حیران تھا کہ اتنے طویل سفر کے دوران، اس کے راستے میں نہ کوئی قصبہ آیا تھا اور نہ ہی اسے کوئی آدمی نظر آیا تھا۔ حتیٰ کہ اسے کوئی جانور بھی نظر نہ آیا تھا۔ اس کی خوراک کا ذخیرہ تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ سمندر اتنی دور کیوں ہے؟ وہ چلتا رہا اور مسلسل چلتا رہا۔ اسے یاد بھی نہیں رہا کہ وہ راستے میں کتنی بار سویا تھا۔ سوتے جاگتے اس کے ننھے ذہن میں صرف سمندر کو دیکھنے کی خواہش تھی اور اسے کسی بھی دوسری چیز کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ اسے ایک بار بھی اپنے ماں باپ کا خیال نہ آیا تھا جو اس کے لیے پریشان ہو رہے ہوں گے۔ تھکان کی وجہ سے جب بھی اسے نیند آتی، وہ خواب میں سمندر میں تیرتی مچھلیاں دیکھتا، خود کو سمندر کی لہروں سے کھیلتا دیکھتا اور سمندر کے نیلگوں پانی میں خود کو تیرتا محسوس کرتا۔ اسے اپنے ارد گرد رنگ برنگی مچھلیاں گھومتی نظر آتیں جو اس کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتیں۔

پورے سفر کے دوران وہ یہی سوچتا رہا کہ جب وہ پہلی بار سمندر کو دیکھے گا تو اس وقت اس کی دلی کیفیت کیا ہوگی؟ وہ سوچتا کہ اس وقت سمندر کی حالت کیا ہوگی؟ کیا اس کی لہریں بپھری ہوئی ہوں گی یا سمندر کا پانی خاموش کھڑا ہوگا؟ کیا ساحل پر اسے اپنے جیسے کچھ اور لوگ بھی ملیں گے جو سمندر کو تلاش کرتے کرتے وہاں پہنچے ہوں گے اور سمندر کی خوبصورتی کو دیکھ کر ہمیشہ کے لیے وہیں رہنے پر مجبور ہو گئے ہوں گے...؟

اس کی ٹانگوں میں چلنے کی سکت ختم ہو رہی تھی لیکن وہ دانت بھینچے آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ اس کا پانی اور خوراک کا ذخیرہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ اس نے اپنا سامان کا تھیلا راستے میں ہی پھینک دیا تھا جس کی وجہ سے اس کے کاندھوں کا بوجھ کچھ کم ہو گیا تھا اور وہ مزید کچھ دیر چلنے کے قابل ہو گیا تھا۔ لیکن جلد ہی اس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔

یہ آدھی رات کا وقت تھا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان پر دو چاند چمک رہے تھے۔ ان کی روشنی میں وسیع و عریض چٹیل میدان کی سرخ مٹی حدِ نگاہ تک پھیلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اب اسے سانس لینے میں بھی دشواری محسوس ہو رہی تھی کیونکہ اس کے خلائی لباس میں موجود آکسیجن کا 200 گھنٹے کا ذخیرہ ختم ہو رہا تھا۔ چند لمحوں بعد جب لڑکے کی سانس رکی تو اس وقت اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ تھی اور اس کی نگاہ آسمان پر تھی۔ مریخ کے تاروں بھرے آسمان پر اسے ایک نیلے رنگ کا روشن ستارہ نظر آ رہا تھا۔ یہ زمین تھی جہاں سمندر موجود تھا لیکن وہ لڑکا کبھی وہاں نہیں پہنچ سکتا تھا کیونکہ مریخ سے کبھی کوئی انسان زمین پر واپس نہ گیا تھا۔

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

ثمر عباس 0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں
35802552-35386783-35804200
ای میل: jdpgroup@hotmail.com

قسط نمبر: 9

وقت

حسام بٹ

موت کے کنویں میں بھی وقت جس کا ہم رکاب تھا۔ ایک ایسے پرعزم بازی گر کی بازی گری ...... سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک دلربا طویل داستان

وقت بادشاہ اور کائنات کی ہر شے اس کی رعایا ہے لیکن ... اس کی نہ کوئی شکل اور نہ ہی وجود ہے۔ اس کے باوجود بھی وقت روپ بدل بدل کر سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ جس کی گردش انسان کی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ ایک ہی پل میں کسی کو بادشاہت سے نوازتا ہے اور کسی کو زمین کی خاک چاٹنے پر مجبور کردیتا ہے۔ کبھی دن اور رات میں ڈھل کر عمرِ رواں کا نام پاتا ہے اور موسم کی طرح گزر جاتا ہے۔ کبھی مہربان اور مخلص دوست بن جاتا ہے اور کبھی سفاک دشمن کا کردار ادا کرتا ہے۔ کبھی محبت بن کر ہونٹوں پر ہنسی بکھیرتا ہے اور کبھی درد کی صورت آنسو بن کر دلوں میں گھاؤ ڈال دیتا ہے۔ چونکہ یہ کسی کا غلام نہیں اسی لیے کسی کی پروا بھی نہیں کرتا لیکن ... اتنا سنگدل ہے جو اس کی پروا نہیں کرتا اسے ایسی مار مارتا ہے کہ پینے کو دو بوند پانی تک نہیں ملتا اور اتنا ایمان بھی ہے کہ جس پر اپنی مرضی سے مہربان ہوجائے اس کے لڑکھڑاتے قدموں سے بھی قدم ملا کر عروج عطا کرتا ہے مگر شرارت سے پلٹ کر ان کی طرف بھی دیکھتا ہے جنہیں وہ بیچ بھنور میں تنہا چھوڑ آتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی مہربان لمحے کا اسیر تھا... جسے یہ تک خبر نہ تھی کہ وہ کون ہے اور کس خاندان سے وابستہ ہے۔ جس کی اپنی کوئی شناخت نہ تھی' اس کے باوجود اس کی داستانِ حیات میں چاہنے والوں کی کمی نہ تھی۔ دو مختلف معاشروں اور تہذیبوں کا حسین امتزاج... ایک ایسا سلسلہ جو برسوں یاد رہے گا۔

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

اس کا نام اسد علی رکھا گیا جسے ”علی“ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ علی اپنے والدین کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو خود کو علی سلطان کی نگہداشت میں پایا۔ علی سلطان ٹیکساس (امریکا) کا ایک معتبر کاروباری شخص تھا۔ ایک حادثے نے علی سلطان کو وہیل چیئر تک محدود کر دیا تھا۔ اس کی اپنی بیوی ریٹا میگنڈالین سے علیحدگی ہو چکی تھی۔ وقتِ رخصت ریٹا اپنی اکلوتی بیٹی نفی کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ علی سلطان نے اپنی اور علی کی دیکھ ریکھ کے لیے ایک کل وقتی ملازمہ رکھی ہوئی تھی اور بچپن سے جوانی تک علی کی تعلیم و تربیت کے تمام تر اخراجات اٹھائے تھے۔ وہ علی کے ساتھ اپنی اولاد ایسا برتاؤ کرتا تھا جو اسے انکل کہتا تھا۔ اپنے والدین کے حوالے سے علی کے ذہن میں سیکڑوں سوالات اس کے ساتھ ہی پل بڑھ کر جوان ہوئے تھے۔ اس نے جب بھی اپنے محسن و مربی انکل سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو اس بردبار شخص نے نہایت ہی خوب صورتی سے یہ کہہ کر اسے ٹال دیا تھا..... ”میرے بچے! انتظار کرو۔ وقت آنے پر تمہیں سب بتادوں گا۔“ یہ تشنگی علی کے تجسس کو ہوا دیتی تھی لہٰذا نتیجے کے طور پر اس کا ذہن بے سمت سوچوں کے جالے میں الجھ کر رہ جاتا تھا مگر اس اضطرابی کیفیت میں بھی اس نے زندگی کے سفر کی روانی میں کوئی رکاوٹ نہیں آنے دی تھی۔ کالج میں قدم رکھتے ہی اس نے ٹیکساس کے علاقے ”ہنگلٹن میں واقع ”سرکل اے“ نامی ایک اسٹور پر جز وقتی ملازمت کر لی تھی۔ بیس سال کی عمر میں جب علی نے سائیکالوجی میں بیچلر ڈگری حاصل کر لی تو نت نئے ہنگامے اس کے تعاقب میں لگ گئے۔ ایک روز دو میکسیکن لڑکے ڈکیتی کی نیت سے ”سرکل اے“ میں گھس آئے۔ تمام کیش لوٹنے کے بعد وہ ڈکیت علی کے ساتھ موجود سیلز مین نظار کو شوٹ کر گئے۔ پولیس نے شک کی بنیاد پر علی کو بھی شاملِ تفتیش کر لیا۔ علی کا دامن صاف تھا۔ پولیس کے سوالات کے جواب میں اس نے انہیں مطمئن کر دیا۔ بعد ازاں ان دونوں میکسیکن ڈکیت کو فی نکس (ایری زونا) سے گرفتار کر لیا گیا۔ علی کا کالج لیک جیکسن (ٹیکساس) میں تھا جبکہ علی سلطان کی رہائش بے سٹی (ٹیکساس) میں تھی۔ علی ایک ہوٹل میں رہتا تھا اور لیک جیکسن کے اکثر ریسٹورنٹس میں اس کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ”ونی لاؤنج“ نامی ایک ریسٹورنٹ میں اس کا زیادہ دل لگتا تھا کیونکہ وہاں ایک ہسپانوی دوشیزہ شارو اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھی۔ اس دل نشیں مہ جبیں نے علی کے دردل پر دستک دی تو اس کی زندگی میں بہار اتر آئی۔ ایک رات ونی لاؤنج میں جب لیونارڈو نامی ایک میکسیکن غنڈے اور اس کے حواریوں نے شارو سے بدتمیزی کی کوشش کی تو علی بیچ میں کود پڑا۔ اس مار ماری کو ایک امیر و کبیر اسپینش لیڈی ڈیلفینا نے بڑی دلچسپی سے دیکھا اور اپنا وزیٹنگ کارڈ علی کو تھما کر یہ کہتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئی..... ”مجھے بہادر لوگ بہت پسند ہیں۔ زندگی میں جب بھی میری ضرورت محسوس کرو تو رابطہ کر لینا۔“ اس واقعے کے بعد گویا لیونارڈو سے علی کی دشمنی کا باقاعدہ آغاز ہو گیا تھا۔ آنے والے دنوں میں علی اور لیونارڈو کے غنڈوں میں گاہے بہ گاہے مڈ بھیڑ ہوتی رہی۔ لیونارڈو نے اپنی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لیے شارو کو ٹارگٹ کرنے کا منصوبہ بنالیا۔ ونی لاؤنج والے ناخوشگوار واقعے کی بنا پر علی نے شارو کی ریسٹورنٹ والی جاب چھڑوا کر اسے انکل سلطان کی خدمت کے لیے گھر میں رکھ لیا تھا۔ ایک روز جب شارو اسٹینے اسٹورز سے گروسری خریدنے گئی تو لیونارڈو نے اسے اغوا کر لیا۔ علی نے شارو کی تلاش میں ہمت نہ ہاری اور شارو کو ڈھونڈتا رہا بالآخر ایک رات لیونارڈو کا ایک قریبی ساتھی چیلو اس کے ہتھے چڑھ گیا۔ دونوں کے بیچ خونیں معرکہ ہوا مگر چیلو، شارو اور لیونارڈو کے حوالے سے زبان کھولنے کو تیار نہیں ہوا۔ علی نے طیش کے عالم میں مار مار کر چیلو کو ادھ موا کر دیا۔ آیندہ روز چیلو کے قتل کی خبر لیک جیکسن اور اس کے قرب و جوار میں گردش کر رہی تھی۔ پولیس قاتل کی تلاش میں تھی۔ لیک جیکسن میں مزید قیام خطرناک ثابت ہو سکتا تھا لہٰذا علی نے انکل سلطان کو صورتِ حال سے آگاہ کیا اور اپنی سرخ ہنڈائے اسپورٹ کار میں لیک جیکسن سے ہوسٹن پہنچ گیا۔ پھر سرخ ہنڈائے اسپورٹس میں قاتل کے فرار ہونے کی خبر نے علی کے ہوش اڑا دیے۔ اس سنگین صورتِ حال میں علی نے ڈیلفینا سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ رابطہ ہونے پر ڈیلفینا نے علی کی کتھا سننے کے بعد کہا کہ اگر وہ بہتر گھنٹے تک باہر کی دنیا سے کٹ کر اس کے ساتھ بنگلے میں رہے تو وہ اسے تمام مسائل سے نجات دلا دے گی۔ راضی ہونے پر ان بہتر گھنٹوں میں ہر پل علی پر حیرتوں کا ایک نیا در وا ہوتا رہا۔ ڈیلفینا بہت اونچی پہنچ کی مالک ایک پراسرار لیڈی تھی۔ اس نے اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے علی کو چیلو مرڈر کیس سے اس طرح نکال لیا جیسے مکھن سے بال..... علاوہ ازیں ڈیلفینا نے ٹھوس ثبوت کی مدد سے علی کو بتایا کہ لیونارڈو، شارو کو اغوا کر کے کیوبا کے شہر ہوانا لے گیا ہے جہاں وہ شارو کو عصمت فروشی کے جہنم میں جھونکنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ڈیلفینا نے علی کو یقین دلایا کہ اگر وہ بہتر گھنٹے پورے ہونے کے بعد اس کی ایک خواہش پوری کر دے تو وہ شارو کو صحیح سلامت واپس لے آئے گی۔ شارو کے حصول کی خاطر علی ڈیلفینا کی بات ماننے کے لیے تیار ہو گیا۔

پریسٹن ہالو والے اس بنگلے میں ڈیلفینا کی سنگت میں گزرنے والے وہ طلسم ہوش ربا بہتر گھنٹے بڑے رنگین، سنگین، رومان پرور اور ناقابلِ یقین تھے۔ ڈیلفینا کی شخصیت کسی معمے سے کم نہ تھی..... اس پر مستزاد، ڈیلفینا نے اپنے ہی ایسی دو پراسرار شخصیات ربی آئزک بارو خ لاؤ اور ربیا ایبل بام سے علی کی ملاقات بھی کروا دی۔ تب علی پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ تمام افراد یہودیوں کی ایک سیکرٹ اور بہت طاقتور سوسائٹی ”اسکل اینڈ بونز“ سے تعلق رکھتے تھے۔ جو لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں آزاد تھے۔ یہ لوگ خود کو زمینی خدا سمجھتے تھے۔ انہیں علی کے ہم عمر ایک ایسے نوجوان کی تلاش تھی جس کی ماں مسلمان اور باپ عیسائی تھا۔ انہیں شک تھا کہ علی وہی نوجوان ہے جس کے والدین اسے علی سلطان کے حوالے کر کے کہیں روپوش ہو گئے تھے۔ ڈیلفینا کی تمنا تھی کہ علی ان کی شرائط پر صاد کرتے ہوئے ”اسکل اینڈ بونز“ کی رکنیت حاصل کرنے پر آمادگی ظاہر کر دے لیکن علی نے ڈیلفینا کی خواہش کو ٹھکرا دیا اور ڈیلس سے بے سٹی اپنے انکل کے پاس آ گیا۔ یہاں حالات کی ایک نئی کروٹ اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ انکل نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں علی کو اس کی زندگی کے دیرینہ اور سربستہ راز سے آگاہ کر دیا۔ علی سلطان کے مطابق، انیس سال پہلے، ایک برس کی عمر میں علی کو کراچی (پاکستان) سے نیویارک (امریکا) مرزا عامر بیگ کے پاس پہنچایا گیا تھا۔ مرزا عامر بیگ، علی سلطان کا دوست تھا۔ اس نے علی کو علی سلطان کے حوالے کر دیا تھا۔ علی سلطان نے ایک گارجین کی حیثیت سے انیس برس تک علی کی پرورش کی تھی۔ اس سلسلے میں ہونے والے تمام تر اخراجات کراچی میں مقیم ایک نیک خاتون برداشت کر رہی تھیں مگر پچھلے چند ماہ سے اچانک کراچی سے یہ رقم آنا بند ہو گئی تھی جس سے مرزا عامر نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ خاتون کسی مصیبت

میں گرفتار ہوگئی ہے۔ چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ علی کو فی الفور کراچی روانہ ہوجانا چاہیے۔ علی سلطان اور مرزا عامر بیگ مذکورہ خاتون کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتے تھے۔ ان کا اندازہ تھا کہ اس خاتون کا علی کے ساتھ کوئی گہرا رشتہ ہے۔ مرزا عامر بیگ نے علی کو چند ایسے اشارے دیے جن کی مدد سے علی کراچی میں اس خاتون کو تلاش کرسکتا تھا۔ اس صورت حال میں علی کا دل علی الاعلان یہ کہہ رہا تھا کہ وہ عورت اس کی ماں ہے۔ علی نے حتی الامکان سرعت سے تیاری کی اور بوسٹن سے کراچی آگیا۔ پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی نئے ہنگاموں نے اس کا استقبال کیا۔ وہ ائرپورٹ سے ایک ٹیکسی پکڑ کر اپنے ہوٹل کی جانب روانہ ہوا تو ٹیکسی ڈرائیور نے اسے ویرانے میں جاکر لوٹنے کی کوشش کی مگر علی نے اسے ناکام بنادیا۔ علی کی دوستی عظیم نامی نوجوان سے ہوگئی۔ عظیم نے اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے علی کی والدہ کا پتا لگالیا اور انہیں گھر لے آیا۔ علی کی ملاقات اپنی ماں سے ہوگئی۔ علی کو اپنی ماں کے حالات جان کر بہت دکھ ہوا اور وہ دشمنوں سے انتقام لینے کے بارے میں سوچنے لگا۔ علی ماں کے بنگلے پر رہنے لگا تھا کہ اسے اطلاع ملی کہ انکل علی سلطان کا انتقال ہوگیا ہے۔ علی سناٹے میں آگیا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

بعض حقائق اتنے تلخ ہوتے ہیں کہ کانوں سے سن کر اور آنکھوں سے دیکھ کر بھی ان پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ دراصل جب ہماری توقعات کے برعکس کچھ وقوع پذیر ہوجاتا ہے تو ہمارا ذہن فوری طور پر اس سچائی کو قبول نہیں کرتا۔ اگر کچھ اچھا ہوا ہوتا ہے تو ہم حیران رہ جاتے ہیں لیکن اگر کچھ برا پیش آجائے تو ہماری یہی حیرانی ایک پریشانی میں بدل جاتی ہے۔ دل بیٹھ جاتا ہے اور دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگتی ہیں۔

ان لمحات میں میری بھی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔ مرزا عامر بیگ نے انکل سلطان کی موت کی خبر سنا کر مجھے دہلا دیا تھا۔ اس حقیقت میں کسی شک وشبے کی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی کہ ہر ذی روح کو ایک دن موت کا ذائقہ چکھنا ہے لیکن میں چونکہ انکل کے حوالے سے اس قسم کی صورتِ حال کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا اس لیے ان کی ڈیتھ کا سن کر سناٹے میں آگیا تھا۔ چند لمحات تک میں گنگ سا ہوکر رہ گیا۔ عین ممکن تھا کہ میں ہمیشہ کے لیے اسی کیفیت کا ہوکر رہ جاتا کہ عامر بیگ کی آواز نے مجھے اپنے زندہ ہونے کا احساس دلادیا۔

''تم خاموش کیوں ہو علی؟'' ان کی مخصوص آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''کیا تم مجھے سن رہے ہو......؟''

''ج...... جی......'' میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''یہ سب...... کب ہوا...... کیسے ہوا......؟''

''ہفتے کی صبح ساڑھے دس بجے انہیں ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔'' بیگ صاحب نے بتایا۔ ''ان کی کیئرٹیکر میڈ ایملی نے انہیں فوراً اسپتال پہنچادیا لیکن وہ جانبر نہ ہوسکے۔ زندگی کے دن پورے ہوچکے تھے لہٰذا وہ رخصت ہوگئے ...... ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔''

''اوہ مائی گاڈ......!'' میں نے دکھتے دل کے ساتھ کہا۔ ''کاش زندگی کے آخری لمحات میں، میں ان کے ساتھ ہوتا۔ انہوں نے انیس سال تک میری نگہداشت کی، مجھے پال پوس کر جوان کیا، اعلیٰ تعلیم دلائی اور جب انہیں میری ضرورت تھی تو میں ان سے ہزاروں میل دور تھا۔ افسوس ...... صد افسوس کہ میں ان کے لیے کچھ بھی نہیں کرسکا......''

''یہ سب قدرت کے کھیل ہیں علی۔'' وہ میری دل جوئی کرتے ہوئے بولے۔ ''تم خود کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔ سب کی باریاں لگی ہوئی ہیں۔ اپنی اپنی باری پر ایک دن ہم سب کو اس دنیا سے رخصت ہوجانا ہے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں انکل۔'' میں نے حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''انسان، قدرت سے لڑ نہیں سکتا۔ مالک کی مرضی کے سامنے سب کو سر جھکانا پڑتا ہے۔''

''اللہ تمہیں صبر اور حوصلہ عطا فرمائے۔'' وہ محبت بھرے لہجے میں بولے پھر پوچھا۔ ''تم جس مقصد کے لیے پاکستان گئے تھے اس کا کیا ہوا؟''

''میں نے اپنی ماں کو تلاش کرلیا ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''اور اس وقت میں ان کے ساتھ ہی بیٹھا ہوا ہوں۔''

''بہت خوشی ہوئی یہ سن کر کہ تم اپنے مشن میں کامیاب ہوگئے ہو۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''قدرت کا کیا عجیب اور نرالا کھیل ہے علی! جس ماں نے تمہیں جنم دیا، تم انیس سال تک اس سے ہزاروں کلومیٹر دور رہنے پر مجبور ہوگئے اور جس مہربان شخص نے انیس سال تک تمہیں ماں اور باپ دونوں ہستیوں کا پیار دیا، اس کے آخری وقت میں قدرت نے تمہیں ہزاروں کلومیٹر دور پہنچادیا۔''

''واقعی...... قدرت کی مصلحتوں کو سمجھنا انسان کے بس کی بات نہیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں اس مہربان شخص کے ایک ایک احسان کو زندگی بھر یاد رکھوں گا۔''

''علی سلطان نے اپنی زندگی میں تم پر جو احسانات کیے سو کیے تھے لیکن اپنی موت کے بعد اس مہربان شخص نے

تم پر جو احسان کیا ہے، اس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔'' وہ معتدل انداز میں بولے۔

''میں سمجھا نہیں انکل۔'' میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔ ''آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔ آپ کا اشارہ کس احسان کی طرف ہے؟''

''تم جانتے ہو نا، پچھلے انیس سال سے تمہاری والدہ ہر ماہ ایک مخصوص رقم مجھے بھیجتی رہی ہیں؟'' انہوں نے سوالیہ انداز میں کہا۔

میں نے جواب دیا۔ ''جی، مجھے یہ حقیقت معلوم ہو چکی ہے۔''

''یہ مخصوص رقم میرے ذریعے علی سلطان تک پہنچ جاتی تھی۔'' وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولے۔

''علی سلطان اس رقم کو تمہاری دیکھ بھال اور تعلیم و تربیت پر خرچ کرتا تھا۔ اس نے تمہارا اتنا خیال رکھا جتنا سگے ماں باپ بھی اپنی اولاد کا نہیں رکھ سکتے۔ انہوں نے ایک مشفق باپ اور ایک مہربان ماں بن کر تمہاری پرورش کی لیکن تمہاری شناخت کو مسخ نہیں ہونے دیا۔ تم اپنے ڈاکیومینٹس کا جائزہ لو تو ہر پیپر پر ولدیت کے خانے میں تمہیں اپنے اصلی والد حیدر علی کا نام لکھا نظر آئے گا اور تمہاری لائف ہسٹری ریکارڈ میں یہ بھی درج ہے کہ تمہاری پیدائش کے فوراً بعد ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں تمہارے والد حیدر علی کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس واقعے کے بعد علی سلطان نے تمہاری پرورش کا ذمہ اٹھالیا تھا۔''

''جی۔ یہ ساری باتیں مجھے معلوم ہو گئی ہیں۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے انکل سلطان کی موت کے بعد کے کسی احسان کی جو بات کی ہے، ذرا اس کے بارے میں بتائیں؟''

''علی سلطان نے انیس سال تک تمہارا جو خیال رکھا، اس کے حوالے سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس کام کے لیے تمہاری والدہ اسے ایک معقول معاوضہ دیا کرتی تھیں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولے۔ ''لیکن اپنی موت کے بعد وہ تمہارے لیے اتنا کچھ چھوڑ گئے ہیں جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ اس مجموعی رقم سے کہیں زیادہ ہے جو پچھلے انیس سال میں تمہاری والدہ نے ان کے لیے بھیجی تھی۔''

''میں...... سمجھا نہیں......؟'' میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔

''وہ اپنی تمام جائداد، بینک بیلنس، مختلف مالیاتی اداروں میں کی گئی لاکھوں ڈالرز کی انویسٹ منٹ...... الغرض، اپنی ایک ایک چیز میں تمہیں ففٹی پرسنٹ کا وارث بنا گئے ہیں۔ میں نے ان کے لیگل ایڈوائزر سے ملاقات کی تھی۔ وکیل صاحب نے مجھے علی سلطان کی ول (وصیت) دکھائی تھی۔ میں نے ان کی وصیت کو بڑی تفصیل سے پڑھا ہے۔ اس ول کے مطابق، علی سلطان کی تمام منقولہ اور غیر منقولہ جائداد کے ففٹی پرسنٹ کے تم اور ففٹی پرسنٹ کی لکی وارث ہے۔ جب تم واپس امریکا آؤ گے تو اس وصیت کے مطابق، ایک لیگل پروسس کے بعد تمہیں اور لکی کو تمہارا حق مل جائے گا......'' لمحاتی توقف کر کے انہوں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''تمہاری واپسی کی کب تک امید رکھی جائے؟''

''میں ایک ماہ کے اندر واپس آرہا ہوں۔'' میں نے بڑے عزم کے ساتھ کہا۔ ''عیدالفطر ان شاء اللہ آپ کے ساتھ مناؤں گا اور میں اپنی والدہ کو بھی لے کر آرہا ہوں۔''

''ویری گڈ......'' وہ سراہنے والے انداز میں بولے پھر کہا۔ ''ذرا اپنی والدہ سے میری بات کراؤ۔''

میں نے سیل فون ماں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''بیگ صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

آئندہ پانچ منٹ تک ماں نے مرزا عامر بیگ سے سیلولر ملاقات کی۔ ان کی گفتگو میں انکل علی سلطان کی موت پر اظہارِ افسوس اور دیگر باتوں کے علاوہ ماں کے امریکا جانے کا ذکر بھی شامل تھا۔ جب ماں نے سیل فون مجھے واپس کیا تو انکل عامر بیگ نے کہا۔

''تمہاری والدہ نے بتایا ہے کہ تم علی سلطان کو میزبان بنا کر اپنی ماں کو مہمان کی حیثیت سے امریکا لانا چاہتے تھے؟''

''جی انکل۔'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔

''میری یہی پلاننگ تھی لیکن انکل علی سلطان کو مالک نے اس منصوبے کی تکمیل سے پہلے ہی اپنے پاس بلالیا۔''

''اس کے پیچھے بھی قدرت کی کوئی منطق پوشیدہ ہوگی۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولے۔ ''تم پریشان نہ ہو۔ میرا یہ مشورہ ہے کہ تم اپنے ریفرنس سے اپنی والدہ کو اپلائی کراؤ لیکن ماں بیٹے کا رشتہ ظاہر نہیں کرنا۔ اگر تم انہیں اپنی آنٹی یا کوئی بھی فیملی فرینڈ شو کرو گے تو بہ آسانی تمہاری والدہ کو ویزا مل جائے گا۔ سیدھی سی بات ہے۔ تم اپنے عزیز واقارب سے ملنے پاکستان گئے تھے اور وہیں پر تمہاری ایک رشتے دار سلمیٰ صاحبہ کا امریکا کی سیر کا پروگرام بن گیا۔

تم انہیں اپنی ذمے داری پر امریکا لے جانا چاہتے ہو۔ ویسی آل ......'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوئے پھر اپنی بات پوری کرتے ہوئے کہا۔

''وزٹ ویزا کے حصول کے لیے تمہارا ریفرنس ہی کافی ہوگا۔ باقی جہاں تک اسائلم کا معاملہ ہے تو یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ آپ کی جیب میں پیسا ہو اور آپ کو راستہ معلوم ہونا چاہیے، بس پھر کوئی کام رکتا نہیں۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''جی انکل! میں آپ کی بات اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں آپ کے مشورے پر عمل کروں گا۔ بہت جلد ہماری ملاقات ہوگی۔''

''ان شاء اللہ......!'' وہ مضبوط لہجے میں بولے۔

''علی سلطان والے گھر کو لاک کر دیا گیا ہے۔ گھریلو ملازمہ ایملی کو بھی فارغ کر دیا گیا ہے۔ اگر تم وہاں فون کرو گے تو تمہیں جواب نہیں ملے گا۔ تمہیں جو بھی کام ہو، ڈائریکٹ مجھ سے رابطہ کرنا۔''

''ٹھیک ہے انکل۔'' میں نے فرماں برداری سے کہا۔ ''میں ایسا ہی کروں گا۔''

الوداعی کلمات کے بعد ہمارے بیچ سیلولر رابطہ موقوف ہو گیا۔

میں نے سیل فون کو ایک طرف صوفے پر رکھا اور غمگین نظر سے ماں کو دیکھنے لگا۔ وہ بھی کافی افسردہ نظر آرہی تھیں۔ انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''علی سلطان کی موت کا مجھے بہت دکھ ہوا ہے۔ اس شخص کے احسانات کو ہم زندگی بھر نہیں اتار سکتے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔''

''آمین......!'' میں نے تہِ دل سے کہا پھر دل گرفتہ لہجے میں اضافہ کیا۔ ''ماں! میں آپ کو سچ بتا رہا ہوں کہ میں آج جو کچھ بھی ہوں، یہ انکل کی محنت اور کوشش کا ثمر ہے۔ ان انیس سالوں میں انہوں نے مجھے ماں کی کمی محسوس ہونے دی اور نہ باپ کی محرومی۔ ایسے عظیم لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ زندگی میں تو انہوں نے مجھے اپنی سگی اولاد سے بھی بڑھ کر قابلِ توجہ سمجھا ہی تھا، موت کے بعد تو وہ مجھ پر اتنا بڑا احسان کر گئے ہیں کہ جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔''

''موت کے بعد احسانِ عظیم......'' ماں نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں ماں کو انکل بیگ سے حاصل ہونے والی ان معلومات سے آگاہ کیا جن کے مطابق، انکل سلطان نے مجھے اپنی آدھی جائداد کا وارث قرار دیا تھا اور یہ کوئی زبانی کلامی بات نہیں تھی بلکہ ایک ول (وصیت) کے ذریعے انکل نے اپنے تمام مال و جائداد کو مجھ میں اور اپنی بیٹی لفنی میں برابر تقسیم کر دیا تھا۔

''واقعی ......یہ تو بڑے دل گردے اور اعلیٰ ظرفی کی مثال ہے۔'' ماں نے میری بات کے جواب میں کہا۔ ''علی سلطان نے تمہیں اپنی سگی بیٹی کے برابر سمجھا یعنی تمہیں سگی اولاد کا درجہ دیا۔''

''ماں! میرا انکل سلطان کے ساتھ انیس سال کا ساتھ رہا ہے۔'' میں نے ایک طویل بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''انکل نے ایک لمحے کے لیے بھی مجھے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میں ان کی سگی اولاد نہیں ہوں اور وہ میرے لیے ایک کیئرٹیکر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لفنی ان کی سگی اولاد ہے لیکن اس کے ساتھ انکل کی وہ جذباتی وابستگی دیکھنے میں نہیں آئی جو میرے ساتھ تھی۔ ان کی موت میرے لیے ایک گہرا ذہنی اور قلبی صدمہ ہے۔''

''ایسا ہونا بھی چاہیے میرے لعل۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔ ''میں تو ان کے لیے مغفرت کی دعا ہی کر سکتی ہوں۔ اللہ ان کی اگلی منازل آسان فرمائے۔''

''آمین......!'' میں نے خلوصِ دل سے کہا۔

ماں نے پوچھا۔ ''اپنی بیٹی لفنی کے ساتھ علی سلطان کا ایسا کیا اختلاف تھا جو وہ اس لڑکی سے دور رہتے تھے؟''

''کوئی اختلاف نہیں تھا۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''انکل، لفنی سے نہیں بلکہ لفنی، انکل سے دور رہتی تھی۔''

''اس کا کوئی خاص سبب تھا؟'' ماں نے دلچسپی لیتے ہوئے استفسار کیا۔

''میں سمجھتا ہوں، اس کے دو بنیادی اسباب تھے۔'' میں نے اپنے تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں ماں کو بتایا۔ ''ایک سبب تو لفنی کی ماں تھی اور دوسرا سبب خود لفنی۔''

''وہ کس طرح؟'' ماں نے سوال کیا۔

''انکل علی سلطان نے امریکی ریاست اوتاہ میں ایک عیسائی عورت ریٹا میگڈالین سے شادی کر لی تھی۔ یہ لوگ سالٹ لیک سٹی میں رہتے تھے۔ لفنی وہیں پر پیدا ہوئی تھی۔ انکل نے اس بچی کا نام آمنہ رکھنا چاہا لیکن ریٹا کی خواہش تھی کہ وہ اپنی بیٹی کا نام لفنی رکھے۔ میاں بیوی میں زیادہ بنتی نہیں تھی لہٰذا ایک روز دونوں نے اپنی زندگی کے راستے الگ

کر لیے۔ اس رسّاکشی کے نتیجے میں بچی ماں کے حصے میں آئی۔ بعدازاں ریٹا، بیٹی کو لے کر لاس اینجلس چلی گئی اور انکل بھی اوماہا چھوڑ کر ٹیکساس آ گئے اور رہائش کے لیے ''بے سٹی'' کا انتخاب کیا۔ بچی چونکہ ریٹا کے پاس رہی تھی اس لیے وہ کبھی بھی آمنہ نہ بن سکی۔ دنیا کے سامنے وہ ٹفنی کی شناخت کے ساتھ ابھری۔ یہ تو سب ہو گیا ریٹا کا۔ اب میں ٹفنی کی طرف آتا ہوں......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ٹفنی نے باپ کے سائے سے محروم رہ کر ماں کی معیت میں اپنی زندگی کو آگے بڑھایا۔ میں یہ بات مانتا ہوں کہ ٹفنی کو زندگی کی راہ گزر پر بڑا ٹف ٹائم ملا تھا اور اس نے جان توڑ محنت کی تھی۔ اس کارِ مسلسل نے اسے ایک دن ایک نمایاں مقام دلا دیا۔ اس وقت وہ ایک معروف نیوز چینل ''فوکس نیوز'' میں کام کر رہی ہے۔ وہ ایک اہم عہدے پر فائز ہے اور پچیس ہزار ڈالرز ماہانہ کما رہی ہے۔ اس کی جاب اتنی تھکا دینے والی ہے کہ اسے کسی اور طرف دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ وہ انکل سلطان سے زیادہ راہ و رسم اس لیے بھی نہیں رکھ سکی کہ ظاہر ہے، ماں نے اس کے ذہن میں باپ کا نیگیٹو امیج بنا رکھا تھا۔ خیر، اب تو ریٹا اس دنیا میں باقی نہیں رہی۔ کچھ عرصہ پہلے اس کا انتقال ہو گیا تھا اور......''

''اور کیا؟'' میں نے جملہ ادھورا چھوڑا تو ماں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''انکل بھی دنیا چھوڑ کر چلے گئے......'' میں نے گلوگیر آواز میں کہا۔

''اس دنیا کا یہی دستور ہے میرے بچے۔'' ماں نے میری دل جوئی کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں خود کو سنبھالنا ہوگا۔ ذرا تصور کرو...... جب تمہارے باپ کو قتل کر دیا گیا تھا تو میں نے خود کو کس طرح سنبھالا ہوگا......؟''

''میں تصور کر سکتا ہوں...... اندازہ لگا سکتا ہوں۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''میں آپ کی ہمت، جرأت اور حوصلے کو سیلیوٹ کرتا ہوں ماں۔ میں تو اس دکھ کے موقع پر اس وقت اپنی ماں سے چند فٹ کی دوری پر بیٹھا ہوا ہوں اور ادھر گیارہ ہزار سات سو کلومیٹر کے فاصلے پر نیویارک میں موجود مرزا عامر بیگ بھی میری دل جوئی میں مصروف ہیں اور آپ...... آپ تو تن تنہا تھیں......!''

''میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا میرے لعل۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولیں۔ ''اللہ تو ہر وقت انسان کے قریب ہے۔ اسے انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ نزدیک بتایا جاتا ہے لیکن انسان اس وقت اللہ کے زیادہ قریب ہو جاتا ہے جب دوسرے انسانی سہارے اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں، وہ دنیا کی بھیڑ میں اکیلا رہ جاتا ہے۔ میری زندگی کے تجربے نے مجھے بتایا اور سکھایا ہے کہ بے یار و مددگار اور تن تنہا انسان اللہ کے بہت زیادہ نزدیک ہوتا ہے...... اتنا قریب کہ اللہ اسے اپنے اندر محسوس ہونے لگتا ہے۔ میں ایسی کیفیات سے گزری ہوں اس لیے بڑے وثوق کے ساتھ یہ بات کہہ سکتی ہوں۔''

''مجھے خود بھی مالک کے قرب کے کئی تجربات ہو چکے ہیں۔'' میں نے ماں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس لیے میں آپ سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔''

''علی! پتا ہے، میں نے ابھی ابھی کیا سوچا ہے؟''

مجھے نہیں معلوم تھا اس لیے کہا۔ ''نہیں ماں......!''

''میں نے تھوڑی دیر پہلے ایک فیصلہ کیا ہے...... ایک حتمی فیصلہ۔'' وہ ٹھوس لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولیں۔ ''یہ تو بات طے ہو گئی کہ میں تمہارے ساتھ امریکا جا رہی ہوں۔ میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ یہاں سے رخصت ہونے سے پہلے میں اپنا بنگلا، گاڑی، جیولری اور تمام قیمتی اشیا فروخت کر دوں گی۔''

''گڈ! یہ تو آپ کو کرنا ہی ہوگا کیونکہ یہاں سے جانا ہے تو پھر واپس نہیں آنا۔'' میں نے بہ دستور ان کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں سمجھ رہا ہوں کہ آپ نے جو حتمی فیصلہ کیا ہے اس کا تعلق اس کے علاوہ کسی اور مشن سے بھی ہے۔ آپ اتنا پیسا ساتھ لے کر تو امریکا نہیں جائیں گی۔''

''تم نے کسی حد تک میرے منصوبے کو سمجھ لیا ہے۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولیں۔ ''امریکا روانہ ہوتے وقت میں اپنے پاس صرف ''شومنی'' کے لیے دو تین ہزار ڈالرز رکھوں گی۔''

ماں نے بات ادھوری کی تھی لہٰذا میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''اب یہ بھی بتا دیں کہ باقی کے کروڑوں روپے کا آپ کیا کریں گی؟ شومنی کی رقم پر تو صرف دو تین لاکھ روپے خرچ ہوں گے......!''

''میں اپنی تمام رقم سے کراچی میں ایک ٹرسٹ قائم کروں گی اور اس ٹرسٹ کا نام ہوگا...... حیدر علی ٹرسٹ۔'' انہوں نے بڑے فخریہ انداز میں بتایا۔ ''مذکورہ ٹرسٹ فلاحی کام کرے گا جس سے دکھی انسانیت کی مدد اور خدمت کی جائے گی۔''

''بہت ہی عمدہ اور نیک ارادہ ہے۔'' میں نے ستائشی نظر سے ماں کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''آپ تو میرے ساتھ چندروز کے بعد امریکا چلی جائیں گی۔ اس ٹرسٹ کے قیام کا کام کون کرے گا اور آگے اسے چلائے گا کون، آپ نے تو ساری زندگی امریکا میں گزارنا ہے؟''

''اس کام کے لیے میرے ذہن میں صرف ایک ہی نام ہے۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بولیں۔

میں نے پوچھا۔ ''کون ہے وہ؟''

''نادر شاہ۔'' انہوں نے بتایا۔

''اچھا...... وہی شخص جس سے آپ کل مجھے ملوانے والی ہیں؟'' میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہاں...... بالکل وہی۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولیں۔

''میں محسوس کر رہا ہوں کہ آپ نادر شاہ پر بہت زیادہ اعتماد کر رہی ہیں۔'' میں نے کہا۔

انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ شخص میرے لیے قابلِ بھروسا ہے۔ نادر شاہ نے بعض نازک مواقع پر میرا بہت ساتھ دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میرے اس مشن کو بھی پایۂ تکمیل تک پہنچائے گا۔''

''اگر آپ کو یقین ہے۔ تو پھر میں بھی یہی امید رکھتا ہوں ماں۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''یہ آپ کا نیک مشن ہے۔ اس ٹرسٹ کے ذریعے میرے باپ کا نام بھی زندہ رہے گا اور اس معاشرے کے پسے ہوئے ضرورت مند افراد کی دادرسی بھی ہوتی رہے گی۔ میری دعا ہے کہ نادر شاہ آپ کی توقعات پر پورا اترے۔''

''آمین......!'' وہ بڑے وثوق سے بولیں...... ''انشاء اللہ! ایسا ہی ہوگا۔''

ہمارے درمیان ایک مرتبہ پھر انکل سلطان کے بارے میں گفتگو ہونے لگی۔ میں نے کہا۔

''مجھے لگتا ہے، انکل کو اپنی موت کی پیشگی خبر ہوگئی تھی۔''

''یہ بات تم کس بنا پر کہہ رہے ہو؟'' ماں نے سوال کیا۔

''ان سے ہونے والی میری آخری گفتگو کی بنا پر۔'' میں نے جواب دیا۔

''اس گفتگو میں ایسی کیا خاص بات تھی؟''

''انکل سلطان سے آخری بار میں نے اٹھائیس جون کو رات ایک بجے فون پر بات کی تھی۔ بے سٹی (ٹیکساس) میں اس وقت ستائیس جون کی سہ پہر کے تین بجے تھے۔'' میں نے بجھے ہوئے لہجے میں بولنا شروع کیا۔ ''میں نے انہیں یہ خوشخبری سنائی تھی کہ مجھے آپ کی تلاش والے کام میں کامیابی حاصل ہوگئی ہے۔ جواب میں پتا ہے، انہوں نے کیا کہا تھا......؟''

''مجھے نہیں معلوم۔ تم بتاؤ......'' ماں گہری دلچسپی سے مجھے سن رہی تھیں۔

''انہوں نے گمبھیر آواز میں کہا تھا......'' میں نے بتایا۔ ''میں مطمئن ہوگیا میرے بچے! میرا مشن پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ اب میرے دل میں کوئی بھی خلش باقی نہیں ہے۔ میں بڑے اطمینان اور سکون کے ساتھ رخصت ہوسکوں گا۔''

''اوہ......'' ماں نے ایک بوجھل سانس خارج کی اور کہا۔ ''علی سلطان کی 'رخصت ہوسکوں گا' والی بات سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جان گئے تھے کہ اب ان کی زندگی کا اختتام ہونے والا ہے۔''

''انکل دمے کے مریض تھے۔'' میں اپنی ہی دھن میں بولتا چلا گیا۔ ''ایک روڈ ایکسیڈنٹ نے ان کے جسم کے زیریں حصے کو بری طرح مفلوج کر دیا تھا۔ وہ وہیل چیئر تک محدود ہوکر رہ گئے تھے لیکن میں نے کبھی انہیں مایوسی کی گفتگو کرتے ہوئے نہیں سنا۔ ان کی بات چیت میں کبھی موت کا تذکرہ نہیں ہوا لیکن اس رات مجھ سے ہونے والی سیلولر گفتگو میں انہوں نے اپنے مشن کی تکمیل کا ذکر کیا اور کہا کہ اب وہ بڑے اطمینان اور سکون کے ساتھ رخصت ہوسکیں گے۔ گویا وہ اپنے مشن کی تکمیل کے لیے ہی اب تک زندہ تھے اور ان کا مشن تھا...... مجھے آپ تک یہ حقائق پہنچانا......'' میں روہانسا ہوگیا۔ ''ماں! آپ انکل کی موت کے وقت پر تو ذرا غور کریں......''

اتنا کہہ کر میں خاموش ہوا تو ماں نے اپنی زبان سے ایک لفظ ادا نہیں کیا۔ وہ یک ٹک مجھے دیکھتی چلی گئیں۔ انکل سلطان کی موت نے انہیں بھی دل گرفتہ کر دیا تھا۔

''انکل عامر بیگ نے مجھے بتایا ہے کہ انکل سلطان کی موت بے سٹی کے وقت کے مطابق، ہفتہ اٹھائیس جون صبح ساڑھے دس بجے واقع ہوئی تھی۔ یہ وہی لمحات تھے جب کراچی میں ہفتہ اٹھائیس جون کی رات کے ساڑھے آٹھ کا وقت تھا۔ میں گزشتہ رات کی بات کر رہا ہوں جب عظیم کے گھر میں ہماری پہلی ملاقات جاری تھی تو انکل سلطان کو دل کا دورہ پڑ گیا۔ اب آپ ان کے الفاظ کی صداقت کو چیک کریں۔ انہوں نے کہا تھا...... میں مطمئن ہوگیا میرے بچے۔ میرا مشن پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ اب میرے دل میں کوئی خلش باقی نہیں ہے۔ میں بڑے

اطمینان اور سکون کے ساتھ رخصت ہوسکوں گا۔ جب میں نے پوچھا کہ آپ کو کہاں جانا ہے انکل؟ تو انہوں نے جلدی سے سنبھلتے ہوئے کہا تھا...... ارے کہیں نہیں میرے بچے! میرا مطلب یہ تھا کہ تمہاری ماں کا سراغ مل گیا۔ یہ تمہاری بہت بڑی کامیابی ہے۔ اس خوش خبری نے مجھے بہت سکون بخشا ہے۔ میرا اندرون شانت ہوگیا ہے۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ اس وقت میں کتنا خوش اور مطمئن ہوں۔ میرے اللہ نے کرم کیا اور تم اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے......'' میں نے سانس ہموار کرنے کے لیے لمحاتی توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''گویا آپ کا سراغ مل جانا ان کی نظر میں میری کامیابی تھی اور میری کامیابی ان کے لیے بے پناہ خوشی کا باعث تھی۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ماں بیٹے کی ملاقات کے انتظار میں زندہ تھے۔ ادھر یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا، ادھر انکل سلطان کی آنکھ بند ہوگئی......''

''بعض انسانوں کے اندر بڑی نیک اور پاکیزہ روح ہوتی ہے۔'' ماں نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''علی سلطان بھی ایک ایسے ہی انسان تھے۔''

میں اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

☆☆☆

رات کے ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ میں اس وقت حفیظ کپور کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ہماری یہ ملاقات کپور صاحب کے بیڈ روم میں جاری تھی۔ ہم دونوں کے سوا اس وقت وہاں اور کوئی موجود نہیں تھا۔ عظیم ٹھیک آٹھ بجے مجھے لینے ماں کے بنگلے پر پہنچ گیا تھا اور مجھے اپنے گھر پہنچانے کے بعد اس نے مجھے اپنے پاپا کے حوالے کر دیا تھا۔ وہ خود کسی کام سے نکل گیا تھا۔

''بیٹا جی! مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم نے مجھ پر اعتماد کیا۔'' حفیظ کپور نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''تم میرے بیٹوں کی طرح ہو۔ عظیم نے تمہارے ایشو کے بارے میں مجھے پوری تفصیل کے ساتھ بتا دیا ہے۔ میں تمہاری والدہ کے ماضی اور حال سے اچھی طرح آگاہ ہوگیا ہوں اور ان کی مشکلات کو میں نے خاطر خواہ سمجھ بھی لیا ہے۔ اب تم مجھے وہ باتیں بھی کھل کر بتا دو جو یہاں سے جانے کے بعد تمہاری والدہ سے ہوئی ہیں۔ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ بس اہم پوائنٹس بتا دو تاکہ میں تمہیں کوئی مفید مشورہ دے سکوں۔''

بات کے اختتام پر انہوں نے مجھے سوالیہ نظر سے دیکھا تو میں نے انہیں ان معاملات سے اپ ڈیٹ کر دیا جو ماں کی موجودگی میں آگے بڑھے تھے۔ یہ خاصی اہم پیش رفت تھی۔ اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے میں نے کہا۔

''انکل! ماں نے اس مذموم راستے کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا ہے اور وہ میرے ساتھ امریکا جانے کے لیے راضی ہوگئی ہیں مگر ویزا پروسس میں تین سے چار ہفتے لگ سکتے ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ اس دوران میں ماں اس بنگلے میں رہیں۔ میں انہیں کسی ایسے مقام پر شفٹ کرنا چاہتا ہوں جہاں ماضی کی کوئی یاد ان کا تعاقب نہ کر سکے، کوئی جاننے والا ان سے رابطہ نہ کر سکے۔''

''یہ کچھ بھی مشکل نہیں ہے میری جان۔'' وہ بڑی محبت سے بولے۔ ''اسلام آباد میں میرا ایک گھر خالی پڑا ہے، لاہور کی شادمان کالونی میں بھی کوٹھی کا بندوبست کیا جا سکتا ہے اور کراچی تو ہے ہی اپنا شہر، یہاں بھی عارضی طور پر کرائے پر اپارٹمنٹ حاصل کر کے تمہاری والدہ کی رہائش کا انتظام کیا جا سکتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ایسا کرنا مسئلے کا حل نہیں۔''

''پھر......'' میں نے متذبذب نظر سے ان کی طرف دیکھا۔ ''آپ کی نظر میں اس مسئلے کا پائیدار حل کیا ہے؟''

''اگر اچانک تمہاری والدہ منظر سے غائب ہوگئیں تو ان کی دنیا میں سنسنی خیز افراتفری پھیل جائے گی۔ میں اس دنیا کا ذکر کر رہا ہوں جسے وہ خیر باد کہہ چکی ہیں مگر انہوں نے اس انقلابی فیصلے کا باقاعدہ اعلان نہیں کیا لہٰذا ان سے متعلق ہر شخص کا تشویش میں مبتلا ہو جانا، اس تشویش کے نتیجے میں ادھر ادھر کن سوئیاں لینا اور کچھ سمجھ نہ آنے کے بعد ٹامک ٹوئیاں مارنا اور ان کی تلاش میں نکل کھڑے ہونا ایک فطری عمل ہوگا۔'' انہوں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''لہٰذا میں تو یہی تجویز کروں گا کہ انہیں اسی بنگلے میں رہنے دو اور تم ان کے ویزا کے پروسس میں لگ جاؤ۔ چند روز کی بات ہے۔ کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ جب انہیں امریکا کا ویزا مل جائے گا تو چپ چاپ دونوں ماں بیٹا یہاں سے پرواز کر جانا اور اگر ضرورت محسوس کرو تو اپنے دوست کو بھی ساتھ لے جانا۔''

ان کا اشارہ عظیم کی جانب تھا۔ میں نے ان کی بات پوری توجہ سے سنی اور ان کے خاموش ہونے پر کہا۔

''آپ کا مشورہ دل کو لگ رہا ہے لیکن چند ایشوز بھی ہیں......!''

''مثلاً کون سے ایشوز ہیں؟'' انہوں نے پوچھا۔

''ماں اپنا بنگلا، گاڑی اور ہر قیمتی چیز کو فروخت کر کے

میرے مرحوم والد کے نام سے ایک ویلفیئر ٹرسٹ قائم کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔'' میں نے بتایا۔ ''وہ اپنی موجودہ دولت میں سے کچھ بھی ساتھ نہیں لے جانا چاہتیں۔ یہاں کی تمام تر کمائی کو وہ ایک نیک کام میں لگا کر سکھ کی سانس لینا چاہتی ہیں۔''

''تو اس میں الشو والی کون سی بات ہے بیٹا جی؟'' انہوں نے مشفقانہ انداز میں کہا۔ ''اپنے شیخ صاحب رئیل اسٹیٹ بزنس کے چیتا ہیں۔ آپ اپنی والدہ سے بنگلے کے ڈاکیومینٹس کی فوٹو کاپی کی فائل لے لو۔ میں شیخ صاحب سے کہہ کر چند دنوں میں بہت اچھی قیمت میں ان کا بنگلا بکوا دوں گا۔ گاڑی کو نکالنا بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

''آپ کی اس مخلصانہ پیشکش کا شکریہ انکل۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جائداد کی فروخت کے لیے ماں کے پاس پلان ہے۔ وہ اپنے ایک دیرینہ خیر خواہ کے ہاتھ سے یہ کام کرانا چاہتی ہیں۔ اس شخص کا نام نادر شاہ ہے۔ میرے مرحوم والد کے نام سے قائم ہونے والا ٹرسٹ بھی نادر شاہ ہی کی زیرِنگرانی چلے گا۔''

''اچھی بات ہے۔'' انہوں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری والدہ کی یہ خوش قسمتی ہے کہ انہیں ایک قابلِ اعتماد خیر خواہ میسر ہے ورنہ آج کل بھروسے کا آدمی ڈھونڈے نہیں ملتا۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں انکل۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''میں کل نادر شاہ سے ملاقات کروں گا۔ اگر وہ ماں کے لیے لائقِ اعتبار ہے تو یقیناً کوئی بھلا انسان ہی ہوگا۔''

''میری جان! تمہارے سارے معاملات تو ایک دم سیدھے نظر آ رہے ہیں۔'' کپور صاحب نے کہا۔ ''پھر کیوں پریشان دکھائی دیتے ہو؟''

''اصل پریشانی میری شکل و شباہت ہے انکل۔'' میں نے ایک اہم نکتے کی جانب ان کی توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا۔

''تمہاری شکل و شباہت کو کیا ہوا ہے؟'' وہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولے۔ ''ماشاء اللہ! اچھے خاصے تو ہو، شکل و صورت کی فکر تو مجھ جیسے انسان کو کرنا چاہیے۔''

میں نے ان کے اپنی ذات کے بارے میں خیالات پر کوئی تبصرہ نہ کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ماں نے بتایا ہے کہ میں قد کاٹھ، انداز و اطوار اور شکل و صورت میں اپنے والد کی کاپی ہوں۔ ماں کو اس بات کی فکر ہے کہ اگر میں ان کے ساتھ آزادانہ گھوموں پھروں گا تو میری جان کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ اس شہر میں ان کے دشمن موجود ہیں۔ انہی لوگوں نے میرے والد کو بھی قتل کیا تھا اسی لیے......'' میں نے لمحاتی توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''میں یہ چاہ رہا تھا کہ اپنی ماں کو چند دن کے لیے کسی ایسی جگہ پر منتقل کر دوں جہاں ان کے کسی دشمن اور کسی دوست کی رسائی نہ ہو تاکہ میں پورے اطمینان کے ساتھ ان کی معیت میں رہ سکوں۔ میں انہیں ایک لمحے کے لیے بھی اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں کرنا چاہتا اور یقیناً ان کی بھی یہی خواہش ہے۔''

''اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں۔'' وہ دوستانہ لہجے میں بولے۔ ''میں نے تین آپشنز تمہیں بتا دیے ہیں...... اس کے علاوہ چوتھا آپشن بھی موجود ہے۔'' انہوں نے ایک لمحے کو رک کر ڈرامائی انداز میں میری طرف دیکھا اور گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میرے گھر کا اوپر والا پورشن بھی خالی پڑا ہے۔ مہر النسا کی واپسی کا کچھ پتا نہیں۔ جب وہ اپنی ماں کے ساتھ ہوتی ہے تو پھر شوہر، بچے...... سب کو بھول جاتی ہے۔ مجھے نہیں امید کہ وہ عید سے پہلے واپس آئے۔ تم ماں بیٹے کے لیے میرا گھر حاضر ہے۔ امریکا کا ویزا ملنے کے بعد آپ لوگ رخصت ہو جائیے گا۔''

''ٹھیک ہے، میں آج جا کر ماں سے مشورہ کرتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''سارے آپشنز ان کے سامنے رکھتا ہوں۔ دیکھیں وہ کیا فیصلہ کرتی ہیں!''

''فیصلہ تو بہر حال انہی کو کرنا ہے۔'' کپور صاحب نے کہا۔ ''کیونکہ اپنے معاملات کو وہ زیادہ بہتر جانتی ہیں۔ اس کے علاوہ تم نے اپنے اور اپنی والدہ کے جن دشمنوں کا ذکر کیا ہے، اگر تمہاری والدہ انہیں نکیل ڈالنے کے لیے مجھ سے کسی بھی قسم کی مدد چاہیں گی تو میں حاضر ہوں۔''

''آپ کے پُرخلوص تعاون کا بہت شکریہ انکل۔'' میں نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا۔''

وہ گمبھیر انداز میں بولے۔ ''تم میرے احسان کا بدلہ اس طرح چکا سکتے ہو کہ زندگی میں جب بھی میری یاد آئے، میرے حق میں دعا کر دینا۔ دعا سے بڑھ کر کوئی اور ایسی چیز نہیں ہے جو ایک انسان کسی دوسرے انسان کو بے لوث دے سکتا ہے۔''

''آپ نے بڑی گہری بات کر دی ہے انکل!'' میں

نے کہا۔

''جیتے رہو میری جان۔'' وہ زندہ دلی سے بولے پھر کہا۔''میں اب آرام کروں گا۔تم عظیم اور علی کے ساتھ تھوڑا وقت گزار کر اپنی ماں کے پاس چلے جانا پھر سلمٰی صاحبہ جو بھی فیصلہ کریں، مجھے اس سے آگاہ کر دینا۔ اللہ خیر کرے گا۔''

''ان شاء اللہ!'' میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں عظیم، علی اور ان کے کزن مصطفیٰ کے ساتھ بنگلے کے باہر بیٹھا بات چیت کر رہا تھا۔ عظیم جو مجھے یہاں پہنچانے کے بعد کہیں غائب ہو گیا تھا، اب حاضر تھا اور سگریٹ نوشی سے دل پشوری کر رہا تھا۔ اغلب امکان یہی تھا کہ وہ سگریٹ کی تلاش میں اِدھر اُدھر ہو گیا تھا۔ مصطفیٰ سے میرا تعارف کرایا گیا۔

مصطفیٰ، ارباب کا بھائی تھا۔ ارباب سے میری ایک مختصر سی ملاقات ہو چکی تھی جب میں نے کراچی میں قدم رکھا تھا اور ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے لوٹنے کی کوشش کی تھی۔ چند روز پہلے یہی ٹیکسی ڈرائیور، جرمنی سے آنے والی ارباب کی پھوپی کو لوٹ چکا تھا۔ عظیم اور ارباب کی بروقت آمد نے مجھے ٹیکسی ڈرائیور کے ہاتھوں لٹنے سے بچالیا تھا۔ ارباب کا تعلق محکمۂ پولیس سے تھا اور وہ انسپکٹر کے عہدے پر فائز تھا۔

عظیم کی زبانی معلوم ہوا کہ مصطفیٰ ایک تجربہ کار شیف تھا۔ وہ دیسی اور بدیسی ہر قسم کے کھانے بنانے کا ماہر تھا۔ مصطفیٰ کا انداز بڑا ڈھیلا ڈھالا اور وزن نارمل رینج سے متجاوز تھا۔ یہی محسوس ہوتا تھا کہ اسے کھانا پکانے سے زیادہ کھانا کھانے کا شوق تھا۔ وہ اگرچہ ایک ہیوی ڈیوٹی انسان تھا تاہم وہ علی کپور سے آدھا تھا۔ مصطفیٰ کو کینیڈا جانے کا شوق چڑھا ہوا تھا۔

''برو! میں دراصل مصطفیٰ ہی کے لیے تم سے کینیڈا کی معلومات حاصل کر رہا تھا۔'' عظیم نے کہا۔''مجھے بتاؤ، کیا شیف کے لیے وہاں کوئی اسکوپ ہے؟''

''ایک اچھے شیف کی دنیا کے ہر ملک میں بڑی ڈیمانڈ ہوتی ہے۔'' میں نے کہا۔''اور کینیڈا میں بھی یقیناً اس پیشے کے لیے بہت اسکوپ ہے لیکن آدمی اپنے کام کا ماہر ہونا چاہیے۔''

''آپ اس کی مہارت کا اندازہ اس بات سے لگالو کہ یہ کراچی اور اسلام آباد کے بعض معروف ہوٹلوں میں کام کر چکا ہے۔'' عظیم نے بتایا۔''اس نے شیف کا کورس بھی ایک انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ سے کیا تھا اور اب اسے کینیڈا کا بخار چڑھا ہوا ہے۔''

''یہ کافی دلچسپ اور پُرکشش بخار ہے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''اسد بھائی! میری یہاں کی جاب بھی ماشاء اللہ ٹھیک ٹھاک ہی ہے۔'' مصطفیٰ براہِ راست مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔''لیکن میں نے کینیڈا کی بہت تعریف سنی ہے۔ فی الحال، میں وزٹ ویزا پر وہاں جانا چاہتا ہوں۔ مہینا بھر کینیڈا میں رک کر وہاں کی زندگی کا مشاہدہ کروں گا۔ اگر میں نے محسوس کیا کہ میں وہاں کے ماحول میں ایڈجسٹ کر سکتا ہوں تو پھر مستقل قیام کے بارے میں کوئی فیصلہ کروں گا۔''

''ویری گڈ۔'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔''آپ کی سوچ بڑی مثبت اور معقول ہے۔ کینیڈا دنیا کے چھ بہترین ملکوں میں پہلے نمبر پر شمار کیا جاتا ہے۔''

''برو! یہ چھ ملک کون کون سے ہیں؟'' عظیم نے پوچھا۔

''نمبر ایک، کینیڈا۔ نمبر دو، آسٹریلیا۔ نمبر تین، نیوزی لینڈ۔ نمبر چار، امریکا۔ نمبر پانچ، جرمنی۔ نمبر چھ، سوئٹزرلینڈ...... کیا آپ کینیڈا کے نمبر ون ہونے کا راز جاننا چاہتے ہیں؟''

''جی...... بالکل...... ضرور......''

''کینیڈا میں صرف کہنے کی حد تک نہیں بلکہ عملاً بھی مرد اور عورت کو زندگی کے ہر شعبے میں یکساں حقوق اور ترقی کے یکساں مواقع حاصل ہیں۔ اس کی بہترین مثال وہاں کی گورنمنٹ ہے۔ ان کے ہاں جتنی بھی وزارتیں ہیں ان میں آدھی خواتین کے پاس اور آدھی حضرات کے پاس ہیں اور سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ کہ ہر وزیر اپنے شعبے کا اسپیشلسٹ ہے۔''

''زبردست......!'' مصطفیٰ نے پُرجوش انداز میں کہا۔ ''بس بھئی، میں تو کینیڈا ہی جاؤں گا۔ بھائی، آپ یہ بتائیں کہ کینیڈا کے ویزا کے لیے سب سے ضروری چیز کیا ہے؟''

''انوی ٹیشن۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔''جب تک کینیڈا کا کوئی سٹیزن آپ کو کینیڈا آنے کی دعوت نہ دے، کینیڈا کی ایمبیسی آپ کو وزٹ ویزا جاری نہیں کرتی۔ دیگر چھوٹی موٹی فارملیٹیز اس کے علاوہ ہیں۔ امریکا کے ویزا کے لیے سب سے اہم آپ کا پولیس کونسلیٹ میں لیا جانے والا انٹرویو ہے، باقی سب چیزیں ثانوی اہمیت کی حامل ہیں۔ اگر آپ نے انہیں مطمئن کر دیا تو سمجھ لیں کہ آپ کو ویزا مل گیا۔''

''کیا کینیڈا کے ویزا کے لیے بھی انٹرویو ہوتا ہے؟'' مصطفیٰ نے استفسار کیا۔

"نہیں۔" میں نے اسے بتایا۔ "کینیڈا کا وزٹ ویزا حاصل کرنے کے لیے آپ کو یعنی کراچی والوں کو کینیڈین ایمبیسی نہیں جانا پڑتا۔"

"پھر......" عظیم نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔ "پھر ویزا کیسے ملتا ہے؟"

"کینیڈا کی ایمبیسی اسلام آباد میں ہے۔ یہ سارا کام کوریئر سروسز کے ذریعے ہوتا ہے۔" میں نے بتایا۔ "ویزا کا اپلی کیشن فارم آپ آن لائن بھرتے ہیں۔ اس فارم کے نتیجے میں آپ کو چند کوڈز الاٹ کر دیے جاتے ہیں۔"

"پھر تو کوئی بہت ہی تگڑا کینیڈین ڈھونڈنا پڑے گا۔" مصطفیٰ نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "ور جس کے انوی ٹیشن میں دم خم ہو۔"

"ارے یار! تم انوی ٹیشن کی فکر نہ کرو۔" عظیم، مصطفیٰ کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔ "میں دو انوی ٹیشن منگواؤں گا۔ ایک ٹورنٹو سے اور دوسرا وینکوور سے۔ ہم دونوں بھائی ایک ساتھ ہی جائیں گے۔"

"ان شاء اللہ......!" مصطفیٰ نے کہا۔

علی کو اگلی صبح اپنی بیوی زرتاش کے ساتھ راولپنڈی جانا تھا اس لیے وہ جلدی اٹھ گیا۔ زرتاش کی کسی کزن کی منگنی تھی۔ اسی سلسلے میں وہ میاں بیوی صبح راولپنڈی جا رہے تھے۔ علی کو تو ایک ہفتے کے بعد واپس آ جانا تھا لیکن زرتاش کا عید کے بعد ہی واپسی کا ارادہ تھا۔ اغلب امکان یہی نظر آ رہا تھا کہ مہر النسا بھی عید کے بعد ہی امریکا سے واپس آنے والی تھی۔ گویا اس گھر میں عید بہوؤں کے بغیر ہی گزرنے والی تھی......!

راولپنڈی کے ذکر پر آپوں آپ میرا دھیان میڈم غریدہ کی طرف چلا گیا۔ وہ میڈم غریدہ جس کا تعلق راولپنڈی سے تھا اور جو کسی طرح برسوں پہلے امریکا پہنچ گئی تھی۔

اس نے امریکی ریاست کیلی فورنیا کے شہر سان ڈیاگو کو اپنے لیے چن لیا تھا۔ راولپنڈی میں اس کا تعلق ایک بیوروکریٹ فیملی سے تھا۔ اس نے سان ڈیاگو میں ایک کرسچین مرد الفریڈ سے شادی کر لی تھی۔ یہ ساری باتیں پریسٹن ہالو والے بنگلے پر ربی آئزک باروخ لاؤ نے مجھے بتائی تھیں۔ اس نے امریکا میں بہت محنت کی اور پھر وہ سان ڈیاگو میں پام ایونیو پر واقع سپر اسٹور "سیون الیون" کی فرنچائز منیجر بن گئی۔ اس کے بعد ان کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا جو لگ بھگ میرا ہم عمر تھا پھر...... ایک روز اچانک یہ تینوں افراد غائب ہو گئے۔ ربی آئزک کی ٹیم نے انہیں تلاش کرنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن بیس سال گزر جانے کے بعد بھی انہیں اس مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی تھی۔ ربی آئزک نے بڑے واضح الفاظ میں مجھے بتایا تھا کہ انہیں جس نوجوان کی تلاش ہے، وہ غیر معمولی ذہنی اور روحانی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ میں نے ربی کی باتوں سے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ اسے شک ہے کہ میں غریدہ اور الفریڈ کا بیٹا ہوں۔ میری حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ہی ربی نے اپنی چیلی ڈیلفینا کو میرے پیچھے لگایا تھا لیکن میں ڈیلفینا کی پیشکش کی ایسی کم تیسی کر کے ڈیلس سے ٹیکساس آ گیا تھا۔ اس کے بعد میری نہ تو ربی آئزک سے کوئی ملاقات ہوئی تھی اور نہ ہی ہسپانوی دوشیزہ ڈیلفینا سے سامنا ہوا تھا۔ ان لوگوں کی طرف مکمل خاموشی تھی اور...... میں بہ خوبی سمجھ رہا تھا کہ یہ خاموشی آگے چل کر میری زندگی میں کوئی خوفناک طوفان لانے والی تھی کیونکہ میں ان لوگوں کی طاقت اور اختیار کا نظارہ اپنی آنکھوں سے کر چکا تھا۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا وہ مجھے فراموش کر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھے میری واپسی کی راہ دیکھ رہے ہوں گے۔ وہ کسی بھی قیمت پر مجھے بھول نہیں سکتے تھے۔ عین ممکن تھا کہ وہ مجھے ٹریپ کرنے کے لیے کوئی نیا جال بُننے میں مصروف ہوں......!

"کہاں کھو گئے بھائی؟" عظیم کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "کوئی یاد آ رہا ہے کیا......!"

"ہاں یار......" میں نے صورتِ حال کو بڑے سلیقے سے سنبھالتے ہوئے افسردہ لہجے میں کہا۔ "کوئی بے طرح یاد آ رہا ہے۔"

عظیم نے ایک انگلی اپنی ناک پر رکھ کر اشارتی زبان میں پوچھا۔ "ہوں......؟"

"نہیں یار، وہ کوئی لڑکی نہیں ہے۔" میں نے بوجھل انداز میں بتایا۔

"پھر کون ہے؟"

"میرے انکل سلطان۔" میں نے کہا۔

"اوہ...... کیا ہوا انکل سلطان کو؟" اس کے لہجے میں تشویش در آئی۔

"ان کی ڈیتھ ہو گئی ہے......"

میں نے عظیم کو انکل علی سلطان کے بارے میں تفصیلاً بتا دیا تھا۔ اب ہمارے بیچ بہت ہی کم معاملات ڈھکے چھپے باقی بچے تھے۔ انکل سلطان کی موت کی خبر سن کر وہ اس طرح اچھلا جیسے اس نے بجلی کے ننگے تار کو چھو لیا ہو۔ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

"یہ کیسے ہوا...... کب ہوا......؟"

"ہارٹ اٹیک......" میں نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔ "کل شام اس وقت انہیں جان لیوا دل کا دورہ پڑا جب میں اوپر تمہارے کمرے میں ماں سے ملاقات کر رہا تھا۔"

"بہت افسوس ہوا یہ سن کر یار۔" وہ ہمدردی بھرے لہجے میں بولا۔ "اللہ پاک ان کی مغفرت کرے۔"

"آمین......!" میں نے پژمردہ آواز میں کہا۔

مصطفیٰ نے بھی اپنایت بھرے لہجے میں انکل کی موت پر مجھ سے تعزیت کی۔ تھوڑی دیر تک ہم چپ چاپ سوگوار فضا میں بیٹھے رہے پھر میں نے عظیم سے کہا۔

"تم مجھے ڈراپ کر دو۔ میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

مصطفیٰ کے چہرے کے تاثرات سے لگتا تھا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ جانے کی خواہش رکھتا تھا لیکن عظیم نے اس سے کہا۔

"مصطفیٰ! تم ادھر ہی بیٹھو۔ میں تھوڑی دیر میں واپس آ رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے بھائی۔" مصطفیٰ اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

عظیم نے وہائٹ وِٹز نکالی اور ہم وہاں سے روانہ ہو گئے۔ واپسی کے سفر میں، میرے اور عظیم کے درمیان علی سلطان ہی موضوعِ گفتگو بنے رہے۔ ساڑھے دس بجے رات ہم ماں کے زمزمہ والے بنگلے پر پہنچ گئے۔ بہ وقتِ رخصت میں نے اس سے پوچھا۔

"کل آفٹر نون میں تمہاری کیا مصروفیات ہیں؟"

"کوئی خاص نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "کوئی کام ہے تو بتاؤ......!"

"تمہارے پاس کمپیوٹر کا پرنٹر ہے؟"

"ہاں ہے۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور استفسار کیا۔ "خیریت...... پرنٹر کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟"

"کل میں ماں کا آن لائن ایپلی کیشن فارم بھرنا چاہتا ہوں۔ امریکا کے وزٹ ویزا کے لیے۔" میں نے بتایا۔ "ان کی تصویر اور بعض دوسری چیزیں اسکین کرنا ہوں گی اور بعض چیزوں کے فوری طور پر پرنٹ بھی چاہیے ہوں گے جو میں اپنے اکاؤنٹ سے اٹھاؤں گا۔"

"کوئی مسئلہ نہیں۔ سب ہے۔" وہ بے پروائی سے بولا۔

"ویری گڈ!" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔

"مبارک ہو یار!" وہ پُرخلوص انداز میں بولا۔ "تمہاری والدہ امریکا جانے کے لیے تیار ہو گئی ہیں۔"

"میں نے انہیں بڑی مشکل سے راضی کیا ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کے بدلے میں انہوں نے مجھ سے ایک وعدہ لیا ہے۔"

"کیسا وعدہ؟" اس نے پوچھا۔

"انہوں نے کہا ہے کہ وہ میرے ساتھ ایک مرتبہ امریکا جائیں گی تو پھر کبھی پلٹ کر واپس نہیں آئیں گی۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے عظیم کو بتایا۔ "مجھے وہاں ان کی مستقل رہائش کے حوالے سے تمام تر لیگل ارینج منٹس کرنا ہوں گے۔"

"اور یہ کام یقیناً تمہارے لیے مشکل ثابت نہیں ہوگا۔" وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"لیکن پھر تمہارے مشن کا کیا ہوگا؟"

"کون سا مشن......؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"اپنے باپ کے قاتلوں اور ماں کی عزت کے ہتھیاروں سے بھیانک انتقام لینے کا مشن۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "اگر تم اپنی والدہ کے ساتھ امریکا روانہ ہو جاؤ گے تو پھر تمہارے دشمنوں کو سزا کون دے گا؟ وہ اپنے عبرتناک انجام کو کیسے پہنچیں گے؟"

"یار! سچی بات تو یہ ہے کہ ان معاشرتی ناسوروں کو نیست و نابود کرنے کا بہت جی کرتا ہے۔" میں نے پھنکار سے مشابہ آواز میں کہا۔ "لیکن ماں نے اپنی قسم سے میرے ہاتھ باندھ دیے ہیں۔"

وہ حیرت بھرے لہجے میں مستفسر ہوا۔ "کیسی قسم برو؟"

"ماں نے مجھے قسم دی ہے کہ میں کسی بھی برے شخص سے نہیں الجھوں گا۔" میں نے اسے بتایا۔ "ان کی خواہش ہے کہ ہم دونوں ماں بیٹا جلد از جلد یہاں سے نکل جائیں۔ وہ کہتی ہیں، انہوں نے اپنا معاملہ مالک کے سپرد کر دیا ہے۔"

"برو! تمہاری ماں بڑی حوصلے والی عظیم عورت ہیں۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ورنہ انسان عموماً اپنی نفسیات کے زیرِ اثر موقع میسر آتے ہی اپنے دشمن سے انتقام لینے کے بارے میں سوچتا ہے۔ اپنے معاملات کو اللہ کے حوالے کر دینا پختہ ایمان اور اعلیٰ ظرفی کی روشن دلیل ہے۔ سلمیٰ آنٹی نے اپنا کیس اللہ کی عدالت میں لگا کر بات ہی ختم کر دی ہے ورنہ......"

وہ بولتے بولتے اچانک رک گیا تو میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔ "ورنہ کیا؟"

''ورنہ یہ کہ......'' وہ خاصے سنگین لہجے میں بولا۔'' تم دونوں ماں بیٹا کے یہاں سے چلے جانے سے بھی کوئی فرق نہ پڑتا......''

اس کی بات نے مجھے الجھادیا۔'' کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔'' تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟ تم کون سا فرق نہ پڑنے کی بات کر رہے ہو؟''

''مطلب یہ کہ تم لوگ ادھر امریکا میں آرام سے بیٹھے رہتے اور یہاں تمہارے دشمنوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی جاتی۔'' وہ بہ دستور سنگین انداز میں بولا۔'' میرے لنک میں ایسے لوگ ہیں جو میری آنکھ کے اشارے پر کسی بھی طرم خان کو اس دنیا سے اس دنیا میں پہنچا سکتے ہیں یا کم از کم ان کی ہڈیوں کا سرمہ بنا سکتے ہیں......''

''ایسا کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں ہے میرے دوست۔'' میں نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔'' مجھے تمہاری جاں نثاری اور وفاداری پر کوئی شک نہیں لیکن ایک عام سا اصول ہے کہ جب کوئی معاملہ دنیاوی عدالت میں ہو تو پھر اس کیس پر اخلاقی اور احتیاطی تقاضوں کے پیشِ نظر ''دائے زنی'' سے اجتناب برتا جاتا ہے اور یہاں تو معاملہ مالک کی عدالت میں رکھا جا چکا ہے......اور تم جانتے ہو، قدرت کے سامنے کسی کی پیش نہیں چلتی۔ ہمیں خاموش تماشائی بن کر قدرت کے کھیل کو دیکھنا ہوگا اور پھر مالک کی عدالت سے جو فیصلہ صادر ہو، اس پر سرِ تسلیم خم کرنا ہوگا۔''

''میں تمہاری بات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں برادر۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔'' اسی لیے تو میں نے شروع ہی میں کہہ دیا تھا کہ......آنٹی سلمٰی نے اپنا کیس اللہ کی عدالت میں لگا کر بات ہی ختم کر دی ہے۔''

میرے اور عظیم کے بیچ کیمسٹری کچھ ایسی میچ کر گئی تھی کہ جب ہم ایک دوسرے سے دور ہوتے تھے تو شدت سے ملنے کو دل چاہتا تھا اور جب مل جاتے تھے تو پھر جدا ہونے کو من نہیں کرتا تھا۔ اس وقت بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال تھی۔ عظیم نے مجھے ماں کے بنگلے پر پہنچا دیا تھا لیکن ابھی تک میں اس کی گاڑی کے اندر ہی تھا اور ہمارے مابین بات چیت جاری تھی۔ میں نے گاڑی سے نکلنے کے لیے دروازے کی جانب ہاتھ بڑھایا تو اس نے کہا۔

''برو! جاتے جاتے ایک بات بتادو......''

میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔

''یار! تم نے کینیڈا کی مختلف وزارتوں کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے وہ سب سچ ہے نا......؟''

''ایک دم سنٹ پرسنٹ سچ۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔'' کینیڈا کی تمام منسٹریز اور ان پر کام کرنے والے سب پروفیشنلز ایک کھلی حقیقت ہیں۔ کینیڈین گورنمنٹ کو اپنے ملک اور اس ملک میں بسنے والے ہر شخص کے کامیاب حال اور خوشگوار مستقبل کی بڑی فکر ہے اسی لیے گورنمنٹ کے کسی بھی شعبے میں کسی نالائق یا نان پروفیشنل کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ واقفانِ حال کینیڈا کو بہشتِ ارضی بھی کہتے ہیں۔''

''کاش! میرا ملک پاکستان بھی ایک جنتِ نظیر وطن بن جائے!'' وہ خواب ناک لہجے میں بولا۔'' یہاں کے حالات اور معاملات کو دیکھ کر قسم سے دل کڑھتا ہے۔''

''میں تمہارے احساسات کو سمجھ سکتا ہوں یار۔'' میں نے ایک بار پھر اس کے کندھے کو تھپتھپایا۔

''وقت بھی ایک سا نہیں رہتا میرے دوست۔'' میں نے ایک ٹھوس حقیقت بیان کرتے ہوئے کہا۔'' امید کا دامن کسی بھی حال میں ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔''

''یار! کینیڈا پاکستان کے مقابلے میں کافی بڑا ملک ہے۔'' عظیم نے کہا۔'' لیکن وہاں آبادی کے وہ مسائل نہیں ہیں جو یہاں پاکستان میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔''

''بالکل ...... یہی ان کی کامیابی کا راز ہے عظیم صاحب۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔'' اس وقت کینیڈا کی آبادی تین کروڑ پچپن لاکھ ہے جبکہ پاکستان کی آبادی انیس کروڑ دس لاکھ ہے۔یعنی پاکستان آبادی کے لحاظ سے کینیڈا کے مقابلے میں ساڑھے پانچ گنا زیادہ آبادی والا ملک ہے۔ کینیڈا کا سب سے زیادہ آبادی والا شہر ٹورنٹو ہے۔ اس کے بعد اوٹاوا کا نمبر آتا ہے جو کہ کینیڈا کا کیپٹل بھی ہے۔''

''یار! کراچی کے بارے میں تمہاری کیلکولیشن کیا کہتی ہے؟'' عظیم نے پوچھا۔

میں نے جواب دیا۔'' اس وقت کراچی کی کُل آبادی چوبیس ملین یعنی دو کروڑ چالیس لاکھ نفوس پر مشتمل ہے اور اس شہر کا رقبہ تین ہزار پانچ سو ستائیس مربع کلومیٹر ہے۔ کراچی دنیا کا چوتھا زیادہ آبادی والا شہر ہے......بس یا کچھ اور؟''

''یار! تم سائیکالوجی کے اسٹوڈنٹ ہو مگر تمہاری جغرافیہ کی نالج بہت زیادہ ہے۔'' وہ تعریفی انداز میں بولا۔

''یہ ٹھیک ہے، میں براز وسپورٹ کالج میں علم نفسیات یعنی سائیکالوجی کی تعلیم حاصل کر رہا ہوں مگر میں علم ارضیات میں بھی خصوصی دلچسپی رکھتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''اس لیے جیولوجی اور جیوگرافی کے معاملات پر مجھے کافی دسترس حاصل ہے۔''

وہ کل سہ پہر میں آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گیا۔ میں بنگلے میں داخل ہوا اور سیدھا ماں کے پاس پہنچ گیا۔ وہ میرا ہی انتظار کر رہی تھیں۔

ہم دونوں نے ایک ساتھ بیٹھ کر ڈنر کیا پھر ہمارے درمیان حالاتِ حاضرہ پر گفتگو کا سلسلہ چل نکلا۔ میں نے ماں کو کپور صاحب سے ہونے والی میٹنگ کا احوال سنایا۔

انہوں نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر کہا۔ ''کپور صاحب کا مشورہ بالکل ٹھیک ہے۔ مجھے کہیں اور شفٹ ہونے کا رسک نہیں لینا چاہیے بلکہ اسی بنگلے پر رہتے ہوئے اپنے معاملات کو بڑی احتیاط کے ساتھ ہینڈل کرتے ہوئے تمہارے ساتھ جلد از جلد امریکا روانہ ہو جانا چاہیے۔''

''جب تک آپ کو امریکا کا وزٹ ویزا نہیں مل جاتا، ہم یہاں سے روانہ نہیں ہو سکتے کیونکہ مجھے ہر قیمت پر آپ کو بھی ساتھ لے کر جانا ہے اور میں سمجھتا ہوں، اس پراسس میں ایک سے دو ہفتے لگ سکتے ہیں۔'' میں نے اپنے ذہن میں موجود خیالات ماں تک پہنچاتے ہوئے کہا۔

''کوئی حرج نہیں ہے۔'' وہ سنجیدہ لہجے میں بولیں۔ ''دو کے بجائے اگر تین ہفتے بھی لگ جائیں تو انتظار کیا جا سکتا ہے۔''

'' بات انتظار کرنے کی نہیں ہے ماں......!'' میں نے متذبذب انداز میں کہا۔

وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مستفسر ہوئیں۔

''پھر کیا بات ہے؟''

'' اصل مسئلہ میری شناخت کا ہے۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے بتایا ہے کہ میں اپنے والد کی کاپی ہوں۔ آپ کے ساتھ میرا آزادانہ گھومنا پھرنا کوئی پرابلم بھی کھڑی کر سکتا ہے۔''

''یہ پوائنٹ میرے ذہن میں بھی ہے میرے لعل۔'' وہ محبت پاش نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولیں۔ ''اور اس سلسلے میں تم سے زیادہ ... فکرمند ہوں۔''

''ماں! آپ کے اس بنگلے پر بھی تو لوگوں کی آمد ہوتی ہے۔'' میں نے دل کی بات کو زبان پر لاتے ہوئے کہا۔ ''یہاں میری موجودگی اگر راز میں نہیں رہے گی تو پھر بھی کسی وقت کوئی مسئلہ کھڑا ہو سکتا ہے......!''

''میں تمہارا پوائنٹ سمجھ گئی علی۔'' وہ بڑی رسان سے بولیں۔ ''پہلی بات تو یہ کہ اس بنگلے پر لوگوں کی بھی بھیڑ نہیں لگی اور نہ ہی تواتر سے کسی کا آنا جانا رہا ہے۔ یہاں صرف وہی شخص آتا ہے جسے میں آنے کی اجازت دیتی ہوں اور میں صرف اسی شخص کو آنے کی اجازت دیتی ہوں جو میرے لیے قابلِ بھروسا ہوتا ہے......'' چند لمحات کا توقف کر کے انہوں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہاں تک رسائی حاصل کرنے والے افراد میں صرف ایک شخص ایسا ہے جس نے تمہارے والد کو دیکھا ہوا ہے لہٰذا صرف وہی تمہیں دیکھ کر چونک سکتا ہے کیونکہ تمہاری صورت میں اسے حیدر علی کا چہرہ نظر آئے گا اور یہ شخص میرا سچا خیرخواہ ہے۔ میں اس پر ٹرسٹ کرتی ہوں۔''

ماں نے اس شخص کے حوالے سے جب ذکر کیا کہ وہ میرے والد کا صورت آشنا ہے تو میرا دھیان فوری طور پر جاوید واسطی کی طرف چلا گیا۔ انکل بیگ نے مجھے بتایا تھا کہ ماں نے آج سے انیس سال پہلے ایک سال کی عمر میں مجھے جاوید واسطی نامی ایک شخص کے ساتھ کراچی سے نیویارک بھجوایا تھا۔ بیگ صاحب کے مطابق، جاوید واسطی میری والدہ کا خیرخواہ تھا اور وہ میرے خاندانی پس منظر سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔ ماں نے جب جاوید واسطی کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو واسطی نے ایک ریکروٹنگ ایجنٹ دوست کی مدد سے مجھے بی سی پاسپورٹ پر کراچی سے نیویارک پہنچانے کا بندوبست کر دیا تھا۔ ابھی ماں نے اپنے کسی سچے خیرخواہ کا تذکرہ کیا تو میرے ذہن میں جاوید واسطی کا نام چمک اٹھا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ یہ وہ شخص نہیں ہوگا۔

''میں آپ کے ایک دیرینہ خیرخواہ کو جانتا ہوں۔'' میں نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن وہ تو اب اس دنیا میں باقی نہیں۔''

''تم کس کی بات کر رہے ہو میرے لعل؟''

''جاوید واسطی کی......!'' میں نے کہا۔

'' اوہ......'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولیں۔ '' واسطی صاحب واقعی بہت عظیم انسان تھے۔ انہوں نے ایک ایسے نازک موقع پر میری مدد کی تھی جب میرا کوئی پُرسانِ حال نہیں تھا۔ کچھ عرصہ پہلے وہ اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ خدا انہیں غریقِ رحمت کرے......'' وہ لمحے بھر کو رکیں پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں اضافہ کیا۔

''میں اس وقت کسی اور آدمی کا ذکر کر رہی تھی۔''

''تو پھر آپ خود ہی بتا دیں کہ وہ آدمی کون ہے۔'' میں نے کہا۔ ''جو میرے والد کا صورت آشنا ہے؟''

''اس شخص کا نام ہے نادر شاہ......''

''ان صاحب کا ذکر تو آپ دوپہر میں بھی کر چکی ہیں۔'' میں نے ماں کو یاد دلایا۔ ''اور کل آپ نادر شاہ صاحب سے میری ملاقات بھی کروانے والی ہیں۔''

''بالکل...... میں نے شاہ جی کو کل شام میں یہاں بلایا ہے۔'' انہوں نے بتایا۔ ''ان سے مل کر یقیناً تمہیں خوشی ہوگی۔ یہی ایک شخص ہے جو تمہیں دیکھ کر فوراً پہچان سکتا ہے کہ تم حیدر علی کی اولاد ہو۔ میں چونکہ شاہ جی پر اندھا اعتماد کرتی ہوں اس لیے میں نے خود ہی انہیں تمہارے بارے میں بتادیا ہے۔''

''اوہ......'' میں نے تشویش بھری نظر سے ماں کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا اس راز سے شاہ جی بھی واقف تھے کہ انیس سال پہلے آپ نے مجھے جاوید واسطی کے ذریعے کراچی سے نیویارک بھجوادیا تھا؟''

''نہیں!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولیں۔

''یہ راز صرف میں، جاوید واسطی، مرزا عامر بیگ اور علی سلطان ہی جانتے تھے۔ ان چار افراد میں سے دو یعنی جاوید واسطی اور علی سلطان عدم آباد روانہ ہوچکے ہیں۔ میں کراچی میں اور مرزا عامر بیگ نیویارک میں موجود ہیں اور چند دنوں کے بعد میں بھی تمہارے ساتھ امریکا پہنچ جاؤں گی گویا...... یہ راز امریکا ہی میں محفوظ ہوجائے گا۔''

''جب نادر شاہ اس راز سے واقف نہیں ہیں تو پھر انہیں اس راز میں شامل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟'' میں نے ایک اہم سوال کیا۔

''میں نادر شاہ کو اس راز میں شریک کرنے کی بات نہیں کررہی کہ میں نے آج سے انیس سال پہلے کس طرح تمہیں نیویارک بھجوایا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولیں۔ ''وہ معاملہ تو اتنا خفیہ تھا کہ نادر شاہ کو اس کی کوئی خبر نہیں حتیٰ کہ وہ تو نہ جاوید واسطی کو جانتا ہے اور نہ ہی اس ریکروٹنگ ایجنٹ کو جس نے تمہیں نیویارک پہنچایا تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میں تمہیں نادر شاہ سے کیوں ملوانا چاہتی ہوں......!''

''جی بالکل......'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اس وقت میرے ذہن میں سب سے اہم یہی سوال ہے۔''

''نادر شاہ یہ بات جانتے ہیں کہ میں نے ایک بچے کو جنم دیا تھا پھر وہ بچہ کہیں گم ہوگیا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولیں۔ ''اس دوران میں بھی کبھار وہ میرے گمشدہ بچے کا ذکر لے آتے تھے اور میں ٹھنڈی آہ بھر کر خاموش ہوجاتی تھی۔ وقت دبے پاؤں آگے بڑھتا گیا اور نادر شاہ اپنے اپنائیت بھرے پُرخلوص رویے کے باعث میرے قریب آتے گئے۔ جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا ہے کہ بعض نازک مواقع پر انہوں نے میری بے لوث مدد بھی کی۔ نتیجتاً، میں ان پر بھروسا کرنے لگی لیکن میں نے کبھی انہیں تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ ان کے سامنے تمہارا جب بھی ذکر ہوا تو انہوں نے خلوص دل سے دعا کی کہ تم جہاں بھی ہو، اللہ تمہیں سلامت رکھے اور میری آنکھ بند ہونے سے پہلے اللہ تمہیں مجھ سے ملوادے۔ میں نے نادر شاہ کے خلوص کو بھی شک کی نگاہ سے نہیں دیکھا اور میں نے ان سے وعدہ کررکھا تھا کہ جیسے ہی مجھے تمہارا کوئی سراغ ملا، میں تمہیں ان سے ضرور ملواؤں گی۔''

لحاتی توقف کر کے انہوں نے ایک طویل آسودہ سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے آج نادر شاہ کو بتایا ہے کہ مجھے تمہارا سراغ مل گیا ہے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ تم مجھے کہاں سے ملے ہو اور اس وقت تم کہاں ہو؟ میں نے ان سے کہا کہ وہ کل شام میں میرے گھر آجائیں پھر میں انہیں تفصیل سے آگاہ کروں گی۔''

''گویا شاہ جی یہ بات نہیں جانتے کہ میں اس وقت آپ کے بنگلے پر موجود ہوں؟''

''نہیں...... میں نے انہیں ایسی کوئی بات نہیں بتائی۔'' وہ معتدل انداز میں بولیں۔ ''جب وہ یہاں آجائیں گے تو میں انہیں سرپرائز دوں گی اور تمہاری طرف اشارہ کرکے ان سے کہوں گی...... پہچانیں، یہ کون ہے؟''

ماں نے آخری جملہ کسی معصوم بچے کے انداز میں ادا کیا تھا۔ میں نے کہا۔

''اور یقیناً شاہ جی مجھے پہچان لیں گے کیونکہ وہ میرے والد کے صورت آشنا ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اور میں شکل وشباہت میں اپنے والد کی کاپی ہوں۔''

''بالکل...... ایسا ہی ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''یہاں تک تو ٹھیک ہے۔'' میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ ''اس کے بعد آپ انہیں میرے بارے میں کیا کہانی سنائیں گی کہ میں نے یہ انیس سال کہاں گزارے؟ میں گم کیسے ہوا تھا؟ اب واپس کیسے آیا ہوں۔ وغیرہ وغیرہ...... کیا اس مرحلے پر آپ انہیں حقائق سے آگاہ کردیں گی؟''

''ہرگز نہیں میرے بچے!'' وہ پوری قطعیت سے بولیں۔ ''جب تک میں امریکا نہیں پہنچ جاتی، تمہارے

بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ شاہ جی سے میں نے چونکہ وعدہ کر رکھا تھا اس لیے تمہاری بازیابی کا انہیں بتانا میں اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ ان کی تسلی کے لیے فوری طور پر رفیق صاحب والی کہانی مناسب رہے گی۔''

''رفیق صاحب والی کہانی......!'' میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''میں کچھ سمجھا نہیں ماں؟''

''میں نے تمہارے سامنے نگینہ آنٹی سے تمہارا تعارف کراتے ہوئے اسے بتایا تھا کہ تم میرے ایک عزیز ہو، تمہارا نام رفیق ہے اور تم ادھر جدہ میں رہتے ہو۔ تم نے ہی میرے لیے عمرے کا انتظام کیا ہے اور میں فرصت کے تمام ایام تمہارے پاس جدہ میں قیام کروں گی۔'' ماں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''نادر شاہ کو بھی میں یہی کہانی سناؤں گی مگر تھوڑی تبدیلی کے ساتھ......'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھمیں پھر اپنی پلاننگ کو آگے بڑھاتے ہوئے بتانے لگیں۔

''نادر شاہ کو میں بتا چکی ہوں کہ تم مجھے مل گئے ہو۔ اب کل انہیں تم سے ملوانے کے بعد یہ اضافہ کرنا ہے کہ آج کل تم جدہ میں ہوتے ہو اور وہاں کوئی ریسٹورنٹ چلا رہے ہو۔ تم نے میرے لیے عمرے کا بندوبست کیا ہے اور میں تمہارے ساتھ مہینے بھر کے لیے سعودی عرب جا رہی ہوں۔''

''مگر شاہ جی سے یہ غلط بیانی کرنے کی کیا ضرورت ہے ماں؟'' میں نے الجھن زدہ نظر سے ان کی طرف دیکھا۔ ''ایک طرف آپ ان پر اندھا اعتماد کرتی ہیں اور دوسری جانب......'' میں نے متذبذب انداز میں سر کو نفی میں حرکت دی اور کہا۔ ''کیا وہ آپ سے یہ نہیں پوچھیں گے کہ میں انیس سال تک کہاں رہا؟ مجھے کس ظالم نے آپ سے چھینا تھا اور میں جدہ کیسے پہنچا؟ انیس سال تک میں نے آپ سے رابطہ کیوں نہیں کیا......وغیرہ ہا۔''

''یقیناً نادر شاہ مجھ سے یہ تمام سوالات پوچھیں گے اور انہیں مطمئن کرنے کے لیے میرے پاس مدلل جوابات بھی ہیں لیکن اس کی تفصیل میں تمہیں چند منٹ کے بعد بتاؤں گی۔ پہلے غلط بیانی والے معاملے کو کلیئر کر دوں۔'' وہ بڑے اعتماد کے ساتھ مجھ سے محو گفتگو تھیں۔

میں ان کے چہرے پر نگاہ جمائے ہمہ تن گوش بیٹھا تھا۔ وہ اپنے بیان کو دراز کرتے ہوئے بولیں۔ ''اگر میں نادر شاہ سے یہ کہوں گی کہ میں تمہارے ساتھ عمرے پر جا رہی ہوں اور اس عمرے کا سارا ارینج منٹ تم نے کیا ہے تو اس میں دروغ گوئی والی کوئی بات نہیں ہوگی۔ میں واقعی عمرے پر جانے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ برائی کی راہ کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہنے کے بعد اللہ کے گھر میں حاضری ضروری ہے۔ میں اس مقدس کام کے اخراجات اٹھانے کی استطاعت رکھتی ہوں اور تم بھی محرم کی حیثیت سے میرے ساتھ حرم جاؤ گے اور عمرہ ادا کرو گے۔ کسی محرم کے بغیر اکیلی عورت یہ کام نہیں کر سکتی۔ تم میری یہ خواہش پوری کرو گے نا۔ میں اپنے ٹریول ایجنٹ سے کہہ کر تمہارے لیے سعودیہ کے ویزا کا انتظام کر دوں گی۔''

''جہاں تک آپ کی خواہش کا معاملہ ہے تو......بس! میں کسی بھی قیمت پر آپ کی خواہش کو رد نہیں کر سکتا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''الحمدللہ میں مسلمان ہوں اور اس نیک سعادت کے لیے حاضر بھی ہوں۔''

''خوش رہو۔ اچھا سنو! میں نادر شاہ کو بتاؤں گی کہ ایک سال کی عمر میں تمہیں اغوا کر لیا گیا تھا پھر مختلف ہاتھوں سے ہوتے ہوئے تمہیں سعودی عرب پہنچا دیا گیا۔ تمہارا بچپن اور نوجوانی ایک غلام کی حیثیت سے گزری پھر کسی طرح تم اس غلامی سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ تم نے سعودی عرب کے مختلف علاقوں میں قسمت آزمائی کی اور پھر جدہ کو اپنا مستقل ٹھکانا بنا لیا۔ آج کل تم وہاں ایک ریسٹورنٹ چلا رہے ہو۔ میرا خیال ہے، اسے میری کہانی پر یقین آ جائے گا۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ ہمیں تو یہاں چند دن رہنا ہے......''

''ٹھیک ہے ماں! آپ نے جو بھی منصوبہ بنایا ہے، میں آپ کے ساتھ ہوں۔'' میں نے ماں سے زیادہ حجت نہیں کی اور صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ شاہ جی کو جو بھی کہانی سنائیں' یہ آپ کا اور ان کا معاملہ ہے۔''

''میرے بچے! اگر میں ''حیدر علی ٹرسٹ'' کے حوالے سے نادر شاہ کے ہاتھ میں کروڑوں روپے دینے کو تیار ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اس شخص پر مکمل بھروسا کرتی ہوں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولیں۔ ''جب ہم دونوں بہ خیریت امریکا پہنچ جائیں گے تو پھر میں نادر شاہ کو حقائق سے آگاہ کر دوں گی۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''جی ماں! آپ کو وضاحت پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔''...... اس کے بعد میں ماں کے حکم پر سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا اور چینج کر کے جب بستر پر آیا تو میرا ذہن انکل علی سلطان کی طرف چلا گیا۔ میرا ان کے ساتھ خون کا رشتہ نہیں تھا مگر زندگی کے تجربے نے مجھے بتایا

تھا کہ روح کا رشتہ خون کے رشتے سے بھی زیادہ مضبوط اور پائیدار ہوتا ہے۔ ہمارے بیچ روحوں کا میلان پایا جاتا تھا۔

انکل سلطان کے بارے میں سوچتے ہوئے میرا دھیان ربی آئزک کی طرف چلا گیا۔ ڈیلس میں پریسٹن ہالو والے بنگلے پر ربی نے مجھ سے روحانی میلان کے حوالے سے بڑی اہم اور قابلِ غور باتیں کی تھیں۔ اس نے اپنی تاثر انگیز آواز میں مجھے بتایا تھا کہ ہم سب ایک آدم کی اولاد ہیں اور ہمارے بیچ برادرہڈ یعنی بھائی چارے کا رشتہ قائم ہے۔ تمام انسان ایک خالق کی مخلوق ہیں، ایک سمندر کے قطرے ہیں، ایک شجر کے پتے ہیں، ایک گھڑیال کے کانٹے ہیں اور ایک فیملی کے ممبرز ہیں۔ جس طرح ایک خاندان کے بعض افراد کے بیچ بہت زیادہ ذہنی ہم آہنگی پائی جاتی ہے، اسی طرح ارواح کے عالم میں بھی بعض روحوں کے مابین بڑا مضبوط تعلق پایا جاتا ہے۔ جو روحیں ایک دوسرے سے بہت زیادہ ہم آہنگ ہوتی ہیں، ان کے حامل انسان ایک دوسرے کے سچے دوست یعنی سول میٹ ہوتے ہیں۔ وہ چاہے زندگی بھر ایک دوسرے کے ساتھ رہیں یا وہ زندگی میں کبھی بھی ایک دوسرے سے نہ ملے ہوں مگر ان کی روحیں بہ خوبی ایک دوسرے کو پہچانتی ہیں۔ ربی نے میرے اور اپنے حوالے سے کہا تھا کہ ہم دونوں سول میٹ ہیں۔ اسی تناظر میں اس وقت میں یہ محسوس کررہا تھا کہ انکل علی سلطان بھی میرے سول میٹ تھے......!

آہ...... میرا روحانی ساتھی مجھ سے بچھڑ گیا تھا۔ انکل سلطان کی ابدی جدائی کا سوچ کر یہی محسوس ہورہا تھا جیسے میرے جسم سے روح رخصت ہوگئی ہو......!

☆☆☆

اس رات میں نے بڑا معنی خیز خواب دیکھا۔

میں سائیکالوجی کا اسٹوڈنٹ رہا ہوں اس لیے جب بھی میرے بیان میں کوئی ایسی سچویشن آتی ہے جہاں انسانی نفسیات کا عمل دخل ہو تو میں جزئیات میں ڈوب جاتا ہوں۔

میں نے اس رات جو عجیب وغریب خواب دیکھا، وہ ماضی قریب کے ایک خواب کا تسلسل تھا۔ پہلے یہ خواب میں نے ڈیلس میں پریسٹن ہالو والے بنگلے پر دیکھا تھا جب میں بہتر گھنٹوں کے لیے کافر ادا ہسپانوی دوشیزہ ڈیلفینا کا مہمان بنا ہوا تھا اور اس وقت میں اپنی ماں کے بنگلے پر موجود تھا۔

میں نے دیکھا کہ ایک کشادہ ہال ہے اور اس ہال میں دو درجن سے زیادہ افراد جمع ہیں جن میں مرد وزن سب شامل ہیں۔ وہاں کا ماحول قدیم زمانے کا ہے جیسا کہ یونانی تہذیب ہوتی ہے۔ وہاں پر موجود تمام افراد نے مخصوص قسم کے لباس پہن رکھے ہیں۔ یہ قیمتی لباس جبہ نما ہیں۔ اپنے پہناوے اور شخصیت کے لحاظ سے وہ سب بڑے محترم اور معتبر نظر آتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بڑے سلجھے ہوئے اور شائستہ انداز سے پیش آرہے ہیں۔ انہی لوگوں میں مجھے ڈیلفینا کی جھلک دکھائی دی۔ وہ بڑی بجی اور سنوری ہوئی تھی۔ اس نے کمال کا بناؤ سنگھار کررکھا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ تقریب اسی کے نام ہو۔ پھر اس عالی شان ہال میں، میں نے ایک ایسے شخص کو داخل ہوتے دیکھا جو پہلے نظر آنے والے خواب میں میرے لیے اجنبی تھا لیکن اب کی بار میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ متاثر کن شخصیت کا مالک انسان ربی آئزک بارو خ لاؤ تھا۔ وہ وہاں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے آیا تھا۔ اسے دیکھ کر وہاں موجود تمام افراد باادب، باملاحظہ، ہوشیار ہوگئے تھے۔ ربی ڈیلفینا کے نزدیک پہنچ کر رک گیا۔ ڈیلفینا نے جھک کر عقیدت بھرے انداز میں ربی کے ہاتھ چومے۔ ربی نے ڈیلفینا کی پیشانی پر بوسہ دیا اور اس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرا اور تقریب کا باقاعدہ آغاز ہوگیا۔ پھر ربی نے اپنے ہاتھوں سے ڈیلفینا کو ایک تاج پہنایا۔ وہاں پر موجود تمام افراد نے ڈیلفینا کو مبارک باد دی۔ ہونٹوں پر ملکوتی مسکراہٹ سجائے ڈیلفینا نے سب سے مبارک سلامت وصول کی۔ اس کے بعد ربی آئزک نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔

''یہ تاج پوشی ایک خاص مقصد کے تحت تھی۔ جیسا کہ تم لوگوں کو معلوم ہے کہ ڈیلفی کا ایک انتہائی اہم پروموشن ڈیو تھا۔ آج اسے اس اعزاز سے نواز دیا گیا ہے۔ اب یہ سوسائٹی میں اس ڈگری تک پہنچ گئی ہے جس کی یہ مستحق ہے۔ اپنا حق حاصل کرنے کے لیے اس نے بڑی محنت کی ہے۔ اس نے بڑی ہمت اور ثابت قدمی سے اپنے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ کو جس طرح شکست دی ہے وہ آپ سب کے لیے ایک روشن اور سبق آموز مثال ہے۔ جونیئرز ڈیلفی کی کارکردگی سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔''

اس کے بعد تقریب کا اختتام ہوگیا تھا۔ میں اس ہال میں موجود تمام افراد کو بڑے واضح انداز میں دیکھ رہا تھا لیکن مجھے اس بات کا بھی بہ خوبی احساس تھا کہ میں ان لوگوں کے بیچ حاضر نہیں ہوں۔ ان میں سے کوئی بھی مجھ سے مخاطب نہیں ہورہا تھا اور نہ ہی کسی نے میری جانب توجہ دی تھی۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے میں مذکورہ ہال سے کہیں دور بیٹھا، اس تقریب کو ٹی وی اسکرین پر لائیو دیکھ رہا ہوں۔

لیکن یہ میری غلط فہمی تھی کہ میں سب کو دیکھ رہا ہوں اور کوئی میری طرف متوجہ نہیں ہے۔ اس عظیم ہال میں جمع مرد و زن میں سے ایک انسان مجھے بھی دیکھ رہا تھا اور وہ تھی ڈیلفینا عرف ڈیلفی......!

وہ مجھ سے ہم کلام ہوئی تھی۔ یہ بڑا پُرمعنی اور سنسنی خیز مکالمہ تھا۔

"بچو......! مجھ سے کہاں تک بچو گے۔ تم اس دنیا یا اس دنیا کے کسی بھی حصے میں پہنچ جاؤ، مجھے تمہارے قریب آنے سے کوئی نہیں روک سکتا اور اس کے لیے مجھے کوئی خاص کوشش بھی نہیں کرنا پڑے گی کیونکہ یہ دنیا گول ہے اور تم ایک دائرے میں بھاگ رہے ہو۔ میں اگر کسی ایک مقام پر ٹھہر بھی جاؤں تو تم لامحالہ مجھ سے آ کر ٹکراؤ گے۔ بھاگو...... جتنا تیز بھاگ سکتے ہو...... مجھ سے دور ہونے کے لیے اپنے جسم و جاں کی ساری توانائی صرف کر ڈالو...... میں کسی نہ کسی طرح تم تک پہنچ ہی جاؤں گی......"

اس کے انداز میں ایک کھلا چیلنج تھا۔ ڈیلفینا کے الفاظ کی سنسنی خیزی نے مجھے ہلا... کر رکھ دیا اور میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

میرا پورا بدن پسینا اگل رہا تھا اور دل کی دھڑکن بھی بلند ترین سطح کو چھو رہی تھی۔ بیڈ روم کا ائرکنڈیشنر بڑی سبک خرامی سے اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔ کمرے کا درجۂ حرارت اتنا تھا کہ پسینا آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یقیناً یہ اس خواب کے اثرات تھے جو تھوڑی دیر پہلے میں نے دیکھا تھا اور اس سنسنی خیز خواب نے میرا بلڈ پریشر بڑھا دیا تھا۔ میری یہ کیفیت ڈیلفینا کے اس معنی خیز چیلنج کے باعث ہوئی تھی جس کے مطابق، وہ مجھے چھوڑنے والی نہیں تھی۔ اس کے مزید۔عزائم کیا تھے، سرِدست میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ میں تو اس کے صرف ایک ہی عزم سے واقف تھا کہ وہ مجھے اپنی سوسائٹی کا ممبر بنانا چاہتی تھی اور میں نے ڈیلفینا کی اس خواہش کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالا تھا۔ پریسٹن ہالو والے بنگلے پر میں نے اس کی پیشکش کی بقول کسے، مٹی پلید کر دی تھی۔ وہ میرے فیصلے پر زخمی شیرنی کے مانند بہت تلملائی تھی۔ اس وقت ڈیلفینا کو مجھ پر غرانے یا مجھ پر جھپٹنے کا موقع نہیں ملا تھا لیکن اب مجھے اس کے انداز میں بلا کی غراہٹ اور خوفناکی محسوس ہوئی تھی۔

میں نے تین چار گہری سانسیں لے کر اپنے حواس کو مجتمع کیا پھر میری نگاہ دیوار گیر کلاک کی جانب اٹھ گئی۔ کلاک ڈھائی بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ میں لگ بھگ ساڑھے بارہ بجے سویا تھا اور سونے سے پہلے میں نے اپنے دماغ کو

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے
امریکا کینیڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔
رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون 021-35895313 فیکس 021-35802551

ہدایت بھی دی تھی کہ میں صبح نو بجے تک پُرسکون، میٹھی اور گہری نیند سوؤں گا لیکن اگر میری اس نیند کے دوران میں میری جان کو کوئی خطرہ ہوا یا اس گھر کی چار دیواری میں کوئی بھی غیر معمولی واقعہ پیش آنے کی توقع ہوئی تو میری آنکھ وقتِ مقررہ سے پہلے ہی کھل جائے گی۔

میری آنکھ وقتِ مقررہ صبح نو بجے سے پہلے یعنی ڈھائی بجے کھل گئی تھی۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ میرے دماغ نے ہنگامی بنیادوں پر مجھے جگا دیا تھا۔ میری جان واضح طور پر سلامت تھی۔ گویا اس گھر کی چار دیواری کے اندر کچھ غیر معمولی ہونے والا تھا...... اس خیال کے ساتھ ہی میں نے بستر چھوڑ دیا۔

میں بیڈروم سے باہر نکلا اور ماں کے بیڈروم کی جانب بڑھ گیا۔ مذکورہ دونوں بیڈ رومز کے بیچ چند فٹ کا فاصلہ تھا۔ میں نے ماں کے بیڈ روم میں جھانکنا مناسب نہیں سمجھا۔ صورتِ حال وہاں امن وامان کا پتا دیتی تھی۔ میں آگے بڑھا تو قریب ہی کہیں مجھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔

یہ احساس ایک لحاظ سے چونکا دینے والا تھا کیونکہ اس وقت ماں، میرے اور سیکیورٹی گارڈ جمشید کے سوا بنگلے میں اور کوئی بھی نہیں تھا۔ ماں اپنے بیڈ روم میں پُرسکون نیند سو رہی تھیں، جمشید کو بنگلے کے گیٹ کے نزدیک بنے گارڈ روم میں ہونا چاہیے تھا...... پھر مجھے کس کی موجودگی کا احساس ہوا تھا؟

اس سنسنی خیز سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے میں دبے قدموں آگے بڑھنے لگا۔ چند قدم کے فاصلے پر کچن تھا اور یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ کچن کے اندر لائٹ جل رہی تھی۔ فوری طور پر میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کہیں ماں کسی ضرورت کے تحت کچن میں نہ گئی ہوں یا جمشید کچھ لینے وہاں پہنچا ہو۔ ایسا ہونا ناممکن تو نہیں تھا......!

میں تیز قدموں سے چلتے ہوئے کچن میں پہنچ گیا اور وہاں جمشید کو دیکھ کر میں نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ کچن کے چولھے کے ساتھ مصروف تھا۔ میری وہاں موجودگی کو محسوس کر کے اس نے پلٹ کر دیکھا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ باادب، باملاحظہ ہو گیا۔

''سر! آپ اس وقت یہاں......'' وہ بے یقینی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''سب خیریت تو ہے نا۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو حکم کریں......!''

''ایک دم سب خیریت ہے اور مجھے کسی چیز کی ضرورت بھی نہیں۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟ تمہیں تو ادھر گیٹ پر ہونا چاہیے......!''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر۔'' وہ خجالت آمیز لہجے میں بولا۔ ''میری ڈیوٹی ادھر گیٹ پر ہی ہے۔ میں تو ذرا کھانے پینے کا بندوبست کرنے یہاں آیا تھا۔''

''کیا تمہیں بھوک محسوس ہو رہی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں سر......'' اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔ ''کوئی ایسی خاص تو نہیں۔''

''پھر......؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ میری نگاہ کا مفہوم سمجھ گیا اور جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''سر! روزہ رکھنے کے لیے سحری کرنا ضروری ہے اور سحری میں کچھ نہ کچھ تو کھانا ہی پڑتا ہے۔''

اس کے جواب سے مجھے قدرے شرمندگی کا احساس ہوا۔ اس وقت میرے ذہن میں ماہِ صیام کا خیال نہیں تھا۔ وہ اللہ کا بندہ روزے کے لیے سحری کا اہتمام کرنے میں مصروف تھا اور میں نے اسے سوالات کی باڑ پر رکھ لیا تھا۔ ندامت محسوس کرتے ہی میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا۔

''کیا اکیلے اکیلے ہی روزہ رکھو گے؟''

''جی......'' وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میڈم روزہ نہیں رکھتیں اور آپ کے بارے میں انہوں نے مجھے ایسی کوئی ہدایت دی نہیں۔''

''وہ تمہیں بتانا بھول گئی ہوں گی۔'' میں نے سچویشن کو قابو میں کرتے ہوئے کہا۔ ''تم میرے لیے بھی سحری تیار کرو۔ میں بھی روزہ رکھوں گا۔''

روزہ رکھنے کا خیال یکایک میرے ذہن میں ابھرا تھا۔ شاید یہ اس خفت کا نتیجہ تھا جو مجھے اس وقت محسوس ہوئی تھی جب میں جمشید سے سوال و جواب کر رہا تھا۔

''ٹھیک ہے سر! آپ اپنے کمرے میں جائیں۔'' وہ بڑے ادب سے بولا۔ ''میں آپ کی سحری وہیں پہنچا دوں گا۔''

میں نے سوال کیا۔ ''کیا تم یہیں کچن میں بیٹھ کر سحری کرو گے؟''

''نہیں سر...... میں اپنے کیبن میں سحری کروں گا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''یہ تو بنگالی بابو چھٹی پر ہے جو مجھے کچن میں آ کر سحری بنانا پڑی ورنہ بنگالی بابو میرے لیے ادھر کیبن ہی میں سحری پہنچا دیا کرتا ہے۔''

''یہ بنگالی بابو کون ہے؟'' میں نے الجھن آمیز لہجے میں استفسار کیا۔

''ہمارا خانساماں۔'' وہ عام سے انداز میں بولا۔

''اس کا اصل نام تو محمد حسین ہے مگر میڈم اسے بنگالی کہہ کر پکارتی ہیں لہٰذا میں بھی اسے یہی کہتا ہوں۔ محمد حسین کا تعلق بنگلا دیش سے ہے۔''

''اوہ......!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔

ماں نے کل مجھے بتایا تھا کہ ان کے ہاں ایک تجربہ کار باورچی کام کرتا ہے جو ہفتے میں ایک دن یعنی اتوار کی چھٹی کرتا ہے لیکن ماں کی ہدایت کے مطابق وہ اتنا کھانا بنا کر رکھ جاتا ہے کہ اس کی غیر موجودگی میں ماں کو کسی قسم کی دقت یا دشواری محسوس نہ ہو۔ ماں نے مذکورہ باورچی کے کھانوں کی بہت تعریف کی تھی۔

''بس آج ہی کی بات ہے سر۔'' جمشید نے بتایا۔ ''بنگالی بابو پیر کی صبح ڈیوٹی پر آجاتا ہے۔''

''ٹھیک ہے جمشید! تم میری اور اپنی سحری لے کر اپنے کیبن میں پہنچو۔'' میں نے کہا۔ ''پانچ منٹ میں، میں بھی وہیں آتا ہوں۔ پھر ہم دونوں ساتھ مل کر سحری کریں گے۔''

''آپ ...... میرے کیبن میں...... سحری کریں گے......سر......؟'' اس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔

''کیوں......!'' میں نے پوچھا۔ ''اس میں کوئی پرابلم ہے کیا؟''

''سر......آپ میڈم کے مہمان ہیں۔'' وہ اپنی عقل اور فہم کے مطابق وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اور میں ادنیٰ سا ملازم ہوں۔''

''کیا ملازم انسان نہیں ہوتے؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''یا اگر وہ انسان ہوتے ہیں تو تمہاری نظر میں مہمان انسان نہیں ہوتے...... اس لیے یہ دونوں ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا نہیں کھا سکتے......؟''

''یہ بات نہیں ہے سر......'' وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔

''پھر کیا بات ہے؟''

''بس سر! مجھے اچھا محسوس نہیں ہو رہا۔'' اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرح اور کیا وضاحت کرے۔ ''اگر میڈم کو اس بات کا پتا چلا تو وہ مجھ سے لازمی خفا ہوں گی۔''

''میڈم کو بتانے کی ضرورت کیا ہے۔'' میں نے اس کی وفاداری کی جانچ کرتے ہوئے کہا۔ ''نہ تم بتانا اور نہ ہی میں ایسا کوئی ذکر کروں گا۔ اس طرح انہیں کچھ پتا نہیں چلے گا......اللہ اللہ، خیر سلا۔''

''نہیں سر۔'' وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''آپ چاہے کوئی ذکر نہ کریں مگر میں یہ بات ان کے علم میں لائے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

''یہ کیا بات ہوئی جمشید۔'' میں نے کریدنے والے انداز میں سوال کیا۔ ''تمہاری ایسی کیا مجبوری ہے؟''

''میری مجبوری یہ ہے سر...... کہ میری رگوں میں ایک وفادار خون گردش کر رہا ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میڈم کے مجھ پر اور میری فیملی پر ان گنت احسانات ہیں۔ میں ان کا نمک خوار ہوں۔ میں انہیں کیسے دھوکا دے سکتا ہوں۔ ان سے کوئی بات چھپانے کو بھی میں دھوکا ہی سمجھتا ہوں اور پھر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ......''

وہ بولتے بولتے اچانک رک گیا تو میں نے استفسار کیا۔ ''کیا ہو سکتا ہے جمشید؟''

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آپ مجھے آزما رہے ہوں!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

جمشید میری توقع سے زیادہ ذہین، سمجھدار اور وفادار شخص تھا۔ وہ میرے مقصد کی تہ تک پہنچ گیا تھا۔ ماں نے اس کو اپنا سیکیورٹی گارڈ رکھ کر عقل مندی اور بردباری کا ثبوت دیا تھا۔ میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔

''جمشید! تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہاری میڈم کو بتادوں گا کہ میں نے خود اپنی مرضی سے تمہارے کیبن میں بیٹھ کر سحری کی تھی۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ وہ تمہیں ڈانٹ ڈپٹ نہیں کریں گی۔''

''آپ کہتے ہیں تو مان لیتا ہوں سر۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ کی بات کو بھی تو نہیں ٹال سکتا۔''

''ٹھیک ہے، تم سحری لے کر اپنے کیبن میں پہنچو۔ میں بنگلے کا ایک راؤنڈ لگا کر تمہارے پاس آرہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

وہ فرماں برداری سے بولا۔ ''اوکے سر!''

میں جمشید کو کچن میں چھوڑ کر باہر نکل آیا اور گھوم پھر کر باؤنڈری وال کے ساتھ ساتھ بنگلے کا چکر لگانے لگا۔ اس راؤنڈ کا مقصد محض اپنی تسلی کرنا تھا کہ کہیں اس گھر کی چار دیواری کے اندر تو کوئی گڑبڑ نہیں جو وقت مقررہ سے پہلے میری آنکھ کھل گئی تھی کیونکہ یہ تو میں چیک کر چکا تھا کہ فی الحال میری جان کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔

وہ ایک حبس زدہ رات تھی۔ بیڈروم کے اندر تو اے سی کی وجہ سے خاصا خوشگوار ماحول بنا ہوا تھا لیکن بنگلے کے بیرونی حصے میں کراچی کا اصل موسم جلوہ گر تھا۔ کراچی اور ٹیکساس کے موسم میں اٹھارہ بیس ہی کا فرق ہے۔ یعنی اگر ٹیکساس اٹھارہ تو کراچی بیس سمجھ لیں۔ جون جولائی میں ادھر

ٹیکساس میں بھی کم وبیش ایسی ہی گھٹن دیکھنے کو ملتی ہے۔

دس منٹ کی مٹرگشت کے بعد میں مطمئن ہوکر جمشید کے کیبن میں آ گیا۔ بنگلے کی چار دیواری کے اندر ہر طرف امن اور سکون خیمہ زن تھے۔ کہیں بھی مجھے کسی ابتری کے آثار نظر نہیں آئے۔ بنگلے کے چاروں طرف سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ اب ایک ہی بات سمجھ میں آتی تھی کہ وقتِ مقررہ سے پہلے میری آنکھ کھلنے کا سبب محض وہ خواب تھا جو تھوڑی دیر پہلے میں نے دیکھا تھا لہٰذا میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مذکورہ خواب میری زندگی میں کسی زاویے سے بے پناہ اہمیت کا حامل تھا۔ مجھے اس پر خصوصی توجہ دینا چاہیے اور یہ بھی سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے کہ اس خواب میں میرے لیے کیا پیغام ہوسکتا تھا......!

سحری کرنے کے دوران میں ہمارے بیچ گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ جمشید کی زبانی مجھے پتا چلا کہ بنگالی بابو محمد حسین پچھلے پانچ سال سے مایں کے ہاں ملازم تھا۔ اس کی فیملی نزدیک ایک بستی میں رہتی تھی۔ وہ روزانہ صبح دس بجے بنگلے پر آتا اور رات کو دس بجے اس کی چھٹی ہوجاتی تھی۔ وہ ہفتہ وار، اتوار کو ایک دن کی مکمل چھٹی کرتا تھا۔ بنگالی بابو کی عمر پچاس سے متجاوز تھی۔

''تم کب سے میڈم کے پاس ملازم ہو؟'' میں نے جمشید سے پوچھا۔

اس نے بتایا۔ ''لگ بھگ آٹھ سال سے ان کی خدمت میں ہوں۔''

''تم نے کچن میں بتایا تھا کہ میڈم نے تم پر ان گنت احسانات کررکھے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''کیا تم مجھے ان احسانات کے بارے میں کچھ بتاؤ گے؟''

''کوئی ایک احسان ہو تو بتاؤں سر۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''یوں سمجھ لیں کہ میڈم کے سلوک نے مجھے اور میری پوری فیملی کو خرید لیا ہے۔ اگر میڈم کو ہماری جان کی ضرورت ہو تو ہم ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کریں گے۔''

''تھوڑی تفصیل تو بتاؤ یار۔'' میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''مجھے بھی تو پتا چلے کہ میڈم نے تم لوگوں کے ساتھ ایسا کون سا سلوک کیا ہے جو تم اپنی جان ان پر نچھاور کرنے کے لیے تیار بیٹھے ہو؟''

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''آپ کو پتا ہے نا، پاکستان میں چند سال پہلے بڑا خوف ناک زلزلہ آیا تھا...... جب آٹھ اکتوبر کو پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں قیامتِ صغریٰ برپا ہوگئی تھی۔''

''تمہارا تعلق کس علاقے سے ہے؟''

''آزاد کشمیر کے دارالحکومت مظفرآباد سے۔'' اس نے دکھی لہجے میں بتایا۔ ''میں مظفرآباد کے علاقے گوجرہ کے ایک قریبی گاؤں کا رہنے والا ہوں۔''

''تم لوگوں کا تو بہت نقصان ہوا ہوگا؟'' میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں...... اس عفریت نے میرے والد صاحب، میرے بڑے بھائی گل داد کی بیوی جمیلہ اور ان کے دو معصوم بچوں کو بھی نگل لیا تھا۔''

''اوہ......!'' میں نے مغموم نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''بہت دکھ ہوا تمہاری بپتا سن کر۔ مالک مرحومین بلکہ شہداء کے درجات بلند فرمائے۔ کسی قدرتی آفت کے باعث ہونے والی ہلاکت بھی شہادت کے زمرے ہی میں آتی ہے۔''

''جب میری یہ بپتا میڈم نے سنی تو انہیں بھی دکھ ہوا تھا۔'' وہ اپنی ہی گھائل دھن میں بولتا چلا گیا۔ ''جب میں نے میڈم کے پاس ملازمت اختیار کی تو اس سانحے کو چند ماہ گزر چکے تھے۔ پتا ہے، اس کسمپرسی کی حالت میں میڈم نے ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' میں نفی میں گردن ہلا کر رہ گیا۔ ''تم بتاؤ......؟''

''میڈم نے اپنی جیب سے ہمارے لیے پہلے سے بھی بڑا گھر تعمیر کروایا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میری بیوی میٹرک تک پڑھی ہوئی ہے۔ میری اور راشدہ کی کوئی اولاد نہیں۔ میڈم نے گھر کے ایک حصے میں راشدہ کو پرائمری اسکول کھول کر دیا۔ اس مصروفیت میں راشدہ اپنی محرومی یعنی بے اولادی کے غم کو بھی بھول گئی ہے۔'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''اس کے علاوہ میری اکلوتی بہن شمائلہ کی شادی کا سارا خرچہ بھی میڈم نے اٹھایا تھا۔ گاہے بہ گاہے میری تنخواہ کے علاوہ بھی اگر ادھر گاؤں میں پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے تو میڈم نے کبھی انکار نہیں کیا۔ اب آپ ہی بتائیں، میں ایسی عظیم ہستی سے کس طرح نمک حرامی یا احسان فراموشی کرسکتا ہوں؟''

اپنی بات کے اختتام پر اس نے میرے لیے ایک بڑا سوال چھوڑا تھا لیکن اسے خبر نہیں تھی کہ میں کون ہوں اور میں نے اسے بتانا ضروری بھی نہیں جانا۔ اس کی زبان سے ماں

کی بڑائی سن کر میرے دل وجگر میں ایک ٹھنڈک سی اتر گئی تھی۔ میں نے جمشید کے سوال کا گول مول جواب دیتے ہوئے صرف اتنا کہا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو......!''

سحری کا وقت ختم ہونے میں جب دس منٹ باقی تھے تو میں جمشید کے کیبن سے نکل کر اپنے بیڈروم میں آ گیا۔

بستر پر لیٹ کر میں نے آنکھیں بند کیں تو بند آنکھوں کے پیچھے ڈیلفینا کا دلکش چہرہ روشن ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی خواب میں کہے ہوئے اس کے الفاظ بھی ذہن میں تازہ ہوگئے۔ اس نے چیلنج کرنے والے انداز میں کہا تھا۔

''بچو! تم چاہے دنیا کے کسی بھی حصے میں پہنچ جاؤ، مجھے تمہارے قریب آنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ مجھ سے دور ہونے کے لیے چاہے تم اپنے جسم وجاں کی ساری توانائی بھی صرف کر ڈالو، میں کسی نہ کسی طرح تم تک پہنچ ہی جاؤں گی۔''

اس کے چیلنج سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ میرے پاس کراچی آنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اس خیال نے مجھے بے حد چوکنا کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی مقبول بھٹی کے کہے ہوئے الفاظ میری یادداشت میں ابھر آئے۔ بھٹی صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں کہا تھا۔ ان لمحات میں وہ علی کپور سے مخاطب تھے۔

''سائیں! میں تو اللہ کا بندہ ہوں۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ اسد صاحب سے جن تین عورتوں کا گہرا تعلق ہے، ان میں سے دو عورتیں اس وقت پاکستان میں موجود ہیں اور تیسری ادھر امریکا میں ہے۔ پاکستان میں موجود دو عورتوں میں سے ایک سے تو اسد کی ملاقات ہوگئی ہے اور دوسری سے بہت جلد ملاقات ہوگی...... یہیں کراچی میں......!''

میں نے بھٹی صاحب کو جن تین عورتوں کے بارے میں بتایا تھا ان میں ایک تو میری والدہ سلمیٰ یعنی ''ایس'' تھیں۔ دوسری شارو یعنی ''سی'' تھی اور تیسری ڈیلفینا یعنی ''ڈی'' تھی۔ سلمیٰ صاحبہ سے میں ملاقات کر چکا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ عنقریب کراچی میں میری ملاقات شارو سے ہونے والی تھی یا ڈیلفینا سے۔ شارو سے ملاقات کا امکان اس لیے صفر کے برابر تھا کہ لیونارڈو نے اسے ٹیکساس کے شہر لیک جیکسن سے اغوا کر کے کیوبا کے شہر ہوانا پہنچا دیا تھا اور وہ وہاں خبیث غنڈے لیونارڈو کی کسٹڈی میں تھی۔ اب ڈیلفینا ہی باقی بچتی تھی۔

مقبول بھٹی کی پیش گوئی کو اگر میں آج والے خواب کے ساتھ جوڑ کر غور وخوض کرتا تو اس سوچ بچار کا ایک ہی نتیجہ برآمد ہوتا کہ...... یا تو ڈیلفینا کراچی پہنچ چکی ہے یا پھر عنقریب وہ یہاں پہنچنے والی ہے!

جب پہلی مرتبہ پریسٹن ہالو والے بنگلے پر میں نے یہ خواب دیکھا تھا تو اس کے بارے میں ربی آئزک سے میں نے بات کی تھی۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ یہ خواب بالکل سچا ہے۔ مجھے بشارت دی گئی ہے کہ ڈیلفی کو ایک بہت بڑے اعزاز سے نوازا جانے والا ہے۔ جب میں نے اس کی تفصیل جاننے کی کوشش کی تو ربی نے کمال مہارت سے گفتگو کا رخ میرے والدین کی جانب موڑ دیا تھا۔ بعدازاں ایک موقع پر جب میں نے ڈیلفینا سے اپنے اس خواب کا تذکرہ کیا تھا اور اسے یہ بھی بتایا تھا کہ ربی آئزک نے اس کی تصدیق کی ہے تو اس نے کہا تھا......''ہاں! تم نے اپنے خواب میں جو عالی شان قدیم طرز کا ہال دیکھا، وہ عمارت یروشلم میں ہے۔ میں اپنے حالیہ بکھیڑوں سے نمٹ لوں تو پھر مجھے یروشلم جانا ہوگا جہاں میرے اعزاز میں اس شاندار تقریب کا انعقاد ہوگا جو تم نے اپنے خواب میں دیکھا ہے۔''

میں نے اس کافر ادا حسینہ سے سوال کیا تھا۔''کیا تم مجھے بتانا پسند کرو گی کہ تمہاری یہ تاج پوشی کس سلسلے میں ہونے والی ہے؟''

''آئی ایم سوری۔'' اس نے مجھے ٹکا سا جواب دیتے ہوئے کہا تھا۔''یو آر ناٹ اے ممبر آف آور سوسائٹی۔ اس لیے میں تمہارے ساتھ یہ راز شیئر نہیں کر سکتی۔''

میرے اور ڈیلفینا کے بیچ معاملہ صرف اسی راز کے شیئر کرنے یا نہ کرنے تک محدود نہیں تھا۔ وہ بڑی چنکاری اور موڈی عورت تھی۔ اس نے مجھے دکھایا کم اور مجھ سے چھپایا زیادہ تھا۔ وہ اکثر اپنی سوسائٹی کے بارے میں بڑے انکشاف انگیز انداز میں ادھوری بات کر کے میرے اندر تجسس کو ابھارتی تھی پھر جب میں پلٹ کر اس کی سیکرٹ سوسائٹی کے حوالے سے کوئی سوال کرتا تو وہ یکایک آنکھیں ماتھے پر بلکہ چوٹی پر رکھ لیتی تھی اور مجھے احساس دلانے کی کوشش کرتی تھی کہ جب تک میں ان کی سوسائٹی کو جوائن نہیں کروں گا، وہ میرے ہاتھ آنے والی نہیں۔ ڈیلفینا کا شمار ان دلکش اور دلفریب عورتوں میں ہوتا تھا جو کبھی کسی مرد کو مکمل طور پر حاصل نہیں ہوتیں، اپنی چند حشر ساماں اداؤں ہی سے وہ بڑے بڑے چیتا مردوں کے غبارے کی ہوا نکال دیتی ہیں۔

وہ مجھے اپنی سیکرٹ سوسائٹی کا ممبر بنانے کے لیے پریسٹن ہالو والے بنگلے پر لے کر گئی تھی اور وہاں پر اس نے

دو اہم افراد ربی آرک باروخ لاڈ اور فلسفے کی پروفیسر ایما ایپل بام سے میری ملاقات بھی کرائی تھی۔ ان دونوں افراد میں ایک قدر مشترک بھی تھی کہ ایما ایپل بام اور ربی آرک کا تعلق امریکی ریاست کنکٹی کٹ کے علاقے نیو ہیون میں واقع ییل یونیورسٹی سے تھا۔ ییل یونیورسٹی کی اہمیت اس حوالے سے بھی تھی کہ ''اسکل اینڈ بونز'' نامی سیکرٹ سوسائٹی کا ہیڈ کوارٹر وہیں پر تھا۔ ایما ایپل بام یہودن تھی اور اسی یونیورسٹی میں فلسفے کی پروفیسر تھی۔ اس نے مجھے ییل یونیورسٹی میں ایڈمیشن کی پیشکش بھی کی تھی مگر میں نے ڈیلفینا کی تمام تر کوششوں پر پانی پھیر دیا تھا، بہ الفاظ دیگر اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے سارے غباروں کی ہوا نکال کر چلتا بنا تھا۔

ڈیلفینا نے بعض مواقع پر ''اسکل اینڈ بونز'' کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے مختلف ڈگریوں کا بھی ذکر کیا تھا اور مجھے بتایا تھا کہ کسی بھی ممبر کے لیے سب سے بڑی ڈگری تھرٹی تھری یعنی تینتیس ہوتی ہے۔ یہ ایک طرح کی ماسٹر ڈگری کہلاتی ہے۔ جب سوسائٹی کا کوئی ممبر ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے تھرٹی تھری ڈگری تک پہنچ جاتا ہے اور یہ ڈگری حاصل کر لیتا ہے تو پھر ایک شاندار تقریب میں اس کی تاج پوشی کر کے اسے اس اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ گویا وہ سوسائٹی سے فارغ التحصیل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد سوسائٹی کے حکم پر وہ عملی میدان میں قدم رکھ دیتا ہے۔ اسے دنیا کے کسی مخصوص علاقے کا پوشیدہ حکمراں بنا دیا جاتا ہے۔ وہ ایک جگہ سکون سے بیٹھ کر ظاہرہ حکمرانوں کی لگامیں کھینچتا رہتا ہے اور انہیں اپنے اشاروں پر نچاتا رہتا ہے۔

یہ سب سوچتے ہوئے ایک خطرناک خیال نے میرے ذہن میں سر اٹھایا اور وہ یہ کہ...... کہیں ڈیلفینا کو تھرٹی تھری ڈگری سے نواز کر کسی خصوصی مشن پر پاکستان تو نہیں بھیجا جا رہا......؟

یہ سوال جتنا خطرناک اور فکر انگیز تھا، اتنا ہی ہلاکت خیز بھی تھا۔ اس کے جلو میں مجھے بہت سی وحشتیں اور دہشتیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ یہ میرے لیے باخبر، ہوشیار ہونے کا وقت تھا۔ میں ڈیلفینا کی انا پر کاری ضرب لگا کر پریسٹن ہالو والے بنگلے سے نکلا تھا۔ وہ مجھے اپنے سامنے جھکانے کے لیے کچھ بھی کر سکتی تھی...... کچھ بھی!

میں نے ڈیلفینا اور اس کے آئندہ مشن کو جوتے کی نوک پر مارا اور سکون کی چادر اوڑھ کر نیند کی پُرفضا وادی میں اتر گیا۔

☆☆☆

اگلے روز دوپہر میں میری آنکھ کھلی۔ میں نے سات آٹھ گھنٹے کی بھرپور نیند لی تھی اس لیے خود کو بڑا ہشاش بشاش محسوس کر رہا تھا۔ میں نے پندرہ بیس منٹ واش روم میں صرف کیے اور فریش ہو کر بیڈ روم سے باہر نکل آیا۔

میرا ارادہ تو سیدھا ماں کے پاس جانے کا تھا لیکن میرے قدم ڈرائنگ روم کی سمت اٹھ گئے اور اس اچانک فیصلے میں تبدیلی کا سبب وہ آوازیں تھیں جو ڈرائنگ روم کی جانب سے چل کر میری سماعت تک رسائی حاصل کر رہی تھیں۔ وہ بہت سی خواتین کی آپس میں باتیں کرنے کی آوازیں تھیں اسی لیے میں ان آوازوں کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ اس بنگلے میں ماں کے سوا اور کوئی عورت موجود نہیں تھی۔

پھر وہ سب کون تھیں اور اس وقت وہاں کیا کر رہی تھیں......

ان پُرتجسس سوالات نے مجھے ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا۔

میں نے ڈرائنگ روم میں ماں کو پانچ حسین و جمیل لڑکیوں کے ساتھ محوِ گفتگو پایا۔ وہ پانچوں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ ان لڑکیوں کو حسن و خوب صورتی کے شاہکار کہا جا سکتا تھا۔ ان کے چہرے دلکش و دلنشیں تھے اور سراپا میں ایک خاص قسم کی مقناطیسی کشش پائی جاتی تھی جو دیکھنے والے کی آنکھ کو ایک جگہ ٹھہرا کر مسحور و مسرور کر دیتی تھی۔ انتہائی مختصر اور جامع الفاظ میں وہ چاروں دلوں کو تڑپانے اور حواس پر بجلیاں گرانے والی لڑکیاں تھیں۔

ماں نے مجھے اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو بڑے محتاط انداز میں بولیں۔ ''علی! میں تو تمہارے لیے زبردست ناشتے کا بندوبست کرنے کا ارادہ رکھتی تھی لیکن پھر مجھے پتا چلا کہ تم نے روزہ رکھ لیا ہے۔''

ماں نے مجھے ''علی'' کہہ کر مخاطب ضرور کیا تھا لیکن اپنی بات سے کہیں بھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ ہمارے بیچ کیا رشتہ ہے لہٰذا میں نے بھی احتیاط کے تقاضے نبھانا ضروری جانا اور ایک خالی صوفے پر بیٹھتے ہوئے معتدل لہجے میں کہا۔

''جی آنٹی...... آپ کا جاسوسی کا نظام بڑا فعال اور شاندار ہے۔ یقیناً آپ کو یہ بات جمشید نے بتائی ہوگی!''

''گُڈ...... تمہارا اندازہ درست ہے۔'' ماں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا پھر ان پانچوں پری وشوں سے میرا تعارف کراتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''یہ رفیق صاحب ہیں، میرے ایک عزیز صدیق صاحب کے بیٹے۔ ان کا پورا نام رفیق علی ہے لیکن میں صرف علی کہہ کر پکارتی ہوں......''

ان میں سے ایک بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ہاں میڈم! آنٹی نگینہ نے ہمیں ان کے بارے میں بتایا تھا۔ یہ ادھر جدہ میں ہوتے ہیں۔ آپ انہی کے ساتھ عمرہ کرنے جارہی ہیں۔''

''بالکل..... نگینہ نے تم لوگوں کو بالکل ٹھیک بتایا ہے۔'' ماں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔ ''یہ سحرش، آرزو، مینا، روبی اور شیلا ہیں۔ یہ پانچوں ادھر نزدیک ہی ایک بنگلے میں رہتی ہیں۔ کل میں نے نگینہ کو انہی کا خیال رکھنے کو کہا تھا۔''

ماں نام لے کر ان ماہ جبینوں کو مجھ سے متعارف نہ بھی کراتیں تو میں بڑی اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ وہ کون ہیں اور ماں کے ساتھ ان کا کس قسم کا کنکشن رہا ہے۔ ''رہا ہے'' کے الفاظ میں اس لیے استعمال کررہا ہوں کہ جس بزنس کے توسط سے یہ ماں کی زندگی کا حصہ ہوا کرتی تھیں، اس بزنس کو ماں نے خلوصِ نیت سے خیرباد کہہ دیا تھا۔ ماں کو ایک بار یہاں سے نکلنا تھا تو پھر تاحیات اس زندگی اور اس سے متعلق افراد کی جانب پلٹ کر نہیں دیکھنا تھا۔ ماں نے جس لمحے مجھے اپنے اس فیصلے سے آگاہ کیا تھا، میرے ذہن نے ماں کو اسی وقت اس ''لائف سیٹ اپ'' سے خارج کردیا تھا لہٰذا آرزو، سحرش، شیلا، روبی اور مینا میری نگاہ میں ماں کی ذات کے حوالے سے قصۂ پارینہ بن چکی تھیں۔

میں جس صوفے پر بیٹھا تھا اس کے بائیں ہاتھ والے سنگل صوفے پر ماں براجمان تھیں۔ میرے سامنے والے بڑے صوفے پر آرزو، شیلا اور روبی بیٹھی تھیں اور میرے دائیں ہاتھ والے صوفے پر مینا اور سحرش موجود تھیں۔ میرے اور مینا کے درمیان ایک، ڈیڑھ فٹ سے زیادہ کا فاصلہ نہیں تھا۔ ہم سب کے بیچ گلاس ٹاپ والی ایک شاندار منقش چوبی میز تھی جس کے اوپر ہم سب کے آئی فون رکھے ہوئے تھے۔ ان پانچوں نے اپنے پرس ڈرائنگ روم کے فرش پر قالین کے اوپر رکھ چھوڑے تھے۔ ویسے تو وہ پانچوں کی پانچوں اپنی مثال آپ تھیں لیکن میری نگاہ مینا کے چہرے سے بار بار الجھ جاتی تھی۔

اس کا سبب یہ تھا کہ وہ باقی چاروں سے کافی مختلف تھی۔ اس کے انداز میں بڑی انفرادیت پائی جاتی تھی۔ دیکھنے میں وہ ایشیا اور یورپ کا ملن نظر آتی تھی۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق، اس یوریشین لڑکی کے والدین میں سے ایک کا تعلق ایشیا سے اور دوسرے کا یورپ سے ہونا چاہیے تھا۔ اس خوب رو لڑکی کو بلاشبہ بلونڈ کہا جاسکتا تھا یعنی اس کے بال شہد رنگ تھے مگر آنکھوں کا رنگ ایک دم سیاہ تھا اور وہ خاصی نمایاں بھی تھیں۔ ہونٹ رسیلے اور قدرے ابھرے ہوئے جن کے لیے مقابلۂ حسن کی اصطلاحات میں ''پلوپلس'' کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ وہ متاثر کن شخصیت کی مالک، بے پناہ اپیل کی حامل لڑکی تھی۔

اس باہمی گفتگو کے دوران میں ماں نے انہیں اپنے عمرے والے پلان سے آگاہ کیا اور ہدایت کی کہ وہ ماں کی غیر موجودگی میں پوری طرح آنٹی نگینہ کو فالو کریں گی۔ انہوں نے باری باری ماں کو اپنی وفاداری اور فرماں برداری کا یقین دلایا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ رخصت ہوگئیں۔

ان کے جانے کے بعد میرے اور ماں کے بیچ کافی دیر تک مستقبل کے حوالے سے منصوبہ بندی ہوتی رہی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ جس دوران میں، میں سو رہا تھا، انہوں نے امریکا کے ویزے کے سلسلے میں دو اہم کام نمٹا دیے تھے یعنی انہوں نے اپنے بینک سے پچھلے چھ ماہ کا اکاؤنٹ اسٹیٹ منٹ بنوالیا تھا اور نوٹری پبلک سے مل کر اپنی جائداد اور دیگر قیمتی اشیا کا پکے اسٹیمپ پیپر پر ایفی ڈیوٹ بھی تیار کروالیا تھا۔ گویا انہوں نے اپنے حصے کا کام نمٹا دیا تھا۔ علاوہ ازیں انہوں نے اپنے فوٹو بھی کھنچوا لیے تھے۔ لگ بھگ تین بجے عظیم میرے پاس پہنچ گیا۔ ماں نے ہمیں فری ہینڈ دے دیا تاکہ ہم اطمینان سے آن لائن ان کا ایپلی کیشن فارم بھر سکیں۔ ہم دونوں، میرے والے بیڈ روم میں آبیٹھے۔

کام کے دوران میں ہمارے بیچ گفتگو کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ امریکا کا آن لائن ویزا فارم پانچ چھ صفحات پر مشتمل ہے اور اسے مکمل کرنے میں اچھا خاصا وقت لگتا ہے۔ مجھے ایک ترتیب سے کام کرتے دیکھا تو عظیم نے کہا۔

''یار! تم تو بڑی روانی سے کام کررہے ہو۔ ایسا لگتا ہے، یہ تمہارا پروفیشن ہو جبکہ مجھے اس پروسس میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے تین چار مرتبہ ٹرائی مارنا پڑی تھی۔''

''یہ ہرگز میرا پروفیشن نہیں ہے برو!'' میں نے... دوٹوک انداز میں کہا۔ ''میری روانی اور آسانی کا سبب یہ ہے کہ میں امریکی ہوں اس لیے امریکیوں کی ذہنیت اور امریکی گورنمنٹ کی پالیسیوں سے بہ خوبی آگاہ ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ ان کی کس بات سے ان کی کیا مراد ہے لہٰذا اس فارم کے مندرجات کو سمجھنے میں مجھے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا۔ بس اتنی سی بات ہے۔''

''سمجھ گیا۔'' وہ ایک خاص انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا پھر پوچھا۔ ''برو! ایک بات تو بتاؤ......!''

''ہاں پوچھو۔'' میں نے کہا۔

''کسی بھی ایمبیسی میں امیگریشن آفیسر کی کیا اہمیت ہوتی ہے؟''

''امیگریشن آفیسر ایمبیسی میں نہیں بلکہ ائرپورٹ پر ہوتا ہے۔'' میں نے تصحیح کرنے والے انداز میں کہا۔ ''جو اس ملک میں داخل ہونے والوں کا ویزا اور پاسپورٹ وغیرہ چیک کرتا ہے اور انٹری کی اسٹیمپ لگاتا ہے۔''

وہ بولا۔ ''اوہ! اچھا تو سنو ایک امیگریشن آفیسر سے میری دوستی ہوگئی ہے۔''

''گڈ......'' میں نے اپنا کام جاری رکھتے ہوئے سراہنے والے انداز میں کہا۔

''اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ آیا وہ امیگریشن آفیسر میری کوئی ہیلپ کرسکتی ہے؟''

''کرسکتی ہے...... مطلب، وہ کوئی خاتون ہے؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں یار......!'' اس نے بتایا۔

''دیکھو بھائی! جہاں تک ''ہیلپ'' کا معاملہ ہے تو اس کا دارومدار تو دوستی کی نوعیت پر ہے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نہیں جانتا کہ تمہارے اور اس امیگریشن آفیسر کے بیچ دوستی کی کتنی گہرائی ہے!''

''دوستی تو بڑی پکی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اگر دوستی پکی ہے تو پھر وہ تمہیں فیور دے سکتی ہے۔'' میں نے دوبارہ کام کی طرف دھیان دیتے ہوئے کہا۔ ''ویسے تمہاری یہ دوست کون سے ائرپورٹ پر ہوتی ہے؟''

''وینکوور کے ائرپورٹ پر۔'' اس نے بڑے فخر سے بتایا۔

''اوہ...... تو کیا وہ کوئی فارنر ہے؟''

''ہاں یار۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس کا نام ٹائبرا ہے اور وہ خود کو پیسیفک آئی لینڈر کہلاتی ہے۔ وہ کینیڈا میں رہتی ہے اور وینکوور ائرپورٹ پر اس کی ڈیوٹی ہے۔''

''بھائی! اگر وہ کوئی لوکل امیگریشن آفیسر ہوتی تو میں بڑے دعوے سے کہہ سکتا تھا کہ وہ تمہیں صد فیصد فیور دے گی۔'' میں نے اپنے خیال کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا کہ یہ گورے اور گوریاں بڑے اصول پرست ہوتے ہیں اور گہری سے گہری دوستی پر بھی اپنے فرائض اور اصولوں کا سودا نہیں کرتے۔ لہٰذا اگر تمہارا کام ان کے کسی اصول یا قانون کے خلاف ہوا تو وہ ہرگز تمہاری ہیلپ نہیں کرے گی۔ ویسے یہ تو بتاؤ کہ تم ٹائبرا سے کس نوعیت کی فیور چاہتے ہو؟''

''کینیڈا کے ویزے کے سلسلے میں اس کی ہیلپ چاہتا ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''ٹائبرا نے کہا ہے کہ یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ ہمارا اپنا کوٹا بھی ہوتا ہے۔ ہم اپنی ذمے داری پر دنیا کے کسی بھی ملک میں رہنے والے کو کینیڈا کا وزٹ ویزا جاری کرواسکتے ہیں۔''

''تمہاری ٹائبرا غلط نہیں کہہ رہی یار۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن اس معاملے کی تہ تک پہنچنے کے لیے میں یہ جاننا چاہوں گا کہ کیا تم کبھی اپنی اس دوست سے ملے بھی ہو؟''

اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بتایا۔ ''نہیں۔''

''دوستی کیسے ہوئی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''سوشل میڈیا پر۔''

''اوہ......!'' میں ایک بوجھل سانس خارج کرکے رہ گیا۔

''کیا ہوا برو؟'' وہ تشویش بھرے لہجے میں بولا۔

اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے میں نے الٹا اسی سے پوچھ لیا۔ ''کیا کبھی تمہاری ٹائبرا سے فون پر بات ہوئی ہے؟ تمہارے پاس اس کا فون نمبر یا اس کی ای میل آئی ڈی ہے؟''

''فون پر کبھی بات نہیں ہوئی۔'' عظیم نے بتایا۔ ''ہاں! اس نے مجھے اپنی ایک دوست کی ای میل آئی ڈی دے رکھی ہے۔ ٹائبرا کی وہ دوست کینیڈا کی کسی سیکیورٹی ایجنسی میں ملازمت کرتی ہے لیکن میں نے کبھی اس آئی ڈی پر ٹائبرا کو میل نہیں کی۔''

''پھر تمہارے بیچ بات کیسے ہوتی ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔

''ٹیکسٹ میسج کے ذریعے۔'' اس نے بتایا۔

''اوہ اللہ کے بندے! تم کتنے سادہ انسان ہو۔'' میں نے افسوسناک انداز میں کہا۔

''کیوں...... میں نے کیا کیا ہے؟'' وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔

''کیا تمہیں یہ معلوم نہیں کہ سوشل میڈیا پر اکثر اکاؤنٹ فیک ہوتے ہیں۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''ان نقلی اکاؤنٹس کے ذریعے سادہ دل لوگوں کو بے وقوف بنایا جاتا ہے۔ کین تکی والے ولیم آرتھر کی مثال تمہارے سامنے ہے۔ اس نے اپنا الو سیدھا کرنے کے

لیے کس طرح تم لوگوں کو ملین ڈالرز کی گولڈن آفر کررکھی ہے۔ ہوسکتا ہے، تمہاری یہ ٹائبرا بھی فیک ہی ہو اور تمہارے جذبات سے کھلواڑ کر رہی ہو......!"

"ایسا نہ کہو برو۔" وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ "پہلے ہی فرحان نے میرا دماغ خراب کر رکھا ہے۔"

"یہ فرحان کون ہے؟" میں نے پوچھا۔ "اور یہ بندہ ہماری گفتگو کے بیچ کہاں سے ٹپک پڑا؟"

"فرحان میرا بڑا گہرا دوست ہے۔" اس نے بتایا۔ "میں نے فرحان کو ٹائبرا کے بارے میں سب کچھ بتا رکھا ہے۔ میں نے اسے ٹائبرا کی تصویریں بھی دکھائی تھیں۔ وہ میرا مذاق اڑاتا ہے۔ کہتا ہے، وہ مجھے بے وقوف بنا رہی ہے۔ ٹائبرا شکل ہی سے ہلاکو خان کی پوتی نظر آتی ہے۔ وہ تمہارے جذبات کا ایسا حشر نشر کرے گی کہ کسی سے ذکر کرنے کے قابل بھی نہیں رہو گے لیکن میں فرحان کی بات کا یقین نہیں کرتا۔"

"دراصل تم ٹائبرا کے ساتھ دل لگا چکے ہو۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اس لیے تمہارا دل کسی بھی قیمت پر اس کے فیک ہونے کے بارے میں نہیں سوچ سکتا۔ اس کی مخالفت میں جانے والی ہر بات کو تمہارا دل ماننے سے انکار کر دیتا ہے اسی لیے تمہیں فرحان کی...... اور میری بات کا یقین نہیں آرہا۔ ایم آئی رائٹ؟"

"یس! یو آر ایبسولیوٹلی رائٹ۔" وہ ٹھوس انداز میں بولا۔ "یہ واقعی میرے لیے دل کا معاملہ بن چکا ہے لیکن فرحان کی بات پر یقین نہ کرنے کا ایک اور بھی سبب ہے۔"

"کیا؟" میں نے پوچھا۔

"یار! وہ کافر ہے۔" وہ بیزاری سے بولا۔

"تمہارا مطلب ہے، فرحان اےتھیسٹ ہے؟"

"تم اسے اےتھیسٹ کہو، دہریہ کہو، منکرِ خدا کہو، کمیونسٹ کہو، کامریڈ کہو یا کافر کہو...... ایک ہی بات ہے۔" وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "یہ کافر کیا جانیں، دل کا لگانا کیا ہوتا ہے!"

"اےتھیسٹ دل کا لگانا جانتے ہوں یا نہیں جانتے ہوں لیکن ایک بات مجھے معلوم ہے کہ یہ لوگ دماغ کا لگانا بہ خوبی جانتے ہیں۔"

"تم کہنا کیا چاہ رہے ہو یار؟" وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔

"برو! اےتھی ازم میں کمٹ منٹ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔" میں نے اسے بتایا۔ "ہر اےتھیسٹ اپنے کاز کے ساتھ بڑا کمیٹڈ ہوتا ہے۔"

"کیا تم اےتھی ازم کی حمایت کر رہے ہو؟" اس نے عجیب سی نظر سے مجھے دیکھا۔

"بات حمایت یا مخالفت کی نہیں میرے دوست۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "میں نے تو اپنے مشاہدے اور تجربے کو بیان کیا ہے۔ آج میں تمہیں اےتھیسٹ افراد کے بارے میں ایک خاص الخاص بات بتاتا ہوں......"

وہ ہمہ تن گوش ہوتے ہوئے بولا۔ "بتاؤ برو!"

"یہ ٹھیک ہے کہ یہ لوگ خدا کو نہیں مانتے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہی لوگ سب سے زیادہ خدا کی مانتے ہیں۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا بات ہوئی یار؟" اس کی الجھن میں اضافہ ہوگیا۔

"بات یہ ہوئی یار کہ......" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "یہ لوگ پورا تولتے ہیں۔ کسی چیز میں ملاوٹ نہیں کرتے حتیٰ کہ اپنی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ کا بھی پاس کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی خوشی، اطمینان اور کامیابی کا راز یہی ہے کہ انہوں نے قدرت کے آفاقی اصولوں کو اپنی زندگی میں نافذ کر رکھا ہے۔"

"یار! تمہارے بیان میں بڑی فصاحت اور بلاغت پائی جاتی ہے۔"

"شکریہ۔ چلیں جی ایک کام تو ہوا؟"

"کونسا کام؟"

"ٹورسٹ کے لیے امریکا کا وزٹ ویزا فارم "ڈی ایس۔ ون سکسٹی" مکمل ہوگیا ہے۔" میں نے فاتحانہ انداز میں کہا۔ "اور ویزا فیس ون سکسٹی امریکی ڈالرز ڈیپازٹ کرنے کے لیے کونسلیٹ کا اکاؤنٹ نمبر بھی ای میل کے ذریعے وصول ہوگیا ہے۔"

"اوکے ویری گڈ...... مگر اب یہ کام پرسوں ہی ہوگا۔"

"پرسوں کیوں؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "آج یا کل کیوں نہیں......!"

"اگر ہم مار دھاڑ کرتے ہوئے ابھی الائیڈ بینک کی کسی آن لائن برانچ تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائیں تو یہ کام ہاتھ کے ہاتھ ہوجائے گا ورنہ معاملہ پرسوں پر چلا جائے گا۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اس کا سبب یہ ہے کہ بینک کا ٹائم ختم ہونے میں بس پندرہ بیس منٹ ہی باقی ہیں اور کل یکم جولائی کو بینک ہالیڈے کی

وجہ سے تمام بینک بند رہیں گے۔''
''اوہ......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''پاکستان میں چھٹیاں بہت ہوتی ہیں۔''
''تم ٹھیک کہتے ہو برو۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''کیم رمضان کو زکوٰۃ کی کٹوتی کے سلسلے میں بینک کی چھٹی تھی۔ اس کے بعد اتوار کو بینک بند تھا اور اب منگل یکم جولائی کو بھی بینک ہالیڈے ہے۔''
''عظیم! میں آج کا کام کل پر ٹالنے کے حق میں نہیں ہوں۔'' میں نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ ''لہٰذا ہم ابھی اور اسی وقت ویزا فیس جمع کرانے الائیڈ بینک کی کسی نزدیکی آن لائن برانچ جائیں گے۔''
''اوکے......آئی ایم ریڈی!'' وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا اور ہم اٹھ گئے۔
ہم گاڑی میں بیٹھ کر روڈ پر نکلے تو میں نے کہا۔
''آج افطار تم میرے ساتھ ہی کرلیتے یار......!''
''آج نہیں برو، پھر کبھی سہی۔'' وہ بے تکلفی سے بولا۔ ''آج افطار پر میرا گھر میں موجود رہنا ضروری ہے۔''
''اوکے......!'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔
میں نے اس سے یہ نہیں پوچھا کہ آج افطار پر گھر میں اس کی موجودگی کیوں ضروری ہے۔ بینک تک پہنچنے کے دوران میں، میں نے اسے بتادیا کہ میں نے ماں کو کسی دوسری جگہ شفٹ کرنے کا ارادہ ترک کردیا ہے لہٰذا وہ اپنے پاپا کو اس سلسلے میں آگاہ کردے کہ میں جب تک پاکستان میں ہوں، اپنی ماں کے ساتھ ہی قیام کروں گا۔
تھوڑی ہی دیر کے بعد ہم فیس جمع کرواکے بینک سے باہر نکل آئے۔ عظیم نے مجھے ماں کے گھر پر ڈراپ کرنا تھا۔ اس مختصر سے سفر کے دوران میں، میں نے اسے اپنے اور ماں کے عمرے والے پراجیکٹ کے بارے میں بتایا۔ اس نے خوش دلی سے کہا۔
''ماشاءاللہ! یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ میں خود بھی دو مرتبہ عمرے پر جاچکا ہوں۔ پاکستان سے سعودی عرب تک پاپا کا عمرے اور حج کا پورا اسسٹم بنا ہوا ہے۔ ان کے ہاتھ سے سالانہ درجنوں افراد حج اور عمرے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ میں پاپا سے کہہ کر آپ دونوں کے لیے سارے انتظامات کروادوں گا۔ آپ لوگوں کو ویزا، ٹکٹ، رہائش اور ٹرانسپورٹ کے سلسلے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔''
''اوکے ڈیئر! میں آپ کے پاپا سے ضرور مدد لوں گا۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔
''یہ اچھا ہوا کہ تم یہاں آگئے اور آنٹی سلمیٰ کو عمرے کے لیے ایک محرم مل گیا۔'' اس نے کہا۔ ''تمہیں یہ تو پتا ہی ہے نا کہ حج اور عمرے کے لیے کسی بھی خاتون کے ساتھ محرم کا ہونا لازمی ہے۔''
''ہاں......ویسے آج کل یہ خبر بھی گردش میں ہے کہ آج کل سعودی گورنمنٹ اس بات پر غور و فکر کررہی ہے کہ عورت کے لیے محرم کی شرط کو ختم کردیا جائے۔'' میں نے انکشاف انگیز انداز میں کہا۔
''یہ تو تم بریکنگ نیوز دے رہے ہو برو......!''
''یہ ابھی محض نیوز ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مستقبل قریب میں سعودی گورنمنٹ کی طرف سے جب ایسا کوئی اعلان ہوگا تو سمجھ لینا کہ اب نیوز بریک ہوگئی۔''
''گڈ......یہ تو بہت اچھی خبر ہے۔'' وہ معتدل انداز میں بولا۔
''جتنے منہ، اتنی باتیں اور جتنے ذہن، اتنی سوچیں۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔
''یار! تم بھی پتا نہیں، کہاں کہاں کی ڈھونڈ کر لاتے ہو۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔
میں نے بھی مذاق کے رنگ میں کہا۔ ''کبھی تنہائی میں بیٹھ کر تم میری باتوں پر غور کرنا کہ میں کہاں کہاں سے ڈھونڈ کر لاتا تھا!''
اس نے زندگی سے بھرپور ایک قہقہہ لگایا اور مجھے ماں کے بنگلے کے سامنے ڈراپ کرکے اپنے گھر کی سمت روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

افطار سے تھوڑی دیر پہلے نادر شاہ آگیا۔ ماں نے ڈرائنگ روم میں شاہ جی سے میری ملاقات کرائی۔ نادر شاہ کی عمر پچاس سے متجاوز تھی۔ وہ درمیانے قد کا مالک ایک قوی الجثہ شخص تھا۔ اس کی کلائی بھی خاصی چوڑی تھی جو اس کی جسمانی مضبوطی کو ظاہر کرتی تھی۔ نادر شاہ نے خاصی صحت مند مونچھیں پال رکھی تھیں جو اس کی شخصیت سے لگا کھاتی تھیں۔ جوانی میں وہ خاصا دبنگ رہا ہوگا۔ اب بھی اس کے چہرے پر ایک عجیب سی کرختگی اور آنکھوں میں ہوشیاری والی چمک پائی جاتی تھی۔ پہلی ملاقات میں نادر شاہ نے مجھے متاثر نہیں کیا تھا۔
ماں نے مجھے بتایا کہ شاہ جی کا رئیل اسٹیٹ کا بزنس تھا۔ نادر شاہ بڑے تپاک کے ساتھ مجھ سے ملا تھا۔ مجھے دیکھ

کر اس کے چہرے پر بے پناہ خوشی چمک اٹھی تھی۔ وہ میری بازیابی پر بار بار ماں کو مبارک باد دے رہا تھا۔ اس نے مجھ سے بھی مختصر گفتگو کی۔ چونکہ ماں نے خود ہی میرے بارے میں نادر شاہ کو تفصیلات سے آگاہ کر دیا تھا، اس لیے اس نے مجھ سے زیادہ سوالات نہیں کیے البتہ اس نے دو تین مرتبہ مجھے یہ نصیحت ضرور کی۔

''دیکھو بیٹا! تمہاری ماں نے بہت صدمے اٹھائے ہیں۔ اللہ نے تمہیں سلمٰی بہن سے ملوایا ہے تو قدرت کی اس نوازش کی قدر کرنا۔ جب تک تم لوگ یہاں سے روانہ نہیں ہو جاتے، بہت زیادہ احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔ تمہاری شکل ہو بہ ہو حیدر علی کی صورت ہے اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ زیادہ وقت گھر کے اندر اپنی ماں کے ساتھ ہی گزارو تا کہ تمہارے دشمنوں کو کوئی اوچھا وار کرنے کا موقع نہ مل سکے۔''

''جی انکل۔'' میں نے فرماں برداری سے کہا۔ ''میں آپ کی ہدایات کو ذہن میں رکھوں گا۔''

''سلمٰی بہن! میں تمہارے منصوبے کو اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔'' وہ ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہارا یہ بڑا پن ہے کہ تم نے مجھے قابلِ بھروسا سمجھا۔ ان شاء اللہ! میں بھی تمہارے اعتماد کو ٹھیس نہیں لگنے دوں گا۔ جو کام تم نے میرے ذمے لگائے ہیں، یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ آپ لوگوں کے جانے سے پہلے میں بنگلے کی فروخت کا کام نمٹا دوں گا اور اس کے بعد ٹرسٹ والے منصوبے کا آغاز کر دوں گا۔ آپ نے دبئی میں مستقل رہائش اختیار کرنے کا فیصلہ کر کے بڑی عقل مندی کا ثبوت دیا۔ آپ وہاں کسی مقامی عربی کے ساتھ پارٹنر شپ میں کوئی بھی بزنس شروع کر دیں گی تو وہاں آپ کو سیٹل ہونے میں کوئی وقت نہیں ہوگی۔ میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔''

''شاہ جی! آپ میرے سچے خیر خواہ ہیں اس لیے میں نے اپنا منصوبہ آپ کے سامنے کھول کر بیان کر دیا ہے۔'' ماں گہری سنجیدگی سے بولیں۔ ''میرے ارادے کی کسی کو ہوا بھی نہیں لگنا چاہیے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں......''

''بہن! میں آپ کی توقع سے بھی زیادہ محتاط ہوں۔'' وہ ماں کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ''میں ایک ایک قدم پھونک کر اٹھاؤں گا۔ آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔'' لمحاتی توقف کر کے شاہ جی نے ہم ماں بیٹے کو یکے بعد دیگرے دیکھا پھر سوال کیا۔

''ویسے آپ لوگوں کا کب تک جانے کا پروگرام ہے؟''

''رمضان کے آخری عشرے میں ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔'' ماں نے جواب دیا۔

''بس تو پھر ٹھیک ہے۔'' وہ ایک اطمینان بخش سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''ابھی تو آپ لوگوں کی روانگی میں کافی دن باقی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس دوران میں تمام کام خوش اسلوبی سے پایۂ تکمیل کو پہنچ جائیں گے۔''

''ان شاء اللہ...... !'' ماں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

نادر شاہ نے ہمارے ساتھ افطار کیا پھر ماں سے بنگلے کی فروخت کے حوالے سے چند متعلقہ دستاویزات کی فوٹو کاپی لے کر رخصت ہو گیا۔

نادر شاہ کے جانے کے بعد ماں نے مجھ سے پوچھا۔ ''علی! شاہ جی تمہیں کیسے لگے؟''

''ماں! آپ کو شاہ جی پر اندھا اعتماد ہے۔'' میں نے کہا۔ ''بس، میرے لیے یہی کافی ہے۔ ظاہر ہے، آپ کسی غلط آدمی پر تو بھروسا کر نہیں سکتیں!''

''ٹھیک کہا تم نے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولیں۔ ''آج شاہ جی سے تمہاری پہلی ملاقات ہوئی ہے۔ دو چار مرتبہ ملو گے تو وہ تمہاری سمجھ میں آ جائیں گے۔''

میں نے ماں کی اس بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور انہیں پوری تفصیل کے ساتھ وہ کہانی سنا دی جو ان کے ویزا کے سلسلے میں میری کوششوں پر مبنی تھی۔ وہ خوش ہوتے ہوئے بولیں۔

''واہ بھئی...... یہ تو کمال ہو گیا۔ اب آگے اور کتنے اسٹیپ ہیں؟''

''صرف ایک اسٹیپ باقی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں سمجھی نہیں۔'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگیں۔

میں نے سمجھایا۔ ''اگر آج قونصلیٹ کے آفس ٹائم میں ہم آپ کی ویزا فیس جمع کروا دیتے تو تھوڑی دیر کے بعد انٹرویو کا اسکیجوئل ہمیں موصول ہو جاتا۔ اب یہ کام مجھے امید ہے، کل دوپہر تک ہو جائے گا۔ امریکی قونصلیٹ آپ کے انٹرویو کے لیے دو تین تاریخیں اور دو تین اوقات آفر کرے گی۔ ان میں سے جو تاریخ اور وقت ہمیں موزوں لگے گا، وہ ہم قونصلیٹ کو کنفرم کر دیں گے۔ بس پھر اس تاریخ کو آپ نے مقررہ وقت سے کم از کم ایک گھنٹا پہلے اپنے پاسپورٹ، شناختی کارڈ اور دیگر ضروری کاغذات کے ساتھ انٹرویو کے لیے امریکی قونصلیٹ پہنچ جانا ہے۔''

''وہ لوگ عموماً کتنے دن میں پاسپورٹ واپس کر دیتے ہیں؟'' ماں نے پوچھا۔

''یہ ان کی مرضی پر منحصر ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ویسے عموماً اس پروسس میں تین سے آٹھ دن لگ جاتے

ہیں۔ مطلب، زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے کا کھیل ہے۔''
''علی! میں انٹرویو میں پاس ہوجاؤں گی نا؟'' وہ متذبذب لہجے میں مستفسر ہوئیں۔
''کیوں نہیں ماں......!'' میں نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔ ''آپ ایک سو ایک فیصد کامیاب ہوں گی۔ جب میں انٹرویو کی تیاری کرواؤں تو پھر ناکامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ نے بس اعتماد کے ساتھ ہر سوال کا جواب دینا ہے۔ میں آپ کے کاغذات میں اپنے پاسپورٹ کی مکمل فوٹو کاپی بھی لگادوں گا۔ آپ کو کسی بھی حوالے سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''
وہ مطمئن ہوگئیں۔ ہم نے دس بجے کے بعد ڈنر کیا پھر لگ بھگ گیارہ بجے میں سونے کے لیے اپنے بیڈروم میں آگیا۔ آج دن میں ماں نے اپنے خانساماں یعنی بنگالی بابو محمد حسین سے بھی میری ملاقات کرادی تھی۔ بنگالی بابو اپنی شکل صورت سے ایک خبط الحواس پروفیسر دکھائی دیتا تھا۔ یہ میں نے اس کے بصری تاثر کی بات کی ہے ورنہ وہ ایک ہوش مند اور تجربہ کار باورچی تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ کے بنے ہوئے کھانوں کی بہت تعریف سنی تھی اور اس کے تیار کردہ کھانے کھائے بھی تھے۔ وہ بیان کردہ تعریف پر پورا اترتا تھا۔
میں سونے کے لیے لیٹا تو بیگ صاحب کا فون آگیا۔ اس وقت کراچی میں رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے اور نیویارک میں دوپہر کے ڈھائی یعنی دو بج کر تیس منٹ۔ میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔
''ہیلو انکل! آپ کیسے ہیں؟''
''میں ٹھیک ہوں علی۔'' انہوں نے جواب دیا۔ ''اور سناؤ، تمہاری طرف کیا چل رہا ہے؟''
میں نے انہیں ''ڈی ایس۔ ون سکسٹی'' ویزا کے حصول کے سلسلے میں اپنی تازہ ترین کوشش سے آگاہ کیا۔ انہوں نے مجھے سراہا اور بہت سی دعائیں دینے کے بعد کہا۔
''میں نے تمہیں اس لیے فون کیا ہے کہ تھوڑی دیر پہلے میری ٹفنی سے علی سلطان کی وصیت کے حوالے سے تفصیلی بات ہوئی ہے۔ وہ کسی لمبے چوڑے بکھیڑے میں پڑنے کو تیار نہیں۔ اس نے کہا ہے کہ میں اپنے طور پر علی سلطان کی منقولہ اور غیر منقولہ جائداد کو اسٹیمیٹ کرکے اس کا جو حصہ بنتا ہے وہ اس کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرادوں۔ کسی قانونی کارروائی کے لیے اگر اس کا آنا ضروری ہوا تو وہ سگنیچر کرنے کے لیے ٹیکساس آجائے گی۔ میں اسے اس وقت بلاؤں گا جب تم یہاں پہنچ جاؤ گے تاکہ قانونی معاملات ایک ہی راؤنڈ میں نمٹ جائیں۔''
''ٹھیک ہے انکل! آپ پیپرز وغیرہ تیار کروالیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں ان شاء اللہ جولائی کے آخری عشرے میں آپ کے پاس ہوں گا۔ ایک بات ذہن میں رکھیے گا انکل کہ بے بی والا اپارٹمنٹ میں اپنے پاس رکھوں گا۔ نیکولز اسکوائر والے اس گھر سے میری بہت سی یادیں جڑی ہوئی ہیں۔ میں اپنی ماں کے ساتھ وہیں پر رہنا پسند کروں گا۔''
''میں تمہاری خواہش کا خیال رکھوں گا۔'' انہوں نے خلوصِ دل سے کہا۔ ''اس سلسلے میں تم بے فکر ہوجاؤ۔''
اور میں واقعی بے فکر ہوگیا۔ مزید چند منٹ کی گفتگو کے بعد ہمارے بیچ رابطہ موقوف ہوگیا۔ میں نے سیل فون کو سائڈ ٹیبل پر رکھا اور بستر پر دراز ہوکر آنکھیں بند کرلیں۔
بند آنکھوں کے پیچھے ٹفنی کا چہرہ روشن ہوگیا۔ ٹفنی سے میری صرف ایک ہی ملاقات ہوئی تھی اور وہ بھی بڑے مختصر وقت کے لیے جب میں پرسٹن ہالو والے بنگلے پر ڈیلفینا کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ ایما ایپل بام کے ساتھ وہاں آئی تھی۔ ٹفنی کو میں نے سنجیدہ، کم گو، موڈی اور بیزار مزاج پایا تھا۔ اس کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو بہت لیے دیئے رہتے ہیں اور اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ تھوڑی دیر پہلے انکل بیگ نے مجھے جو کچھ بتایا تھا، اس کے مطابق بھی ٹفنی نے اسی خشک رویے کا مظاہرہ کیا تھا جو اس کی فطرت کا حصہ بلکہ خاصہ تھا۔
ٹفنی کے بارے میں سوچتے ہوئے میرا دھیان ڈیلفینا کی جانب چلا گیا۔ ایسا کیسے ممکن تھا کہ پرسٹن ہالو کے بنگلے کا خیال آئے اور ڈیلفینا کی یاد نہ آئے۔ اب اس بات کا مجھے بہت اچھی طرح اندازہ ہوگیا تھا کہ اس ہسپانوی دوشیزہ کا میرے ساتھ بڑا گہرا رابطہ پیدا ہوچکا ہے اور یہ تعلق مستقبل میں بہت دیر تک اور بہت دور تک چلنے والا تھا۔ پچھلی رات وہ میرے خواب میں مجھے چیلنج بھی کرگئی تھی کہ میں اگر لاکھ چاہوں بھی تو اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ میں دنیا میں جہاں کہیں بھی ہوں گا، وہ میرے تعاقب میں وہاں پہنچ جائے گی۔
اس کا یہ چیلنج خاصا تشویشناک اور فکر انگیز تھا لیکن کیا کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔
سیل فون کی گھنٹی نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے یہ سوچتے ہوئے اپنے موبائل کی جانب ہاتھ بڑھایا کہ وہ عظیم ہوگا لیکن جب فون کے اسکرین پر دیکھا تو وہاں ایک اجنبی سیل فون نمبر نظر آرہا تھا۔ بے ساختہ میری نگاہ دیوار گیر کلاک کی طرف اٹھ گئی۔ وہاں پورے بارہ کا وقت دکھائی دے رہا تھا۔ تیسری

گھنٹی پر اس خیال سے میں نے فون اٹینڈ کرلیا کہ دیکھوں تو سہی کہ آدھی رات کو کسی اجنبی کو میری یاد کیوں آ گئی ہے!

"ہیلو......!" میں نے کہا۔

"علی بات کر رہے ہو نا؟" ایک نسوانی آواز نے بڑی بے تکلفی سے استفسار کیا۔

"ہاں۔ میں علی ہی ہوں۔" میں نے کہا۔ "آپ کون......؟"

سچی بات تو یہ ہے کہ دوسری طرف بولنے والی کو میں پہچان نہیں سکا تھا۔ اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے کہا۔

"میں کوئی بھی ہوں، ابھی اور اسی وقت تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ یہ بہت ضروری ہے۔"

"آئی ایم سوری۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں آپ کو نہیں جانتا۔ آدھی رات کو میں کسی اجنبی سے ملاقات نہیں کرسکتا۔"

"ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔" اس کی مدھر آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ "اس لیے ملاقات میں کوئی حرج نہیں ہے۔"

اس کا پراسرار انداز مجھے ان گنت شکوک وشبہات میں ڈال رہا تھا۔ میں نے اسے گھیرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اگر ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور میں کسی وجہ سے تمہاری آواز کو پہچان نہیں پا رہا تو تم تعارف کرادو۔ اگر تم واقعی میری شناسا ہو کیں تو پھر ملاقات کے بارے میں بھی سوچا جاسکتا ہے۔"

"علی! تم میری بات کا یقین کرو۔" وہ منت ریز لہجے میں بولی۔ "ہم پہلے مل چکے ہیں اور میرا دعویٰ ہے کہ ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ اس وقت ہماری ملاقات اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس میں ہم دونوں کا فائدہ ہے، ہمیں ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔"

"فائدے کی بات ہر کسی کو اچھی لگتی ہے اور پھر تم نے میری کوئی ضرورت پوری کرنے کا ذکر بھی کیا ہے۔" میں نے اس کے پتے جھانکنے کی کوشش کی۔ "لیکن جب تک میں تمہارے بارے میں کچھ جان نہ لوں، میں تم سے ملاقات نہیں کرسکتا۔ آئی ایم ریئلی ویری سوری۔"

"دیکھو علی! اگر تم مجھ سے ملنے نہیں آؤ گے تو پھر مجبوراً مجھے تمہارے پاس آنا پڑے گا۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ "کیونکہ میں تم سے ملے بغیر ٹلنے والی نہیں ہوں۔ میں اگر تمہارے پاس آ گئی تو تمہارے لیے گمبھیر مسائل کھڑے ہو جائیں گے۔"

اس کے آخری جملے میں ایک نامعلوم دھمکی چھپی ہوئی تھی۔ اس سیلولر گفتگو کے دوران میں، میں مسلسل اس کوشش میں مصروف تھا کہ کسی طرح یہ جان لوں کہ آخر...... وہ ہے کون؟ لیکن ابھی تک میری یہ سعی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکی تھی۔ میں نے اسے کریدنے کی خاطر ایک چال چلتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں تمہاری بات مان لیتا ہوں۔ بتاؤ، مجھے کہاں آنا ہے۔ ویسے میں کراچی میں بالکل اجنبی ہوں۔"

"اوکے میں سمجھاتی ہوں تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔" اس نے آسانی سے مجھے پتا سمجھا دیا۔

"ٹھیک ہے، میں تھوڑی دیر میں تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں۔" میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔ "لیکن ایک مسئلہ ہے......!"

"کیسا مسئلہ؟" اس نے پوچھا۔

"اگرچہ تمہارا دعویٰ یہی ہے کہ ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے تمہارے بارے میں کچھ بھی یاد نہیں آ رہا۔" میں نے کہا۔ "میں تمہیں پہچانوں گا کیسے؟ کم از کم تم مجھے اپنا نام تو بتادو۔"

"تمہارے لیے صرف اتنا جان لینا ہی کافی ہے کہ ہم ایک دوسرے کے صورت آشنا ہیں۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "اگر تمہیں کچھ یاد نہیں بھی آ رہا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں تمہیں دیکھتے ہی پہچان لوں گی۔ چلو تمہاری یادداشت کو واپس لانے کے لیے اتنا بتادیتی ہوں کہ میرے نام کے آخر میں این اے آتا ہے یعنی......نا۔"

"اوہ......!" میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا اور میں یکبارگی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ "کیا تم ڈیلفینا ہو؟...... لیکن یہ تمہاری آواز کو کیا ہوا ہے۔ کیا تم دانستہ لہجہ بدل کر بات کر رہی ہو......؟"

اس نے میرے اضطراری سوالات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اگلے ہی لمحے مجھے محسوس ہوا کہ لائن بے جان ہوچکی ہے۔ اس نے سیلولر رابطہ موقوف کردیا تھا۔

"کیا ڈیلفینا کراچی پہنچ گئی ہے؟" میں نے خود کلامی کی۔

اس تصور نے میرے رگ و پے میں ایک سنسنی سی دوڑا دی تھی۔

امنگوں حوصلوں اور آہوں کے بیچ رلاتی۔ کبھی محبتوں اور چاہتوں کے مدھر گیت سناتی اس ناقابلِ فراموش داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ کریں

خودکردہ

سلیم انور

”خود پہ آئی... دوسروں پہ گنوائی“ یہ محاورہ اگرچہ پرانا ہے مگر ہر دور میں اس کی تفسیر جابجا نظر آتی ہے۔ وہ بھی خود کو اتنا ہی ذہین سمجھ رہا تھا مگر ساری ذہانت اس کی متانت کو لے ڈوبی جب نقاب ہٹانے والوں نے اس کی اصل حقیقت کو جانچ لیا۔

تفتیشی اقدامات میں ساتھ ساتھ رہنے والے خطاکار کی چالاکی

دروازے کے نیچے ایک تولیا اڑسا ہوا تھا، اسی لیے اسے دھکیل کر کھولنے کے لیے ضرورت سے کچھ زیادہ ہی کوشش کرنا پڑی۔

”اپنی سانسیں روکے رہو۔“ سارجنٹ ولسن نے اپنے پیچھے آنے والے آدمیوں سے کہا اور دروازے کو دھکیلتا ہوا بیڈ روم میں داخل ہونے لگا۔

اس کے عین پیچھے پیرامیڈکس کی ایک ٹیم تھی۔ وہ لوگ لپک کر اس شخص کے پاس پہنچے جو گیس کے آتش دان کے

قریب پڑا ہوا تھا۔ سارجنٹ ولسن نے گیس کا والو بند کر دیا اور پھر دوڑ کر کمرے کی تمام کھڑکیاں باری باری کھول دیں۔

ان تمام مراحل کے دوران شرمین ہونز ہال وے میں اپنی سانسوں پر قابو پائے وہیں کھڑا رہا۔

پیرامیڈیکل اسٹاف کے دونوں ممبرز کئی منٹ تک اپنی سی پوری کوشش کرتے رہے پھر انہوں نے ہار مان لی۔

''یہ مر چکا ہے!'' انہوں نے فرش پر پڑے آدمی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

سارجنٹ ولسن نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے ان کی بات کی تصدیق کر دی۔ ''تم اب اندر آسکتے ہو، شرمین...... اور معمول کے مطابق سانس بھی لے سکتے ہو۔''

شرمین اس چھوٹے سے پُرآسائش بیڈروم میں داخل ہو گیا اور اس کا بھرپور جائزہ لینے لگا۔ لاش کے نزدیک ہی ایک بیس بال کا بلّا پڑا ہوا تھا اور بلّے کے دستے پر ایک تولیا بھی لپٹا ہوا تھا تاکہ بلّے کے دستے پر انگلیوں کے نشانات پائے جانے کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔

کمرے میں ایک اور دروازہ بھی تھا جو ایک پرائیویٹ باتھ روم میں کھلتا تھا۔ سارجنٹ ولسن نے اس کے دروازے کا تالا کھول کر اس میں موجود کھڑکی بھی کھول دی اور ایگزاسٹ فین چلا دیا تاکہ یہاں اگر کوئی گیس ہو تو وہ بھی باہر نکل جائے۔

شرمین نے بین ہنٹر کی بائیں کنپٹی پر چوٹ کے نشان کو دیکھا، پھر دم گھٹنے سے نیلے پڑ جانے والے ہونٹوں کا جائزہ لیا اور آخر میں اس کھلے ہوئے سیل فون کو دیکھا جو اس کے ہاتھ میں موجود تھا۔ ''اگر اس نے اپنے بیٹے کے گھر فون کرنے کے بجائے پولیس کو فون کر دیا ہوتا تو شاید اب بھی زندہ ہوتا۔''

''ہو سکتا تھا اور نہیں بھی۔'' سارجنٹ ولسن نے کہا۔ ''میرا اندازہ ہے کہ قاتل نے اس کو بیس بال کے بلّے سے ضرب لگائی، پھر گیس کا والو کھول دیا اور یہاں سے نکل گیا۔ مضروب میں اتنا ہوش اور طاقت باقی تھی کہ اس نے جیب میں سے اپنا سیل فون نکال لیا اور اپنے فون کے اسپیڈ ڈائل کا پہلا نمبر دبا دیا۔ اسے اپنے بیٹے کو اپنا پتا یا کوئی اور معلومات فراہم کرنے کی ضرورت نہیں تھی جو کہ پولیس کو فون کرنے کی صورت میں فراہم کرنا پڑتی۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس کے پاس وقت کم ہے۔ یہ اس کی ایک اسمارٹ کوشش تھی لیکن اس کی قسمت کہ اس وقت اس کا بیٹا گھر پر موجود نہیں تھا۔''

''ہفتے کے عام دنوں میں، میں کبھی گھر پر نہیں ہوتا۔''

انہیں اپنے عقب میں کمرے کے دروازے کی جانب سے یہ آواز سنائی دی۔

اس تمام ہلچل کے دوران وہ لوگ مرنے والے کے ان دو عزیزوں کو فراموش کر بیٹھے تھے جو اس وقت مکان میں موجود تھے۔ ان میں سے ایک بین ہنٹر کا بیٹا ڈوگ ہنٹر تھا جو اپنے باپ کے بے جان جسم پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ ''میرا خیال ہے کہ وہ بہت زیادہ کنفیوژ ہو گئے تھے اور انہیں یہ یاد نہیں رہا کہ میں گھر پر موجود نہیں ہوں گا۔ میں نے اپنے گھر وائس میل پر کال کی تو مجھے پیغام ملا لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی!''

''بین کے ساتھ کچھ صحت کے مسائل بھی تھے۔'' بین کی بیوی کارلا ہنٹر گویا ہوئی۔ ''اور وہ ڈپریشن کا شکار بھی تھا۔ کیا تم لوگوں کو یقین ہے کہ اس نے خودکشی نہیں کی؟''

کارلا نے ہنٹر سے علیحدگی اختیار کی ہوئی تھی اور وہ عمر میں اس سے دس سال چھوٹی تھی۔

''بہ ظاہر تو ایسا دکھائی نہیں دے رہا۔'' سارجنٹ ولسن نے کہا۔ ''بیوی ہونے کے ناتے اس کی جائداد کی وارث تم ہی ہوگی، کیا یہ درست ہے؟''

''اب بچا ہی کیا ہے!'' کارلا نے کہا۔ ''وہ کاروباری طور پر پچھلے سال ہی دیوالیا ہو چکا تھا۔ اگر تم لوگ جواز جاننے کے لیے کسی کو تلاش کر رہے ہو تو ڈوگ سے پوچھو۔ بین نے اپنے بیمے کا وصیت نامہ تبدیل کر کے اپنے مرنے کے بعد بیمہ کی رقم کی وصولی کا حقدار اپنے بیٹے ڈوگ کو قرار دے دیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر بین کی موت قتل ہونے یا تشدد کی وجہ سے واقع ہوئی ہے تو بیمہ پالیسی کے مطابق رقم کی ادائی دگنی ہوگی۔''

''یہ سچ ہے۔'' ڈوگ نے اقرار کیا۔ ''لیکن آج میں صبح سے دن بھر اپنے کام پر تھا۔ تم میرے پلانٹ پر میرے سپروائزر سے اس بات کی تصدیق کر سکتے ہو۔''

شرمین نے سر ہلا دیا۔ وہ ایسی صورتِ حال میں کسی حد تک نروس ہو جاتا تھا لیکن کمرے میں بسی ہوئی گیس کی بو اسے کچھ زیادہ ہی نروس کر رہی تھی۔

''کیا تمہارے پاس وہ وائس میل پیغام موجود ہے جو تمہارے باپ نے تمہارے لیے چھوڑا تھا؟''

ڈوگ ہنٹر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''میں اسے سننا چاہتا ہوں۔''

''یقیناً۔'' ڈوگ ہنٹر نے کہا پھر اس نے اپنے سیل فون کا فلیپ اٹھایا اور کئی ایک نمبروں کے بٹن دبانے کے

سورۃ یاسین قبر کے عذاب سے بچاتی ہے۔
سورۃ رحمٰن امیر کرتی ہے۔
سورۃ واقعہ بھوک مٹاتی ہے۔
سورۃ الملک قبر میں روشنی کرتی ہے۔
سورۃ الجاثیہ زندگی میں امن لاتی ہے۔

☆☆☆

ماں باپ کا دل اور دامن پوری کائنات سے زیادہ وسیع ہوتا ہے جو کبھی اولاد کی خوشیاں مانگنے کے لیے پھیلتا ہے اور کبھی ان کے دکھ سمیٹنے کے لیے۔

☆☆☆

☆ پرانے زمانے میں شادی کی تاریخ گھر کے بڑے طے کرتے تھے۔ اب شادی ہال والے طے کرتے ہیں وہ بھی تین ماہ پہلے۔

☆ سجدوں سے رب کو اور اخلاق سے اس کے بندوں کو خوش رکھو دونوں جہان میں آسانی ہوگی۔

☆ دنیا میں سب سے مہنگا لیکویڈ آنسو ہیں جس کے ایک قطرے میں 1 فیصد پانی اور 99 فیصد احساس ہوتا ہے۔ کوشش کرنا کسی کے آنسو بہنے کی وجہ آپ کی ذات نہ ہو۔

☆ نصیحت کسی کو شرمندہ کرنے کے لیے نہیں کرنی چاہیے اور نصیحت کا مقصد دستک دینا ہونا چاہیے۔ دروازہ توڑنا نہیں۔

مرسلہ: شفیق حسین۔ نیو کراچی، سندھی ہوٹل

بعد فون شرمین کو تھما دیا۔

فون سے ابھرنے والی آواز نحیف سی تھی۔ ''کسی نے مجھے ضرب لگائی ہے۔ بیڈروم...... گیس...... نہیں معلوم وہ کون تھا...... میں بدستور گھر میں ہوں...... ہال میں...... جلدی کرو۔''

شرمین نے اس پیغام کو دو مرتبہ سنا پھر سیل فون ڈوگ کو واپس کر دیا۔

سارجنٹ ولسن اپنے دوست شرمین کو ایک طرف لے گیا اور ایک کھلی ہوئی کھڑکی کے پاس پہنچ کر بولا۔ ''تمہارے خیال میں ان میں سے کسی ایک نے کسی کی خدمات حاصل کی ہوں گی؟ کسی کرائے کے قاتل کی؟''

شرمین نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''جو کچھ دکھائی دے رہا ہے، اصل بات اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔''

☆☆☆

سارجنٹ ولسن کو اپنا کام سہل ہوتا محسوس ہوا تھا لیکن مشکل کام اپنے اس نرالے دوست کو قائل کرنا اور پھر ڈسٹرکٹ اٹارنی کو مطمئن کرنا تھا تاکہ وہ درست فرد پر مقدمہ دائر کر سکے۔ ''میں تفتیش کے لیے کسے لے کر آؤں؟'' اس نے شرمین سے پوچھا۔

''کسی کو بھی نہیں۔'' شرمین نے جواب دیا۔ ''یہ کام جس فرد نے سرانجام دیا ہے، تم اسے کبھی بھی حراست میں نہیں لے سکتے لیکن وہ ملزم ہونے سے کبھی بھی نہیں بچ سکتا۔''

''سنو، شرلاک ہومز!'' سارجنٹ ولسن چیخ پڑا۔ ''میں پہیلیاں بجھوانے کے موڈ میں ہرگز نہیں ہوں۔''

''قتل کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا، سارجنٹ۔ بس یہ انشورنس فراڈ کی ایک کوشش تھی۔''

اس سے قبل کہ سارجنٹ اپنی حیرت کا اظہار کرتا، شرمین نے اپنی بات جاری رکھی۔

''بین ہنٹر نے خودکشی کی ہے...... لیکن غیر متوقع طور پر نہیں...... اس کے کاروبار کی ناکامی، دوالیاپن اور خرابیٔ صحت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ قطعی ممکن بات تھی لیکن وہ چاہتا تھا کہ اس کی بیمہ کی رقم اس کے بیٹے ڈوگ کو مل جائے۔ اس لیے اس نے گیس آن کی، بیس بال کے بلے سے خود کو ضرب لگائی اور پھر اپنے بیٹے کے گھر پر فون کر دیا...... یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اس وقت گھر میں موجود نہیں ہوگا۔ اس نے پولیس کو یا اپنے بیٹے کے سیل فون پر جان بوجھ کر فون اس لیے نہیں کیا کہ اس کے لیے مدد بہت جلدی آ جاتی۔''

''تو پھر مدد کے لیے کال کیوں کی تھی؟''

''بین نے یہ کہا تھا کہ حملہ آور باہر ہال میں نکل گیا ہے پھر بین اس کمرے کو چھوڑ کر ہال میں کس طرح گیا ہوگا؟'' شرمین نے سوال کیا۔

''دروازے کے راستے۔'' سارجنٹ ولسن نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''اس کمرے سے باہر جانے کا یہی تو ایک راستہ ہے۔''

''درست!'' شرمین نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ ''تو پھر دروازے کے نیچے تولیا کس طرح پھنسایا گیا تھا...... وہ بھی اندر کی جانب سے؟''

سارجنٹ ولسن اس بات پر سوچ میں پڑ گیا۔

''ظاہر ہے۔'' شرمین نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ کام وہی کر سکتا تھا جو کمرے کے اندر موجود تھا...... اور وہ بین خود تھا!''

تبادلہ

مظہر سلیم ہاشمی

بعض اوقات ایک باشعور انسان بڑے مزے سے اپنی عقل کے بل پر دوسرے انسان کو بے وقوف سمجھ کر باتوں کے جال میں قید کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر... بے بسی کی انتہا کہ مدمقابل جان بوجھ کر اس جال میں قید ہوجانے پر مجبور ہوتا ہے جیسا کہ یہاں... کیونکہ ہر خریدی ہوئی چیز واپس نہیں ہوتی البتہ تبادلہ ممکن ہوجاتا ہے مگر... بدلے میں اسے کیا ملتا ہے یہ اس کا نصیب۔

خریداری میں خواری اٹھانے والے ایک سادہ انسان کا قصہ

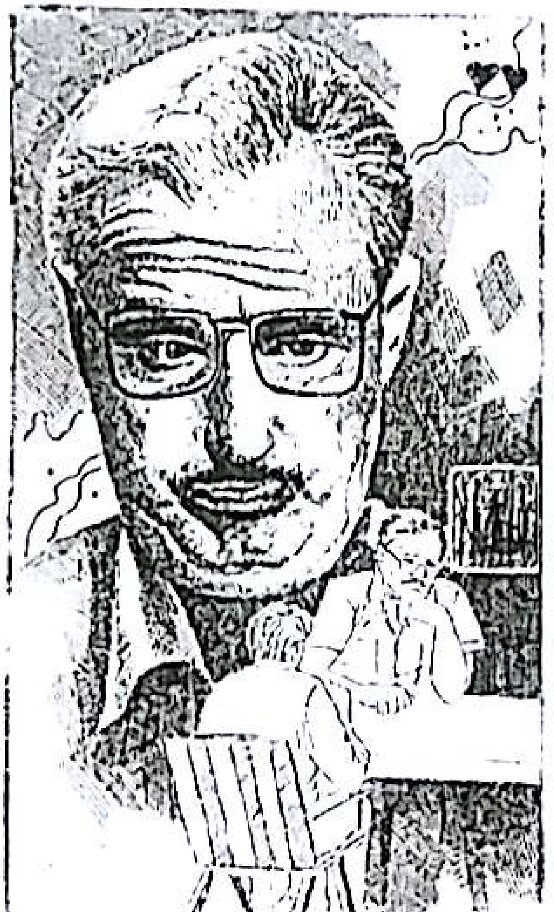

’’ہیلو سر...... میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟‘‘

’’مجھے یہ الارم والی گھڑی واپس کرنی ہے......‘‘

’’جی...... کیا مسئلہ ہے اس کے ساتھ؟‘‘

’’اس کا الارم ہی نہیں بجتا۔‘‘

’’وہ کس طرح؟‘‘

’’مطلب الارم کی آواز ہی نہیں آتی۔‘‘

’’کیا آپ نے اس کے ساتھ دیے ہوئے کتابچے سے مسئلہ حل کرنے کی کوشش کی؟‘‘

’’ہاں جی...... کوشش تو کی تھی۔‘‘

’’تو کیا پھر بھی مسئلہ حل نہیں ہوا؟‘‘

’’نہیں......‘‘

’’تو... کیا آپ کے پاس اس کی رسید ہے؟‘‘

’’نہیں...... بڑا تلاش کیا لیکن نہیں ملی......‘‘

’’اوہ...... پھر تو آپ کی رقم واپس نہیں ہوسکے گی۔‘‘

’’ارے نہیں...... آپ غلط سمجھے...... مجھے پیسے واپس نہیں چاہئیں...... مجھے تو بدلے میں ایک ایسی گھڑی درکار ہے جس کا الارم کام کرتا ہو۔‘‘

’’ٹھیک ہے کیا آپ اس کا پیکنگ والا ڈبا لائے ہیں؟‘‘

’’نہیں...... وہ تو میں نے پھینک دیا۔‘‘

’’مگر جناب ڈبے کے بغیر تو میں تبادلہ نہیں کرسکتا......‘‘

''یہ سخت پلاسٹک والے ڈبے میں پیک تھی۔ مجھے چھری کی مدد سے کاٹ کر اسے نکالنا پڑا...... مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ آپ کو اس کے ڈبے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟''

''ہماری پالیسی کے مطابق مصنوعات کی تبدیلی ان کے اوریجنل ڈبے کے بغیر نہیں کی جاسکتی۔''

''اتنا سارا بے کار پلاسٹک تھا۔ میں اس کچرے کو کیوں سنبھال کر رکھتا؟''

''بھئی ظاہر ہے...... تبدیلی کے وقت کام آجاتا۔''

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ گھڑی چند ہفتوں میں کام کرنا بند کردے گی۔ اس کا مطلب تو یہی ہوا کہ آپ میری کوئی مدد نہیں کرسکتے......؟''

''مدد کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ خریداری کا کوئی ثبوت پیش کرسکیں......''

''میں خود ثبوت ہوں...... میں آپ کو بتا تو رہا ہوں کہ میں نے اسے یہیں سے خریدا تھا...... جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے میرا بل بھی آپ ہی نے بنایا تھا۔''

''کیا آپ نے اس کا وارنٹی نمبر آن لائن رجسٹر کیا تھا؟''

''نہیں......''

''آہ...... یہ تو مسئلہ ہوگیا ہے نا پھر۔ آپ نے ادائیگی کیسے کی تھی...... کارڈ یا کیش؟''

''نقد......''

''اگر آپ نے کارڈ سے ادائیگی کی ہوتی تو آپ کے بینک سے اسٹیٹمنٹ مل جاتی کہ آپ نے کس دن خریداری کی......''

''تو...... میں نے تو نقد رقم دی تھی۔''

''دراصل مسئلہ یہ ہے کہ...... دوسرے اسٹورز بھی یہ والی گھڑی بیچتے ہیں' آپ اسے کہیں اور سے بھی خرید سکتے ہیں......''

''بالکل ایسا ہوسکتا ہے...... لیکن ایسا نہیں ہے۔ میں نے یہ گھڑی ادھر سے ہی خریدی تھی اور اب اس کی خرابی کے بعد آپ مجھے ایک نئی گھڑی دینے کے ذمے دار ہیں......''

''آپ نے یہ خریدی کب تھی؟''

''چند ہفتے قبل......''

''ہماری تبدیلی کی پالیسی اکیس دن کی میعاد رکھتی ہے...... مجھے لگتا ہے آپ اس وارنٹی سے بھی نکل چکے ہیں......''

''میں نے پچھلے ماہ کی کسی تاریخ کو لی تھی...... اب صحیح دن یاد نہیں آرہا......''

''ہم ایسی گھڑیاں پچھلے دو سال سے بیچ رہے ہیں......''

''آپ کو لگتا ہے میں جھوٹ بول رہا ہوں؟''

''بالکل نہیں جناب...... میں بس اتنا کہہ رہا ہوں کہ ہو سکتا ہے یہ آپ نے بائیس دن پہلے خریدی ہو...... ایسی صورت حال میں آپ اگر رسید اور اصل ڈبا بھی لے آتے تو وارنٹی کلیم کرسکتے تھے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کرپایا اور مزید بھی نہ کرپاؤں گا۔''

''بالکل بھی نہیں؟''

''جی بالکل...... بھی نہیں......''

''تو اب یہ خراب گھڑی میں ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھوں گا؟''

''آپ اس کی خرابی کی شکایت کے ساتھ اس کو فیکٹری بھیج سکتے ہیں۔''

''اب میں اس کو چائنا تو بھیجنے سے رہا......''

''پھر میں یہی مشورہ دے سکتا ہوں کہ اس کو کسی گھڑی ساز کے پاس لے جائیں......''

''وہ تو اتنا معاوضہ طلب کرلیتے ہیں جتنے میں نئی گھڑی آجائے......''

''میں جانتا ہوں......''

''کیا میں منیجر سے بات کرسکتا ہوں؟''

''وہ آج چھٹی پر ہیں......''

''تو جو انچارج ہیں ان سے ہی میری بات کرادیں......''

''آپ پہلے سے ہی ان سے بات کررہے ہیں۔''

''منیجر کی کل تک واپسی ہوجائے گی؟''

''نہیں......''

''پھر کب تک آجائے گا؟''

''آجائیں گی......''

''اوہ...... اچھا...... پھر وہ کب تک آجائیں گی؟''

''پیر کو......''

''میں پھر پیر کے روز ہی آؤں گا......''

''اچھی بات ہے...... میں آپ کی کسی اور چیز کی خریداری میں مدد کرسکتا ہوں؟''

''میرا نہیں خیال......''

''او کے...... کیا آپ اپنا اسٹور کارڈ بنوانا پسند کریں گے؟ یہ بالکل مفت ہے...... بس اپنی تفصیلات جمع کرائیں اور آپ کو اس کے بعد ہر چیز کی خریداری پر پانچ فیصد کی یقینی بچت ملا کرے گی۔''

''نہیں...... شکریہ!''

''اگر آپ اپنا کارڈ آج بنواتے ہیں تو کرسمس کی خوشی میں ایک خوبصورت تحفہ بھی ساتھ میں مفت پائیں گے......''

''تحفہ کیا ہے؟''

''الارم والی گھڑی......''

اللہ کے ایک جلیل القدر پیغمبر کی سوانح حیات کے سبق آموز پہلو

اللہ رب العالمین نے تمام انسانوں کی اصلاح کے لیے نہ صرف مختلف پیغمبر دنیا میں بھیجے کہ وہ اپنے رب کا پیغامِ حق لوگوں تک پہنچائیں بلکہ... ان پیغمبروں کی تمام زندگی بھی عملی طور پر اسی حق گوئی کی تفسیر بنا دی گئی... جیسے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کا ہر لمحہ کٹھن آزمائشوں اور صبر و استقامت کی اعلیٰ مثال بن کے بنی نوع انسان کے لیے سبق آموز ٹھہرا... کیونکہ آپ کے لیے کڑی آزمائشوں کا سلسلہ تو بچپن سے ہی شروع ہو چکا تھا کہ جب آپ کے بھائیوں نے آپ کو مصر کے بازار میں پہنچایا اور بچپن کا وہ خواب کہ جس میں آپ کی عظمت کی بشارت دی گئی اور گیارہ ستاروں نے آپ کو سجدہ کیا... پھر دھیرے دھیرے وقت نے ثابت کیا کہ خوابوں کی تعبیر کا ایسا سچا علم آپ کو عطا کیا گیا جس کے ذریعے نہ صرف زلیخا کے دیے گئے جھانسے سے نکلنے میں کامیاب ہوتے بلکہ قیدو بند کی صعوبتوں سے بھی نکلنے کا راستہ نکلا اور آپ کی تمام دعاؤں کو قبولیت بخشی گئی... سبحان اللہ۔

حضرت یوسف علیہ السلام

رضوانہ ساجد

آخری حصہ

انہوں نے ایک مرتبہ پھر کوشش کی اور جمع ہو کر حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس گئے۔ پہلے خوشامد کی اور اس مرتبہ بھی جب صاف جواب مل گیا تو وہ دھمکیوں پر اتر آئے۔

''اپنے بھائی کو لے جانے کے لیے ہم سے جو بھی ہوگا وہ کریں گے۔''

''کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میری بے پناہ فوج کے باوجود تم حملہ کر کے اپنے بھائی کو چھڑا کر لے جاؤ گے؟''

''ہم آپ کو صرف ایک دن دیتے ہیں۔ ہمارا بھائی ہمارے پاس پہنچ جائے ورنہ پھر ہم وہ کریں گے جو ہم نے سوچا ہے۔''

''میں اب بھی تمہیں یہ مشورہ دیتا ہوں کہ جلد سے جلد اپنے ملک کو لوٹ جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم میں سے ایک بھی واپس نہ جا سکے۔''

یہ بھائی وہاں سے ہٹ گئے لیکن محل سے کچھ دور جا کر رک گئے۔ باہم مشورے پھر شروع ہو گئے۔ آپس کے اختلافات کے باوجود یہ طے ہو گیا کہ اگر کل تک بنیامین کو ہمارے حوالے نہیں کیا گیا تو ہم حاکم مصر پر اچانک حملہ کر کے بنیامین کو رہا کرا لیں گے۔ اپنی بہادری کے زعم میں وہ یہ نہیں سوچ رہے تھے کہ وہ تعداد میں صرف دس ہیں۔ مصری افواج کا مقابلہ کیسے کریں گے۔ انہوں نے وہیں محل کی آخری فصیل کے قریب پڑاؤ ڈال لیا۔

مصری مخبروں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو فوراً اطلاع کر دی کہ دس بھائی محل پر حملہ کریں گے اور بنیامین کو چھڑا لے جائیں گے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے ہوشیار ہو کر بنیامین کو تو محل کے اندرونی حصے میں چھپا دیا اور اپنی چالیس ہزار سپاہ کو محل کے چاروں طرف متعین کر دیا اور انہیں حکم دے دیا کہ حملہ آوروں پر کسی قسم کا تشدد نہ کیا جائے بلکہ انہیں کسی ترکیب سے غیر مسلح کر کے بغاوت پر قابو پایا جائے۔

صبح ہوئی تو یہ دس بھائی محل کے سامنے پہنچے اور حضرت یوسف علیہ السلام کو للکارنے لگے۔ مصر میں جو کنعانی موجود تھے۔ وہ بھی ان کی مدد کو آ گئے۔ بہت ممکن تھا کہ ہنگامہ طول پکڑ جاتا لیکن چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام پہلے ہی باخبر ہو چکے تھے اور ضروری انتظامات کر لیے تھے اس لیے اشارہ ملتے ہی مصری سپاہ نے انہیں گھیرے میں لے لیا اور ایک ایک کر کے سب کو غیر مسلح کر دیا۔

''میں چاہتا تو تم میں سے ایک بھی زندہ بچ کر نہ جاتا۔ اب تمہیں معلوم ہو گیا ہوگا کہ تم میرا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ میرا تمہیں یہی مشورہ ہے کہ کنعان واپس چلے جاؤ۔ جو اناج تمہیں ملا ہے اسے کھاؤ۔ میں تمہیں تھوڑی مہلت اور دیتا ہوں۔ خوب اچھی طرح سوچ کر بتاؤ کہ تمہیں کنعان واپس جانا ہے یا میری قید میں دن گزارنے ہیں؟''

تمام بھائی اپنے پرانے ٹھکانے پر چلے گئے۔ اب وہ غیر مسلح بھی تھے اور اپنی ناکامی سے دل برداشتہ بھی۔ اختلافات کی دیواریں پھر کھڑی ہو گئیں۔ اس ناکامی کا الزام ایک دوسرے پر ڈالا جا رہا تھا۔

''آپس میں لڑنے کا کیا فائدہ۔ اب تو یہ سوچو کہ کرنا کیا ہے۔''

''مصری افواج سے مقابلہ کرنا آسان نہیں جبکہ مصر میں رہنے والے تمام کنعانیوں کے ہتھیار لے لیے گئے ہیں، کوئی بھی ہماری مدد کو نہیں آئے گا۔''

''ایک مرتبہ پھر حاکم مصر کو بوڑھے باپ کا واسطہ دے کر بنیامین کی رہائی پر آمادہ کیا جائے؟''

''کوئی فائدہ نہیں۔ وہ نہیں مانے گا۔''

''پھر ہم سب بھی یہیں رک جائیں۔''

''چوری بنیامین نے کی ہے، ہم کیوں سزا بھگتیں۔''

''ہم باپ سے جا کر کیا کہیں گے؟''

''جو سچ ہے وہ کہہ دیں گے کہ تیرے بیٹے نے چوری کی تھی پکڑا گیا۔''

''وہ ہماری بات کا یقین کر لیں گے؟''

''بہت سے کنعانیوں نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ گواہی دیں گے ورنہ ایک سال بعد بنیامین خود آ کر بتائے گا کہ اس سے کیا حرکت سرزد ہوئی ہے۔''

بڑا بھائی راد بین مصر چھوڑنے کا سخت مخالف تھا۔ وہ حضرت یعقوب علیہ السلام سے کہہ کر آیا تھا کہ اگر میں بنیامین کو واپس نہ لاؤں تو ہمیشہ کے لیے گناہ گار ٹھہروں گا۔ اس لیے اب باپ کے سامنے جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

بھائیوں نے اس کی مخالفت کی اور بنیامین کے بغیر ہی کنعان واپس جانے کا تہیہ کر لیا۔

(بعض نے لکھا ہے راد بین مصر ہی میں رک گیا تھا)

میدان خالی ہوا تو مخبروں نے فوراً اطلاع کر دی کہ کنعان سے آئے ہوئے دس بھائیوں نے مصر چھوڑ دیا اور شمالی دروازے سے نکل کر کنعان کی طرف جا رہے ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام اپنے بھائی بنیامین کو اپنے پاس روکنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ وہ اس رات نہایت پرسکون نیند سوئے۔ تھوڑی دیر کو انہیں محسوس ہوا کہ وہ کنعان میں اپنے گھر میں ہیں۔ بنیامین ان کے پاس ہے اور باپ بس آتے ہی ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی سوتیلے بھائی اور ان کا رویہ یاد آیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ بھائیوں کا یہ جملہ کانوں میں گونج رہا تھا۔

''بنیامین نے چوری کی تو کیا تعجب۔ اس سے پہلے اس کا بڑا بھائی بھی چوری کر چکا ہے۔''

انہوں نے مجھ پر یہ الزام کیوں لگایا؟ انہیں بھائیوں کے ظالمانہ رویوں سے اتنی تکلیف نہیں ہوئی تھی جتنی اس الزام سے ہوئی تھی۔ وہ سوچنے لگے کہ بھائیوں نے جو اتنا بڑا الزام لگایا ہے اس کی وجوہات کیا ہو سکتی ہیں۔ بچپن کی یادوں میں سے ایک یاد ان کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

حضرت یعقوب علیہ السلام اپنی والدہ کے کہنے پر اپنے ماموں لایان کے پاس فدان آرام چلے گئے تھے۔ وہیں انہوں نے ماموں کی دو بیٹیوں لئیہ اور راحیل سے شادی کر لی تھی (اس زمانے میں دو بہنوں کو ایک ساتھ نکاح میں رکھنا جائز تھا) حضرت یعقوب علیہ السلام کی تمام اولادیں بنیامین کے علاوہ فدان آرام میں ہی پیدا ہوئیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو بچپن کا ایک واقعہ یاد آیا۔ انہوں نے لایان یعنی اپنے نانا کا ایک بت چوری کر لیا تھا اور اسے توڑ دیا تھا۔ بچپن ہی سے توحید پرستی آپ کی فطرت میں داخل تھی لہٰذا بت کا وجود آپ کو ناگوار ہوا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے اسے چوری نہیں کہا جا سکتا کیونکہ یہ تو بت پرستی کے خلاف نفرت کا اظہار تھا۔

پھر انہیں وہ واقعہ یاد آ گیا جب ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ بنیامین شیر خوار تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام سے ان کے بھائی ان کے حسن و جمال کی وجہ سے حسد کرتے تھے تو ان کی پھوپی انہیں اپنے گھر لے گئیں اور نہایت محبت سے ان کی پرورش کرنے لگیں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے انہیں پھوپی کے گھر بھیج تو دیا لیکن ان کا سکون اٹھ گیا۔ گھر میں ہر طرف انہیں ڈھونڈتے پھرتے تھے پھر انہیں دیکھنے پھوپی کے گھر چلے جاتے۔ کچھ دیر کو سکون مل جاتا۔ گھر لوٹ کر آتے تو پھر وہی بے سکونی۔ پھوپی کے گھر انہیں چھوڑنا ان کی مجبوری بھی تھی کیونکہ گھر میں انہیں اپنے بڑے بیٹوں سے ڈر لگا رہتا تھا کہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی محبت نے پھر ایک راستہ یہ نکالا کہ یوسف ایک ہفتہ ان کے پاس رہیں گے، ایک ہفتہ پھوپی کے پاس۔ اس ایک ہفتے کی جدائی بھی آپ کو شاق گزرنے لگی۔ اب انہوں نے اپنی بہن سے صاف کہہ دیا کہ یوسف کو وہ ان کے پاس نہیں چھوڑ سکتے۔ اب جو وہ رہنے آئیں گے تو مستقل میرے ہی پاس رہیں گے۔

پھوپی کو بھی ان سے ایسی محبت ہو گئی تھی کہ وہ انہیں پل بھر کے لیے خود سے جدا کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ اب وہ کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام ان کے گھر مستقل قیام پر مجبور ہو جائیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یادگار اشیا میں سے ایک کمر بند تھا جو حضرت یوسف علیہ السلام کی پھوپی کے پاس تھا۔ جب حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام کو لینے آئے تو ان کی پھوپی نے انہیں تیار کیا اور یہ یادگار کمر بند ان کے کرتے کے نیچے کمر سے باندھ دیا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام انہیں لے کر گھر آ گئے۔ پیچھے پیچھے ان کی بہن بھی آ گئیں۔ حضرت یعقوب انہیں دیکھ کر مسکرائے۔

''تمہیں یوسف سے ایسی محبت ہو گئی ہے۔ ابھی تو میں اسے لایا ہوں۔ تم اسے دیکھنے چلی آئیں؟''

''اس کی محبت اپنی جگہ لیکن اس وقت میں کسی اور کام سے آئی ہوں۔ دادا ابراہیم کے زمانے کا ایک ازار بند تھا جو گھر سے غائب ہو گیا ہے۔ اسی کی تلاش میں آئی ہوں۔ وہ میرے لیے بڑا قیمتی تھا۔''

''تم کیا سمجھتی ہو، کس نے لیا ہوگا؟''

''شاید آپ کے کسی نوکر نے اڑا لیا ہو۔''

''وہ متبرک ہے اس لیے ہمارے نزدیک قیمتی ہے۔ کوئی اور کیوں لینے لگا تھا۔ پھر بھی میں نوکروں کو بلاتا ہوں، تم ان سے پوچھ گچھ کر لو۔''

نوکروں کو بلایا گیا۔ ایک ایک سے پوچھا۔ ہر ایک نے انکار کیا۔ اب حضرت یوسف علیہ السلام ہی رہ گئے تھے۔

''مجھے بڑی شرمندگی سے کہنا پڑ رہا ہے لیکن آپ ذرا یوسف کو بلوائیں۔ میں اس سے بھی پوچھتی ہوں۔''

"آپ میرے یوسف کو چور سمجھ رہی ہیں؟"
"بچہ ہے، شاید کھیل کھیل میں چھپالیا ہو۔"
حضرت یوسف علیہ السلام کو بلوایا گیا۔ ان سے پوچھا گیا تو ظاہر ہے انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا لیکن پھوپی کو معلوم تھا۔ انہوں نے کرتہ اوپر کیا اور ازار بند برآمد ہو گیا۔
حضرت یعقوب علیہ السلام کو یقین تھا کہ یوسف چور نہیں۔ ان کی بہن نے انہیں اپنے پاس روکنے کے لیے چال چلی ہے۔ انہوں نے بہن سے یہ نہیں کہا کہ چوری یوسف کی نہیں، تمہاری پکڑی گئی ہے۔
"ہمارے قانون میں چوری کی سزا یہ ہے کہ یوسف کو تمہاری غلامی کرنی ہو گی۔ اب میں اسے نہیں روکوں گا۔ تم اسے لے جاسکتی ہو۔ میں کبھی کبھی اسے دیکھنے آجایا کروں گا۔"
حضرت یوسف علیہ السلام اپنی پھوپی کے پاس رہنے لگے۔ پھر ان کا انتقال ہو گیا تو حضرت یوسف علیہ السلام واپس آگئے۔
حضرت یوسف علیہ السلام اپنے محل کے نرم و نازک بستر پر لیٹے سوچ رہے تھے، یہ بھی کوئی چوری تھی جو میرے بھائی مجھے چور ہونے کا طعنہ دے کر چلے گئے۔

☆☆☆

مصر کی طرف سے آنے والی شاہراہ پر گرد و غبار اڑا تو کسی نے آکر حضرت یعقوب علیہ السلام کو خبر کی کہ تمہارے بیٹے اناج لے کر آگئے ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام جو اب تک بنیامین کی طرف سے بے فکر تھے، بیٹوں کی آمد کا سن کر بے چین ہو گئے۔ خدا کرے وہ خیریت سے ہو۔ اس کے بھائی یوسف کی طرح اسے بھی کہیں چھوڑ کر نہ آگئے ہوں۔
دروازے پر کان لگے تھے۔ بار بار اپنے پوتوں سے پوچھتے تھے، تمہارے باپ آئے؟ بیٹوں کو آنے میں دیر ہو رہی تھی۔ اناج سے لدے ہوئے اونٹوں کو کارندوں کے حوالے کرنا تھا۔ اس کے بعد بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ باپ کے سامنے جائیں۔ آخر ہمت کر کے دبے قدموں باپ کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کو آہٹ سے اندازہ ہوا کہ کوئی آیا ہے۔
"تم آگئے ہو مگر بولتے کیوں نہیں؟"
"جو کچھ ہم بولنا چاہتے ہیں اس کے لیے الفاظ کہاں سے لائیں۔"
"کیا تمہیں اناج نہیں ملا؟"
"اناج تو مل گیا لیکن......"
"لیکن کیا؟"
اس کے بعد بیٹوں کی طرف سے پھر خاموشی ہو گئی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے پھر پوچھا۔ اس مرتبہ ان کی آواز غصے سے بھاری ہو گئی تھی۔
"تم بولتے کیوں نہیں...... بولو کیا جرم کر کے آئے ہو؟"
"جرم ہم نے نہیں کیا۔"
"تو کیا حاکم مصر نے تمہاری شان میں گستاخی کر دی؟"
"تمہارے بیٹے نے ہمیں رسوا کر دیا۔"
"میرے تو تم سب ہی بیٹے ہو۔ کس بیٹے نے رسوا کر دیا؟"
"آپ کے بیٹے بنیامین نے چوری کر کے ہم سب کو ذلیل کر دیا۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ وہ ایسی حرکت کرے گا، ورنہ ہم تم سے یہ وعدہ نہیں کرتے کہ اسے ہر حال میں لے کر آئیں گے۔"
"خبردار! اگر اس کے خلاف کوئی ایسی ویسی بات کی۔ بنیامین اور چوری؟ یہ تمہارے دل میں گھڑی ہوئی کوئی بات ہے جو تمہاری زبان پر آگئی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے تم پہلے جھوٹ بول چکے ہو کہ یوسف کو بھیڑیا لے گیا۔"
"تمہیں تو ہماری کسی بات کا یقین ہی نہیں آتا جبکہ ہم سچے ہیں اور واقعہ یہی ہے کہ حاکم مصر نے ہم سے بہت اچھا سلوک کیا تھا اور ضرورت سے زیادہ اناج دے کر رخصت کیا تھا۔ ہم اناج لے کر آ ہی رہے تھے کہ شاہی کارندے دوڑتے ہوئے آئے اور ہمیں روک لیا۔ ایک کارندے نے کہا کہ ہم حاکم مصر کا قیمتی پیالہ چرا لائے ہیں۔ ہم نے انکار کیا۔ انہوں نے

ہماری تلاشی لی۔ ہمارے پاس سے کچھ نہیں نکلا لیکن تمہارا چہیتا بیٹا اسے چرا کر لے آیا تھا۔ اس کے سامان سے پیالہ برآمد ہو گیا۔ ہم نے حاکم مصر کو بہت دھمکیاں دیں۔ اس سے لڑنے کو تیار ہو گئے لیکن اس نے بنیامین کو تاوان کے طور پر اپنے پاس روک لیا۔ اب وہ ایک سال تک اس کی غلامی کرے گا۔''

''میں پھر کہتا ہوں، تم فرضی داستان مجھے سنا رہے ہو۔ بنیامین چوری نہیں کر سکتا۔''

''ہم بھی یہی سمجھتے تھے کہ وہ معصوم ہے لیکن وہ تو اپنے بڑے بھائی سے بھی زیادہ نکلا۔''

''اے میرے بیٹو! تم یوسف کے ساتھ بھی مخلص نہیں تھے اور اب بنیامین کے ذریعے مجھے تکلیف پہنچانے پر تلے ہوئے ہو۔''

''اگر ہم میں سے کوئی یہ حرکت کرتا تو آپ کو پروا بھی نہیں ہوتی۔ یوسف کے لیے دن رات روتے رہتے ہیں اور اب بنیامین کا بھی ایسا ہی غم منائیں گے۔''

''تم جاؤ، اپنا کام کرو۔ مجھے تم سے کیا سروکار۔ میرے لیے اب صبر کے سوا کیا رہ گیا ہے۔ خدائے تعالیٰ سے کیا بعید کہ وہ ایک دن ان گم گشتگان کو مجھ سے ملا دے۔ اچھا ہوا میری آنکھیں چلی گئیں ورنہ مجھے تمہاری صورتیں دیکھنا پڑتیں۔ اب مجھے رونے کے سوا کیا کام رہ گیا ہے۔''

ان کی بے نور آنکھوں میں آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں رہ گیا تھا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا غم کیا کم تھا کہ اب بنیامین کا غم بھی اس میں شامل ہو گیا۔ انہیں ہرگز یقین نہیں تھا کہ بنیامین نے چوری کی ہوگی اور حاکم مصر نے انہیں روک لیا ہوگا۔ وہ تو یہی سمجھ رہے تھے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح ان کا یہ بیٹا بھی بھائیوں کے ظلم کا نشانہ بن چکا ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام دن رات دونوں بیٹوں کے فراق میں تڑپتے رہتے تھے۔ دل غم کی سوزش سے جل رہا تھا، آنکھیں سپید ہو گئی تھیں۔

ان کے بیٹے اس مرتبہ اس حد تک سچے تھے کہ بنیامین کو انہوں نے غائب نہیں کیا تھا بلکہ اس پر واقعی چوری کا الزام تھا۔ وہ بے اعتبار ہو چکے تھے اور حضرت یعقوب علیہ السلام ان کی بات پر یقین نہیں کر رہے تھے۔ اب ان ناخلف بیٹوں کو ان پر رحم آنے لگا تھا لیکن اس میں بھی حسد کا جذبہ موجزن تھا یعنی ان کے رونے میں بھی یوسف اور بنیامین کی محبت ظاہر ہوتی تھی۔

ایک روز ان کے بھائیوں نے انہیں سمجھانے کے لیے یہ لب و لہجہ اختیار کیا۔

''ہم آپ کے ہر وقت کے رونے سے تنگ آ گئے ہیں۔ آپ کو یہ خوشی نہیں ہے کہ دس بیٹے موجود ہیں۔ دو کے لیے روتے رہتے ہیں۔''

''میں نے تم سے تو کچھ نہیں کہا۔ آخر انسان ہوں، بیٹے یاد آ ہی جاتے ہیں جبکہ ان دونوں کو میں نے تمہارے ہاتھوں سے کھویا ہے۔''

''آپ کو اگر ہماری باتوں پر یقین نہیں آیا تو ہمیں ڈر ہے آپ اپنی جان گھلا لیں گے اور روتے روتے دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔''

''اگر تمہیں میرے مرنے کی اتنی ہی فکر ہے تو ایک مرتبہ پھر مصر جاؤ اور میرے بیٹے بنیامین کو لے کر آؤ۔ حاکم سے کہنا اس کا بوڑھا باپ اندھا ہے ورنہ خود چل کر آتا۔ اگر تم سچے ہو تو ضرور جاؤ گے۔''

''حاکم مصر کے پاس جانے کا اب ہمارا منہ نہیں۔ ایک سال کے لیے صبر کر لو۔ وہ خود آ جائے گا۔''

''صبر ہی تو کر رہا ہوں۔ فریاد ہے تو اپنے اللہ سے کہ وہ میری فریاد ضرور سنے گا۔''

اس وقت دل سے کوئی ایسی آہ نکلی تھی کہ عرش تک ہل گیا۔ اللہ نے اپنے نیک بندے کی تسلی کے لیے حضرت جبرائیل کو بھیجا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا خانۂ غم خوشبوؤں سے بس گیا۔

''اللہ نے پیغام بھیجا ہے کہ یعقوب غمزدہ کیوں ہوتے ہو۔ یوسف زندہ ہیں اور بڑے مرتبے پر ہیں۔ خزانے ان کی دسترس میں ہیں۔ وہ لینے والوں میں سے نہیں دینے والوں میں سے ہیں۔ ہزاروں لونڈیاں، باندیاں ان کی خدمت پر مامور ہیں۔ اللہ نیک لوگوں کو ایسا ہی صلہ دیتا ہے۔''

''یہ پیغام تو میرا دل بھی مجھے دیتا رہا ہے۔'' حضرت یعقوبؑ نے کہا۔ ''میں تو یہ جاننے کے لیے بے چین ہوں کہ میرا نورِ

نظر کب میرے سامنے ہوگا۔ میں دیکھ تو نہیں سکتا لیکن کب اس کی خوشبو سے میرے مشامِ جاں آباد ہوں گے۔''

''بس فراق کے دن ختم ہوئے۔ ملاقات جلد ہو جائے گی۔ اپنے اللہ کو راضی کرو۔ دنیاوی تدبیروں کے ساتھ ساتھ اس سے بھی فریاد کرتے رہو۔''

حضرت یعقوب علیہ السلام اپنی تدبیر کر رہے تھے اور اللہ ان کی راہ میں آسانیاں پیدا کرنے کے لیے اپنے احکام جاری کر رہا تھا۔ اللہ نے بھائیوں کے دلوں میں ڈالا کہ وہ باپ کی طرف سے ایک خط حاکمِ مصر کے لیے لے کر جائیں اور اپنی طرف سے بھی اس کی خوشامد کریں۔ شاید اس کے دل میں رحم آجائے اور وہ بنیامین کو ہمارے ساتھ آنے دے۔

یہ سب بھائی مل کر حضرت یعقوب علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

''اے باپ! ہمیں اجازت دے کہ ہم تیسری مرتبہ مصر جائیں اور بنیامین کو لانے کی کوشش کریں۔ قحط بھی شدید ہے، ہمیں اناج کی بھی ضرورت ہوگی۔''

''اے میرے بیٹو! جاؤ اور یوسف اور اس کے بھائی کا سراغ لگاؤ اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ بلاشبہ اللہ کی رحمت سے کافروں کے سوا کوئی ناامید نہیں ہوتا۔''

حضرت یعقوب علیہ السلام نے بنیامین کے ساتھ حضرت یوسف علیہ السلام کا نام لیا تو بیٹوں کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

''ہمیں تو بنیامین سے سروکار ہے کہ وہ زندہ ہے۔ آپ یوسف کا نام کیوں لیتے ہیں۔ اسے تو بھیڑیا کھا چکا۔ اس کا سراغ ہمیں کہاں ملے گا۔''

''یوسف کا نام میں نے اس لیے لیا کہ میں جو کچھ جانتا ہوں، تم اس سے بے خبر ہو۔''

''آپ کو کسی کنعانی نے بہکا دیا ہے کہ یوسف زندہ ہے۔''

''تم مصر جانے سے اسی لیے ڈرتے ہو کہ یوسف نہیں تمہارا کوئی راز وہاں دفن ہے۔ تم مصر جاؤ اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اللہ سے جیسا میں واقف ہوں تم نہیں ہو۔''

حضرت یعقوب علیہ السلام کی باتوں سے بیٹوں پر لرزہ طاری ہو گیا۔

''بھائیو! مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ والد کو یوسف کا سراغ مل گیا ہے۔ اتنے مطمئن وہ کبھی نہیں تھے جتنے آج نظر آرہے تھے۔''

''پڑوس میں ایک بوڑھا رہتا ہے جو یہ دعویٰ کرتا رہتا ہے کہ وہ مصر میں یوسف سے مل چکا ہے۔ اسی نے ابا جان کے کان بھرے ہوں گے۔''

''ابا جان اس سے کیوں نہیں کہتے کہ جائے اور یوسف کو لے آئے۔''

''وہ کہتا ہے بہت بوڑھا ہو چکا ہوں، مصر تک جانے کی سکت نہیں۔''

''اس فضول بحث کو تو چھوڑو۔ اس وقت تو یہ کوشش کرو کہ حاکمِ مصر کے نام خط لکھوا لیا جائے تاکہ ہم اناج لاسکیں اور کوشش کریں گے کہ بنیامین بھی ہمارے ساتھ آجائے۔ ابا جان کے خط کا شاید کوئی اثر ہو۔''

حضرت یعقوب علیہ السلام نے حاکمِ مصر کے نام خط لکھوا دیا۔

''میں بہت بوڑھا ہو چکا ہوں۔ میرا ایک بیٹا جسے میں جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا، غائب ہو چکا۔ میری کمر ٹوٹ گئی۔ آنکھوں کی روشنی جاتی رہی۔ بنیامین میرا سہارا تھا۔ آدھی جان اسی سے میرے جسم میں تھی۔ وہ بھی مجھ سے دور ہو گیا۔ اس کی خطائیں معاف کر کے اسے میرے پاس لوٹا دو تاکہ میں آسانی سے مر سکوں۔

''مجھے میرے خدا نے بشارت دی ہے کہ میرا بیٹا یوسف زندہ ہے اور مصر میں ہے۔ آپ حاکم ہیں۔ اسے تلاش کر کے میری آنکھوں کی روشنی مجھے لوٹا دیں۔ اللہ آپ کا اقتدار دراز کرے۔''

تمام بھائی مصر جانے کے لیے روانہ ہو گئے۔ راستے میں انہوں نے خط کھول کر پڑھا تو ان کے اندیشے سامنے آگئے۔

''ہم نے ابا جان سے کہا تھا کہ وہ خط میں یوسف کا ذکر نہ کریں لیکن انہوں نے یہی کیا اور ہمیں پھنسانے کا پورا سامان کر لیا۔ اگر حاکمِ مصر نے یوسف کو تلاش کر لیا تو ساری حقیقت واضح ہو جائے گی۔ یہ کوئی نہیں جانتا لیکن ہم جانتے ہیں کہ یوسف زندہ ہے۔ اگر مل گیا تو وہ سب کچھ بتا دے گا۔''

''اس خط کو لے جانا خطرناک ہے۔'' یہودا نے کہا۔ ''ہم اس خط کو حاکم تک نہیں پہنچنے دیں گے۔ ہمیں جو کچھ کہنا ہوگا،

زبانی کہیں گے تاکہ اس کے دل میں رحم آئے اور وہ ہمیں اناج دے۔ بنیامین کو چھوڑنا ہے تو چھوڑ دے ورنہ ہمیں کوئی ایسی جلدی بھی نہیں۔''

بیٹوں کے چلے جانے کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی کوٹھری کا دروازہ اندر سے بند کرلیا اور اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو گئے۔

''اے اللہ! یہ عاجز و ناتواں بندہ تجھ سے مدد کا طالب ہے۔ میرا صبر اب میرے ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے۔ دیکھ میری آنکھیں چلی گئیں۔ صدموں سے میری کمر دوہری ہو گئی۔ میرا امتحان ختم کر۔ میرے دونوں بیٹے مجھے لوٹا دے میری خطائیں بخش دے۔ میرا امتحان ختم کر۔ میرا یوسف مجھے لوٹا دے۔ میرا بنیامین مجھے دے دے۔ میرے بیٹے انہیں ڈھونڈنے حاکم مصر کے دربار میں گئے ہیں۔ حاکم کے دل میں رحم ڈال دے۔''

اس فریاد نے سفر طے کیا۔ یہ وہی وقت تھا جب برادرانِ یوسف، حضرت یوسف علیہ السلام کے دربار میں کھڑے فریاد کناں تھے۔

''اے عزیز! (یوسف علیہ السلام) ہم نے تجھ سے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ ہمارا باپ بہت بوڑھا ہے۔ بنیامین کی جدائی نے اسے اور بھی بے حال کر دیا ہے۔ اس کی جان کا خیال کر اور بنیامین کو اس سے ملا دے۔ اگر یہ ممکن نہیں تو تجھے اپنے فیصلوں پر اختیار ہے۔

''ہم تجھ سے تیری فیاضی کا واسطہ دے کر کہتے ہیں کہ ہم کو اور ہمارے گھر والوں کو قحط نے سخت پریشانی اور تکلیف میں ڈال دیا ہے۔ اس مرتبہ تو ہمارے پاس پونجی بھی بہت کم ہے۔ اب معاملہ خرید و فروخت کا نہیں ہے۔ ہم سے قیمت ادا نہیں ہوسکتی اس لیے تیری خدمت میں ہماری یہ درخواست ہے کہ ازراہِ کرم ہمارے تھوڑے سے سرمائے کے عوض ہم کو غلے کی پوری تول دیجیے اور ہمیں ضرورت مند سمجھ کر اپنی جانب سے احسان فرمائیے۔ اللہ صدقہ خیرات کرنے والوں کو نیک بدلہ دیتا ہے۔''

بھائیوں کی یہ دردمند تقریر سنی تو حضرت یوسف علیہ السلام کی آنکھوں میں باپ کا سراپا گھوم گیا جو یہاں سے دور کنعان میں بیٹھا بیٹوں کی راہ تک رہا ہوگا کہ اناج لے کر آئیں گے۔ کب سے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اس امید موہوم میں زندہ ہوں گے کہ یوسف شاید زندہ ہو۔ اس کے ساتھ ہی فریادی بھائیوں کے وہ مظالم آنکھوں کے سامنے گھوم گئے جو انہوں نے ان کے ساتھ کیے تھے۔

خدا نے ان کے دل میں ڈالی کہ اب وہ اپنا راز ظاہر کردیں۔ انہوں نے بھائیوں سے پوچھا۔

''تم جانتے بھی ہو کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا معاملہ کیا جبکہ تم جہالت میں سرشار تھے۔''

جب بھائیوں نے یہ غیر متوقع گفتگو سنی تو چونک کر کسی اور خیال سے حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف دیکھا۔ لب و لہجے پر غور کیا صورت شکل اور گفتگو کے طرز و انداز کو دوسری نیت سے دیکھا تو حضرت یوسف علیہ السلام کی شکل نگاہ کے سامنے پھر گئی۔

بے اختیار چیخ اٹھے۔ ''کیا تم واقعی یوسف ہو؟''

حضرت یوسف علیہ السلام نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں یوسف ہوں۔ تمہارا بھائی یوسف جس کو تم نے بیچ کر مصر پہنچوایا اور اس بات سے کہ تم نے مجھے بیچ کر یہاں پہنچوایا، نہ تو غمگین ہو اور نہ اپنے دل میں پریشان ہو کیونکہ خدا نے جانوں کو بچانے کے لیے مجھے تم سے آگے بھیجا۔ اس لیے کہ اب دو برس سے ملک میں کال ہے اور ابھی پانچ سال اور ایسے ہیں جن میں نہ تو ہل چلے گا اور نہ فصل کٹے گی اور خدا نے مجھے تمہارے آگے بھیجا تاکہ تمہیں زمین پر سلامت رکھے اور تم کو بڑی رہائی کے وسیلے سے زندہ رکھے۔ پس تم نے نہیں بلکہ خدا نے مجھے یہاں بھیجا اور اس نے مجھے فرعون کا باپ اور اس کے سارے گھر کا خداوند اور سارے ملک مصر کا حاکم بنایا۔''

اب برادرانِ یوسف کے پاس ندامت، شرمساری اور اعترافِ خطا و جرم کے سوا کیا تھا۔ آنکھوں کے سامنے تمام نقشہ گھوم گیا۔ جسے وہ کنوئیں میں پھینک آئے تھے، آج وہ مصر کے تاج و تخت کا مالک ہے۔

سر جھکا کر کہنے لگے۔ ''قسم خدا کی! اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تجھ کو ہم پر برتری اور بلندی بخشی، بلاشبہ ہم سرتاپا خطا کار و قصوروار تھے۔'' (سورۃ یوسف)

حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے سوتیلے بھائیوں کی اس خستہ حالی اور پشیمانی کو دیکھا تو ان کی اخلاقی برتری اور پیغمبرانہ رحمت اس کو برداشت نہ کرسکی اور عفو و درگزر سے کہنے لگے۔

''آج کے دن میری جانب سے تم پر کوئی سرزنش نہیں۔ اللہ تعالیٰ تمہارا قصور بخش دے۔''

بھائیوں نے معافی کی نوید سنی تو بے اختیار سجدے میں گر گئے۔

بچپن کا دیکھا ہوا خواب پورا ہو رہا تھا جب حضرت یوسف علیہ السلام نے دیکھا تھا کہ گیارہ ستارے انہیں سجدہ کر رہے ہیں۔ وہ ستارے یہ بھائی تھے۔

بھائیوں کی خطا بخش دینے پر بنیامین بھی حضرت یوسف علیہ السلام کی تعظیم اور شکر گزاری کے لیے سجدے میں گر گیا تھا۔ دس وہ تھے اور گیارھواں بنیامین۔

بھائیوں کی خفت مٹانے اور شرمندگی دور کرنے کے لیے حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں مہمان بنایا اور ہر طرح سے ان کی دیکھ بھال کی۔

حاکمِ مصر کا عہدہ۔ تخت قدموں میں۔ سپاہِ مصر اشارۂ ابرو پر تیار۔ دشمن سامنے۔ کوئی اور ہوتا تو بھائیوں کے ساتھ نہ جانے کیا سلوک کرتا۔ یہ بھی نہ پوچھا کہ بدبختو تمہاری وجہ سے میرا گھر بار چھوٹا بلکہ فرمایا تو یہ......

''جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب ہم سب کو یہ تمام داستان فراموش کر دینی چاہیے۔ میں درگاہِ الٰہی میں دعا کرتا ہوں کہ وہ تمہاری غلطی کو معاف فرما دے۔ اب تم کنعان واپس جاؤ اور میرا پیراہن لیتے جاؤ۔ یہ والد کی آنکھوں پر ڈال دینا۔ انشاء اللہ قمیص یوسف ان کی آنکھوں کو روشن کر دے گی اور تمام خاندان کو مصر لے کر آؤ۔ میں یہاں اتنا اقتدار رکھتا ہوں کہ تمہارے لیے اچھی رہائش کا بندوبست کر سکتا ہوں۔''

ان بھائیوں کو حضرت یوسف علیہ السلام کے ملنے کی خوشی تو کیا ہوئی ہوگی لیکن انہیں یہ خوشی ضرور تھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے حاکم ہوتے ہوئے اور طاقت رکھتے ہوئے ان سے بدلہ نہیں لیا ورنہ وہ کہیں کے نہ رہتے۔ یہ خوشی بھی تھی کہ وہ اب باپ کے پاس سرخرو ہو کر جائیں گے' یوسف نے ہمیں معاف کر دیا تو وہ بھی ہمیں ضرور معاف کر دے گا۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں گاڑیاں دیں۔ وافر مقدار میں زادِراہ بھی دیا اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے لیے دس گدھے جو مصر کی اچھی چیزوں سے لدے ہوئے تھے اور دس گدھیاں جو باپ کے راستے کے لیے روٹی اور زادِراہ سے لدی ہوئی تھیں ان کے ساتھ کیں کہ جب سب کو مصر لاؤ گے تو ان کی ضرورت پڑے گی۔

''ابا جان کے پاس جا کر ان سے میری شان و شوکت بیان کرنا تاکہ انہیں خوشی ہو اور وہ فراق کا صدمہ بھول جائیں۔ انہیں بتانا کہ تیرے بیٹے یوسف کو جہان کے مالک نے مصر کا مالک کر دیا ہے اور اس سے کہنا دیر نہ کر میرے پاس چلا آ۔ اب ہمارا خاندان مصر میں رہے گا اور میں اس کی پرورش کروں گا۔

''اور دیکھنا کہیں تم راستے میں جھگڑا نہ کرنا۔ میں باپ کی تسلی کے لیے بنیامین کو بھی تمہارے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ اسے تم پھر ستاؤ۔''

''ہمارے آنکھوں سے جہالت کا پردہ اٹھ گیا ہے۔ اب ہم بنیامین کو جان سے زیادہ عزیز رکھیں گے۔'' تمام بھائیوں نے عہد کیا اور ملک کنعان کی طرف چل دیے۔

واپسی کا یہ سفر بھی عجیب تھا۔ شرمندگی اور خوشی ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ کسی بھائی کے پاس بولنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ سب پر گہرا سکوت طاری تھا۔ اگر فکر تھی تو یہ کہ حضرت یعقوب علیہ السلام انہیں معاف کرتے ہیں یا نہیں۔ اگر درمیان میں کوئی اور بات کرتے بھی تھے تو یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی تعریف کرتے تھے تاکہ بنیامین خوش ہو جائے۔

اسی خاموشی اور کبھی کبھی کی گفتگو میں سفر کٹ گیا اور وہ کنعان تک پہنچ گئے۔ اتنی جلدی باپ کے پاس جانے کی کبھی نہیں ہوئی تھی جیسی اب ہو رہی تھی۔

ابھی وہ گھر تک نہیں پہنچے تھے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام.... کو وحیِ الٰہی نے حضرت یوسف علیہ السلام کی خوشبو سے مہکا دیا۔ فرمانے لگے۔

''اے خاندانِ یعقوب! اگر تم یہ نہ کہو کہ بڑھاپے میں میری عقل ماری گئی ہے تو میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ مجھے یوسف کی مہک آ رہی ہے۔ باہر جا کر دیکھو شاید یوسف کے بھائی آ گئے ہیں اور ان کے ساتھ یوسف بھی ہے۔''

خاندان کے لوگ واقعی یہ سمجھے کہ ان کی عقل ماری گئی ہے۔

''بخدا تم تو اپنے اسی پرانے خبط میں پڑے ہو۔ یوسف کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا اور تمہیں یوسف ہی کی رٹ لگی

ہوئی ہے۔''

''میں کہہ چکا ہوں۔ کسی کو شاہراہ پر بھیجو۔ قافلہ آ رہا ہوگا۔''

کسی نے پروا بھی نہیں کی، یہاں تک کہ سارے بھائی گھر کے سامنے پہنچ گئے اور اتنے ساز و سامان کے ساتھ جیسے کسی بادشاہ کی سواری آئی ہو۔

جب یہ بھائی حضرت یعقوب علیہ السلام کے سامنے پہنچے تو شیم یوسف بھی بالکل قریب پہنچ گئی۔

''تم لوگ آ گئے۔ مجھے بتاتے کیوں نہیں کہ یوسف بھی تمہارے ساتھ ہے؟ خدا کی قسم! مجھے یوسف کی مہک آ رہی ہے۔''

''ابا جان! یوسف ہمارے ساتھ تو نہیں لیکن ہم یہ خوش خبری لائے ہیں کہ یوسف اب تک جیتا ہے اور وہی سارے ملک مصر کا حاکم ہے۔ ہم اب تک اسی کا دیا ہوا کھاتے رہے ہیں۔''

حضرت یوسف علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق ان بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کا پیراہن حضرت یعقوب کے چہرے پر ڈال دیا۔ اللہ کی قدرت سے آنکھیں روشن ہو گئیں۔ بینائی لوٹ آئی۔

بینائی کا لوٹ آنا انبیا کے معجزات میں سے تھا۔

''میں تم سے نہ کہتا تھا کہ میں اللہ کی جانب سے وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔''

برادرانِ یوسف کے لیے یہ وقت بہت کٹھن تھا۔ شرم و ندامت میں سر جھکائے ہوئے بولے۔

''اے باپ! آپ خدا کی جناب میں ہمارے گناہوں کی مغفرت کے لیے دعا فرمائیے کہ ہم نے آپ سے یہ جھوٹ بولا تھا کہ یوسف کو بھیڑیا لے گیا جبکہ ہم نے اسے ایک قافلے کے ہاتھ بیچ کر مصر بھجوا دیا تھا۔''

حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا۔ ''عنقریب میں اپنے رب سے تمہارے لیے مغفرت کی دعا کروں گا۔''

مفسرین کہتے ہیں کہ برادرانِ یوسف نے مصر میں اپنی خطا کا اعتراف کرتے ہوئے حضرت یوسف علیہ السلام سے بھی مغفرت کی دعا کی استدعا کی تھی اور کنعان پہنچ کر حضرت یعقوب علیہ السلام سے بھی یہی درخواست کی مگر حضرت یوسف علیہ السلام نے تو اسی وقت ان کی بات منظور کر لی مگر حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ نہیں کہا بلکہ صرف توقع دلائی اور عنقریب کا لفظ استعمال کیا۔ یہ اس لیے کہ برادرانِ یوسف کی تمام خطا کاریوں کا معاملہ براہِ راست حضرت یوسف علیہ السلام سے تعلق رکھتا تھا اور حضرت یعقوب علیہ السلام سے بالواسطہ اس لیے حضرت یوسف علیہ السلام نے اسی وقت ان کا اطمینان کر دیا مگر حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ سمجھ کر کہ چونکہ اس معاملے کا تعلق حضرت یوسف علیہ السلام سے ہے اس لیے اس کی مرضی بھی معلوم کر لینا ضروری ہے۔

دوسرے یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام نوجوان تھے اس لیے ان کے کریمانہ وصف میں احتیاط کا پہلو نہ تھا۔ انہوں نے فوراً معاف کر دیا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام تجربہ کار اور محتاط تھے اور پھر باپ تھے۔ اس لیے چاہتے تھے کہ پہلے بیٹوں کا امتحان کریں کہ ان کی ندامت کا اظہار وقتی اور ہنگامی ہے یا ان کی طبیعت میں واقعی شرمساری کا جذبہ پیدا ہو چکا ہے۔

ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو سحر کے وقت کی امید دلائی تھی کہ اس وقت دعا کروں گا۔

ابن جریر فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ مسجد میں تشریف لا رہے تھے کہ کسی انسان کو یہ دعا کرتے سنا۔ ''اے اللہ! آپ نے مجھے پکارا۔ میں نے جواب دیا۔ آپ نے مجھے حکم دیا، میں نے اطاعت کی اور یہ سحر کا وقت ہے لہٰذا میری مغفرت کر دیجیے۔''

حضرت عمرؓ نے توجہ دی تو معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کے گھر سے آواز آ رہی ہے تو آپ نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے دریافت کیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے عرض کیا۔ ''حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد سے سحر کے اوقات تک کی مہلت لی تھی کہ میں اس وقت دعا کروں گا۔''

اللہ تعالیٰ خود بھی نیک بندوں کی صفات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ ''اور وہ سحر کے اوقات میں مغفرت طلب کرتے ہیں۔'' (آلِ عمران)۔

تمام بیٹوں نے اب حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ پیغام پہنچایا کہ ہمیں یوسف کی ہدایت کے مطابق مصر پہنچنا ہے جہاں مصر کی زرخیز زمین اور بہت سی اچھی اچھی چیزیں ہمارا انتظار کر رہی ہیں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا۔ ''کنعان میرے آباء کی سرزمین ہے۔ اسے چھوڑتے ہوئے مجھے دکھ ہوتا ہے لیکن میرا بیٹا یوسف اب تک جیتا ہے۔ میں اپنے مرنے سے پیشتر جا کر اسے دیکھ تو لوں۔ میرے دادا حضرت ابراہیم علیہ السلام کبھی مصر سے کنعان آئے تھے اور میں کنعان سے مصر جاؤں گا۔''

توریت میں اس کی تفصیل یوں دی گئی ہے۔

''اور اسرائیل (یعقوب علیہ السلام) اپنا سب کچھ لے کر چلا اور بیر سبع میں آ کر اپنے باپ اضحٰق کے خدا کے لیے قربانیاں گزرانیں اور خدا نے رات کو رویا میں اسرائیل سے باتیں کیں۔ اس نے کہا میں خدا تیرے باپ کا خدا ہوں۔ مصر میں جانے سے نہ ڈر کیونکہ میں وہاں تجھ سے ایک بڑی قوم پیدا کروں گا۔ میں تیرے ساتھ مصر کو جاؤں گا اور پھر تجھے ضرور لوٹا بھی لاؤں گا اور یوسف اپنا ہاتھ تیری آنکھوں پر لگائے گا۔''

تب یعقوب بیر سبع سے روانہ ہوا اور اسرائیل کے بیٹے اپنے باپ یعقوب کو اور اپنے بال بچوں اور اپنی بیویوں کو ان گاڑیوں پر لے گئے جو فرعون نے ان کے لانے کو بھیجی تھیں اور وہ اپنے چوپایوں اور سارے مال و اسباب کو جو انہوں نے ملک کنعان میں جمع کیا تھا، لے کر مصر میں آئے اور یعقوب کے ساتھ اس کی ساری اولاد تھی۔ وہ اپنے بیٹوں اور پوتوں پوتیوں غرض اپنی کل نسل کو اپنے ساتھ مصر میں لے آیا۔ یعقوب کے گھرانے کے جو لوگ مصر میں آئے، ستر جانیں تھیں۔

جب حضرت یوسف علیہ السلام کو اطلاع پہنچی کہ ان کے والد خاندان سمیت شہر کے قریب پہنچ گئے تو وہ استقبال کے لیے شہر سے باہر نکلے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے مدت دراز کے بچھڑے ہوئے لختِ جگر کو دیکھا تو سینے سے چمٹا لیا۔ آنسو اس وقت بھی ان کی آنکھوں میں تھے لیکن یہ خوشی کے آنسو تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام بھی بچوں کی طرح باپ سے لپٹے ہوئے تھے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے دو بیٹے افرائیم اور منسّی پہلی مرتبہ اپنے دادا کو دیکھ رہے تھے۔ جب مسرت افزا اور رقت آمیز ملاقات ہو چکی تو حضرت یوسف علیہ السلام نے نہایت احترام سے اس قافلے کو دارالسلطنت ''رعمیس'' میں داخل کیا جو ''جشن کا شہر'' کہلاتا تھا۔

حضرت یوسف علیہ السلام والدِ ماجد اور تمام خاندان کو بڑے کروفر کے ساتھ شاہی سواریوں میں بٹھا کر شہر میں لائے اور شاہی محل میں اتارا۔

جب ان تمام باتوں سے فراغت پائی اور باپ کو اچھی طرح دیکھ لیا تو دربار آراستہ کیا تاکہ عوام و خواص مصریوں کا بزرگ باپ اور خاندان سے تعارف ہو جائے کیونکہ شہر میں بھی جشن برپا تھا اور ہر شخص حاکم مصر کے خاندان کو دیکھنے کا مشتاق تھا۔

دربار منعقد ہوا اور تمام لوگ اپنی اپنی مقررہ نشستوں پر بیٹھ گئے تو حضرت یوسف علیہ السلام کے حکم سے ان کے والدین یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت لیہ کو تختِ شاہی پر جگہ دی گئی (حضرت یوسف علیہ السلام کی حقیقی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا) باقی تمام خاندان نے حسبِ مراتب نیچے جگہ پائی۔

جب یہ انتظامات مکمل ہو چکے تو حضرت یوسف علیہ السلام شاہی محل سے نکل کر تختِ شاہی پر جلوہ افروز ہوئے۔ ان کے بیٹھتے ہی تمام درباری دستور کے مطابق تخت کے سامنے تعظیم کے لیے سجدے میں گر پڑے۔ موجودہ صورتِ حال کو دیکھ کر تمام خاندان یوسف نے بھی یہی عمل کیا۔

(تعظیم کا یہ طریقہ شاید اس وقت جائز ہو تاہم نبی اکرم ﷺ نے اس قسم کی تعظیم کو اپنی امت کے لیے حرام قرار دیا اور اس کو صرف ذاتِ الٰہی کے لیے مخصوص بتایا) (ترمذی، ابوداؤد)۔

یہ دیکھ کر حضرت یوسف علیہ السلام کو فوراً اپنے بچپن کا خواب یاد آ گیا۔ گیارہ ستارے سجدہ کر چکے تھے۔ اب سورج اور چاند بھی سجدہ کر رہے تھے۔ اپنے والد سے کہنے لگے۔

''اور...... یوسف علیہ السلام نے کہا اے باپ! یہ ہے تعبیر اس خواب کی جو مدت ہوئی میں نے دیکھا تھا۔ میرے پروردگار نے اسے سچا ثابت کر دیا۔ یہ اسی کا احسان ہے کہ مجھے قید سے رہائی دی۔ تم سب کو صحرا سے نکال کر میرے پاس پہنچا دیا اور یہ سب کچھ اس کے بعد ہوا کہ شیطان نے مجھ میں اور میرے بھائیوں میں اختلاف ڈال دیا تھا۔ بلاشبہ میرا پروردگار ان باتوں کے لیے جو وہ کرنا چاہے، بہتر تدبیر کرنے والا ہے کہ وہ سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔'' (سورۂ یوسف)

جب دربار ختم ہوا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے خلوت میں جا کر خدا کی کرشمہ سازیوں کا شکر ادا کیا۔

''اے پروردگار! تو نے مجھے حکومت عطا فرمائی اور باتوں کا مطلب اور نتیجہ نکالنا تعلیم فرمایا۔ اے آسمان اور زمین کے بنانے والے تو ہی میرا کارساز ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ تو یہ بھی کیجیو کہ دنیا سے جاؤں تو تیری فرماں برداری کی حالت میں جاؤں اور ان لوگوں میں داخل ہو جاؤں جو تیرے نیک بندے ہیں۔'' (سورۃ یوسف)

اب حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ اپنے خاندان کو کس جاگیر پر ٹھہرایا جائے۔ ان کی خواہش تھی کہ یہ سب لوگ ان سے قریب ''جشن کے شہر'' ہی میں آکر ٹھہریں۔ یہ فرعون کی مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ انہوں نے اپنے بھائیوں اور والد حضرت یعقوب علیہ السلام کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ فرعون کے سامنے پہنچ کر انہیں کیا کہنا ہے۔

''میں ابھی جا کر فرعون کو خبر کر دوں گا کہ میرے بھائی اور میرے باپ کے گھرانے کے لوگ جو ملک کنعان میں تھے، میرے پاس آ گئے ہیں۔''

حضرت یوسف علیہ السلام نے فرعون کو یہ خوش خبری سنا دی اور اپنے بھائیوں میں سے پانچ کو فرعون کے سامنے حاضر کر دیا۔

فرعون نے پوچھا۔ ''تمہارا پیشہ کیا ہے؟''

بھائیوں نے جواب دیا۔ ''تیرے خادم چوپان ہیں جیسے کہ ہمارے باپ دادا تھے۔ ہم اس ملک میں مسافرانہ طور پر رہنے آئے ہیں کیونکہ ملک کنعان میں سخت کال ہونے کی وجہ سے تیرے خادموں کے چوپایوں کی چرائی نہیں ہو رہی تھی لہٰذا کرم کر کے ہمیں جشن کے علاقے میں رہنے دے کہ یہ سب سے سرسبز علاقہ ہے۔''

فرعون نے حضرت یوسف علیہ السلام سے کہا۔ ''مصر کا ملک تیرے آگے پڑا ہے۔ ان کو جشن کے علاقے میں ہی رہنے دے۔'' حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کامیابی کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام کو فرعون کے سامنے پیش کیا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرعون کو دعا دی اور حضرت یوسف علیہ السلام کو اچھی طرح رکھنے پر اس کا شکریہ ادا کیا۔

''آپ کی عمر کتنی ہو گی؟'' فرعون نے حضرت یعقوب علیہ السلام سے پوچھا۔

''میری مسافرت کے برس ایک سو تیس ہیں۔ میری زندگی کے ایام تھوڑے اور دکھ سے بھرے ہوئے رہے ہیں اور ابھی یہ اتنے بھی نہیں ہوئے جتنے میرے باپ دادا کی زندگی کے ایام ان کے دورِ مسافرت میں ہوئے۔'' حضرت یعقوب علیہ السلام نے جواب دیا اور فرعون کو دعا دے کر اس کے پاس سے ہٹ گئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے فرعون کے حکم کے مطابق ''رعمیس'' کے علاقے کو جو ملکِ مصر کا نہایت زرخیز خطہ ہے، ان کی جاگیر ٹھہرایا۔

قحط ابھی تک پوری شدت سے جاری تھا۔ سارے ملک میں کھانے کو کچھ نہ رہا۔ مصر اور کنعان دونوں تباہ ہو گئے۔ جتنا روپیہ ملک مصر اور ملک کنعان میں تھا، وہ سب حضرت یوسف علیہ السلام نے اس غلے کے بدلے جسے لوگ خریدتے تھے، لے کر جمع کر لیا اور ساری دولت فرعون کے محل میں پہنچا دی۔

فرعون آپ کے اس حسنِ انتظام سے بہت خوش تھا۔ ان کے اس حسنِ انتظام کی بدولت ایک موت بھی بھوک سے واقع نہیں ہوئی۔

اب ایک اور سخت مشکل سامنے تھی۔ وہ سارا روپیہ جو مصر اور کنعان میں تھا، خرچ ہو گیا اور قحط ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔

مصریوں نے مطالبہ شروع کر دیا کہ روپیہ تو اب ہمارے پاس رہا نہیں۔ ہمیں مفت میں اناج دے تاکہ ہم اپنے بچوں کو کھلائیں۔ تیرے ہوتے ہوئے ہم کیوں مریں۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا۔ ''اگر نقدی نہیں تو اپنے چوپائے دو اور میں تمہارے چوپایوں کے بدلے تم کو اناج دوں گا۔''

لوگ اپنے چوپائے حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس لانے لگے اور گھوڑوں، بھیڑ بکریوں اور گائے بیلوں کے عوض انہیں اناج ملنے لگا۔

ایک سال اور گزر گیا۔ اب مصریوں کے پاس نہ نقدی تھی نہ چوپائے باقی رہے تھے۔ یہ لوگ پھر حضرت یوسف علیہ

السلام کے پاس آئے۔
''اے خداوند! ہمارے پاس کچھ نہیں رہا۔ نقدی بھی ختم ہوگئی۔ ہمارے چوپایوں کا مالک بھی تو ہوگیا۔ اب تو ایک ہی صورت ہے کہ تو اناج کے بدلے ہماری زمین خرید لے۔''
قحط سے تنگ آئے لوگوں نے اپنے کھیت بیچ ڈالے۔ ساری زمین فرعون کی ہوگئی۔ تب حضرت یوسف علیہ السلام نے ان سے کہا۔
''میں نے آج کے دن تم کو اور تمہاری زمین کو فرعون کے نام پر خرید لیا ہے۔ سو تم اپنے لیے مجھ سے بیج لو اور کھیتوں میں ڈال دو۔ فصل پر پانچواں حصہ فرعون کو دے دینا اور باقی چار تمہارے رہے تاکہ کھیتی کے لیے بیج کے بھی کام آئیں اور تمہارے اور گھر کے آدمیوں اور بال بچوں کے لیے کھانے کو بھی ہوں۔''
''خداوند! تو نے ہماری جان بچائی۔ ہم فرعون کے غلام بنے رہیں گے۔'' لوگوں نے کہا۔
قحط کے دن گزر گئے۔ فرعون کے خواب کی تعبیر کے مطابق خوشحالی کے دن آ گئے۔ بارشوں نے زمین کا سینہ نرم کردیا۔ کونپلیں پھوٹنے لگیں۔ کھیت لہلہانے لگے۔ آئین کے مطابق مصری اپنی پیداوار کا پانچواں حصہ فرعون کو دیتے رہے۔
حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کا خاندان جشن کے شہر میں بدستور آباد تھا۔ انہوں نے اپنی جائدادیں کھڑی کرلیں اور وہ بڑھے اور بہت زیادہ ہوگئے۔ یہی اللہ کا ان سے وعدہ تھا۔
خوشحالی کے ان دنوں کو سترہ سال گزر گئے تھے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام بیمار ہوئے۔ یہ بیماری آہستہ آہستہ ان کی موت کو ان کے قریب لاتی رہی۔
حضرت یوسف علیہ السلام نہایت تندہی سے ان کی تیمارداری میں مشغول تھے۔ تمام دنیاوی مشاغل موجود تھے جو وہ والد کی بیماری کو ٹالنے کے لیے استعمال کررہے تھے لیکن حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے دن پورے کرلیے تھے۔
ایک دن جب حضرت یوسف علیہ السلام ان سے ملاقات کے لیے پہنچے تو انہوں نے عہد لینے کے لیے فرمایا۔ ''اپنا ہاتھ میری ران کے نیچے رکھ۔ دیکھ اب میرا وقت آ گیا ہے۔ میں اپنے لوگوں میں شامل ہونے کے لیے تیار ہوں۔ مجھ کو مصر میں دفن نہ کرنا بلکہ جب میں اپنے باپ دادا کے ساتھ سوجاؤں تو مجھے مصر سے لے جاکر کنعان میں دفن کرنا۔ اسی گورستان میں جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت سارہ دفن ہیں۔''
حضرت یوسف علیہ السلام کے بیٹوں کے سر پر ہاتھ رکھا اور فرمایا۔
''مجھے تو یہ خیال بھی نہیں تھا کہ تیرا منہ دیکھوں گا لیکن خدا نے تیری اولاد بھی مجھے دکھائی۔ خدائے قادرِ مطلق مجھے دکھائی دیا ہے اور اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ میں تجھے برومند کروں گا اور بڑھاؤں گا اور تجھ سے قوموں کا ظہور کروں گا اور تیرے بعد یہ زمین تیری نسل کو دوں گا تاکہ یہ ان کی دائمی ملکیت ہوجائے۔'' اور پھر حضرت یوسف علیہ السلام کے بیٹوں کے لیے یہ دعائیہ الفاظ ادا کیے۔
''خدا جس کے سامنے میرے باپ ابراہیمؑ اور اسحٰقؑ نے اپنا دور پورا کیا۔
وہ خدا جس نے ساری عمر آج کے دن تک میری پاسبانی کی۔
اور وہ فرشتہ جس نے مجھے سب بلاؤں سے بچایا۔
ان لڑکوں کو برکت دے۔
اور جو میرا اور میرے باپ دادا کا نام ہے۔
اسی سے یہ نامزد ہوں۔
اور زمین پر نہایت کثرت سے بڑھ پائیں۔''
اس کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو بلایا اور ان میں سے ایک ایک کی عادت کے مطابق انہیں برکت دی اور انہیں بتایا کہ آئندہ زمانوں میں ان کے ساتھ کیا ہوگا۔
اس کے بعد انہوں نے اپنے پاؤں بچھونے پر سمیٹ لیے اور دم چھوڑ دیا۔
حضرت یوسف علیہ السلام اٹھے اور باپ کا منہ چوما اور طبیبوں کو حکم دیا کہ لاش میں خوشبو بھریں تاکہ یہ محفوظ رہے کیونکہ میں وصیت کے مطابق اس لاش کو کنعان لے کر جاؤں گا۔

اس عمل میں چالیس دن لگتے ہیں۔ اس دوران مصر میں ماتم ہوتا رہا۔

جب لاش میں خوشبو بھری جاچکی اور اس کے خراب ہونے کا احتمال جاتا رہا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے تمام خادموں اور مصر کے درباریوں اور اپنے تمام خاندان کو ساتھ لیا اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی تدفین کے لیے چلے۔

یہ سفر بھی عجیب تھا۔ ایک وہ دور تھا جب حضرت یوسف علیہ السلام پا بہ زنجیران راستوں سے گزرتے ہوئے مصر پہنچے تھے اور اب یہ شان کہ شاندار رتھ میں بیٹھے ہوئے ایک بڑے قافلے کے ساتھ جارہے تھے۔ ایک ایک منظر آنکھوں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ آپ اللہ کی کرم نوازی کا شکرادا کرتے ہوئے چلے جارہے تھے۔ اچانک ایک مقام پر آپ نے رتھ بان کو رکنے کا حکم دیا۔ یہ کنعان کے قریب افرات کا مقام تھا۔ ان کے بھائی جوان کے رتھ کے اردگرد حصار باندھے چل رہے تھے، رتھ کے قریب آئے۔

''کیا بات ہے یوسف...... یہاں کیوں رک گئے؟''

''تم شاید بھول گئے ہو لیکن مجھے یاد ہے۔ یہ وہی مقام ہے جہاں میری ماں کی قبر ہے۔ پھر نہ جانے کب میرا یہاں آنا ہو۔ میں اپنی ماں کو بتادوں کہ تیرا بیٹا کس شان سے تیرے پاس آیا ہے۔''

راوبین آگے بڑھا۔ ''مجھے وہ مقام معلوم ہے۔ میں بڑا ہونے کی حیثیت سے باپ کے ساتھ آیا تھا۔ مجھے معلوم ہے۔''

''آیا تو میں بھی تھا لیکن میری عمر اس وقت محض پانچ سال تھی۔ مجھے یقین ہے میرے دل کی آنکھیں اس مقام کو پہچان لیں گی جہاں میری ماں دفن ہے۔''

انہوں نے بنیامین کو ساتھ لیا۔ دوسرے بھائی بھی ساتھ تھے اور واقعی انہوں نے وہ جگہ پہچان لی۔ قبر کا دھندلا سا نشان باقی تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام دوزانو بیٹھ گئے۔ بہت دیر تک سر جھکائے رہے۔ ماں کی بخشش کی دعا کی اور پھر اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

اس کے بعد وہ سب کو لے کر اس گھر پر پہنچے جہاں ان کا بچپن گزرا تھا۔ جہاں ان کے بھائیوں نے ان سے بے وفائی کی تھی، جہاں ان کے والدان کی یاد میں روتے رہے تھے۔

حضرت یوسف علیہ السلام ایک ایک چیز کو دیکھتے تھے اور اپنا بچپن یاد کرتے تھے۔ ان کے بھائی ان کے آگے شرمندہ کھڑے تھے۔ سوچتے ہوں گے کہ جب سب کچھ یاد آرہا ہے تو یہ بھی یاد آرہا ہوگا کہ کس طرح ہم اسے بہلا پھسلا کر جنگل میں لے گئے تھے اور اسے کنوئیں میں پھینک دیا تھا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ باتیں یقیناً یاد آئی ہوں گی لیکن ان کی اعلیٰ ظرفی کہ انہوں نے کسی بھائی سے اس کا تذکرہ تک نہیں کیا۔

کنعان کے وہ پرانے لوگ جو اب تک زندہ تھے حضرت یوسف علیہ السلام کا دیدار کرنے آئے۔ دیکھتے تھے اور خدا کی شانِ کریمی کے قصیدے پڑھتے تھے کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے کیسا اعزاز عطا فرمایا ہے۔

جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام انتقال فرما چکے ہیں تو ان لوگوں نے سات دن تک ان کا ماتم کیا اور پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کے جنازے کو اس قبرستان کی طرف لے کر چلے جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خرید کر اپنی ملکیت بنالیا تھا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کو وہاں ان کی وصیت کے مطابق دفن کردیا گیا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کی تدفین کے بعد یہ قافلہ مصر کو لوٹ آیا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے واپسی کا تمام راستہ خوف اور اندیشوں کے سائے میں کاٹا۔ راستے بھر یہی باتیں کرتے چلے آئے تھے کہ باپ کے مرنے کے بعد یوسف ہم سے بدلہ ضرور لیں گے۔ کچھ نہیں تو یہی ہوگا کہ وہ ہمیں مصر سے نکال دے اور ہمیں پھر کنعان میں آکر آباد ہونا پڑے۔

یہی باتیں کرتے ہوئے جب وہ مصر پہنچے تو حضرت یوسف علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور باپ کے حوالے سے چند باتیں ان سے کیں۔

''مرنے سے پہلے تمہارے اور ہمارے باپ نے ایک پیغام تمہارے نام دیا تھا۔ وہ یہ کہ تم یوسف سے کہنا کہ اپنے

بھائیوں کی خطا اور ان کا گناہ اب بخش دے کیونکہ انہوں نے تجھ سے بدی کی۔ سو اب تو اپنے باپ کے خدا کے بندوں کی خطا بخش دے۔''

''ہم خود بھی تجھ سے معافی کے طلب گار ہیں۔ تو ہمیں مصر سے نہ نکال اور یہیں رہنے دے۔''

''بھائی! یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں تم سے بدلہ لوں گا اور تمہیں مصر سے نکال دوں گا۔ مجھ سے کیوں ڈرتے ہو، کیا میں خدا کی جگہ پر ہوں۔ تم نے تو مجھ سے بدی کا ارادہ کیا تھا لیکن خدا نے اسی سے نیکی کا قصد کیا تاکہ بہت سے لوگوں کی جان بچائے چنانچہ آج کے دن ایسا ہی ہو رہا ہے۔ اس لیے تم مت ڈرو۔ میں تمہاری اور تمہارے بال بچوں کی پرورش کرتا رہوں گا۔''

بھائیوں نے اطمینان کا سانس لیا اور وہیں رہتے رہے۔ اللہ نے ان کے بھائیوں کی نسل میں برکت دی اور بنی اسرائیل یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کی یہ نسل مصر پر چھاتی چلی گئی۔

فراعین تبدیل ہوتے رہے لیکن حضرت یوسف علیہ السلام بدستور حاکمِ مصر رہے۔ بعض کے نزدیک اسی سال مصر پر حکومت کی۔

اس عرصہ دراز میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں کی اولادیں اور ان کی اولادیں مصر کے مختلف علاقوں میں پھیل چکی تھیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے طویل عمر پائی اور اپنے بیٹے افرائیم کی اولاد تیسری پشت تک دیکھی اور دوسرے بیٹے منسّی کے بیٹے مکیر کی اولاد کو بھی اپنے گھٹنوں پر کھلایا۔

جب حضرت یوسف علیہ السلام کا وقتِ وصال قریب آیا تو آپ نے اپنے خاندان والوں کو جمع کیا۔

''جب میں اس دنیا میں نہیں رہوں گا تو کیا دین سے پھر جاؤ گے۔ مجھے بتاؤ تم کس کی عبادت کرو گے؟''

''آپ کے معبود اور آپ کے آباواِبراہیم، اسمٰعیل اور اسحٰق اور یعقوب کی عبادت کریں گے جو معبود یکتا ہے اور ہم اس کے حکم بردار ہیں۔''

''مجھے دفن کہاں کرو گے؟''

''جہاں آپ کی وصیت ہوگی۔''

''دیکھو، تمہاری نسل سے ایک عظیم پیغمبر پیدا ہوگا (موسیٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ تھا) اور وہ تم کو اس ملک سے نکال کر اس ملک میں پہنچائے گا جس کے دینے کی قسم میرے پروردگار نے ابراہیم، اسحٰق اور یعقوب سے کھائی تھی۔ سو تم ضرور میری ہڈیوں کو یہاں سے لے جانا اور میرے آبا کے ساتھ مجھے دفن کرنا۔''

جب حضرت یوسف علیہ السلام کا انتقال ہوا تو ان کی لاش میں خوشبو بھر کے مصر ہی میں دفن کر دیا گیا۔

آپ کی وصیت نسل در نسل چلتی رہی یہاں تک کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ایک بھائی لاوی کی نسل سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی۔

یہ وصیت اس وقت بھی سفر میں تھی چنانچہ جب مصریوں کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکلے تو حضرت یوسف علیہ السلام کے تابوت کو بھی ساتھ لے کر گئے۔

''اور موسیٰ، یوسف کی ہڈیوں کو بھی ساتھ لیتا گیا کیونکہ اس نے بنی اسرائیل سے یہ کہہ کر خدا ضرور تمہاری خبر لے گا اس بات کی سخت قسم لے لی تھی کہ تم یہاں سے میری ہڈیاں اپنے ساتھ لیتے جانا۔'' (توریت)

کہتے ہیں حضرت یوسف علیہ السلام کی قبر بلاطہ میں ہے جو فلسطین کے علاقے نابلس کا ایک گاؤں ہے۔

بعض کہتے ہیں حضرت یوسف علیہ السلام نے ایک سو دس سال کی عمر پائی بعض نے ایک سو بیس سال بتائی ہے۔

(ختم شد)

ماخذات

قصص القرآن۔ قصص الانبیا۔ توریت۔ پہلے نبی سے آخری نبی تک

سُلگتے چنار

افتخار اعوان

اس میں جانے کیسا بھید چھپا ہے کہ حسن ہمیشہ افسردگی میں گھرا یا آنسوئوں میں ڈوبا ہوا مزید دو آتشہ ہوجاتا ہے۔ شاید... اسی لیے کشمیر کی جنت نظیر وادی آزادی کے متوالوں کے لہو میں ڈوبی رہی ہے۔ اس کی فضائوں میں بے فکری کے قہقہے اور آزادی کے پھول جانے کب کھلیں گے... محض اپنوں کا درد سہنے کی تعزیر میں انہیں بھی ایک ذرا سی نیکی کی اتنی بڑی قیمت چکانا پڑی کہ زندگی نے ان پر اپنے دروازے ہی بند کرلیے۔

سلگتی راکھ...... کبھی بھڑکتے شعلوں کے درمیان

زندہ رہنے والوں کا حوصلہ

موسم بہت خوبصورت تھا۔ ہوا کے ٹھنڈے جھونکے جسم کو سرساتے ہوئے گزرتے اور مزاج میں ترنگ پیدا کررہے تھے۔ فضا میں اس وقت بانسری کی مدھر میٹھی تانیں بکھری تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں ہوا کے بھیگے ہوئے جھونکوں کے ساتھ بارش کی ہلکی سی پھوار پڑنے لگی۔ ریاض علی نے اپنا چہرہ آسمان کی جانب اٹھا کر بوندوں کا استقبال کیا۔

انیس سالہ ریاض علی گاؤں 'کھیتر' کا رہائشی تھا جو خوبصورتی میں اپنی مثال آپ تھا۔ بڑے بڑے اور لمبے

کھیتوں میں مکئی کاشت کی جاتی اور انہی کھیتوں کی وجہ سے اسے کھمیتر کا نام دیا گیا تھا۔ ٹھنڈے اور میٹھے چشموں کا پانی ایک ڈھلوان کی جانب اکٹھا ہوکر نشیب کی طرف بہتا رہتا۔

گاؤں کے چاروں طرف گھنا جنگل بھی آباد تھا جہاں مقامی لوگ اپنے مویشی چرایا کرتے۔ آبادی تقریباً پچاس گھروں پر مشتمل تھی۔ کچے پکے گھروں پر ٹین کی چھتیں تھیں۔ ایک چھوٹی سی عمارت بیک وقت پرائمری اسکول اور دواخانہ کے لیے استعمال ہوا کرتی۔ دیہاتی شریف النفس، صلح جو اور محنتی تھے۔ یہ چھوٹی سی جگہ کشمیر جنت نظیر میں تھی۔

ریاض علی بانسری بہت اچھی بجاتا تھا۔ پہاڑی کے نزدیک ہی اس کا کچی مٹی سے بنا گھر تھا جہاں وہ اپنے والدین کے ساتھ بہت خوش و خرم زندگی گزارتا تھا۔ اس کے والد کے پاس چند مویشی موجود تھے جنہیں چرانے کے لیے وہ جنگل میں لے آیا کرتا اور چنار کے درخت سے پشت ٹکائے بانسری اپنے ہونٹوں سے لگا کر مدھر نغمے ہوا میں بکھیرتا رہتا۔

بارش کی پھوار تھوڑی تیز ہوئی تو اسے ایک جانب سے جاذب کی آواز سنائی دی۔

''رک جاؤ ریاض علی! میرے ساتھ ہی چلنا واپس۔''

ریاض علی نے دائیں جانب مڑ کر دیکھا تو اس کا چچازاد بھائی اپنے گنے چنے مویشیوں کے ساتھ اسی جانب چلا آرہا تھا۔ جاذب گاؤں میں اس کا واحد بہترین دوست تھا۔ اس نے خوشگوار انداز میں ہاتھ ہلایا اور وہ کچھ ہی لمحوں بعد نشیب کی طرف بڑھ گئے۔

پھوار اب تیز ہوگئی تھی۔ انہوں نے عجلت میں اپنے مویشی مخصوص جگہ پر باندھے اور گھر کے عقب میں موجود درختوں کے جھنڈ میں جا بیٹھے۔ ریاض علی کے مزاج میں آج کچھ خاموشی اور افسردگی کا عنصر غالب تھا۔

''کیا بات ہے ریاض علی! اتنے افسردہ کیوں ہو؟'' اسے اپنی بائیں جانب سے کسی کی آواز سنائی دی۔ یہ اس کی تایازاد بہن نوشین عرف نوشی تھی جو غیر ضابطہ طور پر جاذب کی منگیتر بھی تھی۔ وہ جنگل سے لکڑیاں چنتی ہوئی ادھر چلی آئی تھی۔

''نہیں۔ افسردہ تو نہیں ہوں۔'' ریاض علی نے ٹالا۔ وہ تینوں بچپن سے اکٹھے پلے بڑھے تھے، اس لیے ایک دوسرے کے خاصے مزاج آشنا بھی تھے۔

''تو پھر تمہاری بانسری کیوں خاموش ہے؟ تمھیں پتا ہے نا کہ ہمیں اس کی تان کس قدر پسند ہے۔'' جاذب نے اسے ٹہوکا دیا۔

ریاض علی نے مسکراتے ہوئے اپنی بانسری ہونٹوں سے لگائی اور ایک مقامی دھن بجانی شروع کردی۔ موسم کی خوبصورتی میں اس مدھر موسیقی کے ملاپ نے جاذب اور نوشی کو بالکل بےخود کردیا۔

''تم لاجواب ہو میرے دوست! کاش یہ فن میں بھی کسی طرح سیکھ سکتا۔'' جاذب نے اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''بھئی اللہ بخشے ہمارے دادا جی کہا کرتے تھے کہ بانسری تو کشمیر کی ثقافت ہے۔'' وہ ان دونوں سے بڑا تھا اور اپنے دادا مرحوم کے ساتھ سب سے زیادہ وقت بھی اسی نے بتایا تھا۔

''اب تو حالات بھی ویسے نہیں رہے۔ کرب اور دکھ کی لہر ہی ہر وقت اس وادی کو اپنی لپیٹ میں لیے رکھتی ہے۔'' جاذب نے کہا۔

''ہاں! اب تو ہندوستانی فوج نے یہاں ظلم کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ کسی کی بھی جان، مال اور آبرو محفوظ نہیں۔'' نوشی نے ہونٹ کچلتے ہوئے کہا۔

''حالات بد سے بدتر ہوتے چلے جارہے ہیں۔ کشمیریوں کی نسل کشی کا پورا پلان تیار ہوچکا ہے۔ ابھی پچھلے ہفتے چچا مہر دین اور اس کا خاندان ہجرت کرکے پار آزاد کشمیر چلے گئے ہیں۔ ایسے ہی جانے کتنے خاندان اپنی عزتیں محفوظ رکھنے کے لیے ایسی ہجرتیں کرنے پر مجبور ہوچکے ہیں۔'' ریاض علی نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''کیا ہی اچھا ہوتا کہ جب ہندوستان اور پاکستان کی تقسیم ہوئی تھی، ریاست جموں کشمیر کی آزادی اور الگ تشخص کو بھی اسی وقت تسلیم کرلیا جاتا۔ یہ صدیوں پرانی ریاست ہے لیکن اسے رائے شماری کا بھی حق ہی نہیں دیا گیا۔'' نوشی نے کہا۔

''جب پاکستان بنا اس وقت بھی ہم نے بہت سی قربانیاں دیں، ایک سال بعد ہونے والی جنگ میں بھی ہمارے آباؤاجداد نے بہت خون بہایا لیکن عالمی ناانصافی ہر موڑ پر ہمیں برباد کرتی رہی۔ لائن آف کنٹرول کے نام پر ہمارے درمیان ایک خونی لکیر کھینچ دی گئی ہے۔ جن کے خاندان پار کی طرف ہیں وہ آج بھی اپنے عزیز و اقارب کی یاد میں خون کے آنسو بہاتے ہیں اور جانے کب تک بہاتے رہیں گے۔'' ریاض نے نمناک آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔

ماحول پر مزید اداسی چھا گئی۔ جاذب اور نوشی کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ ریاض نے فوراً خود کو سنبھالا اور انہیں دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

''ہر رات کے بعد ایک روشن سویرا ہوتا ہے۔ مجھے

یقین ہے کہ ہماری اس جنتِ نظیر وادی میں بھی وہ روشن سویرا ضرور آئے گا۔"

ان دونوں نے بھی ایک عزم سے سر ہلایا اور موسم کے تیور دیکھتے ہوئے گھر کی جانب بڑھ گئے۔

☆☆☆

کھیتر میں روزمرہ کی سرگرمیاں اپنے معمول کے مطابق جاری تھیں۔ آئے روز ہونے والے واقعات ان کا عزم جوان کردیتے تھے۔ وہ تینوں اکثر سہ پہر کے بعد مویشیوں کی واپسی کے ساتھ اپنی مخصوص جگہ پر بات چیت ضرور کرتے تھے لیکن ایک روز ریاض علی کو وہاں موجود نہ پاکر وہ تشویش میں مبتلا ہوگئے۔ وہ کافی دیر تک وہیں بیٹھے اس کا انتظار کرتے رہے اور پھر اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔

"پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا، ریاض اپنے ڈھور ڈنگر یہاں لے کر نہ آئے۔ ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔" نوشی نے کہا۔

"مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ وہ ضرور کسی مصیبت میں گرفتار ہوچکا ہے ورنہ اس کی بانسری کی آواز خود ہی اس کا سراغ دے دیا کرتی ہے۔" جاذب نے تائید کی۔

"اب کیا کریں؟ گھر پہنچ کر کسی کو اطلاع دیتے ہیں۔"

"نہیں! وہ سب بھی خوا مخواہ پریشان ہوجائیں گے۔ ہم خود ہی اسے ڈھونڈ لیں گے۔" جاذب نے ٹوکا۔

انہوں نے پہاڑی کے دامن سے جنگل میں اترنے والی پگڈنڈی کی راہ لی اور زیرِ لب آیات کا ورد کرتے ہوئے ریاض علی کی سلامتی کی دعائیں کرنے لگے۔

کچھ دور جانے کے بعد انہیں فضا میں نامانوس آوازوں کی سرسراہٹ محسوس ہونے لگی۔ کتوں کے بھونکنے کی وحشیانہ صداؤں نے ان کے قدم وہیں ساکت کردیے۔ جاذب نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ پکڑا اور فوراً ایک جھاڑی کی اوٹ میں ہوگیا۔

"خاموش رہنا بالکل...... یہاں ضرور کچھ بہت بڑی گڑبڑ ہے۔" اس نے سرگوشی کی۔

نوشی وہیں دبک گئی۔ وہ دونوں دم سادھے آوازوں کا ماخذ جاننے کی کوشش کررہے تھے۔ کچھ لمحوں بعد ہوا کے دوش پر انہیں چند مزید فقرات سنائی دیے۔

"بچاؤ...... بچاؤ...... کوئی ہے...... آہ...... کوئی تو مدد کرو میری۔ خدا کے واسطے! کوئی تو مدد کرو۔"

اس کے فوری بعد ایک مرد کی آواز سنائی دینے لگی۔

"اب کسی نے ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو زبانیں گدی سے کھینچ لوں گا۔" وہ کافی غصے میں لگ رہا تھا۔

"لیکن ہمارا قصور کیا ہے؟ ہم تو وادی سے نقل مکانی کررہے ہیں۔ کس جرم کی سزا دے رہے ہو ہمیں؟" ایک خاتون کی کربناک آواز آئی۔

نوشی کچھ سہم سی گئی۔ اس کے منہ سے دبی دبی سسکیاں برآمد ہونے لگیں۔

"ڈرو مت! میں ہوں نا... تمہارے ساتھ۔ کچھ نہیں ہوگا...... بس خاموشی سے یہیں بیٹھی رہو۔" جاذب نے اسے تسلی دی۔

وہ دونوں بزدل ہرگز نہیں تھے لیکن نہتے ضرور تھے۔ اردگرد سے آنے والی صداؤں سے جھلکتے کرب نے انہیں بہت دکھی کردیا تھا۔ جاذب نے کچھ دیر بعد جھاڑی کی اوٹ سے سر نکالا اور پہاڑی کی ڈھلوان کی جانب صورتِ حال کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں دکھائی دینے والا منظر اس کے لہو میں ابال پیدا کرنے لگا۔

جنگل کی طرف اسے چند عورتیں، بچے اور مرد دکھائی دے رہے تھے جنھیں بھارتی فوجیوں نے اپنے نرغے میں لے رکھا تھا۔ فوجیوں کی پوزیشن اس طرح تھی کہ وہ بہ آسانی ان کی نظروں میں آسکتا تھا۔ جاذب بے آواز طریقے سے دوبارہ پیچھے کھسک گیا۔

"کیپٹن! ہمارے مخبر کے مطابق یہ وہی خاندان ہے جس کے دو لڑکے مجاہدین کی ٹریننگ لے رہے ہیں۔" ایک کرخت آواز سنائی دی۔

"آئی سی...... ان میں سے کوئی بھی بھاگنے نہ پائے۔ اگر کوئی ہلنے کی کوشش بھی کرے تو فوراً بھون دینا۔" کیپٹن نے حقارت سے کہا اور ایک توقف سے پھر دہاڑا۔

"مہیش! تم کہاں مر گئے ہو؟"

"آئی ایم ہیئر سر! حکم کریں۔" مہیش ایک اوٹ سے برآمد ہوا۔

"اس خاندان میں کتنی نوجوان لڑکیاں ہیں؟"

مہیش نے فوری طور پر خواتین کے چہروں سے چادریں اور نقاب ہٹائے اور سرعت سے بولا۔

"تین لڑکیاں ہیں سر!"

"ٹھیک ہے! انہیں کیمپ میں لے چلو۔ آج وہیں دعوت اڑاتے ہیں۔" اس کے اشارے پر باقی اہلکاروں نے انہیں بالوں سے پکڑ کر گھسیٹنا شروع کردیا۔

دیگر خواتین اور عمر رسیدہ افراد ان کی راہ میں حائل ہوگئے اور اپنی پوری قوت سے انہیں روکنے کی کوششیں کرنے لگے۔ ایک بوڑھی عورت ان سے التجا کرتے ہوئے بولی۔

"تم بھلے ہماری جان لے لو لیکن انہیں چھوڑ دو۔ یہ ظلم

نہ کرو۔"

مہیش غضب ناک ہوکر آگے بڑھا اور بندوق کا کندا اسے مار کر پیچھے ہٹا دیا۔

"اب کوئی اور آگے بڑھا تو میں اسے ایک پل میں نرک میں پہنچا دوں گا۔"

"ہم یہ گاؤں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔" ایک اور عمر رسیدہ شخص نے بات کا آغاز کیا ہی تھا کہ مہیش نے اس کے منہ پر زوردار طمانچہ رسید کیا۔

"یہی تمہارا جرم ہے بڈھے! یہاں سے جاتے ہی تمہارے یہ بچے مجاہدین کے ساتھ مل کر ہمارا جینا حرام کر دیں گے۔"

بوڑھا آدمی تیورا کر نیچے گرا تو مہیش نے اس کے جسم پر برسٹ چلا دیا۔ اس نے لڑکھڑاتی زبان سے کلمۂ شہادت پڑھا اور بے نور نگاہوں سے آسمان کی وسعتوں میں اپنے لیے رحم و کرم کی بھیک مانگنے لگا۔

بچوں کے چہرے خوف اور وحشت سے سپید پڑ گئے۔ ان میں سے کئی افراد نے ہسٹریائی انداز میں چیخنا شروع کر دیا۔ عورتوں کے بین اور آنسو دیکھ کر چنار کے درخت بھی سلگتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

مہیش نے ایک برسٹ ہوا میں چلایا اور دہاڑ کر بولا۔

"ان لڑکیوں کو کیپٹن کے کیمپ میں لے چلو! آج ان کی مدد کے لیے یہاں کوئی نہیں آنے والا۔ انہیں تڑپا تڑپا کر مارنا ہے۔ ان کی آتمائیں اگلے کئی جنموں تک بے کل رہیں گی۔"

کیپٹن شرما ایک جانب اپنی جیب سے چھوٹی سی بوتل نکال کر مے نوشی میں مگن تھا۔ فوجی اہلکار انہیں بال کھینچتے ہوئے لے جا رہے تھے۔ لڑکیوں کے چہرے پر اب کسی قسم کا کوئی خوف نہ تھا۔ آنے والے وقت کے تصور نے ان کے ذہن میں ہلچل برپا کر دی تھی۔ اہلکار ان کی بے بسی سے مکمل لطف اندوز ہوتے پھبتیاں بھرنے سے باز ہی نہیں آ رہے تھے۔

"اپنے غلیظ ہاتھ مجھ سے دور رکھو ذلیل انسان!" ایک لڑکی چلا کر بولی۔

اس اہلکار نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا اور ذرا دیر کے لیے اس کے بال چھوڑ کر ایک زوردار ٹھوکر رسید کی۔ اسے ٹھوکروں کی زد میں دیکھ کر ایک بوڑھی عورت بے اختیار تڑپ کر بولی۔

"آمنہ! میری بچی!"

آمنہ نے ایک نظر مڑ کر اس عورت کو دیکھا اور بجلی کی سی تیزی سے اپنے لباس سے چاقو نکال کر اپنے سینے میں گھونپ لیا۔ فوجی اہلکار ہکا بکا رہ گئے۔ اس کا خون آلود جسم زمین پر جاں کنی کے عالم میں تڑپ رہا تھا۔ کیپٹن کے لیے یہ نظارہ اس کے منہ پر زوردار طمانچے کے مترادف تھا۔ اس کا ذہن پہلے ہی شراب کے زیرِ اثر تھا اور اب تو وہ بالکل ہی اپنے حواس کھو بیٹھا۔

"مہیش! اس لڑکی کو سامنے چنار کے درخت کے ساتھ باندھ دو اور اس کے تمام کپڑے اتار دو۔" وہ چلایا۔

مہیش نے اسی چاقو سے آمنہ کا لباس چاک کیا اور اسے گھسیٹتا ہوا درختوں کی جانب لے گیا۔ ایک جانب ساکت کھڑے اس خاندان میں ہلچل ہوئی اور ایک دس سالہ بچہ بہن کو پکارتا ہوا ہر خطرے سے بے نیاز ہو کر مہیش پر پل پڑا۔ دیوقامت مہیش نے اسے ہاتھوں سے اچھال کر دوسری جانب پھینک دیا۔

"مار دو اس سالے کو! زندہ رہا تو یہ بھی مجاہد ہی بنے گا۔" کیپٹن نے نفرت سے کہا۔

ایک فوجی اہلکار آگے بڑھا اور اسے دوبارہ اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر زوردار طریقے سے اچھال دیا۔ وہ بچہ جاذب اور نوشی سے چند قدم کی دوری پر جھاڑیوں کے پاس آ کر گرا۔ اسی لمحے ایک خوفناک برسٹ چلا اور بچے کا جسم کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ نوشی کے حلق سے ایک گھٹی ہوئی چیخ برآمد ہوئی لیکن جاذب نے فوراً اس کے منہ پر سختی سے ہاتھ رکھ دیا۔

"شش......خاموش۔"

آمنہ کی والدہ ہسٹریائی انداز میں چیختی ہوئی بچے کی جانب بڑھی لیکن ایک اور فوجی اہلکار کی بندوق سے نکلنے والے شعلوں نے اس کے سر میں کئی روشندان بنا دیے۔ فضا میں موت کا گہرا سناٹا تھا۔ چنار کے درخت بھی انسانیت کی اس تذلیل پر اشک بہاتے محسوس ہو رہے تھے۔ باقی ماندہ افراد کے چہروں پر زردی کھنڈی تھی۔

فوجی اہلکار ایک بار پھر آمنہ کی جانب متوجہ ہو گئے جو اس جاں کنی کے عالم میں بھی اپنا آپ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مہیش اسے گھسیٹتا ہوا لے جا رہا تھا۔

"اس سالی نے یہ چاقو میرے دل میں اتارا ہے۔ میں اسے اس کے کیے کی سزا تو ضرور دوں گا۔ اگر کوئی جوان اپنی بھوک مٹانا چاہے تو میری طرف سے اجازت ہے۔ نوچ ڈالو اسے!" کیپٹن چلایا۔

"پچھلے ماہ ان مجاہدوں نے میرے بھائی کی ہتھیا کی تھی۔ اس کے شعلے میرے سینے میں اب بھی مچل رہے ہیں۔ میں اس کا وہ حال کروں گا کہ آئندہ کوئی بھی لڑکی

اپنے باپ بھائی کو اس راہ پر چلنے ہی نہ دے گی۔'' مہیش نے اپنی بندوق ایک جانب رکھتے ہوئے آمنہ کو بھوکی نظروں سے دیکھا۔

''گڈ اسپرٹ جوان اگو آہیڈ!'' کیپٹن ایک بار پھر شراب کی طرف متوجہ ہوگیا۔

مہیش پر پوری طرح شیطان حاوی ہو چکا تھا۔ آمنہ کی اذیت ناک کراہیں جاذب کے دل پر تیزاب کے چھینٹے ڈال رہی تھیں۔ اس نے کچھ لمحے سوچ بچار کی اور چوپایوں کی طرح رینگتا ہوا جھاڑیوں ہی سے چنار کے درختوں کی جانب چل دیا۔ مہیش کے اس غیر انسانی تماشے میں دیگر فوجی بھی پوری طرح منہمک ہو چکے تھے۔ جاذب نے بے آواز طریقے سے مہیش کی بندوق تھامی اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ان سب پر فائر کھول دیے۔ نفس کی لذت میں غرق بھارتی فوجیوں کے سنبھلنے سے قبل ہی وہ انہیں موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔

کیپٹن بھی اس ساری صورتِ حال پر بوکھلا کر رہ گیا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے اپنے ہولسٹر سے ریوالور نکالنے کی کوشش کی لیکن جاذب نے فوراً آگے بڑھ کر اس کی کلائی پر زوردار ٹھوکر رسید کی اور بندوق کا کندا اس کے چہرے پر مار کر کہا۔

''خبیث انسان! اگر ذرا سی بھی حرکت کی تو اس بندوق کا سارا سیسہ تیرے جسم میں اتار دوں گا۔''

''تو نے میرے جوانوں کو مار کر اپنے خاندان کے لیے بڑی دردناک موت چن لی ہے لڑکے! میں تیرے خاندان کو نرک میں پہنچا دوں گا۔''

جاذب نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ آمنہ کی لڑکھڑاتی آواز میں کلمے کی ادائیگی نے اسے گنگ کر دیا۔ اس کی روح پرواز کر چکی تھی۔ جاذب کے وجود میں انگارے دہکنے لگے۔ اس کے اشارے پر ایک بزرگ نے آگے بڑھ کر آمنہ کے بے جان وجود کو اپنی چادر سے ڈھانپ دیا۔ جاذب نے طیش کے عالم میں کیپٹن کے بازو کو نشانہ بنایا اور چلا کر بولا۔

''تیرے ناپاک وجود سے آج میں اس دھرتی کو پاک کر دوں گا۔ تجھے آسان موت ہرگز نہیں ملنی چاہیے۔''

یہ کہہ کر اس نے کیپٹن کے دونوں بازوؤں اور دائیں ٹانگ پر فائر کھول دیے۔ وہ لڑکھڑا کر نیچے گر گیا۔

''ان سب سے معافی مانگو!'' جاذب نے اسے ٹھوکر ماری۔

''نہیں! میں معافی نہیں مانگوں گا۔''

جاذب نے اس کے بائیں گھٹنے اور دائیں شانے کی ہڈی کو نشانہ بنایا اور سرد لہجے میں بولا۔

''معافی مانگ لے کیپٹن!''

''تم بہت پچھتاؤ گے لڑکے! تمہاری ساری بستی کو میں آگ لگوا دوں گا۔''

جاذب نے اس کے بائیں شانے اور پھر رانوں پر بھی فائر کھول دیے۔ کیپٹن کی ہمت اب جواب دینے لگی تھی۔

''م...... مجھے چھوڑ دو...... تمہیں منہ مانگی قیمت دینے کو تیار ہوں۔'' اس کا لہجہ ڈوبنے لگا۔

''ان عورتوں سے معافی مانگ۔''

کیپٹن بہ مشکل اپنا وجود گھسیٹتا ہوا ان کی طرف بڑھا اور ان کے قدموں میں گر کر بولا۔

''تم لوگ جہاں چاہو چلے جاؤ۔ مگر اس لڑکے سے میری جان بخشی کروا دو۔'' وہ منمنایا۔

عورتوں نے نفرت اور حقارت سے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ اتنے میں نوشی بھی جھاڑی کی اوٹ سے نکل کر وہاں پہنچ چکی تھی۔

''جس وقت تم ان معصوم اور بے گناہ لوگوں پر ظلم کر رہے تھے تب تمہاری فرعونیت عروج پر تھی۔ اب موت سامنے دیکھ کر پسینا کیوں آ گیا؟'' وہ جلال میں آ گئی۔

''ان کی بہادری صرف نہتے لوگوں تک ہی محدود ہوتی ہے۔'' جاذب نے واحد بچے ہوئے سپاہی کو بھی نشانے پر لیا۔

''میں اسے بالکل معاف نہیں کروں گی۔ اس معصوم لڑکی کی پکار، پھول سے بچے کی لاش اور ماں کی بے حرمتی کا انتقام نہ لیا تو کبھی سکون سے جی نہ سکوں گی۔'' نوشی نے کچھ دور پڑے ایک پتھر کو اٹھایا اور وحشیانہ انداز میں کیپٹن کی کھوپڑی پر تابڑ توڑ حملے کر دیے۔ جاذب کا دھیان بھی وقتی طور پر اس سپاہی سے ہٹ گیا۔ اس نے اس غفلت کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور جاذب کی بندوق کو ٹھوکر سے ایک طرف پھینک کر ڈھلوان کی جانب چھلانگ لگا دی۔

''یہ بہت غلط ہوا۔ کہیں یہ کمک نہ لے آئے۔'' نوشی نے تاسف سے سر ہلایا۔

''اب یہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں۔ اس لیے فوری طور پر یہ جگہ چھوڑ دینی چاہیے۔'' جاذب نے دکھ اور الم کی تصویر بنے ان افراد سے کہا۔

ان سب نے آمنہ اور دیگر دونوں افراد کی لاشیں اٹھائیں اور خاموشی سے جاذب کے ساتھ اس کے گاؤں کی طرف چل دیے۔

گاؤں والوں کو ان کی بپتا کا علم ہوا تو سب کے دل دکھ

سے بھر گئے۔ بزرگوں نے فوری طور پر میتوں کو غسل دلوا کر دفنانے کا انتظام کیا اور نہایت خلوص سے انہیں بارڈر کراس کرنے کا مشورہ دے کر زادِراہ بھی ہمراہ کر دیا۔

ان کی روانگی کے بعد جاذب نے خود پر بیتنے والے واقعات بھی بلا کم وکاست سنا دیے۔ ان کی پیشانیوں پر تفکرات کی گہری لکیریں ابھر آئیں۔

''بھارتی فوجی بہت منتقم مزاج ہوتے ہیں بیٹا! زندہ رہ جانے والا فوجی اپنے ساتھیوں کا بدلہ لینے کے لیے ہر قریبی گاؤں میں تم لوگوں کو شکاری کتوں کی طرح ڈھونڈتا پھرے گا۔'' ایک بزرگ نے کہا۔

''اب ہمارے لیے کیا حکم ہے چچا جان؟'' جاذب نے پوچھا۔

''حکم کیا کروں بیٹا! بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ تم بھی فوری طور پر یہ علاقہ چھوڑ دو۔''

''ہاں! اس کے سوا کوئی اور چارہ بھی نہیں۔'' خاندان کے ایک اور بزرگ نے کہا۔ ''اس فوجی نے تم دونوں کو اچھی طرح دیکھ لیا ہے اور اب تک تو تمہاری تلاش بھی شروع ہو چکی ہوگی۔''

جاذب ان کی پریشانی سمجھ سکتا تھا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ ایک اور بزرگ نے ہاتھ اٹھا کر بولنے سے منع کیا اور کہنے لگے۔

''بہتر یہی ہے کہ ان دونوں کا ابھی نکاح پڑھوا کر اسی قافلے کے پیچھے روانہ کر دیا جائے۔ آزاد علاقے میں ہمارے بہت سے رشتے دار موجود ہیں۔ یہ وہیں قیام کر سکتے ہیں۔''

جاذب ان کے الفاظ سن کر سکتے میں رہ گیا اور بے چینی سے بولا۔

''لیکن چچا جان!''

''یہ ہمارا آخری فیصلہ ہے بیٹا! یہاں رہنے میں بہت سے خطرات ہیں اس لیے ایک محرم رشتے میں بندھ کر ہی اپنا سفر جاری رکھنا ہوگا۔''

انہوں نے خاندان کے دیگر لوگوں کو نکاح کے انتظامات کرنے کا حکم دیا۔ جاذب کے ہوش وحواس سلب ہو چکے تھے۔ نوشی بھی اس اچانک صورتِ حال پر گنگ تھی۔

ان کے ذہنوں پر جیسے دھند طاری تھی۔ شام کے سائے گہرے ہوتے ہی ایجاب وقبول کے تمام مراحل طے ہو گئے۔ جاذب کو تو ہوش اس وقت آیا جب ریاض نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔

''بہت مبارک ہو میرے دوست! اللہ پاک تمہاری زندگی کا یہ نیا سفر کامیاب کرے۔''

''تم...... کہاں چلے گئے تھے...... ہم تمہیں ڈھونڈتے ہوئے......'' جاذب نے تیزی سے کہا۔

''مجھے سب علم ہو گیا ہے...... میرا ایک بیل گم گیا تھا جسے ڈھونڈتے ہوئے میں بہت دور نکل گیا تھا۔''

''وہاں انڈین آرمی نے ان لوگوں کے ساتھ بہت ظلم کیا۔''

''ایک لحاظ سے تمہارا وہاں اچانک پہنچنا ان کے حق میں بہت اچھا ثابت ہوگیا۔ یہ سب تو قدرت کی طرف سے طے تھا۔ اب تم کوئی فکر نہ کرو اور مستقبل کی سوچو۔'' ریاض علی نے اسے تسلی دی۔

''ہاں! ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ اگر میں وہاں نہ پہنچتا تو جانے وہ بھیڑیے اور کیا کرتے؟''

ریاض علی نے اسے ایک بار پھر گلے لگا کر خوب تشفی دی۔ چناروں کے اس دیس میں رات اتر آئی تھی۔ خاندان کے بزرگوں نے دعاؤں کے سائے میں جاذب اور نوشی کو کچھ زادِراہ دے کر رخصت کر دیا۔

اس انوکھی رخصتی پر ہر آنکھ اشکبار تھی۔

☆☆☆

وہ دونوں بغیر رکے چلتے جا رہے تھے۔

گاؤں کی سرحد پار کرنے سے قبل ایک بار انہوں نے گردوپیش کی ہر چیز کو نم آنکھوں سے خوب یادوں میں اتارا۔ وہ جانتے تھے کہ یہاں زیادہ دیر رکنا بھی ان کے لیے بہت بڑا خطرہ ہوگا اس لیے دل پر پتھر رکھے وہ اونچے نیچے رستوں پر ہموار انداز میں قدم بڑھاتے رہے۔ رستہ اب بہت دشوار ہونے لگا تھا لیکن وہ بچپن ہی سے ان کٹھنائیوں کے عادی تھے اس لیے انہیں کوئی بھی مسئلہ درپیش نہ ہوا۔

رات اپنا آدھا سفر طے کر چکی تھی۔ آسمان پر چاند بھی گہرے بادلوں کی اوٹ میں تھا۔ وہ جنگل میں کافی دور نکل آئے تھے۔ یہاں سے رستہ اجنبی تھا اور اب اس اندھیرے میں مزید سفر ان کے لیے بہت خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ رستہ بھول جانے کا اندیشہ بھی سر پر منڈلا رہا تھا۔

''کچھ دیر آرام کر لیں جاذب؟'' نوشی نے کہا۔

''کیا تھک گئی ہو؟''

''ہاں! اب مزید چلنے کی ہمت نہیں ہے۔'' اس نے گہری سانس لی۔

''ٹھیک ہے۔ کوئی جگہ تلاش کر لیتے ہیں۔'' جاذب کی آنکھیں اندھیرے سے کافی مانوس ہو چکی تھیں۔ اس نے تھوڑی ہی دیر بعد ایک غار تلاش کر لیا اور نوشی کا ہاتھ پکڑے

مضبوط قدموں سے اندر چلا گیا۔

غار کا اندرونی حصہ کافی کشادہ تھا۔ جاذب نے روانگی سے پہلے انڈین فوجیوں سے حاصل کی گئی بندوق بھی اپنے ہمراہ لے لی تھی۔ اس نے بندوق کو احتیاط سے تھاما اور غار میں کسی جانور کی موجودگی کا اندیشہ ذہن میں رکھتے ہوئے پھونک پھونک کر قدم بڑھانے لگا۔ خوش قسمتی سے انہیں کسی بھی خطرے کا سامنا نہ کرنا پڑا۔

غار کا فرش بالکل ہموار تھا اور وہاں بہ آسانی لیٹا جا سکتا تھا۔ جاذب نے اپنے سامان سے ایک چادر نکالی اور فرش پر بچھا دی۔ نوشی نے بھی اپنا سامان وہیں رکھ دیا اور دیوار سے پشت ٹکا کر بیٹھ گئی۔ کئی لمحے یونہی خاموشی سے سرک گئے۔

''نوشی!'' کچھ دیر بعد جاذب نے پکارا۔

''جی؟''

''کیا تم رو رہی ہو؟''

''نہیں۔''

''تو پھر اتنی اداس کیوں ہو؟ کیا میرے ساتھ آنے کی تمہیں کوئی خوشی نہیں!''

''مجھے تمہارے ساتھ آنے سے بہت خوشی ہے جاذب لیکن میں سب گھر والوں کو یاد کر کے دکھی ہو رہی ہوں۔ جانے وہ کس حال میں ہوں گے؟''

''ہمارے ہتھیار جب سے بھارتی فوج نے اپنے قبضے میں لے لیے ہیں ہم بے بسی کی انتہا پر پہنچ چکے ہیں۔ نہتے ان سے لڑیں بھی تو کیسے؟''

''پروردگار! ان سب کو اپنے حفظ وامان میں رکھنا۔'' نوشی گڑگڑائی۔

''اللہ بہتر کرے گا۔'' جاذب نے خلوص سے کہا۔

ایک بار پھر ان دونوں کے مابین گہری خاموشی حائل ہو گئی۔ وہ اپنی اپنی سوچوں میں گم موجودہ حالات پر غور کرنے لگے۔ بچپن کی نسبت کے باعث ان میں ایک گہری انسیت کا رشتہ قائم تھا جو شعور کی وادی میں قدم رکھتے ہی ایک بے عنوان سی محبت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ انہوں نے باہمی زندگی ساتھ گزارنے کے بہت سے خواب دیکھے تھے لیکن جن حالات میں یہ نکاح ہوا تھا اور اپنوں سے فاصلے پیدا ہوئے تھے وہ دونوں ملول ہو گئے تھے۔

خوشی اور مسرت کا کوئی لمحہ ان کے علاقے میں کم ہی راس آیا کرتا تھا۔ کسی بھی تہوار یا شادی بیاہ کے موقع پر بھارتی فوج اپنی درندگی دکھانے سے نہ چوکتے اور نوعمر لڑکیوں کی کٹی پھٹی لاشیں اکثر جنگل یا پہاڑوں پر جنگلی جانوروں کی خوراک بن جایا کرتیں۔

نوشی ان لمحات کا تصور کر کے تھرا اٹھی اور جاذب کی زندگی و سلامتی کے لیے بھی دعا گو ہو گئی۔ کچھ ہی لمحوں میں تھکاوٹ سے چُور ہو کر وہ نیند کی وادی میں کھو گئے۔

☆☆☆

رات کا جانے کون سا پہر تھا کہ جاذب کی آنکھ کھل گئی۔ کچھ دیر تو وہ اپنے اردگرد ماحول کا ادراک ہی نہ کر پایا۔ غار میں گھپ اندھیرا تھا۔ دھیرے دھیرے اسے اپنی پوزیشن کا احساس ہوا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس طرح غفلت کی نیند ان کے لیے بہت خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔

اس نے ٹٹول کر اپنی بندوق اٹھائی۔ نوشی کی مدھم سانسوں کی آواز بھی اس کی سماعت میں پڑ رہی تھی۔ وہ اندازے سے چلتا ہوا غار کے دہانے پر آ کر بیٹھ گیا۔ دور کہیں کوئی پرندہ کوک رہا تھا۔ جنگل کے مہیب سناٹے میں جاذب کو یہ آواز بہت بھلی محسوس ہوئی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ نایاب النسل پرندہ قدرتی طور پر فجر سے پہلے بیدار ہوا کرتا ہے اور اپنی مخصوص آواز میں راگ الاپتا ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں جنگل مزید پرندوں کی آواز سے بھی گونج اٹھا۔ انہی خوشنما آوازوں میں ہوا کے دوش پہ لہراتی ایک بھیانک آواز بھی اس کی سماعت سے دور نہ رہ سکی۔ کسی شکاری کتے کی آواز اسے بہت قریب آتی محسوس ہو رہی تھی۔

جاذب ایک ہی پل میں ساری صورتِ حال سمجھ گیا۔ بھارتی فوجی ضرور کتوں کے ذریعے انہیں تلاش کرتے ہوئے جنگل میں پہنچ چکے تھے اور اب یہاں مزید ٹھہرنا خودکشی کے مترادف تھا۔ وہ ایک جست میں اندر پہنچا اور نوشی کو جھنجوڑ کر اٹھا دیا۔

''کک......کک......کیا ہوا؟'' وہ ہڑبڑا گئی۔

''ہندوستانی فوجی کسی بھی لمحے یہاں پہنچنے والے ہیں......ان کے پاس شکاری کتے ہیں جن سے انسانی جسم کی بو چھپی نہیں رہ سکتی۔ ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہوگا۔'' وہ دانستہ بلند آواز میں بولا تا کہ نوشی کے حواس جلد بحال ہو سکیں۔

نوشی نے بھی تیزی سے سامان سمیٹا اور اس کا ہاتھ تھامے باہر آ گئی۔ چاند اب بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا تھا۔ اس لیے راستے کے نشان اجنبی نہیں رہے۔ وہ احتیاط سے قدم اٹھاتے مخالف سمت میں تیزی سے چلنے لگے۔ مختصر نیند نے انہیں کافی حد تک تازہ دم کر دیا تھا اور جان بچانے کی جبلی خواہش بھی ارادوں کو مزید مہمیز کر رہی تھی۔

صبح صادق کی روشنی دھیرے دھیرے پھیلنے لگی۔ وہ

بغیر رکے چلتے جارہے تھے۔ ایک جگہ پانی کا چشمہ نظر آتے ہی بے اختیار ٹھٹک کر رک گئے۔ ٹھنڈے میٹھے پانی سے وضو کر کے دونوں نے نماز ادا کی اور اپنے سامان سے مکئی کی روٹی نکال کر پیٹ کے ایندھن کو سرد کیا۔ اوک سے جی بھر کر ٹھنڈا پانی پینے کے بعد انہوں نے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا ہی تھا کہ اپنے عقب میں دھپ دھپ کی آوازوں کے بعد ایک اور کرخت آواز نے انہیں چونکا دیا۔

''ہینڈز اپ! خبردار حرکت کی تو بھون کے رکھ دیں گے۔''

جاذب اور نوشی کے ذہنوں میں بیک وقت ایک ہی خیال سرسرایا کہ انہیں ٹریس کرلیا گیا ہے۔ وہ دو افراد تھے۔ ان کی بڑھی ہوئی شیو' آنکھوں میں سرخی اور منہ سے اٹھتے بدبو کے بھبکوں سے کراہت محسوس ہورہی تھی۔

''کون ہو تم اور یہاں کیا کررہے ہو؟'' ان میں سے ایک نے کرختگی سے پوچھا۔

جاذب یہ سوال سن کر چونک گیا۔ یہ کوئی انجان اہلکار معلوم ہوتے تھے۔ اس نے انہیں چکر دینے کا فیصلہ کرلیا۔

''صاحب جی! ہم دونوں پریمی ہیں۔ ہمارے بڑے بیاہ کے لیے نہیں مانتے تھے تو ہم گھر سے بھاگ آئے ہیں۔ غلطی ہوگئی جی۔ رستہ بھول کر ادھر نکل آئے ہیں۔'' جاذب نے اپنی اداکاری میں رنگ بھرنے کے لیے کانوں کو ہاتھ لگا کر ہاتھ بھی جوڑ دیے۔

''بہت تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہو۔ ادھر تھوڑی دور ہی ہمارا کیمپ ہے۔ آرام کرلو پھر جہاں کہو گے پہنچا دیں گے۔'' دوسرے سپاہی نے ہوس ناک نظروں سے نوشی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

جاذب کسی بھی طرح اپنے سامان کے نیچے دبی بندوق نکالنا چاہتا تھا لیکن ان اہلکاروں کی نظر سے بچنا ممکن نہیں لگ رہا تھا۔ انہوں نے نوشی کو بازو سے پکڑ کر آگے گھسیٹا۔ اس کا پاؤں بے اختیار پھسلا اور وہ کراہتی ہوئی نیچے گرگئی۔ جاذب اس کی چال سمجھ گیا۔ دونوں اہلکاروں کا دھیان نوشی کی جانب ہی تھا۔ اس نے سرعت سے ایک اہلکار سے بندوق چھینی اور ان دونوں پر فائر کھول دیے۔

جنگل میں دھماکوں کی اس زوردار آواز سے پرندوں نے بھی احتجاج کرنا شروع کردیا۔ وہ دونوں اب ہر طرف سے خطرے میں گھر چکے تھے۔ جاذب جانتا تھا کہ یہ اہلکار کسی قریبی چوکی سے یہاں آئے ہوں گے اور اسے یہ بھی علم تھا کہ ہر چوکی پر ایک افسر کے علاوہ دو ماتحت تعینات ہوتے ہیں۔ دو افراد کے جہنم واصل ہونے کا سکون اپنی جگہ لیکن تیسرا نادیدہ دشمن بھی اپنی موجودگی سے ان کے لیے شدید خطرے کا باعث بن سکتا تھا۔ اس کے علاوہ فائرنگ کی یہ آواز تعاقب کرنے والی ٹیم کو بھی خود بخود ان کا سراغ دے دیتی۔

یہ سبھی خیالات ایک لمحے میں جاذب کے ذہن میں گردش کر گئے اور اس نے فوراً وہاں سے فرار ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ دونوں فوجیوں کی بندوق اور اضافی گولیوں پر قبضہ جما کر وہ سامنے کی سمت میں نظر آتی پہاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ اس پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ کر وہ دوسری طرف مڑجانا چاہتے تھے جہاں ان کی معلومات کے مطابق آزاد کشمیر کا علاقہ واقع تھا۔

چڑھائی بہت دشوار تھی لیکن انہوں نے ہمت نہ ہاری اور ہانپتے کانپتے وہ فاصلہ طے کرتے گئے۔ کافی بلندی پر پہنچنے کے بعد نوشی نے اس کا بازو تھاما اور التجائیہ انداز میں بولی۔

''مجھ سے اب مزید نہیں چلا جارہا۔ تھوڑی دیر یہیں رک جاؤ۔''

''ٹھیک ہے۔ تم وہاں درخت کے سائے میں چلو۔ میں ذرا اردگرد کی خبر لے لوں۔'' اس نے نوشی کا سر تھپتھپایا۔

ایک درخت کی شاخ پر چڑھ کر اس نے نیچے کا جائزہ لیا تو اس کے اندازے کے عین مطابق تیسرا اہلکار ان کی راہ پر لگ چکا تھا۔ جاذب گہری سوچ میں مبتلا ہوگیا۔ وہ اب فائرنگ کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا...... اس لیے دائیں جانب موجود جھاڑیوں کی اوٹ میں دبک گیا۔ اس اہلکار کو یہاں سے لازمی گزرنا تھا۔

انتظار اور سنسنی کی کیفیت میں اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اسے ایک سوکھی لکڑی چٹخنے کی آواز آئی۔ وہ فوراً چوکنا ہوگیا۔ اہلکار کے وزنی جوتوں تلے کوئی شاخ ٹوٹی تھی۔ جاذب نے بندوق کو نال سے تھاما اور قریب آتے ہی اس کے سر پر پے در پے کئی وار کردیے۔ کھوپڑی چٹخنے کی مخصوص آواز کے بعد وہ فوجی اہلکار تیورا کر نیچے گرگیا۔

سورج اب کافی بلند ہوگیا تھا۔ ہلکی سنہری دھوپ نے اپنے پَر پھیلا لیے۔ ذرا پل ستانے کے بعد حرکت میں آنے کا وقت ہوچکا تھا۔ نوشی کسی گہری سوچ میں تھی۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' جاذب نے محبت سے پوچھا۔

''ہم رستہ بھٹک گئے ہیں۔ وہ قافلہ تو ہمیں کہیں بھی نہیں ملا۔''

''شاید وہ لوگ کسی دوسرے رستے سے واقف ہوں گے۔''

''اب کیا ہوگا جاذب؟'' وہ بے اختیار پریشان ہوئی۔

''فکر نہ کرو۔ ہم ضرور بارڈر کراس کریں گے اور انہیں کھیتر گاؤں کے حالات سے آگاہ کر کے مدد طلب کریں

گے۔'' اس نے تسلی دی۔

وہ جانتا تھا کہ نوشی کا کبھی ایسے حالات سے واسطہ نہیں پڑا۔ وہ اسے مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سرحد پار کرنا بالکل بھی آسان نہیں تھا لیکن آزاد خطے کی تمنا اسے ہر خطرہ مول لینے کے لیے اکسا رہی تھی۔

انہوں نے اپنی چھاگل سے تھوڑا پانی پیا اور ایک بار پھر سفر شروع کردیا۔ اب وہ پہاڑی کی دوسری جانب نشیب میں گامزن تھے۔ اس طرف کا علاقہ ان کے لیے مکمل اجنبی تھا۔ وہ صرف اتنا ہی جانتے تھے کہ اس پار کے لوگ 'آزادی' جیسی عظیم دولت سے مالا مال ہیں۔ وہ کھلے عام نماز پڑھتے ہیں' تہوار مناتے ہیں' شادیاں کرتے ہیں اور سبھی اسلامی رسوم ورواج پر آزادانہ عمل کرتے ہیں۔ اس آزادی اور ان تعیشات کی وہ محض تمنا ہی کرسکتے تھے۔

دوسری جانب نشیب میں پھر جنگل کا سامنا تھا۔ چنار کے بلند درخت انہیں حیرانی سے تک رہے تھے۔ وہ بغیر رکے شام تک چلتے رہے لیکن اب بھی انہیں کوئی گاؤں یا رہائشی علاقہ نظر نہ آیا تھا۔ وہ ابھی تک مقبوضہ علاقے میں ہی تھے اور اس وقت تلوار کی دھار پر سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔

ایک جگہ رک کر انہوں نے باقی ماندہ مکئی کی روٹی سے پیٹ پوجا کی۔ کھانا اب ختم ہوچکا تھا البتہ پانی جابجا چشموں سے انہیں مل جاتا تھا جسے وہ اپنی چھاگل میں بھر لیتے۔ شام کے سائے گہرے ہونے لگے۔ انہیں رات گزارنے کے لیے کسی محفوظ ٹھکانے کی ضرورت تھی جو خوش قسمتی سے کچھ دور جاتے ہی مل گیا۔

یہ ایک قدرتی کھوہ تھی۔ جاذب نے نوشی کا ہاتھ تھاما اور دہانے سے جھاڑیاں ہٹا کر اندر چلا گیا۔ اندرونی جانب بالکل کشادگی نہیں تھی۔ دو افراد کے بیٹھنے کے لیے ہی یہ مشکل جگہ تھی۔ انہوں نے گہری سانس لے کر سامان رکھ دیا۔

''نوشی! تم کافی تھکی ہوئی ہو اس لیے تھوڑی دیر آرام کرلو۔ ہم دونوں میں سے ایک کے لیے بیداری بہت ضروری ہے۔ میں کچھ دیر بعد تمہیں جگا دوں گا۔''

''مجھے نیند بالکل نہیں آئے گی۔ پہلے تم سو جاؤ۔ میں تمہیں جگا دوں گی۔'' نوشی نے کہا۔ وہ جانتی تھی کہ جاذب محض اس کی وجہ سے اپنی تھکاوٹ کا اظہار نہیں کررہا اور اگر وہ سوگئی تو اس کے آرام کی خاطر جاذب اسے بالکل نہیں جگائے گا۔

جاذب نے اس تجویز پر کوئی اعتراض نہ کیا اور اپنا جسم موڑ کر ایک پتھر پر سر رکھے تھوڑی ہی دیر میں سوگیا۔ نوشی خاموشی سے اس کے نقوش اور وجود پر طاری جامد خاموشی کو دیکھتی رہی۔ تقدیر انہیں عجیب موڑ پر لے آئی تھی۔

''یہ غلامی جانے کب تک اندھیروں کی طرح ہمارا مقدر بنی رہے گی؟ آزادی کا سورج لیے روشن صبح کب طلوع ہوگی؟'' اس کی آنکھوں میں نمی چھلکی۔

وہ کافی دیر تک کھوہ سے باہر نظر آنے والے اندھیرے میں امید کے جگنو تلاشتی رہی اور پھر اپنی تھکاوٹ اور نیند کے سامنے سرنگوں ہوکر ہوش وحواس سے بیگانہ ہوگئی۔

☆☆☆

رات کے پچھلے پہر اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اپنے آس پاس ایک تیز سرسراہٹ کے علاوہ چہرے پر شدید نمی بھی محسوس کررہی تھی۔ کچھ دیر تو اسے سمجھ ہی نہ آیا کہ وہ کہاں موجود ہے لیکن جب آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہوئیں تو اپنے دائیں جانب دو سرخ آنکھوں کو دیکھ کر ہسٹریائی انداز میں چیخ اٹھی۔

اس کے بالکل قریب ایک بھیڑیا موجود تھا جس کی تھوتھنی سے ٹپکنے والا مادہ اس کا چہرہ چپچپا رہا تھا۔

''کیا ہوا نوشی؟ تم ٹھیک تو ہو؟'' جاذب کی آنکھ بھی کھل گئی۔

نوشی نے بے اختیار اس کا بازو دبوچ لیا۔ جاذب کی نظر بھی بھیڑیے پر پڑ چکی تھی۔ اس نے لپک کر اپنی بندوق تھامی لیکن بھیڑیا ایک جست لگا کر تاریکی میں غائب ہوگیا۔ اب نیند آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ دونوں کھوہ کے دہانے میں بیٹھ کر صبح ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

بھوک ان کے معدوں کو اپنے تیز پنجوں سے نوچ رہی تھی لیکن پانی کے سوا کچھ بھی میسر نہیں تھا۔ چنار اور چیڑ کے درختوں سے ہوا سرسراتی ہوئی گزرتی تو شاخوں کی آواز سے بھی ان کے دل دھڑک اٹھتے۔ وقت سست رفتاری سے ہی سہی لیکن گزرتا چلا گیا۔ پرندوں کی مخصوص آوازیں فضا میں پھیلیں تو وہ ایک بار پھر نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہوگئے۔

سورج اب سر پر چڑھ آیا تھا۔ وہ جانے کتنی مسافت طے کرچکے تھے۔ ایک مقام پر بندروں کی ٹولی دیکھ کر وہ ٹھٹک کر رک گئے۔ ان کی یہاں موجودگی کا واضح مطلب تھا کہ قریب ہی کہیں جنگلی پھل یا میوے موجود ہیں۔ جاذب نے بےتابی سے نظریں ادھر اُدھر دوڑائیں اور پھر کچھ ہی دور راستے ایک پھل دار درخت نظر آگیا۔ یہ ایک مقامی پھل تھا جو چھوٹے بیروں کی شکل میں دستیاب ہوتا تھا۔

''نوشی! تم یہ سامان پکڑو۔ بھوک مٹانے کا انتظام ہوگیا ہے۔'' وہ پرجوش ہوا۔

''یہ تھیلی لیتے جاؤ۔ پھل اس میں ڈال دینا۔'' نوشی نے کپڑے کی بنی وہ تھیلی تھمائی جس میں مکئی کی میٹھی روٹیاں تھیں۔

جاذب تیزی سے درختوں کے جھنڈ میں گیا اور وہ اگلے نصف گھنٹے میں جھولی کے علاوہ اپنے دامن میں بھی ڈھیروں پھل بھر لایا۔ انہوں نے سیر ہو کر پھل کھایا اور پانی پی کر رب کا خصوصی شکر ادا کیا۔ اب ایک بار پھر وہی سفر تھا اور وہی گھنا جنگل۔

"مزید کتنا سفر رہ گیا ہے جاذب؟" نوشی نے پوچھا۔

"میرے اندازے کے مطابق تو اب تک سرحد آجانی چاہیے۔" اس نے پیشانی مسلی۔

"کیا تمہیں اس کی کوئی نشانی یاد ہے؟"

"ہاں۔ ایک نالا بہتا ہے جو دوسری طرف دریائے نیلم میں جا گرتا ہے۔"

"اگر آج رات بھی کسی کھوہ یا غار میں بسر کرنی پڑی تو......" نوشی گزشتہ رات کا منظر یاد کرکے ایک بار پھر تھرا گئی۔

"فکر کیوں کرتی ہو؟ ہم اس وقت ایک نیک مقصد کے لیے حالتِ سفر میں ہیں۔ قدرت ہماری مدد ضرور کرے گی۔"

شام کے سائے تیزی سے پھیلنے لگے۔ اب وہ مایوسی کا شکار ہونے لگے تھے لیکن یکدم پانی بہنے کی ہلکی سی آواز ان کے لیے حیات نو کی نوید ثابت ہوئی۔ منزل قریب تر نظر آنے لگی تو قدرتی طور پر ان کی رفتار تیز ہوگئی۔ دس منٹ کی مسافت کے بعد وہ ایک ایسے علاقے میں پہنچ گئے تھے جہاں سے خاردار تاریں اور سرحدی علاقہ واضح نظر آنے لگا تھا۔

"اب خطرہ مزید بڑھ گیا ہے۔ ہمیں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔" جاذب نے سرگوشی کی۔

"وہ کیوں بھلا؟ اب تو منزل پاس ہے۔"

"یہاں بھارتی فوجیوں نے ہر جانب نادیدہ جال اور بارودی سرنگیں بچھائی ہوئی ہیں۔ ایک قدم بھی غلط جگہ پر پڑا تو ہمارے چیتھڑے اڑ جائیں گے۔"

خاردار تاروں کو پھلانگنا ایک ناممکن امر تھا۔ اندھیرا تیزی سے پھیلنے لگا۔ جاذب نے بھارتی فوجی سے حاصل کی گئی ایک پنسل ٹارچ نکالی جو ایسے ہی کسی موقع کے لیے اس نے اب تک استعمال نہیں کی تھی۔ ٹارچ کی مدھم روشنی میں بھی دوسری جانب جانے کے بھی امکانات صفر نظر آتے تھے بلکہ اب تو وہ دہرے خطرے کا شکار تھے۔ سرحد پار فوجی بھی انہیں دشمن سمجھ کر ہی نشانہ بنا سکتے تھے۔ اس کشمکش میں گھرا وہ بے چینی سے اپنی پیشانی مسل رہا تھا۔

"جاذب! وہ درخت نظر آرہے ہیں تمہیں؟" نوشی نے اس کا کندھا ہلا کر اشارہ کیا۔

"ہاں...... کیوں کیا ہوا؟" وہ بے دھیانی سے بولا۔

"آج بندروں کو نہیں دیکھا تھا جو ایک شاخ سے دوسری شاخ پر جھول رہے تھے۔ کیا ہم ایسا کوئی طریقہ نہیں اپنا سکتے؟" نوشی کی تجویز سن کر اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"بالکل۔ یہ تو سامنے کی بات ہے۔ مجھے تو خیال ہی نہ آیا۔ کمال کی تجویز دی ہے تم نے۔" اس کے والہانہ انداز پر نوشی کے رخسار تمتما اٹھے۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور واپس اوپر مڑتے ہوئے پنسل ٹارچ کی روشنی میں درختوں کا جائزہ لینے لگا۔ کچھ دیر بعد اسے ایک ایسا درخت مل گیا جس کے ساتھ خاردار تاریں گزر رہی تھیں۔ یہ بھی چنار ہی کا درخت تھا جس کی شاخیں قدرتی طور پر کئی میٹرز تک پھیلی ہوئی تھیں۔ یہی شاخیں انہیں اپنے مقصد میں کامیاب کرسکتی تھیں۔

وہ خوشی سے جھومتا ہوا نوشی کے پاس آیا اور اسے اپنی دریافت کے بارے میں آگاہ کیا۔ وہ بھی پُرجوش ہوگئی۔ آزاد فضا میں سانس لینے کا تصور انہیں کسی بھی گہرائی میں سوچنے کی مہلت ہی نہیں دے رہا تھا۔ وہ ایک عزم سے آگے بڑھے اور درخت کے پاس پہنچ گئے۔ جاذب نے محتاط نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور نوشی کو ایک شاخ پکڑ کر دوسری طرف کودنے کا اشارہ کیا۔ اس کے آگے بڑھتے ہی اس نے ایک نسبتاً اونچی شاخ تھامی اور اپنا جسم چوکس کرلیا۔

اسی پل ہوا میں ایک زوردار برسٹ کی آواز گونجی اور جاذب نے نوشی کے وجود کو لہرا کر دوسری جانب گرتے ہوئے دیکھا۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ سمجھ پاتا، اسے اپنی پشت میں بھی انگارے دھنستے ہوئے محسوس ہوئے۔ اسی لمحے میں وہ ساری صورتِ حال سمجھ گیا کہ یہ بھی ان کے صیادوں کا لگایا ہوا ایک پھندا تھا جس میں وہ بھی پھنس گئے تھے۔

اس کے خون آلود ہاتھوں سے شاخ پھسلی اور وہ بھی نوشی ہی کی طرح لڑھکتا چلا گیا۔ بارودی سیسہ، سنگلاخ زمین سے ٹکرانے کی خراشوں کی اذیت سے بڑھ کر اس وقت وہ کسک اور تشنگی تھی جو انہوں نے لبِ بام محسوس کی۔

"نوشی......" اس نے ڈوبتی ہوئی آواز سے پکارا۔

دوسری جانب مکمل خاموشی تھی۔ اس کا دل کسی نے یک لخت مٹھی میں بھینچ لیا۔ اس نے تیزی سے اندھیرے میں ڈوبتے ہوئے ذہن کو سنبھال کر کلمے کا ورد کیا اور آزاد سرزمین کی مٹی کی چٹکی اٹھا کر اپنے چہرے پر مل لی۔ انہیں درندوں سے آزادی نہیں مل سکی تھی مگر اس نوبیاہتا جوڑے نے آزادی کی خواہش ......صرف خواہش اور کوشش کی پوری قیمت اپنے لہو سے ادا کر دی تھی!

تحفہ

شاہ زین رضوان

مجرم چاہے کتنا ہی بڑا شاطر ہو مگر قانون کے آگے ایسا ہی نادان بچہ ثابت ہوتا ہے جو قدم قدم پر لڑکھڑاہٹ کے خوف میں مبتلا ہو۔ اس نے بھی بہت چالاکی سے بازی تو کھیلی مگر... اندھے قانون کی تیز نگاہوں سے پھر بھی بچ نہ سکی۔

جرم کو چھپانے کے لیے انوکھا انداز اختیار کرنے والی حسینہ کی مکاری

فلوریڈا کے ساحلی شہر سارا سوتا میں طوفان کا زور ٹوٹا تو لوگ معمولاتِ زندگی بحال کرنے میں مصروف ہو گئے۔ بجلی کا نظام تباہ ہو چکا تھا۔ اس لیے لوگ دن کے مقابلے میں زیادہ تر رات کو باہر نکلتے۔ پولیس آفیسر ہیکٹر جارج نے اس کا اظہار سراغ رساں یوریکا کلبرن سے کیا تو وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ''تمہارا مطلب ہے حالیہ دنوں میں؟'' دن میں پڑنے والی شدید گرمی کی وجہ سے شہر ویران ہو چکا تھا لیکن طوفان کی وجہ سے ہونے والا بلیک آؤٹ ختم

ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ سمندر کے پانی نے ٹرانسفارمر تباہ کر دیے اور تاریں زنگ آلود ہو چکی تھیں۔ کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ بجلی کا نظام کب ٹھیک ہوگا۔

”تمہیں اگر میری بات پر یقین نہیں آرہا تو خود چل کر دیکھ لو۔ تمام بار بھرے ہوئے ہیں۔“ ہیکٹر نے کہا۔

”بہت دلچسپ بات ہے۔“ یوریکا بولی۔

طوفان گزرنے کے دو دن بعد ہیکٹر پولیس اسٹیشن پہنچا۔ وہ بھوکا تھا اور اس کے کپڑے پھٹ چکے تھے۔ اس نے پانی میں گھرے ہوئے میامی سے اپنا سفر شروع کیا اور تباہ شدہ گنے اور ٹماٹر کے کھیتوں سے گزرتا ہوا اپنی منزل تک پہنچا۔ ایک کھیت میں اس نے ٹوٹا پھوٹا احاطہ اور دوسرے میں منہدم شدہ گودام دیکھا جس میں رکھی ہوئی سیکڑوں ٹن چینی سیلابی پانی میں بہہ گئی تھی۔

اس خوفناک سفر کے باوجود وہ خاصا خوش لگ رہا تھا جیسے اس نے کسی گرے ہوئے درخت کو سو ٹکڑوں میں کاٹا ہو۔ یوریکا نے اس کے لیے فوراً ہی خوراک اور لباس کا بندوبست کیا تاکہ وہ اپنے فرائض دلجمعی سے انجام دے سکے۔ یوریکا کو یہ جان کر بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی کہ ہیکٹر نے رات کو گشت کرنا شروع کر دیا ہے۔

”میں مون بار میں کچھ غیر معتبر لوگوں سے ملا ہوں۔“ ہیکٹر نے کہا۔ مون بار صرف ان راتوں میں کھلتا تھا جب چاند نکلا ہوا ہوتا تھا۔ ”میری پناہ گزینوں، موسیقاروں اور بجلی کے ستائے ہوئے لوگوں سے بات ہوتی ہے۔ دن کی روشنی میں طاقتور لوگ کمزوروں کا شکار کر لیتے ہیں لیکن رات کے اندھیرے میں یہی کمزور لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ بہ حفاظت چلے جاتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ یوریکا نے کہا۔ ”میں کسی وقت مون بار جاؤں گی۔“

”ہاں۔ وہاں کئی عورتیں آئی ہیں۔“ ہیکٹر نے کہا۔

یوریکا جانتی تھی کہ عورتیں ہیکٹر کو پسند کرتی ہیں اور وہ بھی ان کے ساتھ خوش رہتا ہے۔ وہ انہیں خوش کرنے کے لیے عمدہ لباس پہنتا تھا۔ اس نے اپنی وردی کی خاکی پتلون اور سفید قمیص بھی جدید انداز میں سلوائی تھی اور اس کے بال ہمیشہ خوب صورتی سے ترشے ہوئے ہوتے۔

”میری گزشتہ شب ایک ایسی عورت سے ملاقات ہوئی جو بہت مشکل میں ہے۔“

وہ ویسے بھی بہت زیادہ خیال رکھنے والا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جب وہ چھوٹا تھا تو اس کی ماں سیلاب میں بہہ گئی تھی۔

”کیا اسے کسی مرد کی وجہ سے پریشانی ہے؟“ یوریکا نے پوچھا۔

یوریکا کے انداز میں بے اعتنائی تھی۔ ہیکٹر نے اسے غصے سے دیکھا۔ ان دنوں ہر ایک کا ماضی مشکوک لگتا تھا چاہے وہ ہیکٹر کی طرح جوان ہی کیوں نہ ہو۔

”اس نے مجھے اعتماد میں لیتے ہوئے بتایا۔“ اس نے کہا۔ ”وہ اس پر ظلم کرتا ہے، بدقسمتی سے وہ اس پر انحصار کرتی ہے۔“

”اور اسے تمہاری مدد چاہیے؟“

”نہیں۔ دراصل وہ تمہاری مدد چاہتی ہے۔“

”واقعی۔“ یوریکا حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ”کیا تم نہیں سمجھتے کہ وہ میرے بجائے تمہاری مدد کو ترجیح دے گی اور شاید وہ میری مدد لینا پسند نہ کرے۔“

”وہ چاہتی ہے کہ آج رات میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر جاؤں تاکہ وہ تم سے ملاقات کر سکے۔“

”اس سے کہو کہ پولیس اسٹیشن آجائے۔“

”یہ اس کے لیے مشکل ہوگا۔ وہ صرف رات میں ہی باہر نکل سکتی ہے۔ اسے کچھ غیر معمولی تجربات ہوئے ہیں۔ معاشی حالات کی وجہ سے اسے کچھ قابلِ اعتراض معاملات پر مجبور ہونا پڑا۔“

”قابلِ اعتراض۔ یہ تو سننے میں ہی برا لگتا ہے۔“

”جوانی میں اسے کچھ ایسے سفر کرنا پڑے جو نہیں کرنا چاہیے تھے۔“

”مجھے اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آرہی۔“

”بعض اوقات آپ کو کسی ایک چیز کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔“ جارج نے کہا۔ ”اور آپ کوئی ایک راستہ اختیار کر لیتے ہیں لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ آگے کیا ہوگا۔ یہ بات تو تم بھی سمجھتی ہو۔“

”ٹھیک ہے۔“ یوریکا نے کہا۔ ”آج رات میں مون بار جاؤں گی۔“

”کیا تم وردی میں وہاں جاؤ گی؟“ ہیکٹر نے پوچھا۔

”اس کی ضرورت نہیں لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”وہ تمہیں وردی میں دیکھنا چاہتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس طرح اسے تحفظ کا احساس ہوگا۔“

سراغ رساں یوریکا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس معاملے کا وردی سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ ایک شہری عورت اسے کیوں وردی میں دیکھنا چاہتی ہے۔ اسے یاد نہیں تھا کہ

باس کے علاوہ کبھی کسی نے اسے وردی میں دیکھنا چاہا ہو۔

''تم اس عورت کے بارے میں اور کیا جانتے ہو؟''

''کچھ زیادہ نہیں۔'' ہیکٹر نے کہا۔ ''اور جو جانتا ہوں اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔''

اس رات بھی بہت سے لوگ گھروں سے باہر نکلے ہوئے تھے لیکن یوریکا یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ آیا ان کی تعداد دن کی نسبت زیادہ تھی۔ شاید پورے چاند کی وجہ سے اس تعداد میں اضافہ ہوگیا تھا۔ یوریکا نے اپنی اسکواڈ کار نکالی اور تامیامی ٹریل پہنچ گئی جو مون بار سے ایک بلاک کے فاصلے پر تھا۔ اس نے اپنی گاڑی ایک ہوٹل کے نیون سائن کے قریب پارک کی جو سڑک پر گر پڑا تھا۔ اس کے لوہے کے ستون بل کھا کر درمیان سے ٹوٹ چکے تھے اور بڑے سائز کا سائن بورڈ امید بھری نظروں سے راہ گیروں کو دیکھ رہا تھا۔

جب وہ بار کے اردگرد کا علاقہ چیک کر رہی تھی تو اسے محسوس ہوا کہ اس کی نیند غائب ہو چکی ہے اور وہ غیر شعوری طور پر کسی خفیہ آپریشن کے پروٹوکول پر عمل کر رہی ہے۔ عام طور پر وہ کبھی کسی بار میں ڈرنک کے لیے نہیں جاتی تھی۔

اس نے ہر جگہ لوگوں کو خرید و فروخت میں مصروف دیکھا۔ ایک عمر رسیدہ عورت چھکڑے پر سبزیاں فروخت کر رہی تھی۔ فٹ پاتھ پر ایک شخص کرسی پر بیٹھا اپنے بال ترشوا رہا تھا۔ وہ اردگرد دیکھتے ہوئے محتاط انداز میں مون بار میں داخل ہوگئی۔ اس کی لمبائی کم اور چوڑائی زیادہ تھی اور سڑک کی جانب والا حصہ کھلا ہوا تھا۔ اس کی شکل ڈائننگ ہال جیسی تھی جس میں کاؤنٹر کی جگہ بار بنا دیا گیا تھا۔ چند مرتبہ طوفان باد و باراں آنے کے بعد مالک نے موم بتیوں کا استعمال شروع کر دیا تھا اور دوبارہ بجلی استعمال نہیں کی۔ اس کے مقابلے میں چاند کی روشنی ایک مستحکم اور قابلِ اعتبار روشنی کا ذریعہ تھی۔

اس کمرے میں ایک بار کاؤنٹر اور اس کے عقب میں دیوار گیر الماری میں مشروب کی بوتلیں ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں جبکہ بار اور بار اسٹولوں پر مختلف تصویریں بنی ہوئی تھیں، ان کے سامنے فٹ پاتھ پر چھوٹی میزیں رکھی ہوئی تھیں۔ ہر میز کے ساتھ ایک یا دو بوسیدہ سی لوہے کی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ چاندنی نے کچھ حصوں پر دودھیا روشنی بکھیر رکھی تھی لیکن بیشتر حصہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

یوریکا کی نظر جارج پر گئی جو وہاں پہلے سے ایک میز پر بیٹھا ہوا تھا۔

''تمہاری دوست نظر نہیں آ رہی؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ ابھی نہیں آئی۔'' ہیکٹر نے جواب دیا۔ اس کی میز پر مشروب کی بوتل اور گلاس رکھا ہوا تھا۔ ان دونوں چیزوں کو اس نے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اس نے بوتل یوریکا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ تمہارے لیے ہے۔''

''شکریہ۔'' وہ بولی۔ اسے معلوم تھا کہ زیادہ تر مشروب کی بوتلوں پر جعلی لیبل لگے ہوئے ہیں۔ جنہیں انٹرنیٹ سے کاپی کر کے چھاپا کیا جاتا ہے اور یہ جگہ بھی شہر کے دوسرے بار سے مختلف نہ تھی۔

''تم نے بار کے آخری سرے پر جیکٹ میں ملبوس اس شخص کو دیکھا؟'' ہیکٹر نے پوچھا۔

''میں جانتی ہوں کہ تمہارا اشارہ کس جانب ہے؟'' یوریکا نے اپنی آنکھیں گھمائے بغیر احتیاط سے کہا۔ اس نے فوراً ہی اس کا نوٹس لیا۔ سارا سوتا میں ہر شخص دن کے وقت سفید یا ہلکے رنگوں کا لباس پہنتا تا کہ سورج کی روشنی منعکس ہو سکے۔ مون بار میں لوگوں کی بڑی تعداد سیاہ کپڑوں میں ملبوس تھی۔ بار کے آخری کونے پر کھڑا ہوا شخص بھی سیاہ بلیزر پہنے ہوئے تھا۔ اس کی جیکٹ ڈھیلی اور اوپر سے کھلی ہوئی تھی جس میں سے اس کی وی گلے والی ٹی شرٹ صاف نظر آ رہی تھی۔ اس کے شانے چوڑے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کوئی معمولی جیکٹ اس کے لیے موزوں نہ ہوتی۔ وہ اسے نہ پہچان سکی۔ ویسے بھی چاندنی میں اتنے فاصلے سے کسی کو پہچاننا مشکل تھا۔

''اس نے بارٹینڈر سے کہہ کر یہ مشروب یہاں بھیجے تھے۔ مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں کہ یہ کون ہے؟''

یوریکا نے مڑ کر اس سیاہ جیکٹ والے کی طرف دیکھا۔ مشروب کی بوتل اٹھائی اور آہستہ سے سر ہلا دیا۔ جواب میں اس نے بھی اپنا سر ہلا دیا۔ تاہم اس ناکافی روشنی میں اس کے چہرے کے تاثرات پڑھنا مشکل تھے۔

''تمہارا خیال ہے کہ یہ شخص تمہاری دوست کا شوہر ہوسکتا ہے جس سے وہ خوفزدہ ہے؟'' یوریکا نے پوچھا۔ اس کی نظریں اب بھی اس جیکٹ والے پر تھیں گو کہ وہ براہِ راست اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔

''ہوسکتا ہے۔ میں بھی اس کے شوہر سے نہیں ملا۔''

''یہ یقیناً قرب و جوار کا رہنے والا نہیں ہے۔'' یوریکا نے کہا۔

''اس طرح کا لباس میامی میں پہنا جاتا ہے۔'' ہیکٹر نے کہا۔ ''اس نے میرے لیے ڈرنک کیوں خریدی؟''

''تمہیں زہر دینے کے لیے۔'' یوریکا نے سنجیدگی سے کہا۔

''بارٹینڈر نے میرا گلاس بھرا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ شخص مجھے کیسے جانتا ہے؟''
''شاید اسے پولیس والے پسند ہیں۔''
بار میں زیادہ لوگ نہیں تھے جو انہیں وردی میں دیکھ کر حیران ہوتے۔ ممکن ہے کہ ہیکٹر کی دوست یہ ظاہر کرنا چاہتی ہو کہ اس نے اپنے تحفظ کا بندوبست کرلیا ہے۔
سراغ رساں یوریکا نے اپنے کورفون پر رِنگ کی آواز سنی۔ اس پر ایک پرانے اور تجربہ کار آفیسر کٹ کامیو کا پیغام آرہا تھا جس کا متن کچھ یوں تھا۔
''دو بلیک باکس ٹرک وار بلر بینڈ سے ٹریل کی جانب بڑھ رہے ہیں۔'' ٹریل سے اس کی مراد تامیامی ٹریل تھی جو مرکزی شمال اور جنوب کو ملانے والی سڑک تھی جو درختوں اور جھاڑیوں کی بھرمار سے جنگل جیسی ہوگئی تھی کیونکہ شہر کے لوگ موسم کی شدت سے گھبرا کر سارا سوتا سے شمال کی طرف جارہے تھے۔
کٹ کا پیغام عموماً مکمل الفاظ اور مخفف کا مجموعہ ہوتا تھا۔ سراغ رساں یوریکا کے لیے یہ انداز اجنبی نہیں تھا کیونکہ وہ اسے تب سے جانتی تھی جب اس نے نو برس پہلے پولیس میں شمولیت اختیار کی تھی جبکہ دوسری جانب وہ ہیکٹر جارج کو صرف چند ہفتوں سے جانتی تھی۔
''واقعی آج رات لوگ گھروں سے باہر ہیں۔'' یوریکا نے کہا۔ ''گاڑیاں چلا رہے ہیں۔''
''اچھی بات ہے۔'' ہیکٹر بولا۔
''کاریں نہیں۔'' یوریکا نے کہا۔ ''ان دنوں کار چلانا خطرناک ہے۔ پیٹرول مہنگا ہے اور کچھ کاریں سیلاب میں بہہ گئی ہیں۔ البتہ ٹرک سڑکوں پر نظر آرہے ہیں۔ کٹ نے دو ٹرک تامیامی والے راستے کی طرف آتے ہوئے دیکھے ہیں۔''
''لیکن کس لیے؟'' وہ بولا۔
''یہاں بھی کبھی کبھی ٹرک آتے رہتے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''یہ نیپلز یا وسطی فلوریڈا سے آتے ہیں لیکن عموماً تاریکی میں سفر نہیں کرتے کیونکہ سڑکیں بہت خراب ہیں۔''
''سڑک پر اسٹریٹ لائٹس تو ہیں۔'' حالانکہ ان میں سے صرف چند ہی کام کررہی تھیں۔ یوریکا کو حیرت ہوئی کہ ہیکٹر نے یہ بات کیسے کہہ دی لیکن فوراً ہی اس کے ذہن میں بھاری سیاہ ٹرکوں کا تصور ابھرنے لگا۔ اس نے اپنے قدم مضبوطی سے سیٹ کر فرش پر جمالیے۔ وہ جانتی تھی کہ ان ٹرکوں کا رنگ پہلے سفید تھا لیکن ان پر سیاہ رنگ کردیا گیا تاکہ رات کی تاریکی کا حصہ بن جائیں۔ وہ یقیناً بڑی آہستگی سے تاریک شہر کی جانب بڑھ رہے ہوں گے اور ان کی رفتار پچیس میل فی گھنٹا سے زیادہ نہ ہوگی۔ سڑک کی حالت کو دیکھتے ہوئے اس سے زیادہ رفتار پر چلانا ممکن نہ تھا۔ انہیں سڑک پر موجود گڑھوں سے بچنے کے لیے بار بار رکنا پڑ رہا ہوگا۔ ان میں سے کئی ایک اس میز سے بھی زیادہ بڑے تھے جس پر وہ اور ہیکٹر بیٹھے ہوئے تھے۔
''میں سوچ رہی ہوں کہ ان ٹرکوں میں کیا چیز ہوسکتی ہے؟'' وہ بولی۔
''منشیات۔'' ہیکٹر نے کہا۔ ''بہت بڑی تعداد میں۔ ان کی مختلف اقسام اور قیمتیں ہیں۔''
''آج کل ان میں سے کئی ایک قانونی ہوچکی ہیں۔ اس لیے کوئی غیر قانونی اشیا کو نہیں پوچھے گا۔''
''پناہ گزینوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟''
''میں نے نہیں سنا کہ کوئی انہیں جنوبی فلوریڈا سے نکالنے کی کوشش کررہا ہے۔''
''ہاں۔ میرا خیال ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو پھر یہ انسانی اسمگلنگ ہوگی۔ لڑکیوں کی تجارت؟''
''کچھ بھی ممکن ہے۔'' یوریکا نے کہا۔ ''لیکن وہ ہمیشہ پرانی وین استعمال کرتے ہیں۔'' ہیکٹر سوچنے لگا کہ بیشتر آبادی محفوظ مقامات پر منتقل ہوچکی ہے اور ان میں سے کوئی بھی واپس لوٹ کر نہیں آیا جس کی وجہ سے وین اور ٹرکوں کے ذریعے تجارت بری طرح متاثر ہوئی ہے۔
اچانک ہی ہیکٹر اپنی جگہ پر کھڑا ہوگیا۔ ایک چھوٹے قد کی دبلی پتلی عورت سفید شرٹ اور سیاہ پینٹ میں ملبوس بار میں داخل ہورہی تھی۔ یوریکا کو معلوم نہیں تھا کہ یہی ہیکٹر کی دوست ہے جب تک کہ اس نے تعارف نہیں کروایا۔ وہ عورت ہیکٹر سے عمر میں بہت بڑی تھی اور نرم یا زخم خوردہ نہیں لگ رہی تھی۔ ہاں بے چین ضرور تھی لیکن اس کا چہرہ کسی ماسک کی طرح ہموار اور مضبوط لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جھیل جیسی گہرائی تھی اور اس نے بالوں کو پیچھے کی طرف مضبوطی سے باندھ رکھا تھا۔ ممکن ہے کہ دوسرے لوگوں کی طرح اس سے بھی کچھ غلطیاں ہوئی ہوں لیکن وہ مصیبت میں مبتلا عورت نہیں تھی۔
سراغ رساں یوریکا نے فوراً ہی فرض کرلیا کہ اس عورت کا جیکٹ والے سے کوئی تعلق ہے گوکہ دونوں بار کی مخالف اطراف میں تھے اور ایک دوسرے کی جانب نہیں دیکھ رہے تھے۔ ان کے علاوہ کوئی بھی اس جگہ ایسے نئے خوب صورت کپڑے نہیں پہنے ہوئے تھا اور شہر کے جو حالات

تھے، ان میں شاید کسی کے لیے یہ ممکن بھی نہیں تھا۔ اگر ان میں سے کسی ایک پر کچھ گزری ہو تو یہ پرانی بات تھی۔

"تم کیسی ہو؟" یوریکا نے پولیس آفیسر کے انداز میں سرہلاتے ہوئے کہا۔

وردی کا اثر مختلف لوگوں پر مختلف طریقوں سے ہوتا ہے گو کہ لولو نے یہ کہا تھا کہ پولیس آفیسر سے وردی میں مل کر اسے تحفظ کا احساس ہوگا لیکن اب وہ اسے بڑی ہوشیاری سے دیکھ رہی تھی جس کا ایک ہی مطلب تھا کہ وہ کوئی معمولی عورت نہیں تھی۔

"میں نے سنا ہے کہ اگر کچھ لوگ تمہارے ساتھ ہیں تو کچھ خلاف بھی ہیں۔" لولو نے کہا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" یوریکا بولی۔ "ایسا ہر جگہ ہوتا ہے۔"

"یہ بہت اہم بات ہے۔"

"میں سمجھ گئی۔" یوریکا بولی۔ "بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کرسکتی ہوں؟"

یہ سن کر لولو کے چہرے پر سختی نمودار ہوگئی۔ وہ بولی۔ "میں جاننا چاہتی ہوں کہ تم ہیکٹر کے بارے میں کیا سوچتی ہو؟"

"میں پہلے ہی تمہیں بتا چکا ہوں کہ اس پر بھروسا کرسکتی ہو۔" ہیکٹر نے کہا۔

"کیا اس بات کا تعلق اس شخص سے ہے جو بار کی دوسری جانب موجود ہے؟" سراغ رساں یوریکا نے پوچھا۔

"میں نہیں جانتی کہ تمہارا اشارہ کس طرف ہے؟" لولو نے بلند آواز میں کہا لیکن اس جانب دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔

یوریکا نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "میں نے ابھی اسے دیکھا ہے۔ وہ بھی تمہاری طرح گھر سے باہر گھوم رہا ہے۔"

"اس نے میرے لیے ڈرنک بھی خریدی۔" ہیکٹر نے کہا۔

"بہت سے لوگ پولیس والوں کے لیے مشروب خریدتے ہیں۔"

ہیکٹر اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا پھر بھی اس نے یوریکا سے کہا۔ "تم اسے بتا کیوں نہیں دیتیں کہ یہ تم پر بھروسا کرسکتی ہے۔"

اس نے مشروب کا گلاس اٹھایا اور چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگا۔ وہ عادی بلانوش نہیں تھا۔

"میں لوگوں کو اس شہر میں جرائم کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔" یوریکا نے اس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ہر کام جرم نہیں ہوتا۔" لولو بولی۔ "حالانکہ میں جانتی ہوں کہ شاید پولیس والوں کو وہ جرم ہی نظر آئے۔"

"شاید۔"

لولو نے اپنی توہین محسوس کی جس کی پرچھائیں اس کے چہرے پر نظر آنے لگی۔

"مجھے یقین نہیں کہ ہم یہاں کوئی بات کرسکیں گے۔" یوریکا نے اپنی رانوں پر ہاتھ مارا اور اٹھنے کی تیاری کرنے لگی۔

"میں تمہاری باس سے تنہائی میں بات کرنا چاہتی ہوں۔" لولو نے ہیکٹر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"میں بار کے عقب میں موجود رہوں گا۔" اس کا اشارہ اس حصے کی جانب تھا جسے مرد ٹوائلٹ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

دونوں عورتیں اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہیں۔ یوریکا نے محسوس کیا کہ سیاہ جیکٹ والا بھی ہیکٹر کو دیکھ رہا تھا۔

"ہیکٹر کا کہنا ہے کہ تم اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتی ہو۔" لولو نے کہا۔

"وہ ایک اچھا افسر ہے۔"

"تمہیں اندازہ نہیں ہے۔ وہ ایک مہربان اور پیارا لڑکا اور محنتی کارکن ہے۔"

"اس کا کہنا ہے کہ تم کسی مشکل میں ہو۔"

"ہاں بھی اور نہیں بھی۔" لولو نے کہا۔ اس نے اپنے بیگ میں سے ایک چھوٹی تھیلی نکالی اور اسے میز پر رکھتے

رازکی باتیں

☆ مرد خواہ کتنا ہی آزاد خیال ہو بیوی ہمیشہ باپردہ اور باحیا ہی پسند کرے گا۔

☆ دوسروں کی مثال دینے سے پہلے سوچ لو کہ آپ کا تذکرہ کس طرح کی مثال میں دیا جاتا ہے۔

☆ جس طرح گھوڑے کی لگام کوچوان کے ہاتھ میں محفوظ ہے، اس طرح جوانی کی لگام والدین کے ہاتھ میں بہتر ہے۔

☆ اگر اپنے لیے محبت تلاش کرنے نکلو گے تو ناکام رہو گے اس لیے خود محبت دینے کی کوشش کرو۔

☆ وقت اور جوانی بڑی تیزی سے گزرتے ہیں اس لیے انہیں اچھے کاموں میں صرف کرو۔

مرسلہ: وزیر محمد خان۔ بٹل ہزارہ

ہوئے بولی۔
''میں تمہیں ایک اور بات بتاتی ہوں جو میں نے سیکھی ہے۔ سب سے بہترین ہتھیار انسان کی اپنی فطرت ہے۔ تم اسے معلوم کر کے اسی کے خلاف استعمال کرسکتی ہو۔ میں ہیکٹر کو بہت کچھ سکھا سکتی تھی لیکن میں نے ایسا نہیں چاہا۔ وہ دوسروں سے بہت مختلف، اسمارٹ اور بہتر ہے۔ اس کے علاوہ وہ ہمیشہ بہت زیادہ پریشان رہتا ہے۔''
''ممکن ہے کہ پریشانی کی کوئی وجہ ہو۔'' یوریکا نے کہا۔
''ہاں۔'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔
''تم کون ہو؟''
''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' یہ کہہ کر اس نے تھیلی الٹ دی اور اس میں سے نصف درجن نوٹوں کی گڈیاں باہر آگئیں جنہیں پیپر بینڈ سے باندھا گیا تھا۔ یہ کسی اسٹور کا کیش نہیں تھا جس میں ایک اور پانچ کے نوٹ ہوتے ہیں بلکہ یہ بالکل نئے بیس بیس کے نوٹ تھے جو بینکوں سے ملتے ہیں گو کہ اب سارا سوتا میں کوئی بینک باقی نہیں بچا تھا لیکن پہلے وہاں کئی بینک تھے۔
''کیا تم چاہتی ہو کہ سب لوگ انہیں دیکھیں؟'' یوریکا نے کہا۔ برابر والی میز پر بیٹھا ہوا جوڑا انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ ڈیٹ پر آئے تھے۔ مرد نے بھی سیاہ جیکٹ پہن رکھی تھی اور اس کی نظریں اسی جانب تھیں۔
''یہ رقم ہیکٹر کے لیے ہے۔'' لولو نے کہا۔ ''اسے بتا دینا کہ یہ تحفوظ ہے۔''
''تحفوظ؟'' یوریکا نے پوچھا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ جائز طریقے سے بھیجی جا رہی ہے؟''
''یقیناً اب تم سمجھ جاؤ کہ میں اس کے لیے کبھی ایسا کام نہیں کروں گی جس سے وہ مشکل میں پڑ جائے۔''
''کم از کم تمہیں اس کو وضاحت تو کرنا ہوگی کہ یہ رقم کس لیے دی جا رہی ہے۔''
''وہ جان جائے گا۔'' یہ کہہ کر وہ کھڑی ہوگئی۔ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ پہلے جانے کے لیے تیار ہو چکی تھی۔ یوریکا اسے پکڑنے کی کوشش کرسکتی تھی لیکن اسے اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ اس سے بہتر تھا کہ وہ رقم کی حفاظت کرتی۔
لولو اس سڑک پر چل دی جو ہیکٹر کی مخالف سمت میں تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے مدھم روشنی میں گم ہوگئی۔ ہیکٹر تقریباً اسی وقت آ گیا اور میز پر پڑی ہوئی رقم دیکھتے ہوئے بولا۔
''یہ کیا ہے؟''
''اس نے کہا ہے کہ وہ تم سے دوبارہ ملے گی۔''
''لیکن یہ رقم؟''
''یہ تمہارے لیے ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ محفوظ ہے۔''
''تحفوظ؟'' ہیکٹر نے اپنے آپ سے کہا۔
''تم دیکھ رہے تھے؟''
''بالکل۔''
یوریکا نے وہ رقم دوبارہ بیگ میں رکھی اور اس دوران میں اس نے کوئی حرکت نہیں کی۔ اس نے بارٹینڈر کی طرف دیکھتے ہوئے سر ہلایا۔ سیاہ جیکٹ والا شخص جا چکا تھا۔
جب وہ بھاری قدموں سے چلتی ہوئی اسکواڈ کار کی طرف واپس آئی تو اس نے چاروں طرف دیکھا لیکن اسے سیاہ جیکٹ والے شخص، لولو یا ہیکٹر کا کوئی نشان نظر نہیں آیا۔ اس نے رقم ثبوت والے شیف میں مقفل کی اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی پھر ہیکٹر کو پیغام بھیج کر اس کا انتظار کرنے لگی۔ اگر ہیکٹر نہ آتا تب بھی وہ ان ٹرکوں کو دیکھنے ضرور جاتی۔
وہ ٹرک دور سے ہی بڑے دکھائی دے رہے تھے اور وہ محسوس کرسکتی تھی کہ ان میں کوئی غیر معمولی چیز ہے۔ اس خفیہ سامان کا تصور کرتے ہی اس کے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔
اس نے اپنی گاڑی سڑک کے دائیں جانب کھڑی کی۔ ہوٹل کے گرے ہوئے سائن بورڈ کی وجہ سے وہ کسی حد تک نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی۔ اس کے لیے آسان تھا کہ وہ سڑک پر گاڑی چلاتے ہوئے ٹرکوں کے کسی قافلے کا تعاقب کرتی لیکن لگتا تھا کہ وہ ایسا نہیں کرے گی۔ سڑک پر چند گاڑیاں نظر آ رہی تھیں اور وہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے انہیں نظر آ جاتی۔ شاید وہ ٹرکوں کا تعاقب کرنے کے بجائے انہیں کسی جگہ روک لیتی لیکن اس کے پاس وارنٹ نہیں تھا بلکہ جائز یا ناجائز شک بھی نہیں۔ یہ بڑی دلچسپ بات تھی کہ اس کے ذہن میں ان ٹرکوں کی ایسی تصویر بن رہی تھی جو اس نے کبھی نہیں دیکھے۔
پھر اسے ہیکٹر جارج اور لولو کی طرف سے دیے گئے ناقابلِ فہم تحفے کا خیال آیا جو وہ اس کے لیے لائی تھی۔ اس کے ذہن میں اور بھی کئی باتیں گھوم رہی تھیں اور یہ تاثر پختہ ہو رہا تھا کہ اس رات میں ہونے والے واقعات اور ٹرکوں کے درمیان کوئی تعلق ہے۔ اگر ہیکٹر کسی جائز کاروبار میں حصہ دار ہوتا تو وہ یوریکا کو ضرور بتاتا...... تو کیا وہ کوئی غلط کام کر رہا تھا؟ یہ تصور ہی مضحکہ خیز تھا لیکن اسے مسترد کرنا ممکن نہیں تھا۔
وہ ٹرک اس کی چھاتی پر ایک بوجھ کے مانند تھے۔

اس نے اپنا کورفون نکالا، وہ جاننا چاہتی تھی کہ انہیں پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا۔ کٹ نے پیغام کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ وہ جلد آنے والے ہیں۔

اسے یقین نہیں تھا کہ ہیکٹر ان ٹرکوں پر لدے ہوئے سامان کے بارے میں جانتا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ ان میں منشیات، پناہ گزین یا لڑکیاں ہوسکتی ہیں۔ یہ بات اس نے اپنے اندازے کی بنیاد پر کہی تھی شاید۔ اس میں اس کے تجربے کا کوئی دخل نہیں تھا۔

تبھی ہیکٹر اس کے برابر والی نشست پر آ کر بیٹھ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ دروازہ اندر سے بند ہو تو اسے کس طرح کھولا جاتا ہے۔

''کچھ معلوم ہوا؟'' یوریکا نے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''وہ عورت کون ہے؟''

''میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں تمہیں بتاتی ہوں۔ تم اس سے گزشتہ شب نہیں ملے تھے بلکہ ایک طویل عرصے سے اسے جانتے ہو۔ ممکن ہے کہ یہ کوئی ایسی عورت ہے جس نے ماں کے مرنے کے بعد تمہاری دیکھ بھال کی ہو۔ بہن، آنٹی، کزن یا فیملی فرینڈ کے طور پر۔''

اب وہ کار کے دروازے پر انگلیوں سے ڈرم بجا رہا تھا پھر اس نے کہا۔ ''میں اس کا ہر احسان مانتا ہوں۔ ہاں وہ میری بہن ہے۔ وہ کبھی ایک عام لڑکی ہوا کرتی تھی۔ کیک بناتی اور گٹار پر لوک دھنیں سنا کرتی تھی۔ وہ مجھ سے عمر میں بہت زیادہ ہونے کے باوجود کسی بھی دوسری لڑکی کی طرح احمق تھی پھر اچانک ہماری ماں کا انتقال ہوگیا اور لولو نے ہی ہر بات کا خیال رکھا۔ اس سے بڑھ کر اسے ہماری حفاظت کرنا تھی، ورنہ ہم زندہ نہ رہتے صرف یہی نہیں اس نے کوشش کی بلکہ اس نے اپنا ذہن بنایا کہ اسے ہر قیمت پر یہ کرنا ہے۔ چاہے اس کے لیے کچھ بھی کرنا پڑے اور اس نے ایسا ہی کر کے دکھایا۔ حالات واقعی بہت سخت تھے لیکن اس نے ان کا مقابلہ کیا اور اس کے لیے اسے کچھ خطرناک کام بھی کرنا پڑے۔''

''کیا وہ گزشتہ رات ہی مون بار پر آئی تھی؟''

''میں نے ہی اس سے وہاں ملنے کے لیے کہا تھا۔ اس نے مجھے پیغام بھیجا تھا کہ وہ شہر میں ہے۔''

''وہ رقم کہاں سے آئی؟''

''کیا وہ اب بھی تمہارے پاس ہے؟''

''ہاں۔''

''کیا میں اسے دوبارہ دیکھ سکتا ہوں۔ میں نے اس سے پہلے کبھی اتنی رقم نہیں دیکھی۔''

''اس کا کہنا ہے کہ تم اس رقم کے بارے میں جانتے ہو۔''

''اس نے ہمیشہ مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ میرے لیے کچھ کرے گی لیکن اسے کبھی موقع ہی نہیں ملا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ اسی بارے میں بات کر رہی تھی لیکن اس کا خیال تھا کہ میرا پولیس آفیسر بننا بڑی بات ہے۔ وہ اس میں بہت دلچسپی لے رہی تھی اور اس نے اس بارے میں بہت سے سوالات بھی کیے۔'' وہ کچھ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''وہ عام نوعیت کے سوالات تھے۔ میں نے اسے کوئی ایسی بات نہیں بتائی جو نہیں بتانی چاہیے تھی۔''

یوریکا نے ناگواری سے سر ہلایا۔

''اس طرح کی ملازمت حاصل کرنا ایک معجزہ ہے اور وہ یہ بات جانتی ہے۔'' ہیکٹر نے وضاحت کی۔ ''اب تو معمولی ملازمت بھی نہیں ملتی۔''

''کیا واقعی اس نے تم سے یہ کہا تھا کہ وہ کسی مشکل میں ہے؟'' یوریکا نے پوچھا۔

''ہاں۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ کیا مسئلہ ہے لیکن میرا اندازہ ہے کہ اس کا تعلق اس کے نئے دوست سے ہے۔ اس کا نام البرٹ ہے اور میرے میامی چھوڑنے کی یہی وجہ ہے۔ طوفان کی وجہ سے مجھے نکلنے کا بہانہ مل گیا۔''

''تمہیں اس سے کیا شکایت تھی؟'' یوریکا نے پوچھا۔

''وہ ایک کاروباری شخص ہے۔ لولو نے قسم کھا کر بتایا کہ اس کا کاروبار قانونی ہے۔ آہستہ آہستہ باتیں کھلنے لگیں۔ بالآخر اس نے مجھے اس کے بارے میں بہت کچھ بتا دیا۔ وہ لوگوں سے غیر قانونی کام کرواتا اور انہیں کم معاوضہ دیتا۔ انہیں ناقص خوراک دی جاتی اور اس کے پیسے بھی ان کی تنخواہ سے کاٹ لیتا۔''

''کیا وہ میامی میں رہتا ہے؟''

''ہاں لیکن تم جانتے ہو کہ اس کا وہاں رہنا کتنا برا ہے۔ اس نے سب کو خرید لیا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ کیسا کاروبار ہے جس میں اپنے کارکنوں کو اچھی تنخواہ دینے کے بجائے سیاست والوں کے ایک گروہ کو خرید لیا جائے۔''

''تم سمجھتے ہو کہ بار کے سرے پر سیاہ جیکٹ میں ملبوس شخص وہی ہوسکتا ہے؟''

''میرا یہی خیال ہے۔'' ہیکٹر نے کہا۔ ''غالباً میں نے کبھی میامی میں اس کی شکل غور سے نہیں دیکھی۔ شروع

مس لولو اس سے ڈیٹنگ کر کے بہت پُرجوش تھی۔ اس نے بتایا کہ مجھے اس سے کتنا فائدہ ہوگا۔ اس کے پاس اتنا پیسا ہے کہ وہ مجھے کالج بھیج سکتا ہے' جب اسے اس کے بارے میں مزید معلوم ہوا تو وہ مجھے اس سے دور رکھنے کے بہانے تلاش کرنے لگی لیکن اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اسے اس کی دولت کا مزہ لگ گیا تھا۔"

"تمہیں کوئی اندازہ نہیں کہ یہ پیسا کہاں سے آیا؟"

"یہ لولو کا پیسا نہیں ہے۔" ہیکٹر نے کہا۔ "اس کے پاس کچھ نہیں۔ یہ البرٹ کی رقم ہے۔"

"یقیناً ایسا ہی لگتا ہے۔" یوریکا نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن لولو جانتی تھی کہ وہ بار میں موجود ہے، ورنہ وہ اس سمت میں ضرور دیکھتی جب میں نے اس کے بارے میں پوچھا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اسے رقم دیتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ لگتا یہی ہے کہ اس نے یہ سب ایک منصوبے کے تحت کیا ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیوں؟"

"میں نہیں جانتا لیکن تمہیں سمجھ لینا چاہیے کہ لولو بری عورت نہیں ہے۔ اس نے یہ رقم کہیں سے نہیں چرائی۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے یہ کام کرنے کے لیے کوئی خوفناک حرکت نہیں کی ہوگی۔"

یوریکا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ "اور میں نے بھی کچھ نہیں کیا۔" ہیکٹر مشتعل ہوتے ہوئے بولا۔ "میں تو کبھی اس شخص سے ملا بھی نہیں۔ وہ ایک بار گھر آیا تھا لیکن لولو نے اسے اندر نہیں آنے دیا۔"

"گویا وہ تمہیں نہیں پہچان سکتا؟"

"میں ایسا نہیں سمجھتا۔ میں نے اس کی جھلک دیکھی ہے لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں، اس نے کبھی مجھے نہیں دیکھا۔"

"گویا ہم اس کے لیے صرف پولیس والے ہیں۔"

"ہاں بالکل۔ صرف پولیس والے۔" اس نے دہراتے ہوئے کہا۔

اس کی کار کے عقبی شیشے میں ایک ٹرک نمودار ہوا جو اس کے تصور سے بھی بڑا تھا۔ اس کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں۔

"ٹرک یہاں پہنچ گئے۔" یوریکا نے کہا۔

"ٹرک۔" ہیکٹر چونکتے ہوئے بولا جیسے وہ انہیں بھول چکا ہو۔ اس نے اپنی نشست پر بیٹھے بیٹھے گردن گھما کر پیچھے آنے والے ٹرک کو دیکھا جو کچھ فاصلے پر تھا۔

"لولو کہتی ہے کہ کسی سے لڑنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کی فطرت کو اسی کے خلاف استعمال کرو۔" یوریکا نے کہا۔

"اس نے مجھے بتایا تھا کہ کسی لالچی شخص کو بے وقوف بنانا آسان ہے لیکن میں ذاتی طور پر کسی لالچی انسان کو نہیں جانتا۔"

یوریکا نے کئی برسوں میں پہلی بار اپنی اسکواڈ کار کا سائرن اور چھت پر لگی ہوئی لائٹ آن کی اور بولی۔ "اب ہم انہیں ہائے، کہنے والے ہیں۔"

پہلا ٹرک ابھی اتنے فاصلے پر تھا کہ وہ اس کا راستہ روکنے کے لیے آسانی سے اپنی کار کو نوے درجے کے زاویے پر گھما سکتی تھی۔ وہ اور ہیکٹر جلدی سے اترے اور کار کے دونوں طرف کھڑے ہو گئے۔ ٹرک ڈرائیور شاید کار کے قریب آ کر رک جاتا لیکن وہ کبھی سڑک سے نیچے نہ اترتا جو کافی خطرناک تھا۔

جیسے ہی ٹرک قریب آیا تو یوریکا نے بریکوں کی آواز سنی۔ دونوں پولیس والے پیچھے کی طرف ہٹے لیکن ٹرک ان کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ بالآخر وہ اسکواڈ کار سے چند گز کے فاصلے پر رک گیا۔ وہ خطرناک حد تک قریب آ چکا تھا اور اگر ڈرائیور سے تھوڑی سی دیر ہو جاتی تو اس کا کار سے ٹکرانا یقینی تھا۔

"دوسرے ٹرک پر بھی نظر رکھو۔" اس نے ہیکٹر سے کہا حالانکہ وہ ابھی تک نظر نہیں آیا تھا۔

ٹرک ڈرائیور نے تھوڑا سا دروازہ کھولا جیسے وہ کسی ٹریفک سگنل پر رکا ہو۔ اس نے ڈرائیور سے لائسنس مانگا اور دیکھ کر واپس کر دیا۔

"ہم صرف تمہاری حفاظت کے لیے چیکنگ کر رہے ہیں۔" اس نے ڈرائیور سے کہا۔ "میں پچھلا حصہ بھی دیکھنا چاہوں گی۔"

ڈرائیور نے نیچے اترتے وقت انجن بند نہیں کیا۔ شاید اسے احساس تھا کہ وہ اسے دوبارہ اسٹارٹ نہیں کر سکے گا۔ سیلاب سے ٹرک کو بھی نقصان پہنچا تھا اور اس کے کچھ حصے زنگ آلود ہو چکے تھے۔

ڈرائیور نے کچھ کہے بغیر پیچھے کا دروازہ کھول دیا لیکن اندر کی لائٹس خودکار طریقے سے آن نہ ہو سکیں۔ شاید وہ خراب ہو چکی تھیں۔ یوریکا نے ٹارچ کی مدد سے ایک آلہ دریافت کیا جو چینی صاف کرنے کے کام آتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک بڑی مشین رکھی ہوئی تھی جسے چاپر کہا جاتا ہے اور یہ گنے کے کھیتوں میں کٹائی کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ وہاں اور بھی کئی دھاتی اشیا رکھی ہوئی تھیں۔ پچھلے حصے میں بڑی عجلت میں سامان رکھا گیا تھا۔ تمام آلات کو تیل لگانے اور صفائی کی ضرورت تھی، ورنہ نمک کی وجہ سے سب خراب

ہوجاتے۔

جارج ..... دوسرے ٹرک کا معائنہ کررہا تھا۔ اس میں نسبتاً زیادہ سامان اور چینی کے ڈبوں کا ڈھیر تھا جو خراب ہونے سے بچ گیا تھا۔ ان ڈبوں کا گتا خراب ہونے کے باوجود خشک تھا۔

''ہم اس بات کو یقینی بنائیں گے کہ تم شہر سے... بہ حفاظت گزر جاؤ۔'' سراغ رساں یوریکا نے کہا۔

جب وہ واپس اپنی کار میں آئے تو ہیکٹر نے سکون کا سانس لیا۔ یوریکا اس سے متفق نہیں تھی۔ اس کی بے چینی کم نہیں ہوئی تھی اور اس کے ذہن میں شک سر ابھار رہا تھا۔ نہ جانے اس کے دماغ میں یہ بات کیوں بیٹھ گئی تھی کہ گتے کے ڈبوں میں چینی کے علاوہ بھی کچھ تھا۔

''وہ روانہ ہو رہے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''ساری چینی خراب ہو چکی ہے۔ اسے خشک کر کے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ سیلابی پانی میں موجود نمک نے اسے زہریلا کر دیا ہے۔''

''البرٹ یقیناً شمال کی طرف جا رہا ہوگا۔'' ہیکٹر نے کہا۔

ٹرک اسٹارٹ ہو چکے تھے۔ یوریکا نے اپنی کار ایک طرف کر کے انہیں راستہ دے دیا اور ان کے پیچھے چل پڑی۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لولو نے البرٹ میں کیا خوبی دیکھی کہ ایک بار پھر اس کے لیے کام کرنے پر تیار ہوگئی۔'' یوریکا نے پوچھا۔

''لالچ...... لیکن البرٹ جیسے آدمی کو کسی جعلی سودے کے ذریعے بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا۔''

''لالچ کی بھوک کبھی ختم نہیں ہوتی اور لالچی شخص دوسروں کو بھی ایسا ہی سمجھتا ہے۔ اس نے سوچا ہوگا کہ ہم بھی لالچی ہیں۔''

''کیا لطیفہ ہے۔'' ہیکٹر نے کہا۔ ''لیکن میں تمہاری بات سمجھ گیا۔ اس نے البرٹ کو بتایا ہوگا کہ وہ ہمیں رشوت دے رہی ہے۔''

''وہ ضرور یہی سوچ کر گزشتہ شب آئی تھی اور اس نے بڑی ہوشیاری سے منصوبہ بنایا۔ شاید تم رقم لینے سے انکار کر دیتے۔ اس کے لیے اس نے مجھے استعمال کیا۔ اسے احساس تھا کہ البرٹ اس رقم کو بطور تحفہ دینے پر رضامند نہیں ہوگا لیکن کاروبار کی قیمت ادا کرنے پر تیار ہوگیا۔''

آگے جانے والے ٹرکوں کی رفتار کم ہونا شروع ہوگئی تھی۔

''لولو نے مجھ سے ٹریفک کے بارے میں کچھ سوالات کیے تھے۔'' ہیکٹر نے کہا۔ ''مجھے جان لینا چاہیے تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔''

''اس نے ضرور البرٹ سے کہا ہوگا کہ ان ٹرکوں کو شہر سے گزرنے کا محفوظ راستہ دینے کے لیے اسے کچھ دینا ہوگا۔ وہ جانتی تھی کہ ہم انہیں ہراساں نہیں کریں گے۔ اسے امید تھی کہ ٹرک بہ حفاظت گزر جائے گا لیکن پھر مجھے تجسس ہوا۔ میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔ میں انہیں شہر سے گزرنے کا محفوظ راستہ دے رہی تھی کیونکہ انہوں نے اسی مقصد کے لیے ادائیگی کی تھی۔''

آگے جانے والے دونوں ٹرک ویران ائرپورٹ کے موڑ پر رک گئے۔ تاریکی میں سے دو سائے نمودار ہوئے۔ ان میں ایک بھاری جسامت اور دوسرا دبلا پتلا تھا۔ چاند کی روشنی میں دونوں کی سفید قمیصیں نظر آ رہی تھیں۔ بھاری جسامت والے نے جیکٹ پہن رکھی تھی۔

ہیکٹر نے سوالیہ نظروں سے یوریکا کو دیکھا تو جواب میں اس نے سر ہلا دیا۔ انہوں نے چھوٹے سائے کو ٹرک کے اگلے حصے میں سوار ہوتے دیکھا۔ دوسرے نے بھی اس کی تقلید کی۔ یوریکا نہیں جانتی تھی کہ اس نے ذرا دیر پہلے جو فیصلہ کیا تھا وہ صحیح تھا یا غلط اور کیا آگے چل کر وہ اس کے لیے مددگار ثابت ہوگا۔ لولو شاید سوچ رہی ہوگی کہ اس نے اپنے بوائے فرینڈ پر احسان کیا ہے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس نے ہیکٹر کے لیے رقم وصول کر کے غلطی کی۔ کئی لوگوں نے اسے دیکھا ہوگا۔ اس کی ساکھ متاثر ہو سکتی تھی۔

ٹرک دوبارہ اسٹارٹ ہوئے اور انہوں نے ائرپورٹ کا موڑ کاٹ کر شمال کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ یوریکا وہیں کھڑی رہی۔

''تم اس رقم کا کیا کرو گی؟'' ہیکٹر نے پوچھا۔

''وہ رقم میری نہیں تمہاری ہے۔'' یوریکا نے کہا۔ ''اسے پولیس اسٹیشن پر رکھنا، جہاں وہ محفوظ رہے گی۔ وقت آنے پر تم جان جاؤ گے کہ اس کا کیا کرنا ہے۔''

ہیکٹر نے اپنا سر نشست کی پشت سے ٹکا دیا اور جھکے ہوئے انداز میں بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ میں نے لولو کو ہاتھ ہلاتے ہوئے دیکھا تھا۔''

یوریکا نے تائید کی۔ ''میں نے بھی۔'' ''لیکن اس نے ہیکٹر کو یہ نہیں بتایا کہ اس نے صرف شہر سے گزرنے کا محفوظ راستہ دیا تھا۔ اس سے آگے کی ذمے داری اس کی نہیں تھی۔ آگے کٹ ان ٹرکوں کے استقبال کے لیے موجود ہوگا جسے وہ ہیکٹر کی نظر بچا کر ٹیلی فون پر اطلاع دے چکی تھی۔ چینی کی آڑ میں منشیات کی اسمگلنگ کوئی معمولی جرم تو نہیں تھا۔

قدم قدم پر شکست کھانے والی دوشیزہ کی حیران کن فتح......ٹوٹے ہوئے
دل سے بکھرے ہوئے رشتوں کو جوڑنے والی حسینہ کی پرفکر داستان

شکست کی فتح

طاہر جاوید مغل

دوسرا اور آخری حصہ

زندگی کی بساط پر ایک ایسا اسرار چھپا ہے جسے کوئی چاہے یا نہ چاہے... کھیلنے پر مجبور ہوتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کھلاڑی منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں اور اناڑی بازی مات کرلیتے ہیں... یہ بھی ایک ایسی اسرار بھری گرہ ہے جسے شاید کھولنا آسان نہیں۔ جو جتنا بڑا بے ایمان... اتنا ہی بڑا فنکار۔ وہ بھی اپنے پرائیوں کے درمیان دوڑتے دوڑتے ہار گئی... اگرچہ انسان کے تصورات اور بلند خیالات کی کوئی انتہا نہیں ہوتی مگر... معاشرے میں رہنے اور ماحول سے مطابقت رکھنے کے لیے کچھ حدود و قیود کا نفاذ ازحد ضروری ہوتا ہے البتہ... حدود اور قید میں کچھ فرق بھی ہونا ضروری ہے ورنہ انسان پنجرے میں قید طائر کے مانند بے بسی کا شکار ہوکر رہ جاتا ہے۔ اس نے بھی اپنے ماحول سے بغاوت کی جسارت کرڈالی اور بلند پرواز کی خواہش میں اپنے مسکن سے جدا ہوگئی... لیکن یہ عارضی جدائی نہ صرف اسے بلکہ اس کے خون کے رشتوں کو بھی زندگی کی باریکیاں سمجھاگئی کہ ہر ایک کی زندگی کا مقصد جدا اور انفرادی ہوتا ہے جسے ہر حال میں اسے پورا کرنا ہوتا ہے... چاہے کوئی مانے نہ مانے اسے حق دینا پڑتا ہے اور جب کوئی نہ دے تو چھین لینے کی جسارت بھی ضروری ہے کیونکہ حق کے لیے اڑ جانا بغاوت نہیں سعادت ہے۔

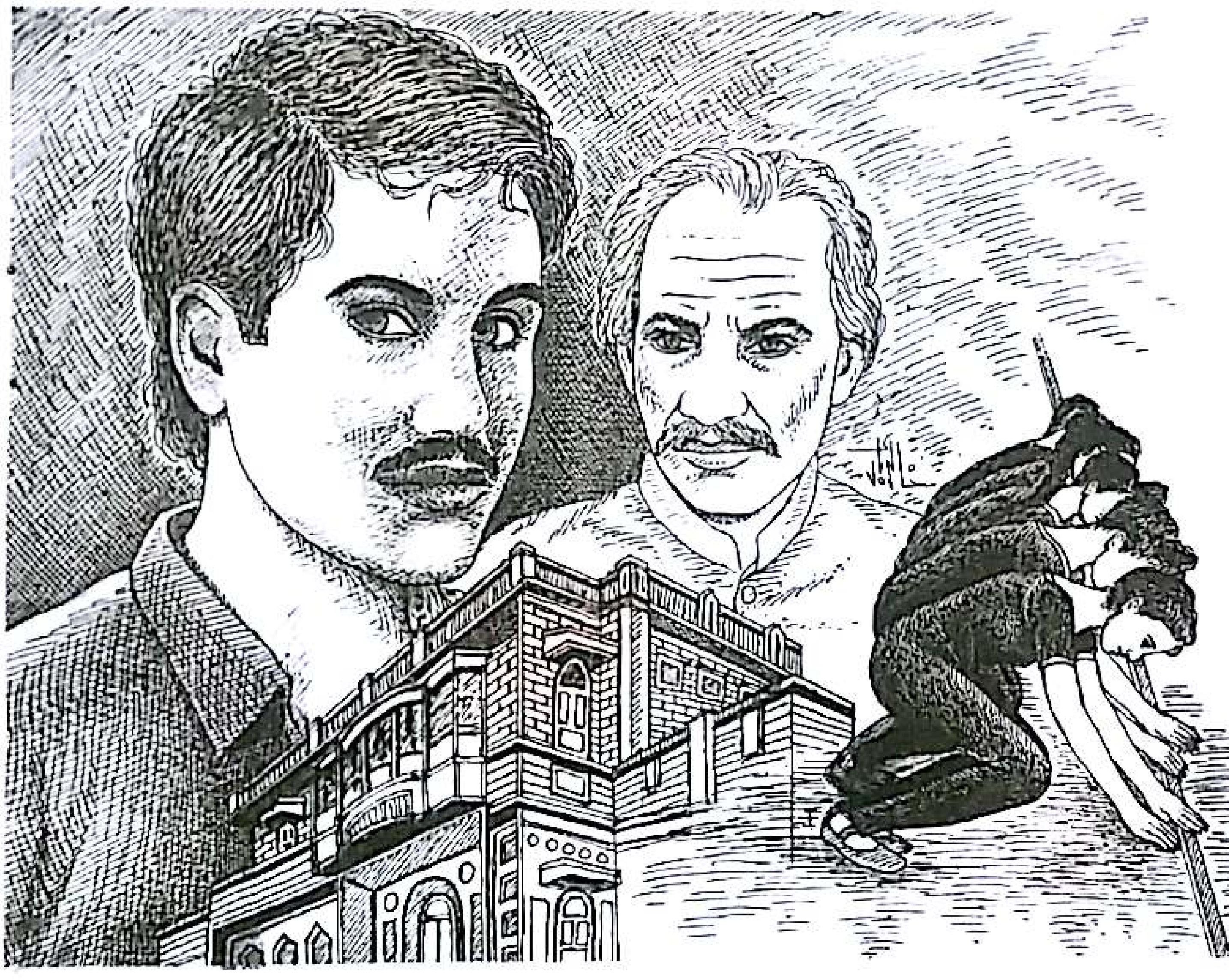

وہ اپنی فٹنس کے حوالے سے مطمئن نہیں تھی مگر اپنی ہیڈ کوچ میڈم فرحانہ کو بتا بھی نہیں رہی تھی۔ اسے اندیشہ تھا کہ اگر اس نے اس حوالے سے میڈم فرحانہ سے تفصیلاً بات کی تو ہوسکتا ہے کہ معاملہ خراب ہوجائے۔ نتیجہ یہ نکلے کہ اسے ایونٹ میں حصہ لینے سے ہی روک دیا جائے۔ وہ فٹنس حاصل کرنے کی پوری کوشش کررہی تھی اور ساتھ ساتھ شب و روز دعا گو بھی تھی۔

بالآخر فیصلے کا دن آن پہنچا۔ توقع کے عین مطابق ٹاپ کی پانچ چھ اسپرنٹرز آسانی سے فائنل تک پہنچ گئیں۔ ان میں نشو بجلی، نور اور ایچی سن کالج کی ارم بھی شامل تھیں۔ ہر کسی کو فائنل ریس کا نہایت شدت سے انتظار تھا۔ اسٹیڈیم تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کیمروں کی فلیش لائٹس چمک رہی تھیں۔ ٹی وی کیمرے اور عام ویڈیو کیمرے بھی چکراتے دکھائی دے رہے تھے۔ دل دھڑک رہے تھے اور سانسوں کے زیروبم میں تیزی آچکی تھی۔ اس کے کزن مہرین، شرجیل، عثمان وغیرہ بھی یہاں موجود تھے...... اور تایا جان کی موجودگی تو ہمیشہ لازمی ہوتی تھی۔ ہاں، بسمہ اس دفعہ نہیں آسکی تھی لیکن یقیناً وہ بھی کہیں نہ کہیں ٹی وی کے سامنے موجود تھی۔

رنرز نے ٹریک پر پوزیشن لی۔ اپنے پاؤں فٹ بلاکس پر جمائے۔ آگے جھک کر اسٹارٹنگ لائن کو چھوا اور فائر ہوتے ہی اپنے سپنوں کی تعبیر کی طرف دوڑے۔ ان لمحوں میں نور نے اپنے فٹنس کے پرابلم کو قطعی طور پر ذہن سے نکال باہر کیا تھا۔ بس ایک ہی بات اس کے ذہن میں تھی، اس نے جیتنا ہے اور ہر صورت جیتنا ہے۔ اس نے اپنی اس حریف کو نیچا دکھانا ہے جس نے اسے ہرانے کے لیے بدترین حربے اختیار کیے۔ وہ اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کا بدلہ اس لڑکی سے قانونی طور پر نہیں لے سکتی تھی مگر کھیل کے میدان میں تو لے سکتی ہے اور وہ ضرور لے گی......
ایک دوسرا تصور جو اس کے حوصلے کو مہمیز کررہا تھا، وہ اس کے تایا ابا کا تصور تھا۔ انہوں نے بہت انتظار کیا تھا۔ آج وہ ان کی آنکھوں میں خوشی کی چمک دیکھنا چاہتی تھی...... خوشی اور فتح کی چمک۔

وہ فٹ بلاکس کو دھکیلتے ہوئے دوڑی اور اپنی تمام تر ذہنی و جسمانی توانائیاں صرف کردیں۔ وہ آغاز میں ہی دفاعی چیمپئن نشو سے تین چار فٹ آگے نکل گئی...... نشو نے چالیس میٹر طے کرنے کے بعد پورا زور لگایا اور نور کے برابر آگئی۔ وہ آج پھر آگے بڑھنا چاہتی تھی مگر آج نور نے تہیہ کیا ہوا تھا کہ اپنی لیڈ برقرار رکھے گی۔ تماشائیوں کے شور سے پورا اسٹیڈیم گونج رہا تھا...... اور پھر یکایک زمین و آسمان نور کی نگاہوں میں گھوم گئے۔ اس کے پاؤں زمین پر نہیں تھے۔ اس کے ایک گھٹنے میں ایسی شدید ٹیس اٹھی تھی جیسے کسی نے ٹانگ میں دہکا ہوا نیزہ اتار دیا ہو پھر شاید وہ ایک دو نہیں کئی پلٹیاں کھا گئی تھی۔ وہ فنش لائن سے پچیس تیس میٹر پہلے ہی گرچکی تھی۔ کئی سیکنڈ تک تو اسے پتا ہی نہیں چلا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ دل و دماغ یقین نہیں کر پا رہے تھے مگر نگاہوں کو کیسے جھٹلایا جاسکتا ہے۔ وہ اسپرنٹرز کو عقب سے دیکھ رہی تھی۔ وہ فنش لائن پار کرچکی تھیں۔ نشو بجلی کے دونوں بازو بے ساختہ فضا میں اٹھ گئے تھے۔ وہ اپنے بازوؤں اور اپنی انگلیوں سے وکٹری کا نشان بنا رہی تھی۔ بھاگتی چلی جارہی تھی جیسے ہواؤں میں اڑ رہی ہو۔

نور اپنی جگہ پڑی رہی، وہ کیسے اٹھتی؟ مُردے بھی کہیں اٹھتے ہیں۔ ان لمحوں میں وہ مُردہ ہی تو تھی۔ انتظامیہ کے چند مرد و زن اس کی طرف لپکے۔ فی میل ورکرز نے اسے بازوؤں سے تھام کر اٹھایا۔ وہ ایک ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح تھی۔ وہیں ٹریک پر بیٹھی رہی۔ اس کی کہنیاں اور گھٹنے بری طرح چھل گئے تھے۔ ان میں آگ بھری ہوئی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور سر اپنے گھٹنوں میں گھسیڑ لیا۔ وہ کچھ دیکھنا نہیں چاہتی تھی، کچھ سننا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے سنا تھا کہ آسمان لوگوں کو نگل لیتا ہے، یا زمین پھٹ جاتی ہے اور وہ اس میں سما جاتے ہیں۔ شاید وہ بھی کسی ایسی ہی انہونی کی منتظر تھی۔ اس وقت جس منظر کی دید کا خوف اسے سب سے زیادہ ''ہانٹ'' کررہا تھا، وہ تایا جان کے ہلدی رنگ چہرے کا منظر تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں مزید مضبوطی سے بھینچ لیں۔

☆☆☆

صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے، محنت کا صلہ ملتا ہے۔ عمل پیہم رائگاں نہیں جاتا...... کہاں تھے ان محاوروں کے خالق، کیوں بنائے گئے یہ محاورے؟ کیوں شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں نے امید کی شان میں قصیدے کہے اور اسے زندگی کی بقا کی بنیاد قرار دیا۔ وہ رات دن سوچتی تھی اور سوچتی چلی جارہی تھی۔ وہ ایک بار پھر کمرے میں بند ہوگئی تھی، نہ کسی سے مل رہی تھی، نہ کسی کی بات سن رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے تین دن گزرنے کے باوجود تایا جان کا سامنا بھی نہیں کیا تھا۔ اتنے میں دروازہ کھٹکھٹایا گیا پھر مہرین

کی مدھم آواز ابھری۔ ''دروازہ کھولو نور! یہ ٹھیک بات نہیں۔ کیوں بھوکوں مرنا چاہتی ہو؟''

''نہیں مروں گی بھوکی۔'' وہ چڑچڑے انداز میں بولی۔ ''بسکٹ ہیں اندر اور دودھ بھی ہے فریج میں۔ جاؤ تم۔ میں کھالوں گی۔''

''لیکن یہ کیا بیوقوفی ہے نور! تم تو تماشا بنا رہی ہو اپنے آپ کو۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب اپنے حواس ٹھکانے پر کرو۔ اگر گھٹنے کا مسئلہ زیادہ ہے تو اس کو بھی ٹریٹ منٹ کی فوری ضرورت ہے۔''

''نہیں...... ٹھیک ہے گھٹنا میرا۔'' وہ لہجے کی تلخی کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''دیکھو نور! تمہیں ابا جان کے سامنے جاتے ہوئے اچھا نہیں لگ رہا نا؟ لیکن وہ تو کل شام ہی چنیوٹ چلے گئے تھے۔'' (ابا جان سے مہرین کی مراد اپنے ابا جان تھے)۔

''گھر میں اور کون ہے؟'' نور نے مری مری آواز میں پوچھا۔

''بس میں اور امی۔ وہ بھی بازار گئی ہیں۔''

کچھ دیر سوچنے کے بعد نور نے ایک لمبی سانس لی اور دروازہ کھول دیا۔ مہرین اندر آ گئی۔ نور جیسے سسک کر اس کے گلے سے لگ گئی۔ وہ رونا چاہتی تھی مگر آنسوؤں کے بغیر کیسے رویا جا سکتا ہے؟

''کوئی بات نہیں نور۔ ہر کام میں اللہ کی بہتری ہوتی ہے۔ تم نے کوشش تو پوری کی۔ کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اب جو اللہ کو منظور۔ کل ابا جی بھی یہی بات کہہ رہے تھے۔'' وہ نور کو دلاسا دینے لگی۔

نور بالکل بجھ سی گئی تھی۔ کوئی دلاسا کام نہیں کر رہا تھا۔ وہ کہیں چلے جانا چاہتی تھی۔ کچھ دنوں کے لیے ہر ایک سے دور ہو جانا چاہتی تھی...... مگر کہاں جاتی؟

اچانک اس کی نگاہ خدیجہ پر پڑی۔ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی۔ یقیناً نور کو حوصلہ تسلی دینے کے لیے ہی آئی تھی۔ نور کے قدم جیسے بے ساختہ خدیجہ کی طرف اٹھ گئے۔ اس سے بات کر کے نور کو بہت اچھا لگا کرتا تھا مگر پھر یکایک وہ ٹھٹک سی گئی۔ اسے خدیجہ کے ساتھ اس گھر میں اپنی آخری ملاقات یاد آ گئی تھی۔ خدیجہ کا بھائی اس کے ساتھ آیا تھا اور وہ قاری ذوالقرنین تھا۔ ذوالقرنین کا خیال آتے ہی نور کے اندر کچھ بجھ سا گیا۔ خدیجہ کے حوالے سے اس کی ساری چاہت ایک دم گھٹ گئی۔ وہ دھیمے قدموں سے خدیجہ کے پاس پہنچی اور عام سے انداز میں اس سے ملی۔

خدیجہ بے حد سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ نور کو اندازہ ہو گیا کہ وہ کافی دیر سے یہاں مہرین کے پاس موجود تھی اور دونوں میں نور کی چوٹ وغیرہ کے حوالے سے تفصیلی بات ہوتی رہی ہے۔ نور کو مہرین پر تھوڑا سا غصہ بھی آیا کہ اس نے کیوں خدیجہ سے اس معاملے پر بات کی مگر پھر یہ سوچ کر اسے اپنا غصہ ماند پڑتا محسوس ہوا کہ اس کی ہار کی وجہ اور اس کی چوٹ کے بارے میں تو اب ہر کسی کو معلوم ہو چکا ہوگا اور پھر جب سب کو معلوم ہو چکا ہے تو خدیجہ کو بھی سہی۔

رسمی کلمات کے بعد خدیجہ نے کہا۔ ''میں کل کے اخبار میں تمہارے بارے میں پڑھ رہی تھی۔ ڈاکٹر رضوان کا مختصر انٹرویو تھا۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ تمہارے گھٹنے کی چوٹ سے آگاہ تھے اور انہوں نے تمہیں اور تمہاری ہیڈ کوچ کو مشورہ بھی دیا تھا کہ تمہارا ایونٹ میں حصہ نہ لینا بہتر ہے۔''

''لیکن میں کچھ بہتر محسوس کرنے لگی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میں یہ کر سکتی ہوں مگر جو میری قسمت میں تھا۔''

''میں سمجھتی ہوں نور کہ جو تمہاری قسمت میں تھا وہ تمہیں نہیں ملنے دیا گیا اور اس کی قصوروار صرف نشو ہے۔ وہ مدت سے تمہارے پیچھے پڑی ہوئی تھی اور آخر اپنا کام دکھا گئی۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ سارے ثبوت ہونے کے باوجود ہم اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکے...... اور اس لیے نہیں بگاڑ سکے کہ وہ بڑے باپ کی بیٹی ہے۔ وہ طاقتور لوگ ہیں۔ کوئی باہر کا ملک ہوتا تو تمہارا کیریئر داؤ پر لگانے والی اس خبیث کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے کر دیا جاتا۔''

''چھوڑیں خدیجہ! خود کو پریشان نہ کریں، جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب میں یہ سب بھول جانا چاہتی ہوں۔'' اس نے عام سے لہجے میں کہا تھا مگر لہجے کی تہ میں جو غیر معمولی کرب تھا، وہ چھپائے نہیں چھپا تھا۔

خدیجہ نے جیسے بے قرار ہو کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''ایسے مت بولو نور! سب کچھ ختم نہیں ہوا ہے۔ یہ صرف ایک ایونٹ کی بات ہے، تم بھلی چنگی ہو جاؤ گی۔ ڈاکٹر رضوان نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ ڈیڑھ دو ماہ کا مکمل آرام تمہیں پھر سے فٹ کر سکتا ہے، اس کے علاوہ......''

''پلیز خدیجہ! آپ یہ ذکر نہ ہی کریں، مجھے اب گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔ ویسے بھی میں کچھ دن کے لیے ذرا تنہائی میں رہنا چاہتی ہوں۔ اب بھی...... سکون کی گولی کھائی ہوئی ہے...... تھوڑی دیر سونا چاہ رہی تھی۔'' وہ کہتے کہتے کہہ ہی گئی۔

یہ اس امر کا واضح اشارہ تھا کہ وہ زیادہ دیر خدیجہ کے

پاس بیٹھنا نہیں چاہتی۔ نور کی یہ بے رخی محسوس کرنے کے باوجود خدیجہ کی خندہ پیشانی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ اس نے بڑے پیار سے اس کے ہاتھ کو تھپتھپایا...... نم آنکھوں کے ساتھ اس کے سر کو چوما اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''اچھا تم آرام کرو۔ اگر موڈ اچھا ہو اور کسی وقت بات کرنے کو دل چاہے تو فون ضرور کرنا۔''

☆☆☆

وہ کسی صورت اس کے ذہن سے نکلتی ہی نہیں تھی۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے ہر وقت اس کا خیال تھا۔ شادی کی تقریب کا وہ منظر جیسے ذوالقرنین کے دل و دماغ پر نقش ہو کر رہ گیا تھا...... اس نے اپنا ڈھیلا اسکارف کھول کر پھر باندھا تھا۔ ستاروں کے درمیان جیسے ایک چاند چمکا تھا اور پھر اوجھل ہو گیا تھا۔ کئی گھڑیاں ایسی ہی کایا پلٹ ہوتی ہیں۔ وہ پوری زندگی پر محیط ہو جاتی ہیں۔ کہنے کو تو بس چند سیکنڈ لیکن جھیلنے کو ساری زندگی۔

تین دن پہلے اسے پتا چلا تھا کہ نور ایک بار پھر ٹائٹل جیتنے میں ناکام رہی ہے اور بری طرح ناکام رہی ہے۔ وہ آدھے راستے کے فوراً بعد ٹریک پر گر گئی تھی اور دور تک لڑھکتی گئی تھی۔ اس کی یہ تصویر کئی اخباروں میں چھپی تھی اور پی ٹی وی پر بھی یہ منظر دکھایا گیا تھا۔

ذوالقرنین کا دل غم سے بھرا ہوا تھا، اتنے میں اس کی جڑواں بہن خدیجہ اندر آگئی۔ وہ اس کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ ذوالقرنین کے کہنے پر ہی وہ نور سے ملنے گئی تھی۔

خدیجہ بالکل گم صم تھی۔ گہری سانس لے کر بولی۔ ''وہ بہت خاموش ہے۔ بالکل ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔ میں سوچتی ہوں ذوالقرنین...... دانشوروں نے شاید درست ہی کہا ہے کہ ظلم کی حکومت تو قائم رہ سکتی ہے مگر ناانصافی کی نہیں۔ یہاں دو طرح کا انصاف ہے۔ ایک غریب اور بے وسیلہ لوگوں کے لیے، دوسرا امیر اور اثر رسوخ والوں کے لیے۔ ہمارا اندازہ بالکل درست تھا۔''

''کیا مطلب؟''

''نور کی ناکامی کی وجہ وہی چوٹ ہے جو اس کمینی نشو نے اسے کالج والے ایونٹ میں لگوائی تھی۔ اس کا گھٹنا پوری طرح فٹ نہیں تھا پھر بھی اس نے ریس میں حصہ لیا اور شکست کھا گئی۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ وہ نشو کہیں میرے سامنے آئے اور میں اسے گولی مار دوں۔ سنا ہے آج کل وہ لاہور آئی ہوئی ہے، اس کے اعزاز میں تقریبات ہو رہی ہیں۔''

''اب کیا کہتی ہے نور...... کیا اب بھی اپنی ضد پر رہے گی؟''

''نہیں، اس بارے میں تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ یقین کرو ذوالقرنین! آج اسے دیکھ کر بڑا ترس آیا ہے مجھے۔ اپنے تایا اور والد کے سامنے سرخرو ہونے کے لیے بڑی جان ماری تھی اس نے مگر......''

ذوالقرنین ذرا توقف سے بولا...... ''چلو تم اس سے ملتی رہو۔ اسے سمجھانے کی کوشش کرو کہ زندگی میں ایک ہی جیت نہیں ہے اور ایک ہی میدان نہیں ہے۔ بندہ ایک جگہ کامیابی حاصل نہ کر سکے تو کسی اور شعبے میں نام کما سکتا ہے۔''

''تمہیں کہا تھا نا ذوالقرنین! یہ جو کھلاڑی اور آرٹسٹ ہوتے ہیں نا، یہ دھن کے بڑے پکے ہوتے ہیں۔ ان کے بارے میں یقین سے کوئی پیش گوئی بھی نہیں کی جا سکتی۔''

خدیجہ نے بھائی سے یہ بات چھپائی کہ نور اس سے بڑی سرد مہری سے ملی ہے۔

اگلے روز ذوالقرنین عصر کی نماز پڑھ کر دکان پر پہنچا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف خدیجہ کی ایک دوست تبسم تھی۔ وہ ہیجانی لہجے میں بولی۔

''ذوالقرنین بھائی! خدیجہ زخمی ہو گئی ہے۔ شیخ زید اسپتال میں ہے۔ آپ جلدی آئیں۔''

''ہوا کیا ہے؟'' ذوالقرنین چلا کر بولا۔

''فیڈریشن کے آفس میں لڑائی ہوئی ہے۔ نشو اور اس کی دوستوں نے خدیجہ کو بری طرح مارا ہے۔ اس کی...... کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے اور بھی کئی زخم ہیں۔''

ذوالقرنین اپنی ایف ایکس پر آندھی کی رفتار سے شیخ زید اسپتال پہنچا۔ خدیجہ ابھی ایمرجنسی میں ہی تھی۔ اس کی ٹوٹی ہوئی کلائی پر عارضی ڈریسنگ کر دی گئی تھی۔ اس کے سر، کندھے اور پاؤں کی انگلیوں پر شدید چوٹیں آئی تھیں۔ تنظیم کی کئی ممبران بھی وہاں موجود تھیں۔ زخمی ہونے کے باوجود خدیجہ پریشان نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں میں جیسے آگ سی روشن تھی۔ ذوالقرنین نے اسے گلے سے لگا کر تسلی دی۔ پھر تبسم سے پوچھا کہ کیا ہوا ہے؟

اس نے بتایا کہ فیڈریشن کے آفس میں نشو کے اعزاز میں ایک فنکشن تھا۔ خدیجہ اکیلی وہاں پہنچ گئی۔ وہاں اس نے اسٹیج پر آکر اور ڈائس کے سامنے نشو کے خوب لتے لیے۔ اسی پر لڑائی ہوئی۔

ایک دوسری لڑکی بولی۔ ''خدیجہ باجی نے غلطی کی، اگر ایسا کچھ کرنا تھا تو کم از کم ہم میں سے دو چار کو انفارم کر دیتیں۔''

واقعے کی جو تفصیل معلوم ہوئی، وہ کچھ اس طرح تھی۔ خدیجہ کے اندر نشو کے لیے مسلسل غصہ پل رہا تھا۔ آج اس سے برداشت نہیں ہو پایا۔ وہ فیڈریشن کے آفس پہنچ گئی۔ وہاں نشو اور اپنی سن ڈانچی کی ارم کو نقد انعامات دیے جانے والے تھے۔ جب نشو ڈائس پر آئی تو خدیجہ نے وہاں پہنچ کر مائک کے سامنے بولنا شروع کر دیا۔ نشو کی چیمپئن شپ کو فراڈ قرار دیا — اور بتایا کہ اس نے کس طرح "پری پلاننگ" اصل حق دار نور کو ایونٹ سے باہر کیا ہے۔ وہاں اتفاقاً وہ بنی کی لڑکی بھی موجود تھی جس نے نور کی ٹانگ پر کرسی کے ٹوٹے ہوئے پائے سے ضرب لگائی تھی۔ وہ حاضرین میں سے نکل کر خدیجہ پر جھپٹ پڑی۔ خدیجہ نے اس کی بھی ٹھکائی کر دی۔ اس کے ناک منہ سے خون جاری ہو گیا۔ نشو پہلے تو سکتہ زدہ کھڑی رہی مگر پھر خدیجہ پر جھپٹی۔ خدیجہ نے اسے ایک یادگار طمانچہ رسید کیا۔ بعد میں تقریباً اسے بھی طمانچے پڑے اور وہ زدوکوب بھی ہوئی مگر وہ پہلا طمانچہ درجنوں کیمروں میں ریکارڈ ہو گیا۔

☆☆☆

ممرین نے نور کو زبردستی بیڈ پر نیم دراز کر رکھا تھا اور اس کو گھٹنے کی مختلف ورزشیں کرا رہی تھی۔ اسی دوران میں پی ٹی سی ایل فون کی گھنٹی بجی۔ ممرین نے کال ریسیو کی اور اس کے تاثرات میں ہلچل مچ گئی۔ دوسری طرف سے کسی جھگڑے کی بات ہو رہی تھی۔ فون سننے کے بعد ممرین نے نور سے کہا۔

"ابھی خبر ملی ہے، خدیجہ اور نشو کی لڑائی ہوئی ہے۔ خدیجہ کا بازو فریکچر ہو گیا ہے، اسپتال میں اس کا آپریشن ہوگا۔"

"او گاڈ۔" نور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "کس نے بتایا ہے؟"

"میری کولیگ ہے — وہ بھی شیخ زید کے فزیوتھراپی ڈیپارٹمنٹ میں ہے۔"

"لیکن معاملہ کیا تھا — کوئی اپنی بھی دشمنی ہے ان کی؟"

"نہیں بھئی۔ تمہاری والی دشمنی ہی ہے۔ ایک فنکشن میں خدیجہ ڈائس پر پہنچ گئیں اور خطاب فرماتی ہوئی نشو کا اچھا خاصا ریمانڈ لیا۔ کافی ہنگامہ ہوا ہے۔"

آدھ پون گھنٹے میں نور اور ممرین کو اس واقعے کی ساری تفصیلات معلوم ہو چکی تھیں۔ یہ بھی پتا چلا کہ چند دن پہلے نور کو چوٹ لگانے والی لڑکی سلطانہ اس لڑائی میں اسٹیج سے گر کر تھوڑی دیر کے لیے بے ہوش بھی ہو گئی تھی۔ ممکن تھا کہ نشو کے ورثاء پرچہ وغیرہ بھی درج کرا دیتے مگر چونکہ خدیجہ کو بھی سخت چوٹ لگی تھی اس لیے ابھی تک پولیس کو انفارم نہیں کیا گیا تھا اور معاملہ رفع دفع کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

"خدیجہ اچھی بھلی سمجھ دار ہیں۔ انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ کیوں میرے لیے لڑائی مول لے رہی ہیں۔"

"کبھی کبھی اس طرح کی بات اپنے بس میں نہیں رہتی نور! صبر کا پیمانہ لبریز ہو جائے تو پھر زیادہ ہی چھلک جاتا ہے۔ میں نے اس دن نوٹ کر لیا تھا کہ تمہیں دیکھ کر خدیجہ بہت پریشان ہوتی ہیں —"

تین دن بعد کی بات ہے، نور اور ممرین نے خدیجہ کی مزاج پرسی کے لیے اسپتال جانے کا فیصلہ کیا۔ خدیجہ کا آپریشن کامیابی سے ہو چکا تھا۔ نور چاہتی تھی کہ وہ اس وقت اسپتال پہنچیں جب خدیجہ کا بھائی ذوالقرنین آس پاس موجود نہ ہو۔

خدیجہ پرائیویٹ روم میں تھی۔ جب وہ اس کے پاس پہنچیں تو وہ روم میں اکیلی ہی تھی۔ وہ دونوں اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئیں، ایک خوبصورت "بُکے" اس کے سرہانے رکھ دیا۔ رسمی کلمات کے بعد نور نے کہا۔ "آپ نے ایسا کیوں کیا خدیجہ — خواہ مخواہ لڑائی مول لی۔ آپ تو مجھے سمجھاتی تھیں کہ ان باتوں میں پڑنے سے کوئی فائدہ نہیں۔"

"پتا نہیں نور کیسے ہو گیا۔ جب میں تم سے مل کر آئی تو میرے دل کی حالت عجیب ہو گئی تھی۔ پھر نہ چاہتے ہوئے بھی میں وہاں پہنچ گئی۔ آئی ایم سوری لیکن ایسا لگتا تھا کہ کچھ بھی میرے بس میں نہیں رہا۔"

"آپ جانتی ہیں خدیجہ! یہ لوگ اچھے نہیں ہیں۔ یہ آپ کے لیے پریشانیاں پیدا کر سکتے ہیں۔"

"نہیں، کوئی پریشانی نہیں ہوگی ان شاء اللہ! انہیں پتا تھا کہ اگر وہ پولیس تک گئے تو پھر بات آگے تک جائے گی۔ کل صلح صفائی کی بات ہوگئی ہے۔ میں نے انہیں صاف بتایا ہے کہ وہاں فیڈریشن کے دفتر میں جو کچھ بھی ہوا، اس میں کسی اور کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔"

"مگر اس سے فائدہ کیا ہوا خدیجہ؟" نور نے جزبز ہو کر کہا۔

"بہت فائدہ ہوا ہے نور! کم از کم ان لوگوں کو ایک جواب تو ملا ہے۔ اب آئندہ کوئی حرکت کرنے سے پہلے وہ کئی بار سوچیں گے۔ تمہیں پتا چلا ہی ہوگا، وہ ماڈرن غنڈی تو اسٹیج سے گر کر کچھ دیر کے لیے بے ہوش بھی ہو گئی تھی —"

ممرین بولی۔ "مگر آپ کو بھی تو قیمت چکانا پڑی خدیجہ آپی! آپ اسپتال میں پڑی ہیں۔"

"کوئی قیمت نہیں۔" وہ مصنوعی ناراضگی سے بولی۔

بھلی چنگی ہوگئی ہوں۔ کل تک شاید چھٹی بھی مل جائے۔"

ابھی وہ باتیں کر ہی رہی تھیں کہ واش روم کا دروازہ کھلا اور ذوالقرنین تولیے سے بازو صاف کرتا ہوا باہر نکلا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی ہموار ڈاڑھی میں پانی کے قطرے چمک رہے تھے۔ ذوالقرنین کو دیکھ کر نور کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ بھی ذرا ٹھٹکا پھر اس نے شائستگی سے "السلام علیکم" کہا۔ نگاہیں حسبِ معمول جھکی ہوئی تھیں۔ نور اور مہرین نے جواب دیا۔ وہ شاید وضو کر کے نکلا تھا۔ بولا۔ "خدیجہ! نماز کا ٹائم ہو رہا ہے۔ میں بس ابھی آتا ہوں۔"

وہ چلا گیا۔ مہرین نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کون تھے خدیجہ آپی؟"

"میرا بھائی ذوالقرنین۔"

"اچھا، آپ انہی کے ساتھ ہمارے گھر آئی تھیں؟"

خدیجہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ "بہت زیادہ خیال رکھتا ہے میرا۔ چار دن سے مسلسل یہاں میرے پاس ہے۔"

اسی دوران میں مہرین کی وہ دوست آگئی جو اسی اسپتال میں فزیوتھراپسٹ تھی۔ مہرین اس کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی باہر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد کمرے میں ایک بوجھل خاموشی طاری ہوگئی۔ نور کے علاوہ جیسے خدیجہ بھی کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر کہہ نہیں پا رہی تھی۔ آخر نور نے ہی اس خاموشی کو توڑا۔ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "اس کا مطلب ہے کہ آپ پہلے سے جانتی ہیں؟"

"کیا؟" خدیجہ نے پوچھا۔

اس نے ذرا توقف سے کہا۔ "یہی کہ میں وہی ہوں جس کے ساتھ کچھ عرصہ پہلے آپ کے بھائی کے رشتے کی بات چلی تھی؟"

خدیجہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور تکیے سے ٹیک لگالی۔ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "ہاں نور...... میں جانتی تھی...... مگر میں نے تمہیں بتایا نہیں...... مجھے ڈر تھا کہ تمہیں پتا چل گیا تو ہماری دوستی شروع میں ہی ختم ہوجائے گی لیکن یہ نہ سمجھنا کہ میرے اور تمہارے ملنے میں کوئی پلاننگ تھی۔ ظاہر ہے کہ ہم ایک ہی کالج میں تھیں، جو کچھ ہوتا رہا خود بخود ہوتا رہا۔"

"...... آپ میرے لیے صرف خدیجہ ہی رہتیں تو بہت اچھا ہوتا۔" نور کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔

"میں اب بھی تمہارے لیے صرف خدیجہ ہوں۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں ہمارے درمیان اور کوئی تعلق کبھی نہیں آئے گا۔"

اس سے پہلے کہ خدیجہ مزید کچھ کہتی، مہرین اور اس کی دوست واپس آگئیں۔ گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ نور اب جلد یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ خدیجہ سے رخصت ہو کر وہ دونوں کمرے سے باہر آگئیں۔ جب وہ سیڑھیاں اتر رہی تھیں تو ان کی ملاقات پھر ذوالقرنین سے ہوگئی۔ وہ کولڈ ڈرنکس اور اسنیکس وغیرہ لے کر اوپر آ رہا تھا۔

"آپ جا رہی ہیں؟" وہ ان کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

"جی ہاں۔ گھر میں انتظار ہو رہا ہوگا۔" مہرین نے جواب دیا۔

"آپ پانی تو پی لیتیں۔"

"شکریہ۔ دیر ہو رہی ہے۔" مہرین نے کہا۔

وہ دونوں سلام لیتے ہوئے نیچے اتر آئیں۔

راستے میں مہرین نے گہری نظروں سے نور کو دیکھا اور دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "ویسے نور! بندہ اتنا برا بھی نہیں لگتا جتنا ہم سمجھتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"سیانے کہتے ہیں ناکہ شکلوں پر نہیں جانا چاہیے۔ شکل صورت سے یہ ذرا سخت مزاج اور گم صم سا ہے مگر جب بات کرتا ہے تو اور طرح کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔"

"اچھا تم زیادہ مردم شناس نہ بنو۔" نور نے چڑ کر کہا۔

"یار! میں تو ایک عام سی بات کر رہی ہوں۔"

"لیکن میرے لیے یہ عام نہیں ہے مہرین! میں اس طرح کے کسی بندے کو اپنی زندگی میں لانے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"کوئی آئیڈیل؟" مہرین دبی دبی شوخی سے بولی۔

"نہیں۔ کوئی آئیڈیل نہیں مگر یہ قاری ذوالقرنین بھی نہیں۔"

نور کا موڈ دیکھتے ہوئے مہرین نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔

...... پندرہ بیس روز گزر گئے۔ انہوں نے دوبارہ خدیجہ کی خیر خیریت دریافت نہیں کی حالانکہ انہیں چاہیے تھا کہ کم از کم ایک بار تو اسے فون کرلیتیں۔ (نور نے مہرین کو بتا دیا تھا کہ خدیجہ اور اس کے درمیان ذوالقرنین والی بات کھل چکی ہے) آخر ایک روز مہرین نے خدیجہ کو فون کر ہی دیا۔ حال احوال پوچھا۔ نور نے بھی تھوڑی سی بات کی۔ گفتگو کے آخر میں خدیجہ نے نور سے کہا۔ "نور! تمہارے پاس اور کون ہے؟"

"کوئی نہیں۔ مہرین تھی، باہر چلی گئی ہے۔"

خدیجہ بولی۔ "تم مجھ سے خفا تو نہیں ہو نور؟"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ میں آپ سے کبھی خفا

نہیں ہوسکتی۔ میرے دل میں آپ کا ایک مقام بن چکا ہے۔ بس تھوڑا سا افسوس ضرور ہے۔''

''کس بات کا؟''

''یہی کہ ماضی کی ایک بات ہمارے درمیان آ گئی ہے۔ ہم پہلے کی طرح آزادانہ نہیں مل سکتیں لیکن کچھ بھی ہے خدیجہ! آپ دور رہ کر بھی میرے قریب ہی رہیں گی۔''

دوسری طرف کچھ دیر بوجھل سی خاموشی طاری رہی پھر خدیجہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''نور! اس دن اسپتال میں، میں نے تم سے ایک فقرہ کہا تھا، اپنے اور تمہارے تعلق کے بارے میں...... تمہیں یاد ہے؟''

نور نے کہا۔ ''ہاں، آپ نے کہا تھا، میں اب بھی تمہارے لیے صرف خدیجہ ہوں۔ تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ ہمارے درمیان اور کوئی تعلق کبھی رکاوٹ نہیں بنے گا۔''

''میں اپنی اس بات پر قائم ہوں نور۔ بس تم سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔ یہ پہلی اور آخری بات ہوگی۔ اس کے بعد میں کبھی اس موضوع پر بات نہیں کروں گی۔ اس موضوع کا صفحہ ہماری گفتگو کے باب میں سے ہمیشہ کے لیے علیحدہ ہوجائے گا۔''

''آپ...... کیا...... کہنا چاہتی ہیں؟''

''نور! ہر بہن کو اپنا بھائی پیارا ہی ہوتا ہے لیکن میں جو بات کہنے جارہی ہوں، یہ بالکل بے لاگ ہے...... وہ تمہیں دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہے نور! اس کی محبت میں اتنی گہرائی ہے کہ کبھی کبھی میں ڈر جاتی ہوں۔ شاید تمہیں معلوم نہ ہو جب تم دونوں کے رشتے کی بات ختم ہوئی تو وہ کئی دن اپنے کمرے میں بند رہا تھا۔ اب کافی عرصہ گزر چکا ہے، وہ گھر والوں پر بظاہر تو کچھ نہیں کرتا لیکن میں جانتی ہوں کہ وہ دن رات تمہیں سوچتا ہے۔ پچھلے چند مہینوں میں کئی موقعے ایسے آئے جب اچھی جگہ اس کا رشتہ ہوسکتا تھا مگر وہ انکار کردیتا ہے۔ میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں نور......''

خاموشی کا ایک وقفہ آیا۔ شاید خدیجہ منتظر تھی کہ نور ہنکارا بھرے گی مگر وہ چپ رہی۔ خدیجہ نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''نور! ہم بچپن سے ایک دوسرے کے رازداں تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں بھی ایک دوسرے سے شیئر کرتے تھے۔ مار بھی اکٹھے کھاتے اور ہمیں پیار بھی اکٹھا ہی ملتا تھا۔ میں اسے مذاق میں اخروٹ کہا کرتی تھی۔ جب وہ غصہ کرتا تو میں کہتی، ذوالقرنین! میں تمہاری تعریف کررہی ہوں۔ اخروٹ اوپر سے سخت لیکن اندر سے کتنا نرم ہوتا ہے۔ وہ کہتا کہ پھر تم خوبانی ہو، اوپر سے نرم لیکن اندر سے سخت۔ ہم ایک دوسرے کے مزاج شناس ہیں نور۔ وہ جتنا سنجیدہ اور کم گو ہے، اندر سے اتنا ہی خوش مزاج ہے۔ وہ تمہیں بہت پیار دے سکتا ہے نور...... تمہاری توقعات سے کہیں زیادہ اور یہ وقتی جذبہ نہیں ہوگا۔ اس میں اتنی پائیداری ہوگی کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ تم میری بات سن رہی ہونا؟''

نور ذرا توقف سے بولی۔ ''میں زیادہ کچھ کہنا نہیں چاہتی...... صرف یہی گزارش ہے کہ...... آپ...... اپنے وعدے پر قائم رہیے گا...... میرا مطلب ہے...... آپ جو کہنا چاہتی تھیں آپ نے کہہ دیا...... اور میں نے سن لیا۔ اب اگر ہم...... کبھی کوئی بات چیت کریں گے تو اس میں یہ موضوع نہیں آئے گا۔''

دوسری طرف چند سیکنڈ سناٹا سا رہا پھر خدیجہ کی بوجھل آواز ابھری۔ ''ٹھیک ہے نور! میں اپنے وعدے پر قائم ہوں لیکن تم اس بارے میں ایک بار سوچنا ضرور۔''

رسمی کلمات کے بعد گفتگو کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ ابھی وہ ریسیور رکھ ہی رہی تھی کہ تائی جان آگئیں۔ آج کل ان کے رویے میں تھوڑی سی تبدیلی محسوس ہورہی تھی۔ اب بھی ان کی پیشانی پر ہلکا سا بل موجود تھا۔ بولیں۔ ''کس سے بات کررہی تھیں؟''

''خدیجہ تھیں۔ ان کی خیر خیریت پوچھ رہی تھی۔''

تائی بولیں۔ ''دیکھو اب جبکہ ہمیں پتا چل گیا ہے کہ خدیجہ، اسی ذوالقرنین کی بہن ہے تو پھر ہمیں اس سے زیادہ میل جول نہیں رکھنا چاہیے۔''

''آپ اس بارے میں بے فکر رہیں تائی امی۔ اب بھی میں نے فون نہیں کیا تھا۔ مہرین نے حال چال پوچھنے کے لیے کال ملائی تھی۔''

تائی جان نے نور کی جانب پُرسوچ انداز میں دیکھا پھر اس کے قریب ہوگئیں۔ نرم لہجے میں بولیں۔ ''دوپہر کو جب تم سو رہی تھیں تو تمہاری کوچ میڈم فرحانہ کا فون بھی آیا تھا۔ تم سے بات کرنا چاہ رہی تھیں۔ میں نے کہا اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

نور خاموش بیٹھی رہی۔

تائی راحت نے دلار سے اس کا ہاتھ تھاما اور بولیں۔ ''نور! کئی کاموں میں اللہ کی مرضی شامل نہیں ہوتی۔ ہم کتنی بھی کوشش کرلیں وہ کام ہو نہیں پاتے۔ تم نے اپنے طور پر بہت کوشش کی ہے کھیل کے میدان میں۔ کوئی کسر اٹھا نہیں

رکھی۔ تمہارے تایا ابا نے بھی اپنی حیثیت اور ہمت سے بڑھ کر تمہارا ساتھ دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب تمہیں ذرا دوسرے انداز میں سوچنا چاہیے۔ میری بات کا برا نہ ماننا۔ لڑکیوں کی شادی کی ایک عمر ہوتی ہے۔ تین چار سال کا ایک دور ہوتا ہے جس میں ان کا گھر بس جانا چاہیے، ورنہ مشکلیں بڑھ جاتی ہیں۔"

"آپ...... کیا کہنا چاہتی ہیں تائی امی؟" نور ان کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

"تم ہمیں بہت پیاری ہو نور...... جس طرح یہ مہرین کا گھر ہے اسی طرح تمہارا بھی ہے لیکن ایک دن تو مہرین کو بھی جانا ہی ہے نا۔ میرا مشورہ ہے نور کہ اب تم گھر گرہستی کے بارے میں سوچو، ماشاء اللہ کوئی کمی نہیں ہے تم میں۔ اچھے سے اچھا رشتہ مل جائے گا۔"

نور نے تائی کی طرف دیکھا اور بولی۔ "کیا تایا ابا نے یہ کہا ہے؟"

"انہوں نے کہا تو نہیں لیکن میں جانتی ہوں وہ رات دن تمہاری بھلائی کے بارے میں سوچتے ہیں۔ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ تمہارے اباجی کے ساتھ تمہاری صلح ہو۔ تمہارے کاموں میں تمہارے والد کی مرضی شامل ہو۔ اسی میں خیر ہے اور اسی میں دین و دنیا کی بھلائی بھی ہے۔"

"میں نے تو ہر طرح کوشش کر کے دیکھی ہے تائی امی۔ ان کی ناراضگی وقتی طور پر کچھ کم تو ہو جاتی ہے مگر دور نہیں ہوتی۔"

وہ عینک درست کرتے ہوئے بولیں۔" اور اس کی وجہ بھی تم اچھی طرح جانتی ہو جب تک تم یہ بھاگ دوڑ والا کام چھوڑو گی نہیں، ان کا دل تمہاری طرف سے صاف نہیں ہوگا۔ میرا تو مشورہ یہی ہے نور! اب تم میڈم فرحانہ سے صاف صاف بات کرلو۔ انہیں بتادو کہ تم کلب میں نہیں آؤ گی۔ سیانے کہتے ہیں کہ باپ کی بددعا نہیں لینی چاہیے۔ وہ بڑی سخت ہوتی ہے۔ کبھی کبھی مجھے ڈر لگتا ہے کہ تم کسی ایسی ہی سختی کی لپیٹ میں نہ آجاؤ۔ پلیز نور...... پلیز۔" انہوں نے اس کا ہاتھ دبایا اور ملتجی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

نور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس خالی خالی نظروں سے دیوار کو گھورتی رہی۔ تائی راحت کچھ دیر انتظار کرتی رہیں پھر جز بز سی ہو کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور خاموشی سے باہر نکل گئیں۔

نور نے دروازہ اندر سے بند کیا اور بستر پر ڈھے سی گئی...... "میں کیا کروں میرے خدا...... کس طرف جاؤں؟" وہ دل ہی دل میں پکاری۔

پتا نہیں کیوں جب وہ رنگ سے پیچھے ہٹنے کا سوچتی تھی اور ابا جان کی نصیحتوں کے سامنے سر جھکانے کا سوچتی تھی تو اس کے سامنے ایک دیوار سی کھڑی ہو جاتی تھی۔ یہ کیسی دیوار تھی؟ کیا یہ انا کی دیوار تھی؟ کیا یہ اس عزم کی دیوار تھی کہ اس نے کچھ بن کر دکھانا ہے اور تایا ابا کا سر لوگوں کے سامنے جھکنے نہیں دینا؟ کیا اس دیوار کی تعمیر اس کے اندر کے جنون سے ہوئی تھی، وہ جنون جو سو میٹر کے ٹریک سے وابستہ تھا؟

اگرچہ اس کا دل گواہی دیتا تھا کہ ابا جان اپنے نظریات پر بالکل درست ڈٹے ہوئے ہیں اور ان کی ناراضگی بھی بجا ہے اور وہ دل سے چاہتی تھی کہ ابا جان اس سے راضی ہو جائیں۔ اس کا مقصد ہرگز بھی ان کے نظریات و خیالات سے ٹکرانا نہیں تھا مگر وہ اپنے اندازِ زندگی کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔

وہ بہت دیر سوچتی رہی۔ کھڑکیوں سے باہر شام کے سائے تاریکی میں بدلنے لگے، ذہن تھک سا گیا۔ اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ وہ سوتے جاگتے کی درمیانی کیفیت میں تھی۔ اس نے تصور میں دیکھا۔ اسے دلہن بنایا گیا ہے۔ بھاری بھر کم چمکیلے کپڑے، زیورات، چوڑیاں، نیکلس، ناک میں نتھلی، چہرے پر میک اپ کی تہ۔ وہ سکڑی سمٹی بیٹھی ہے...... جس طرح اس کے گاؤں موراں والی کی لڑکیاں دلہن بن کر بیٹھتی تھیں۔ ایک ہیولا کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ وہ اس کا دلہا ہے، شاید ذوالقرنین ہے۔ ہاں ذوالقرنین ہی ہے۔ وہ اسے دبوچتا ہے، مسہری پر گراتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار چاپڑ (برچھا) ہے۔ وہ کہتا ہے...... چلو ہم ایک نئی زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں اور تم کو کھونا نہیں چاہتا۔ لہٰذا سب سے پہلے ہم اس جھگڑے کو ختم کرتے ہیں جو ہماری ازدواجی زندگی میں زہر گھول سکتا ہے۔ وہ بے دردی سے چاپڑ چلاتا ہے اور نور کے دونوں پاؤں ٹخنوں کے پاس سے کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ لرزتے ہوئے سفید پاؤں کمرے کے گلابی قالین پر پڑے ہیں۔

نور جیسے تڑپ کر اپنے تصور سے باہر آ گئی۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر تھا۔ دل بے پناہ رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ وہ واش روم میں چلی گئی۔ چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے، اپنی گردن کو بھگویا اور باہر آ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ سامنے ہی ایک دیوار پر فلورنس کی تصویر آویزاں تھی۔ امریکا کی وہی فلورنس جس نے 10.49 سیکنڈ کا عالمی ریکارڈ قائم کر رکھا تھا۔ اس تصویر میں وہ برق کی رفتار سے فنش لائن کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ہزاروں نگاہیں اس پر لگی ہوئی تھیں۔

وہ دیر تک تصویر کو دیکھتی رہی، پھر ایک گہری لمبی سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے اندر پھر تحریک پیدا ہو رہی تھی۔ دور کہیں ریڈیو یا ٹیپ ریکارڈر پر کسی گیت کے

بول گونج رہے تھے۔ گر گر کے مصیبت میں سنبھلتے ہی رہیں گے...... جل جائیں مگر آگ پہ چلتے ہی رہیں گے۔

وہ ذرا جھک گئی اور اپنے گھٹنے کا جائزہ لینے کے لیے آہستہ آہستہ ٹانگ کو اوپر نیچے حرکت دینے لگی۔ وہ خود کو بہتر محسوس کر رہی تھی۔

☆☆☆

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزر رہا تھا۔ صبح ہوتی تھی، شام ہوتی تھی۔ دن کا اجالا اور رات کا اندھیرا ایک دوسرے کا تعاقب کرتے رہے...... گھڑی کی سوئیاں متحرک رہیں...... اسی طرح چار ماہ گزر گئے۔ نور ابھی تک تایا ابا کے گھر میں تھی۔ تائی راحت کے رویے میں کچھ فرق آ گیا تھا مگر تایا ابا بدستور اس کے ساتھ جم کر کھڑے تھے۔ وہ ہر طرح اس کی حوصلہ افزائی کی کوشش کرتے۔ انہوں نے بھی اسے رننگ سے دور جانے کا مشورہ نہیں دیا...... ہاں کسی وقت اتنا ضرور کہتے کہ وہ دیگر معاملات پر بھی توجہ دے اور اپنے والد سے اپنا فاصلہ گھٹانے کی کوشش کرے۔ وہ جیسے، نور سے خفا ہونا یا اس کی بات کو رد کرنا جانتے ہی نہیں تھے۔

دو ڈھائی ماہ کے مکمل آرام کے بعد نور ایک بار پھر رننگ میں حصہ لینا شروع کر چکی تھی۔ اب گھٹنا اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن رہا تھا۔ وہ اپنی پہلی فارم حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لگتا تھا کہ پہلے والی فارم حاصل ہو تو جائے گی مگر آسانی سے نہیں۔ وہ اب گاہے بگاہے ٹریننگ سینٹر (ایف اے ایس) بھی جاتی تھی۔ تایا ابا اسے چھوڑ کر آتے تھے اور واپس بھی لاتے تھے۔ وہ کسی عذر کو اس معمول کے راستے میں رکاوٹ نہیں بننے دیتے تھے......

بسمہ کو تقریری مقابلوں میں حصہ لینے کا شوق پیدا ہوا تھا اور وہ کئی جگہ جیتی بھی تھی۔ ابا جان کی غیر موجودگی میں دونوں بہنیں آپس میں مل بھی لیتی تھیں...... اور ایک دوسرے کے حالات سے آگاہ ہوتی تھیں۔

خدیجہ یا اس کے بھائی ذوالقرنین کے ساتھ پھر کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ ایک بار نور کا دل چاہا کہ وہ کم از کم فون کرلے اور خدیجہ کی خیریت دریافت کرے مگر پھر وہ فون کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گئی۔ ایسے موقعوں پر عجیب سی کشمکش اس کے اندر نمودار ہو جاتی تھی۔

اور پھر ایک دن نور کی زندگی میں ایک اہم واقعہ رونما ہوا۔ اسے یوں لگا جیسے اس واقعے نے اسے اپنے والد سے کچھ اور دور کر دیا ہے۔ نور چھت پر بیٹھی پیپرز کی تیاری کر رہی تھی کہ تائی راحت اس کے پاس آ بیٹھیں۔ ان کا انداز دیکھ کر ہی نور کو اندازہ ہو گیا کہ کوئی اہم بات ہے۔ انہوں نے کہا۔ ''نور! تمہیں کچھ پتا چلا ہے اشفاق کے بارے میں؟''

''کیوں، کیا ہوا ہے ابا جان کو؟'' وہ چونک گئی۔

''وہ شادی کر رہے ہیں...... میرا مطلب ہے، نکاح کر رہے ہیں۔''

وہ کتنی دیر سناٹے میں رہی...... پھر بہ مشکل بولی۔ ''آپ سے کس نے کہا ہے؟''

''کہنے کی بات نہیں ہے۔ یہ کام ایک دو روز میں ہونے والا ہے۔ کوئی بیوہ عورت ہے۔ بچہ وغیرہ بھی نہیں ہے۔ امام مسجد صاحب کی کوئی عزیزہ ہے۔ انہوں نے ہی بات طے کرائی ہے۔''

''مگر...... وہ......'' نور کچھ بول نہ سکی۔ گڑبڑا کر رہ گئی۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

تائی راحت نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ ''ذرا عجیب تو لگتا ہے مگر شرعی طور پر اس میں کوئی برائی بھی نہیں ہے۔ تمہاری امی کے انتقال کو کافی عرصہ ہو گیا ہے۔ انہوں نے ڈھائی تین سال بیماری کے بھی کاٹے۔ شاید اشفاق کو دکھ سکھ کے لیے کسی ساتھی کی ضرورت محسوس ہوتی ہو۔ تم بہنوں نے تو بیاہ کر اپنے گھروں کو چلے جانا ہے۔''

اس کی آنکھوں میں نمی سی آ گئی۔ توقف سے بولی۔ ''شاید اسی لیے ابا جان کو ہمیں بیاہ دینے کی جلدی تھی۔''

''نہیں نور! ہر بات کو منفی انداز میں نہیں لیتے۔ یہ ٹھیک ہے کہ انہوں نے تمہارے رشتے کی بات چلانے میں بہت جلدی کی...... اور شاید وہ لڑکا تمہارے جوڑ کا بھی نہیں تھا مگر نیت تو ان کی ٹھیک ہی رہی ہوگی۔ وہ دراصل تمہاری مصروفیات سے بھی ڈرے ہوئے تھے اور...... دیکھا جائے تو ان مصروفیات نے تمہیں کوئی فائدہ بھی نہیں دیا۔ میں سمجھتی ہوں کہ اگر......'' پھر وہ ایک دم خاموش ہو گئیں۔ غالباً انہیں محسوس ہوا تھا کہ اس موقعے پر یہ نیا موضوع چھیڑنا مناسب نہیں۔

انہوں نے نور کو بتایا کہ وہ خود بھی اس خاتون سے ملی ہیں۔ ملنسار اور اچھے مزاج کی لگتی ہیں۔ تم تینوں بہنوں کے بارے میں تفصیل سے پوچھ رہی تھیں۔ تمہارے بارے میں تو پہلے سے ہی تھوڑا بہت جانتی ہیں۔ بتا رہی تھیں کہ کسی اخبار میں تمہاری تصویر بھی دیکھی تھی۔

تائی راحت باتیں کر رہی تھیں اور نور کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ پتا نہیں کیوں اسے عجیب سی شرمساری محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے والد دوسری شادی کر رہے تھے۔

یہ بڑا کٹھن مرحلہ تھا۔ آیا اور گزر گیا۔ ابا جان چند افراد کے ساتھ گئے اور زلفت نامی اس خاتون کے ساتھ نکاح کر کے اسے گھر لے آئے۔ پھپو حاجرہ کے علاوہ تایا ابا بھی بوجھل دل کے ساتھ اس مختصر تقریب میں شریک ہوئے۔ ماموؤں نے شرکت نہیں کی۔ نور بھی اس وقت شریک ہوئی جب اس کی نئی امی گھر آ چکی تھیں۔ چھریرے جسم کی دراز قد کشمیری خاتون تھیں۔ عمر 35 اور 40 کے درمیان رہی ہوگی۔ اپنی اس ''نئی والدہ'' سے مل کر نور کو اتنا برا نہیں لگا جتنا وہ سمجھ رہی تھی۔ بیگم زلفت نے اسے پیار کیا، اپنے پاس بٹھایا اور محبت آمیز باتیں کرتی رہیں۔ پھر بھی کوشش کے باوجود نور زیادہ دیر اس کے پاس نہیں بیٹھ سکی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی مرحومہ والدہ جنہوں نے ساری عمر ابا جان کی جھڑکیاں سہی ہیں، کہیں آس پاس ہی موجود ہیں اور نم آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہی ہیں۔

دو ڈھائی سال بعد یہ پہلا موقع تھا جب ابا جان نے اس کے سر پر پیار دیا اور نارمل انداز میں چند باتیں بھی کیں مگر نور جانتی تھی کہ یہ عارضی تبدیلی ہے۔ ابا جان کے اندر جو ناراضی جڑ پکڑ چکی ہے وہ اپنی جگہ قائم ہے۔ ایک عجیب سی دیوار حائل تھی باپ اور بیٹی کے درمیان۔

''میں مانتی ہوں ابا جان آپ اپنی جگہ بالکل درست ہیں...... شاید میں ہی غلط ہوں...... مگر...... مگر یہ کیسی جنگ میرے اندر ہوتی رہتی ہے۔ مجھے جو بھی صلاحیتیں ملی ہیں وہ بھی تو اللہ کی طرف سے تحفہ ہے میرے لیے۔ میں نے تو کبھی کوئی غلط قدم اٹھانا نہیں چاہا۔ ہمیشہ اللہ کی نیک بندی اور آپ کی فرماں بردار بیٹی بن کر رہنا چاہا...... معلوم نہیں قدرت کو مجھ سے کیا کام لینا ہے...... میرے پیارے ابا جان...... بس مجھے زندگی میں اس ایک لمحے کا انتظار ہے۔ جب میں آپ کے سامنے سرخ رو ہو جاؤں گی۔''

اس دن گھر آ کر نور دیر تک روئی۔ اس کا رونا آنسوؤں کی صورت میں نہیں ہوتا تھا، بس اس کی آنکھوں کے کنارے جلتے رہتے تھے۔ دل میں ایک دھواں سا بھر جاتا تھا اور یہ دھواں آنکھوں تک آ کر شدید جلن میں بدلتا رہتا تھا۔

وہ تکیے میں چہرہ گھسا کر جیسے خیالوں ہی خیالوں میں بے زبان خاموشی اپنے ابا جان سے مخاطب ہوتی...... ابو! میں تیسری تھی نا۔ اُن چاہی تھی نا...... آپ نے ہمیشہ مجھے خود سے کچھ فاصلے پر رکھا لیکن میں تو آپ کے بہت قریب تھی۔ ہر وقت آپ کی باہوں میں سمائے رہنا چاہتی تھی۔ میں نے ہمیشہ آپ کی نظروں میں اہمیت حاصل کرنا چاہی۔ بچپن سے ہی اس کھوج میں رہتی تھی کہ میری کوئی بات آپ کو بھا جائے، آپ آپی بتول اور بسمہ سے نظر ہٹا کر میری طرف دیکھیں۔ جب آپ نہیں دیکھتے تھے تو میں اور سہارے ڈھونڈتی تھی، شاید تایا جان کی مہربان آغوش میں بھی آپ کی محبت ڈھونڈنے کی کوشش کرتی تھی۔ میری یہ حسرت میرے ساتھ ہی جوان ہوتی رہی ہے ابو! آپ کو کیا پتا میں نے آپ کی توجہ پانے کے لیے کیا کیا جتن کیے لیکن میرا ہر جتن مجھے آپ سے دور ہی لے گیا۔ میں چاہت کی نگاہ کو ترستی تھی لیکن آپ نے تو کبھی مجھ پر رحم کی نگاہ بھی نہ ڈالی۔

وہ دیر تک اسی انداز میں سسکتی رہی پھر سو گئی۔

اس کی نئی امی زلفت نے دو تین ہفتے میں ہی گھر میں اپنی جگہ بنالی۔ وہ نور اور بتول سمیت ہر ایک کے ساتھ خوش خلقی کے ساتھ پیش آتی تھیں۔ نور کو یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ اس کے اور ابا جان کے درمیان دوریاں ختم کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ایک روز وہ نور کو زبردستی گھر لے گئیں۔ وہ شام تک وہاں رہی پھر ایک دن جب تایا ابا کی طبیعت کچھ ناساز تھی، وہ ان کی عیادت کے لیے آ گئیں۔ ابا جان بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہ کوشش کرتی رہیں کہ نور کے ابا جان، نور سے بھی بات کریں اور ان دونوں کے درمیان جو ایک دیوار سی کھڑی ہو چکی ہے، وہ مسمار ہو۔ اس دن پہلی بار نور نے خود پر جبر کر کے ان کو ''چھوٹی امی'' بھی کہا۔

ایک روز جب تایا جان اپنے کام کے سلسلے میں گجرات گئے ہوئے تھے اور مہرین کالج میں تھی، چھوٹی امی ان کے گھر آئیں۔ انہوں نے اکیلے میں نور کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''نور! اس بات میں شک و شبہے کی کوئی گنجائش نہیں کہ تمہارے ابو تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔ بس تمہاری طرف سے ان کے دل کو ٹھیس پہنچی ہے اور یہ انہیں ہر وقت دکھی رکھتی ہے۔''

''کیا آپ سمجھتی ہیں کہ یہ ٹھیس پہنچنے میں میرا قصور ہے؟ کیا آپ جانتی ہیں کہ جس وقت میرے رشتے کی بات چلائی گئی اس وقت میری عمر کیا تھی؟''

''مجھے سب پتا ہے بیٹا جی! اور میں مانتی ہوں کہ اس معاملے میں ان سے ذرا جلدی ہوئی ہے مگر اب تو ان باتوں کو لمبا عرصہ گزر چکا ہے۔''

''لمبا عرصہ گزر چکا ہے پر مجھے معلوم ہے کہ ابا جان کے دل سے نکلا کچھ نہیں۔ وہ آج بھی یہی کہیں گے کہ میں موٹی سی چادر اوڑھ کر اور گھونگٹ نکال کر گھر میں بیٹھ جاؤں اور چپ چاپ اسی جگہ شادی کر لوں جہاں وہ کہتے تھے۔''

''اس جگہ شادی والی بات تو میں بھی نہیں مانتی......

لیکن نور! جہاں تک کھیل والی بات ہے..... شاید اب تم بھی محسوس کرتی ہوگی کہ...... یہ سفر اب کافی لمبا ہو گیا ہے۔ تم نے ماشاء اللہ کافی کامیابیاں بھی حاصل کی ہیں مگر انسان کو وہ سب کچھ تو نہیں ملتا جس کی وہ تمنا کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ تم اس معاملے پر پھر غور کرو۔''

نور نے ذرا بے رخی سے کہا۔ ''چھوٹی امی! اگر آپ مجھے بھی سب کچھ سمجھانے آئی ہیں تو پلیز...... نہ سمجھائیں۔ آخر ایک دن تو مجھے کھیل چھوڑنا ہی ہے لیکن کب چھوڑوں گی، اس کا فیصلہ میں نے خود کرنا ہے۔''

''اچھا...... تم اپنے اندازے کے مطابق کوئی ٹائم بتا دو کہ کب تک یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا؟ میں تمہارے ابو کو مطمئن کر لوں گی۔''

''اگر انہوں نے اس شرط پر مطمئن ہونا ہے تو بے شک نہ ہوں۔'' وہ جھلا کر بولی۔ شاید اٹھ ہی کھڑی ہوتی مگر چھوٹی امی نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور پچکارنے لگیں پھر انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگایا اور سر چوما، بولیں۔

''میرا بڑا دل چاہتا ہے کہ تمہیں بھی اسی طرح تمہارے ابا جان سے باتیں کرتے دیکھوں جس طرح بتول اور بسمہ کرتی ہیں۔ اللہ وہ دن جلدی لائے۔''

وہ اس سے بڑی بہن بتول اور اس کے شوہر کی باتیں کرنے لگیں اور بتانے لگیں کہ کس طرح وہ بتول کے شوہر غیاث کو راہ راست پر لانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ انہوں نے نور کی دادی کا ذکر بھی کیا اور کہا کہ وہ ذرا سخت مزاج تو ہیں لیکن دل کی بہت اچھی ہیں اور وہ بھی نور کو پھر سے اپنے گھر میں دیکھنا چاہتی ہیں۔

یہ اگلے روز کی بات ہے۔ نور اور مہرین بازار گئیں۔ کچھ شاپنگ کرنا تھی، سہ پہر کا وقت تھا۔ وہ شاہراہ قائداعظم کے ایک ریستوران میں جا کر سوپ پینے لگیں۔ دو نوعمر لڑکیوں نے نور کو پہچان لیا اور اس سے ایتھلیٹکس کے متعلق باتیں کرنے لگیں۔ اسی دوران میں نور کی نگاہ کھڑکی سے باہر گئی۔ پرجوش افراد کی ایک ریلی سڑک پر سے گزر رہی تھی۔ وہ نعرے لگا رہے تھے اور کتبے لہرا رہے تھے۔ نور دیکھ کر چونکی، ریلی میں سب سے آگے ذوالقرنین نظر آ رہا تھا۔ اس کی سیاہ ڈاڑھی دھول میں اٹی ہوئی تھی اور بال پیشانی پر لہرا رہے تھے۔

وہ بلند بھاری آواز میں پکارا۔ ''پاکستان کا مطلب کیا؟''

نعرے لگاتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔

یہ غالباً اسی تنظیم اصلاح معاشرے کی ریلی تھی۔ کتبے اور بینرز کچھ اس قسم کے تھے...... فحاشی و عریانی نامنظور۔ امریکیوں، یہودیوں کے ایجنڈے نہیں چلیں گے۔

تیس چالیس سیکنڈ کے اندر ریلی کھڑکی کے سامنے سے گزر گئی اور اس کے عقب میں رینگتی ہوئی ٹریفک دکھائی دینے لگی۔ مہرین نے کہا۔ ''بھئی! یہ تو وہی ہے خدیجہ کا بھائی...... اس وقت تو پورا پورا لیڈر لگ رہا تھا۔''

''چلو پورا پورا لیڈر رہو یا آدھا آدھا، ہمیں کیا۔'' وہ سوپ کا چمچ لیتے ہوئے بولی۔

''ہمیں ہے نا بھئی۔ ریلی تو گزر گئی مگر ٹریفک پھنس گئی۔ ابھی ہم نکلیں گے تو کچھ نہ کچھ بھگتنا پڑے گا۔''

''بھگت لیں گے۔'' وہ بے پروائی سے بولی۔ پھر چند لمحے توقف کر کے کہا۔ ''خدیجہ سے تو بات نہیں ہوئی دوبارہ؟''

''تم نے ہی روک دیا تھا، میرا تو دل چاہ رہا تھا۔''

''دراصل دل تو میرا بھی چاہتا ہے۔ ایک عجیب سی انسیت محسوس ہوتی ہے ان سے لیکن وہ کیا کہتے ہیں کہ گلاب کے ساتھ کانٹا بھی ہو تو گلاب کے قریب جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔''

''لیکن کانٹا بھی تو گلاب کا بھائی ہی ہے نا۔ ویسے ہو سکتا ہے کہ وہ اتنا کانٹا بھی نہ ہو۔ جب تک بندے کو پرکھا نہ جائے اس کے بارے میں حتمی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ اب دیکھو نا...... وہ جو اسپورٹس صحافی فرہاد تھا شکل سے کیسا لگتا تھا، مگر نکلا کیا؟''

اس موضوع نے نور کو بدمزہ کر دیا۔ اس نے برا سا منہ بنایا۔ مہرین بولی۔ ''لگتا ہے کہ فرہاد کے ذکر نے تمہارا منہ کڑوا کر دیا ہے۔ کوئی میٹھی چیز منگواتے ہیں۔'' اس نے ویٹر کو بلایا۔

نور نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی جہاں ٹریفک رینگ رینگ کر گزر رہی تھی۔ جن دو کم سن لڑکیوں نے نور سے آٹوگراف لیے تھے، وہ دور ایک کرسی پر بیٹھی اشتیاق سے اسی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ ان دونوں کے لیے بڑی اہم تھی۔ شاید ایک اسٹار کی حیثیت رکھتی ہو لیکن وہ جانتی تھی کہ یہ اسٹار کن کالے بادلوں کی زد میں ہے۔ پتا نہیں کیوں اب کبھی کبھی مایوسی بھی اس پر طاری ہونے لگتی تھی۔ محنت اور مسلسل محنت مگر وہ صلہ کہیں نہیں تھا جس کی وہ آرزومند تھی۔ پھر تایا ابا کی آواز کی بازگشت اس کے کانوں میں گونجی۔ نور کی ایک ہار کے موقع پر انہوں نے کہا تھا...... خدا کے گھر میں دیر ہوتی ہے اندھیر نہیں۔

اس شام جب وہ بازار سے گھر پہنچیں تو ٹی وی آن تھا۔ ان دنوں پی ٹی وی کے علاوہ بس دو چار چینلز ہی اور ہوتے تھے جن میں سی این این اور این ٹی ایم وغیرہ کے

علاوہ ایک اسپورٹ چینل بھی تھا۔ وہاں ایک نیوز چل رہی تھی۔ نیوز کاسٹر کہہ رہا تھا..... ''مسٹر فرہاد کا تعلق اسپورٹس نیوز کے شعبے سے ہے۔ وہ ایک بڑے میگزین کے اسپورٹس انچارج ہیں۔ ان کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا نوٹس لیا جانا چاہیے۔''

اس کے ساتھ ہی ایک ویڈیو کلپ چلایا گیا جس میں ایک اسٹریچر کو تیزی سے کسی اسپتال کی ایمرجنسی میں داخل کیا جارہا تھا۔ نیم بے ہوش فرہاد صاف پہچانا جارہا تھا۔ اس کے سر، دونوں بازوؤں اور ایک پاؤں پر پٹیاں تھیں۔ نیوز کاسٹر کہہ رہا تھا۔ ''میاں بیوی کے درمیان خلع کے کیس کی خبر دو دن پہلے آئی تھی۔ ایتھلیٹ شاہینہ کے والد کی طرف سے فرہاد پر کیس کیے جانے کا ذکر بھی آیا تھا لیکن آج جو واقعہ ہوا وہ زیادہ غیر متوقع ہے۔ شاہینہ کے بھائیوں کی طرف سے فرہاد کو زبردست تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ وہ گاڑی پر سوار جیل روڈ سے گزر رہا تھا۔ گاڑی روک کر اسے اور اس کے وکیل دوست کو باہر گھسیٹا گیا اور فرہاد کو سڑک پر لٹا کر بے دریغ مارا گیا۔ اس کے دونوں بازو ٹوٹ گئے ہیں۔ اس سے گاڑی بھی چھین لی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ہنڈا گاڑی بھی اسے سسرال کی طرف سے ہی ملی ہوئی تھی اور بیوی کے نام رجسٹرڈ تھی۔''

نور اور مہرین حیرت میں گم یہ سب کچھ سنتی رہیں۔ آج ہی ان کی گفتگو میں فرہاد کا ذکر آیا تھا اور آج ہی یہ خبر سننے میں آگئی تھی۔ رات تک اس بارے میں مزید تفصیل کا پتا بھی مختلف ذریعوں سے چلا۔ معلوم ہوا کہ شادی کے دو تین ماہ بعد ہی شاہینہ اور فرہاد میں اختلافات شروع ہوگئے تھے۔ فرہاد کی نگاہ سراسر شاہینہ کے والد کے روپے پیسے پر تھی۔ اس کے علاوہ وہ شادی شدہ ہونے کے باوجود ادھر ادھر منہ مارنے سے باز نہیں آرہا تھا۔ کئی بار کی تنبیہ اور وارننگ کے باوجود اس نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ بالآخر نتیجہ خلع کے مطالبے، دیگر کیسز اور فرہاد کی شدید درگت کی صورت میں نکلا۔

کمرے میں بند نور دیر تک سوچتی رہی۔ اسے یوں لگا جیسے کافی عرصے بعد بالآخر اس کے نہایت شدید اور توہین آمیز دکھ کا مداوا ہوگیا ہے۔ فرہاد نے جس طرح اسے اپنے کھیل کا حصہ بنایا اور مطلب نکلنے کے بعد منہ پھیرا، وہ سب نور کے لیے ایک کربناک تجربہ تھا اور یہی کربناکی تھی جس نے اسے اپنے کیریئر کے نہایت اہم دور میں ایک حوصلہ شکن شکست سے دوچار کیا تھا۔

ایک بار پھر تایا ابا کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے..... اللہ کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں۔

ہاں یہاں بھی شاید دیر تو ہوئی تھی مگر مکافات کا قانون حرکت میں آیا تھا۔ اس نے نیم دراز ہو کر تکیے سے ٹیک لگائی اور سوچنے لگی..... کیا اس کی مسلسل محنت، جانفشانی اور غیر مشروط کمٹ منٹ کے حوالے سے بھی کوئی قانون قدرت حرکت میں آئے گا؟ اسے اور اس کے تایا ابا کو کوئی صلہ ملے گا؟

اگلے روز تایا ابا سے بھی اس بارے میں بات ہوئی۔ انہوں نے کہیں اخبار میں یہ خبر دیکھی تھی۔ بولے۔ ''نورا! تمہیں پتا چلا ہے اس فرہاد کے بارے میں؟''

نور نے اثبات میں جواب دیا اور ٹی وی کی نیوز کا ذکر کیا۔ وہ گہری سانس لے کر بولے۔ ''بندے کی اصلیت کا پتا اس وقت چلتا ہے جب اس کے ساتھ واسطہ پڑتا ہے۔ اس لڑکے نے کلینک کے سلسلے میں مجھے بہت دھوکا دیا۔ پچیس تیس ہزار روپیہ بھی لے گیا مگر زیادہ تکلیف اس ذہنی پریشانی کی ہے جو اس کی وجہ سے ہوئی۔''

نور اب تایا ابا کو کیا بتاتی کہ وہ جس دھوکے کا ذکر کررہے ہیں وہ اس کا عشر عشیر بھی نہیں جو اس شخص نے خود اسے دیا تھا، اپنے مطلب کے لیے اسے کھلونا بنا ڈالا تھا۔ تایا ابا نے اسے سوچ میں گم دیکھ کر موضوع بدلا۔ ''تمہیں پتا ہے، امنالے کا میلا آنے والا ہے؟''

''کب؟'' وہ بے ساختہ بولی۔

انہوں نے کیلنڈر پر نگاہ دوڑائی اور حساب لگا کر بولے۔ ''بس تین ہفتے رہ گئے ہیں تقریباً۔ میں تو کہتا ہوں پروگرام بنالو۔ پچھلی دفعہ بھی اچھا وقت گزرا تھا تم لوگوں کا۔''

امنالے کا ذکر ہی ایسا تھا کہ بچپن اور لڑکپن کی بے شمار سنہری یادوں کو ہانک کر دل و دماغ کے باڑے میں لے آتا تھا۔ یادوں کے اس احاطے میں سرما کی سنہری دھوپ ہوتی تھی، ڈھول کی تھاپ، گھوڑوں کے رقص، جھولے، تماشے، پکوانوں کی مہک، کشتیاں، کبڈیاں، رنگین آنچل، دلنشیں گیت..... اور پتا نہیں کیا کچھ۔

نور تناؤ اور پژمردگی کے عجیب دور سے گزر رہی تھی (اس کی نوکری کی بنیاد ایتھلیٹکس پر تھی اور کسی وقت یہ نوکری بھی خطرے میں محسوس ہوتی تھی)۔ امنالے کے نام پر اس کا دل دھڑکا اور سینے میں امنگ سی جاگی۔ اس نے کہا۔ ''تایا ابا! دل تو چاہتا ہے لیکن.....''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ بس تم پروگرام بناؤ، سب

ٹھیک ہوجائے گا۔"

"دادی اماں بھی کچھ بیمار ہیں۔" نور نے کہا۔

"تو ان کے علاج کی بات ہی تو کر رہا ہوں میں...... دیکھنا میلے پر جانے کے لیے وہ کیسے بستر سے اٹھتی ہیں اور تیاری کرتی ہیں۔"

پتا نہیں کیوں نومبر دسمبر کے مہینے ہمیشہ سے نور کے لیے کچھ اداسی لے کر آتے تھے۔ سردی بڑھ جاتی تھی۔ شامیں چھوٹی ہوجاتی تھیں۔ لوگ دیر تک کمروں میں بند رہتے تھے، کہرا مناظر کو ڈھانپتا تھا اور درخت بے لباس نظر آتے تھے۔ آج کل بھی وہ کچھ ایسی ہی کیفیت محسوس کر رہی تھی۔ کئی دن سے آسمان پر بن بارش کے بادل تھے۔ سورج شکل نہیں دکھا رہا تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ آج اسے پریکٹس کے لیے جانا تھا مگر دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ کمبل اوڑھ کر کرسی پر بیٹھی رہی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا وا کیا۔ باہر باغیچے میں حسین پودے سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ کیاریوں میں گیندے اور چائنا روز کے پھول بھی جیسے سردی سے سکڑے سمٹے تھے۔ اسے وہ منظر یاد آگیا جو دو دن پہلے اس نے اور مہرین نے شاہراہ قائداعظم کے ریستوران میں بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ چھوٹا سا جلوس جو نعرے لگاتا اور کتبے لہراتا کھڑکی کے سامنے سے گزرا تھا۔ اس میں سب سے آگے وہ تھا۔ اس کا چہرہ غصے اور جوش سے تمتما رہا تھا۔ وہ بار بار اپنا مکا فضا میں لہراتا اور نعرہ بلند کرتا تھا...... پاکستان کا مطلب کیا؟ آواز میں ٹھہراؤ تھا اور وہ سچائی تھی جو اپنے موقف کے حوالے سے اس کے اندر موجود تھی۔ اپنی تمام تر سخت گیری کے باوجود وہ کھرا شخص دکھائی دیتا تھا...... اور اس کی بہن خدیجہ نے کہا تھا کہ وہ اندر سے اخروٹ کے مغز کی طرح نرم ہے۔ یہ ایک بہن کے تاثرات ایک بھائی کے بارے میں تھے اور ابھی تایا ابا نے کہا تھا...... حقیقت کا پتا تو اسی وقت چلتا ہے جب کسی انسان سے مستقل طور پر واسطہ پڑتا ہے۔

خدیجہ کی کہی ہوئی باتیں نور کے کانوں میں گونجنے لگیں۔ اس نے کہا تھا کہ وہ یہ باتیں پہلی اور آخری بار کہے گی اور واقعی تب سے اب تک اس نے دوبارہ اس موضوع پر بات نہیں کی تھی بلکہ اتفاق یہ ہوا تھا کہ اب تک ان کی بات ہی نہیں ہو پائی تھی۔ خدیجہ نے کہا تھا...... نور، وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے۔ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اور میں دعوے سے کہتی ہوں کہ یہ کوئی عارضی یا سطحی جذبہ نہیں ہے۔ میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ وہ دن رات تمہیں سوچتا ہے...... تمہارے حوالے سے کسی اچھے وقت کا انتظار کرتا ہے۔

نور نے ایک آہ بھری اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔ خدیجہ کی باتوں کے حوالے سے وہ کبھی کبھی بے چین سی ہوجاتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ کوئی واقعی اس کا انتظار کر رہا ہے۔ اس کی آس لگائے بیٹھا ہے، اس کی نسبت سے کسی انہونی کی راہ دیکھ رہا ہے۔

وہ کیوں کر رہا تھا ایسا؟ کیوں سراب کے پیچھے دوڑ رہا تھا؟ نور کو اپنے دل پر بہت بوجھ محسوس ہونے لگا۔ وہ جیسے اندر سے جھنجلا سی گئی۔ وہ کیوں یہ بات سمجھ نہیں جاتا کہ نور کے دل میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ وہ دو مختلف مزاجوں اور مختلف سوچوں کے انسان ہیں۔ وہ نہیں مل سکتے...... اور انہیں ملنا بھی نہیں چاہیے۔

پتا نہیں کیوں نور کا دل چاہا کہ وہ ایک بار اس سے بات کرے...... ٹیلی فون پر ہی سہی مگر اس سے رابطہ کرے۔ اسے سمجھائے کہ وہ کسی انہونی کی آس نہ لگائے۔ جو وہ سوچ رہا ہے کبھی نہیں ہوگا۔ اس کے والدین اور اس کی بہن جلد از جلد اس کے سر پر سہرا دیکھنا چاہتے ہیں، وہ ان کا دل نہ دکھائے۔

یہ عصر کا وقت تھا۔ وہ کافی دیر سوچتی رہی۔ اس نے اپنے آپ کو مضبوط کیا اور پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اماں لے کے میلے پر جانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ اسے بھی اپنے لیے کچھ چیزیں خریدنے اپنی کالونی کی مارکیٹ تک جانا تھا۔ اس نے گرم شال لی۔ اونی ٹوپی پہنی اور شولڈر بیگ لے کر قریبی مارکیٹ کو چل پڑی۔ اس کے پاس ذوالقرنین کی دکان کا نمبر موجود تھا۔ اسے پتا تھا کہ اس وقت وہ دکان پر ہی ہوگا۔

وہ ایک پی سی او باکس کے اندر چلی گئی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا مگر اس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ ٹھوس بے لچک لہجے میں وہ سب کچھ کہہ دے گی جو اس نے سوچ رکھا ہے اور بات کو مزید طول دیے بغیر فون بند کردے گی۔

اس نے نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف گھنٹی بجنا شروع ہوئی پھر فون اٹھایا گیا۔ اردو بازار کا شور کانوں میں گونجا، تب ذوالقرنین کی بھاری مگر ٹھہری ہوئی آواز ابھری۔ "ہیلو...... ہیلو...... کون؟"

پتا نہیں یہ کیسے لمحے تھے۔ نور کوشش کے باوجود بول نہیں سکی۔ وہ جو نہایت روکھے پھیکے لہجے میں ذوالقرنین کی مکمل حوصلہ شکنی کا ارادہ رکھتی تھی، ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکی۔ چند سیکنڈ توقف کے بعد آواز دوبارہ ابھری۔

"ہیلو، کون بول رہا ہے؟ کس سے بات کرنی ہے؟"

نور نے ایک بار پھر کوشش کی مگر گلے میں پھندا سا تھا۔ کبھی نہ گھبرانے والی اور شدید ترین تناؤ میں بھی خود کو یکسو رکھنے والی نور منتشر سی ہوگئی تھی۔ اس نے ریسیور کو مضبوطی سے تھاما۔ کچھ کہنے کے لیے لمبی سانس لی...... لیکن...... مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی ایک دم ریسیور واپس کریڈل پر رکھ دیا گیا۔

وہ تقریباً ایک منٹ تک وہاں گم صم کھڑی رہی پھر باہر نکل آئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا ہے۔ اس کے ذہن میں ابھی تک ہلچل تھی۔ وہ یونہی گارمنٹس کی ایک دکان کے سامنے جاکھڑی ہوئی اور شوکیس میں جھانکنے لگی۔ اس نے اپنے دل کو سخت کرنا چاہا۔ شعوری طور پر ذوالقرنین کی وہ ساری باتیں یاد کیں جو اسے بری لگتی تھیں۔ اس کا Tipical لباس، اس کا بے لچک لب ولہجہ، اس کی گھنی بھویں جنہیں وہ غصے کے وقت اچکاتا تھا اور اس کا وہ رویہ جو خواتین کو کھیل کے میدان اور اس طرح کی دیگر مصروفیات سے دور رکھنے کے حوالے سے تھا۔

وہ ایک بار پھر پی سی او کے کیبن کی طرف بڑھی۔ ایک خاتون اپنی بات ختم کر کے باہر نکل رہی تھی۔ نور اندر چلی گئی اور دروازہ بند کرلیا۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ اچھی طرح کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ دل ایک بار پھر شدت سے دھڑکنے لگا تھا۔ اس نے ہمت کر کے ڈائل پر انگلی رکھی...... لیکن...... آدھا نمبر ڈائل کرنے کے بعد ہی ایک بار پھر اس نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا اور تیزی سے باہر نکل آئی۔ وہ بے خوف لڑکی تھی اور دل کی بات کہہ دیا کرتی تھی لیکن آج پتا نہیں کہ اسے کیا ہوا تھا؟

☆☆☆

ذوالقرنین اپنی شاپ پر گم صم بیٹھا تھا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے اسے ایک فون کال آئی تھی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کئی بار ہیلو کہا تھا مگر جواب ندارد تھا بس سانسوں کی آواز آتی رہی تھی۔ تب اس نے دوبارہ پوچھا تھا کہ کون بول رہا ہے۔ آواز اس مرتبہ بھی نہیں آئی تھی۔ ہاں کسی کلائی کے بینگل ٹکرانے کی مدھم صدا ضرور ابھری تھی اور فون بند کردیا گیا تھا۔ پتا نہیں کیوں ذوالقرنین کو محسوس ہورہا تھا کہ یہ فون کسی اور کی طرف سے نہیں، نور یا اس کی تایازاد بہن مہرین کی طرف سے تھا۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ یہ نور کی طرف سے ہوگا لیکن وہ کچھ بولی نہیں تھی۔ اگر وہ نور ہی تھی تو کیا کہنا چاہتی تھی؟ ذوالقرنین کے ذہن میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔

اسے یاد آیا کہ خدیجہ کالج گئی ہوئی ہے۔ وہاں فیئر ویل کی ایک تقریب تھی۔ وہ جب بھی کسی ایسی تقریب میں جاتی تھی، ذوالقرنین کو تشویش ہونے لگتی تھی۔ چند مہینے پہلے ایک ایسی تقریب میں ہی تو خدیجہ کا بازو ٹوٹا تھا اور چوٹیں لگی تھیں۔ خدا کا شکر تھا کہ اب یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ نشو بجلی یا اس کے گروپ کی طرف سے کم از کم اب تک تو کوئی چھیڑ خانی نہیں ہوئی تھی۔ پھر بھی ذوالقرنین کو ایسے موقعوں پر دھڑکا سا لگ جاتا تھا۔ اس نے گھر فون کیا۔ والدہ نے بتایا کہ خدیجہ ابھی نہیں آئی ہے۔ وہ ذرا بے چینی سے دکان کے اندر ہی ٹہلنے لگا لیکن اسی دوران میں فون کی گھنٹی بج گئی۔ دوسری طرف خدیجہ ہی تھی۔ وہ آچکی تھی۔ ذوالقرنین بولا۔

"واپسی میں دیر لگائی ہو تو کسی طرح انفارم کردیا کرو بھئی۔ تمہیں معلوم ہے تمہارا بھائی پنجوں پر کھڑا ہوکر تمہاری راہ دیکھتا رہتا ہے۔"

"سوری۔ بس رش کی وجہ سے تھوڑا ٹائم لگ گیا۔ تم نے فون کیا تھا؟"

"ہاں، تمہاری واپسی کا پوچھنا تھا...... اور ایک دوسری بات بھی کرنا تھی۔"

"دوسری بات؟ کوئی لڑکی تو نہیں دیکھ لی؟" اس نے حسبِ عادت چھیڑا۔

"دیکھی تو نہیں سنی ہے...... اور مجھے لگتا ہے کہ وہ نور ہی تھی۔"

وہ چونک کر بولی۔ "کیا مطلب...... کوئی...... فون آیا تھا؟"

"ہاں، آیا تو فون ہی تھا مگر دوسری طرف سے صرف سانسوں کی آواز ہی آتی رہی۔"

"اور سانسوں کی آواز سے جناب کو پتا چل گیا کہ وہ نور تھی؟"

"ہاں۔ میرے اندازے کے مطابق یہ فون اس مارکیٹ سے کیا گیا تھا جس کے پاس انکل اشفاق کی رہائش ہے۔ اب تم پوچھوگی کہ یہ نتیجہ میں نے کیسے نکالا؟"

"بالکل۔ بات تو پوچھنے والی ہے۔"

"مارکیٹ کی جامع مسجد میں عصر کی اذان ہورہی تھی۔ میں وہاں کے مؤذن عبید اللہ صاحب کو اور ان کی اذان کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہاں کئی بار جمعہ بھی پڑھا ہے، کیا سمجھیں؟" ذوالقرنین معنی خیز لہجے میں بولا۔

"تمہیں تو سی آئی ڈی میں بھرتی ہونا چاہیے تھا۔" خدیجہ نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا پھر ذرا توقف سے بولی۔ "لیکن یہ ضروری تو نہیں ہے نا کہ وہ نور ہی ہو۔"

"میرا قیافہ تو یہی ہے کہ وہ نور یا مہرین میں سے کوئی

ایک تھی۔ باقی واللہ علم بالصواب۔'' تھوڑے سے توقف کے بعد اس نے دوبارہ کہا۔ ''خدیجہ، کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تم ایک بار اور اس سے مل لو۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہو لیکن کہہ نہ پا رہی ہو۔''

''نہیں ذوالقرنین، میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اس حوالے سے پہلی اور آخری بار اس سے بات کر رہی ہوں۔ میں اپنے وعدے پر قائم رہنا چاہتی ہوں...... اور...... ویسے بھی ذوالقرنین! سیانے کہتے ہیں کہ محبت کو آزاد چھوڑ دینا چاہیے، بغیر شرط کے...... بغیر کسی بندھن کے...... اگر وہ واقعی محبت ہوگی تو کسی نہ کسی طور آپ کی طرف پلٹ آئے گی۔ ہم نے اس سے جو بھی کہنا ہے کہہ دیا ہے۔ اب انگریزی کے محاورے کے مطابق گینداس کی کورٹ میں ہے۔''

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر فون پر اس نوع کی مزید گفتگو مناسب نہیں تھی۔ وہ خاموش رہا۔ اس کی خاموشی کو محسوس کر کے خدیجہ نے کہا۔ ''آج کیا تاریخ ہے؟'' ذوالقرنین نے بتایا کہ گیارہ ہے۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''کچھ یاد آیا تمہیں؟ آٹھ دس دن بعد امنالے کا میلا آنے والا ہے۔ پچھلے سال نور کے اباجی نے تمہیں میلا دیکھنے کی دعوت دی تھی۔ میں تو کہتی ہوں اس بار ہو آؤ وہاں سے...... ہوسکتا ہے کہ کوئی اچھی بات ہوجائے۔''

''میرے خیال میں تو یہ بے کار کی باتیں ہیں......'' شاید وہ اور بھی کچھ کہتا مگر لائن میں شور اور کھڑکھڑاہٹ شروع ہوگئی۔

اس نے فون بند کردیا۔ دل میں ایک بے قراری سی تھی۔ اگر وہ واقعی نور یا مہرین کی کال تھی تو ہوسکتا تھا کہ دوبارہ کال آئے کل یا پرسوں...... یا ممکن ہے کہ ابھی کچھ دیر بعد۔ اس نے سیاہ رنگ کے فون سیٹ کا ریسیور اچھی طرح کریڈل پر جمایا اور جیسے منتظر نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ کیوں اسے بھول نہیں پاتا؟ کیوں ہر گھڑی اس کا انتظار رہتا ہے؟ وہ کوئی عاشق مزاج کالجیٹ لڑکا نہیں تھا...... وہ قاری ذوالقرنین تھا۔ اس کی ایک پہچان تھی۔ اس کے گھرانے کی پہچان تھی۔ لوگ ان کی نجابت کی مثالیں دیتے تھے اور جو کچھ ہوا اس میں ذوالقرنین کا کوئی قصور بھی نہیں تھا۔ نور اس کی سوچوں اور نظروں میں آنے والی پہلی لڑکی تھی اور وہ بھی صرف اس لیے آئی تھی کہ اس کے والدین نے اسے ذوالقرنین کے لیے پسند کیا تھا۔ نور اس کو دکھائی گئی تھی۔ اس کی باتیں اسے بتائی گئی تھیں۔ ذوالقرنین کے دل میں اس کے لیے جگہ بنائی گئی اور جب جھکی جھکی نگاہوں والے خاموش طبع ذوالقرنین کے دل میں اس کی جگہ بن گئی تھی تو سب الٹ پلٹ ہوگیا تھا اور اب وہ بے پناہ کوشش کے باوجود اس کی سوچوں سے چھٹکارا حاصل نہیں کر پا رہا تھا۔ بے شک وہ اس کے مزاج کی نہیں تھی، بے شک اس کی مصروفیات ذوالقرنین کو پسند نہیں تھیں لیکن وہ اس سے محبت کرنے لگا تھا۔ محبت ایسی ہی بے دلیل اور منہ زور ہوتی ہے۔ وہ اپنے راستے اور اپنے اصول ضابطے خود مقرر کرتی ہے۔

ایک گاہک کی آواز نے اسے خیالوں سے چونکایا۔ ''بیٹا ذوالقرنین! سیرت امام زین العابدین ہوگی آپ کے پاس؟'' یہ ایک قریبی مدرسے کے استاد تھے اور ذوالقرنین کے پرانے کسٹمر۔

''جی سر! ایک کاپی موجود ہے۔ اوپر پڑی ہے، میں دیکھتا ہوں۔'' ذوالقرنین نے کہا اور سیڑھی چڑھ کر دکان کے بالائی حصے کی طرف گیا۔ ابھی وہ پانچ چھ سیڑھیاں ہی چڑھا تھا کہ فون کی گھنٹی پھر بج اٹھی۔ وہ بڑا باتحمل نوجوان تھا مگر گھنٹی کا بجنا اور نور کا خیال ذہن میں آنا اتنا ہی ہیجان خیز تھا کہ وہ جلدی سے پلٹا۔ شلوار کے پائنچے میں اس کا پاؤں الجھا اور وہ چار پانچ زینوں سے لڑھکتا ہوا نیچے آیا۔ اس کے سر پر ٹھیک ٹھاک چوٹ لگی اور ناک سے خون رسنے لگا۔ کہنیوں پر بھی گہری خراشیں آئی تھیں۔ اسے قریبی کلینک میں پہنچایا گیا۔ ڈاکٹر نے چیک کیا اور تسلی دی۔ اس کی ایک آنکھ خون کی طرح سرخ ہوگئی تھی۔ پیشانی پر پٹی بندھوا کر اور انجکشن وغیرہ لگوا کر وہ دوبارہ دکان پر آگیا۔

اردگرد کے دکاندار حال احوال پوچھنے کے لیے جمع ہوگئے۔ ایک نے کہا۔ ''یار! تم تو ہمارے بازار کے سب سے رکھ رکھاؤ والے دکاندار ہو، دکان میں دو سیلز مین موجود تھے پھر خود کیوں سیڑھی چڑھ گئے اور اگر چڑھ ہی گئے تھے تو پھر چھلانگ کیوں لگا دی؟''

دوسرے نے کہا۔ ''کوئی ضروری فون آگیا تھا۔ جناب پلٹے تو گر گئے۔''

ایک بے تکلف ہمسائے نے کہا۔ ''کوئی اور ہوتا تو اس بات کا بھی بتنگڑ بنتا کہ ایسا کون سا ضروری فون تھا مگر بھئی، تم پر شک کرنا تو ایسے ہی ہے جیسے کسی میاں مٹھو پر شک کیا جائے کہ وہ رات کو مرغ کی طرح اذان دیتا ہے۔''

دوست ادھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے اور وہ اپنے اندر ہی اندر بے پناہ خجل ہو رہا تھا۔ گھر میں کچھ نہیں بتایا گیا

تھا۔ اس کی طبیعت ذرا بہتر ہوئی تو اس نے ایک پڑوسی دکاندار کو ساتھ لیا اور اپنی ایف ایکس خود ہی ڈرائیو کر کے گھر چلا گیا۔

......اگلے روز رات کو اسے خاصا تیز بخار ہو گیا۔ تسلی کے لیے سی ٹی اسکین وغیرہ بھی کرا لیا گیا۔ او کے رپورٹ ملی۔ ڈاکٹر نے کہا دو تین دن تک بخار چلے گا...... اگلے روز بخار نسبتاً کم تھا مگر غنودگی بدستور تھی۔ رات کو ذوالقرنین کے کمرے میں خدیجہ تیمارداری کے لیے موجود تھی۔ رات گئے بخار کی مدہوشی میں ذوالقرنین نے دو تین بار کچھ کہا۔ خدیجہ نے اٹھ کر سنا۔ اس کا بھائی بہت مدھم آواز میں دلفگار لہجے میں ''نور'' کا نام لے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

اس نے نور سے وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ اب بھی اس سے اپنے بھائی کے حوالے سے بات نہیں کرے گی اور وعدہ ایفا کرنا خدیجہ کی خو تھی لیکن وہ کم از کم یہ تو کر سکتی تھی کہ مہرین کو فون کرتی اور اسے ذوالقرنین کی چوٹ کے بارے میں بتاتی۔ وہ جانتی تھی کہ مہرین رات کو دیر تک جاگتی ہے۔ اس کو فون کرنے کے لیے وہ فون سیٹ کے پاس آن بیٹھی۔ دل و دماغ میں کشمکش سی تھی۔ کافی دیر تک فون کے پاس بیٹھنے اور سوچنے کے بعد وہ نفی میں سر ہلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے اندر سے یہ آواز آ رہی تھی کہ کچھ باتوں کا فیصلہ وقت پر چھوڑ دیا جائے۔

☆☆☆

نور کمرے میں گم صم سی بیٹھی تھی۔ نئی ملازمہ ابھی ابھی کمرے میں صفائی کر کے گئی تھی۔ چاندی نام تھا۔ یہ مشکل پچیس چھبیس سال کی رہی ہوگی۔ قبول صورت تھی لیکن بڑی بجھی بجھی اور ڈری ڈری سی۔ ماتھے پر چوٹ کا پرانا نشان تھا، تھوڑا سا لنگڑاتی بھی تھی۔ کل تائی امی نے بتایا تھا کہ اس کا شوہر پچپن سال سے زیادہ عمر کا ہے اور اس کو بہت مارتا پیٹتا ہے۔

تائی امی کمرے میں آئیں تو نور نے پوچھا کہ یہ کیوں اس کی مار کھاتی ہے؟

تائی بولیں۔ ''دور دراز علاقے کے رہنے والے ہیں۔ راجن پور کے آس پاس۔ اس کی شادی زبردستی کی گئی تھی۔''

''وہ کیوں؟''

''کوئی لمبا چکر تھا۔ اس کے بھتیجے نے کسی لڑکی کو بھگایا تھا۔ لڑکی والوں نے پنچایت بلائی۔ ایسی پنچایتوں میں بڑے بڑے منحوس فیصلے ہوتے ہیں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ ملزم لڑکے کی بہن کی شادی لڑکی کے باپ سے کر دی جائے لیکن دوسری پارٹی نہیں مانی۔ وہ لڑکی بہت چھوٹی تھی مشکل سے چودہ پندرہ سال کی۔''

''تو پھر؟''

''پھر ملزم پارٹی نے آفر کی کہ ہم لڑکے کی چھوٹی پھوپی چاندی کا رشتہ دے دیتے ہیں۔ چاندی بھی اچھی شکل کی تھی مگر اس کو پہلے شوہر سے طلاق ہو چکی تھی، بچہ وغیرہ کوئی نہیں تھا۔ اس بار مدعی پارٹی نہیں مانی۔ انہوں نے کہا ہمیں کنواری کے بدلے کنواری چاہیے۔ اندازہ لگاؤ ان لوگوں کی جاہلیت کا۔ مرد عورت کا رشتہ کتنا خوبصورت اور خوشبودار ہوتا ہے لیکن ایسے لوگ اسے بدلے کی آگ سے گھناؤنا اور مکروہ بنا دیتے ہیں۔''

''پھر کیا ہوا؟'' نور نے پوچھا۔

''وہی سودے بازی۔ معتبر لوگوں کے بیچ میں پڑنے سے مدعی پارٹی چاندی کے رشتے پر مان تو گئی مگر ساتھ میں دو بھینسوں اور نقد رقم کی صورت میں بہت سا جرمانہ بھی وصول کیا۔ اب یہ بے چاری اپنے سے دو گنا عمر کے شوہر کے ساتھ بسر کر رہی ہے۔ وہ پکا جواری ہے، بہت کچھ ہار چکا ہے۔ اب گھر میں پڑا اینٹھتا ہے۔ یہ بے چاری گھروں میں کام کرتی ہے۔''

''یعنی اپنے بھتیجے کے کیے کی سزا بھگت رہی ہے؟''

''بالکل۔ ایسی کہانیاں ہمارے دیہاتوں اور گوٹھوں میں ہر جگہ بکھری ہوئی ہیں نور...... کنواری کے بدلے کنواری۔ بیاہتا کے بدلے بیاہتا۔ یا ایک کنواری کے بدلے دو بیاہتا......سن کر اور دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم پتھر کے زمانے میں بستے ہیں اور ہم پر جنگل کے قانون لاگو ہوتے ہیں۔''

''ایسا قانون جس میں مردوں کے کیے ہوئے کی سزائیں بھی صرف عورتوں کو ہی ملتی ہیں۔'' نور نے تائیدی انداز میں کہا۔

''بالکل......اب یہی چاندی والا معاملہ ہی دیکھو۔ اس کا کیا قصور تھا؟ یہ بیٹھی بٹھائی اس گھپرے میں آ گئی۔ لڑکے کی پھپو کی حیثیت سے اسے قربانی دینا پڑی۔ اچھی صورت کی تھی، جوان تھی، بھگائے جانے والی لڑکی کا کوئی جوان بھائی یا چچا وغیرہ ہوتا تو اس کے پلے باندھ دی جاتی۔ کوئی ایسا نہیں تھا اس لیے لڑکی کے کھوسٹ باپ نے یہ جرمانہ وصول کیا اور اسے اپنے گھر ڈال لیا۔''

نور آہ بھر کر رہ گئی۔

اسی دوران میں پی ٹی سی ایل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

نور نے دیکھا، یہ فون انہی چھوٹی لڑکیوں کی طرف سے تھا جن سے ایک دن ریستوران میں ملاقات ہوئی تھی۔ ظاہر تھا کہ انہوں نے ایتھلیٹکس کے حوالے سے ہی بات کرنا تھی۔ آج کل نور کا دل بالکل نہیں چاہ رہا تھا کہ اس موضوع پر بات کرے یا اس بارے میں سوچے۔

اس نے فون نہیں اٹھایا۔ کچھ دیر بعد پھر بیل ہونے لگی۔ تیسری بار بیل ہوئی تو نور نے کال ریسیو کرلی۔ بچیوں کی والدہ بول رہی تھی۔ اپنی اندرونی کیفیت کو دباتے ہوئے نور نے خوش خلقی سے بات کی۔

بچیوں کی والدہ صباحت بولی۔ ''نور! تم میری بچیوں کی آئیڈیل ہو۔ وہ دونوں بڑی دلچسپی لے رہی ہیں رننگ میں۔ اس حوالے سے میں تم سے دو منٹ بات کرنا چاہتی ہوں۔''

''جی کہیں۔''

''میں ایک بڑی بہن کی طرح تم سے آزادانہ بات کرسکتی ہوں۔ تمہاری طرح ہم بھی ایک دینی رجحان والے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ کیا طریقہ ہوسکتا ہے نور کہ بچیاں پُروقار طریقے سے اور اپنے حجاب کو برقرار رکھتے ہوئے بھی اس طرح کی صحت مند تفریحات میں حصہ لے سکیں؟''

''یہ تو بڑا لمبا موضوع ہے صباحت صاحبہ لیکن جو کچھ میری ادنیٰ سمجھ میں آیا تھا، وہ میں نے ایک اخباری انٹرویو میں بھی تفصیل سے بیان کیا تھا۔ آپ......''

''ہاں۔ وہ انٹرویو میں نے بھی پڑھا تھا۔'' صباحت نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''تمہاری کچھ باتیں ابھی تک میرے ذہن میں ہیں۔ اس میں تم نے ایک لباس کا آئیڈیا بھی پیش کیا تھا جو لڑکیاں اور خواتین رننگ کے وقت پہن سکتی ہیں۔ ظاہر ہے نور، خواتین کے جسم کے کچھ حصے ایسے ہیں جنہیں کسی بھی طرح نمایاں نہیں ہونا چاہیے اور مردوں کے سامنے تو بالکل نہیں۔''

''جی ہاں۔ اس لباس میں، میں نے یہی چیز مدنظر رکھی تھی۔ بہت سی نئی لڑکیوں نے اسے اپنایا ہے اور مفید پایا ہے۔''

''نیکر کے بجائے غالباً ٹراوزر قسم کی چیز تھی۔'' صباحت نے کہا۔

''ہاں لیکن زیادہ کھلا ٹراوزر نہیں اور کپڑا بھی ہلکا پھلکا لچکدار اور ملائم ہو۔ جو سامنے سے ہوا کی مزاحمت نہ کرے۔ لباس کا اپر کولہوں سے نیچے تک جاتا ہے اور بھاگتے ہوئے بھی آپ کے جسم کے ساتھ رہتا ہے، سامنے کی طرف دو ایک جگہ ہلکی پھلکی پیکنگ ہے جو باڈی کی شیپ کو نمایاں نہیں ہونے دیتی۔ آپ کہیں گی تو میں آپ کو انٹرویو کی فوٹو اسٹیٹ بھجوا دوں گی۔ تفصیل سے دیکھ لیجیے گا......'' اب وہ پیچھا چھڑانے کے موڈ میں تھی۔

بہتر ہوا کہ دوسری طرف کوئی بچہ رونے چلّانے لگا اور صباحت نے کہا۔ ''اچھا نور! چھوٹا بیٹا رو رہا ہے، پھر بات کریں گے۔''

نور کو یہ ساری گفتگو بوجھ محسوس ہوتی تھی۔ اس نے سکھ کا سانس لیا، عجیب کیفیت تھی اس کی۔

یہ دوسرے روز کی بات ہے، سہ پہر اور شام کے درمیان ایک کمزور سی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔

نور کمرے میں بیٹھی تھی۔ مہرین لپکتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور بولی۔ ''مبارک ہو بھئی۔ کوئی مٹھائی وغیرہ ہونی چاہیے۔'' نور کا دل دھڑک اٹھا۔ اسے لگا جیسے شاید اس کے حوالے سے کوئی اچھی خبر ہے۔ واپڈا والی نوکری خطرے میں دیکھ کر اس نے دو تین اور جگہوں پر ٹرائل دے رکھے تھے۔ اس نے سمجھا شاید کہیں سے کوئی لیٹر آیا ہے مگر مہرین کی مبارک دوسرے حوالے سے تھی، اس نے کہا۔ ''آل پنجاب تقریری مقابلے میں گولڈ میڈل جیتا ہے بسمہ نے...... تمہیں ابھی تک خبر نہیں ہوئی؟''

بسمہ کی کامیابی کا سن کر نور کا دل بلّیوں اچھل گیا، مہرین کہہ رہی تھی۔ ''مجھے تو دوپہر ایک بجے ہی پتا چل گیا تھا، میں نے سمجھا تم تک بھی خبر پہنچ چکی ہوگی۔''

خوشی کے اس موقع پر نور کو اپنے سینے میں کچوکا سا محسوس ہوا۔ شام ہونے کو آئی تھی اور وہ ابھی تک اپنی بہن کی اتنی اہم کامیابی سے بے خبر تھی۔ وجہ صاف ظاہر تھی، ابا جان نے جو پابندیاں لگا رکھی تھیں، ان کے سبب دونوں گھروں میں اطلاعات کا تبادلہ کم ہی ہوتا تھا۔ ابا جان نے ابھی تک ٹیلی فون بھی نہیں لگوایا تھا۔

ابھی نور اور مہرین باتیں ہی کررہی تھیں کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ دوسری طرف بسمہ تھی، کسی پی سی او سے بات کررہی تھی۔ ''نور! میں نے گولڈ میڈل جیت لیا۔'' وہ چھوٹتے ہی بولی۔ اس کی آواز جذبات کی شدت سے کپکپا رہی تھی۔

''ہاں...... مجھے ابھی پتا چلا ہے مہرین سے۔ بہت بہت مبارک ہو۔'' وہ بولی۔

نور کے لہجے میں اداسی کی جھلک کو بسمہ نے فوراً نوٹ کیا۔ بولی۔ ''ویری سوری نور! میں تمہیں دوپہر کو ہی اطلاع دینا چاہ رہی تھی مگر ابا جان اور چھوٹی امی ساتھ تھیں۔ موقع ہی نہیں ملا۔''

''چلو کوئی بات نہیں۔ دوپہر کو تمہارا فون نہیں آیا تو میں نے یہی سمجھا کہ فائنل آج نہیں ہوگا۔''

''بس اب جلدی سے گھر آجاؤ۔ اکٹھے ''سیلیبریٹ'' کریں گے، آپی بتول بھی آئی ہوئی ہے۔''

''ابا جان کا موڈ کیسا ہے؟'' نور نے پوچھا۔

''بالکل ٹھیک ہے۔ نہ بھی ہو تو چھوٹی امی ہیں نا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے۔ وہ بھی کہہ رہی تھیں کہ نور اور مہرین کو بلالو۔''

اسی دوران میں رابطہ منقطع ہوگیا۔ بہرحال ضروری بات ہوگئی تھی۔ نور کو امید تھی کہ ابھی پھپو یا چھوٹی امی میں سے کوئی آئے گا اور نور کو اپنے ساتھ لے جائے گا مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ رات گزر گئی، اگلا روز بھی گزر گیا۔ اگلے روز شام کو تایا ابا گھر آئے تو انہوں نے نور کو بتایا۔ ''بھئی آج دعوت پر چلنا ہے۔''

''کہاں؟'' نور نے پوچھا۔

'' تمہارے گھر اور کہاں؟ بسمہ کی کامیابی پر تمہارے ابا جان نے کافی بڑا فنکشن کرڈالا ہے۔ پاس کے سارے رشتے دار آرہے ہیں۔ میرا خیال ہے جہاں بسمہ کے رشتے کی بات ہوئی ہے، وہ لوگ بھی آئیں گے۔''

''ہمیں تو کسی نے نہیں بتایا۔'' مہرین نے کہا۔

''چلو اب میں جو بتا رہا ہوں، تیار ہوجاؤ۔ نو بجے تک پہنچنا ہے۔''

نور کو سینے میں چبھن سی محسوس ہوئی۔ نجانے کیوں اسے یوں لگا کہ ابا جان کی طرف سے بسمہ کی کامیابی پر خوشی کا یہ غیر معمولی اظہار اسے دکھانے کے لیے بھی ہے۔ جیسے وہ اسے بتانا چاہتے ہوں اور تایا ابا کو بھی بتانا چاہتے ہوں کہ یہ ہوتی ہے کامیابی اور یوں ملتا ہے والدین کی فرمانبرداری کا صلہ۔ یہ بات نہیں تھی کہ نور اپنی بہن کی کامیابی پر خوش نہیں تھی۔ اس کی کامیابی کا سن کر اس کے دل کی اتھاہ گہرائی سے خوشی کے سوتے پھوٹے تھے مگر ابا جان اور دیگر اہلِ خانہ کے رویے نے اسے تھوڑا سا افسردہ کیا تھا۔

تقریب میں کافی مہمان تھے۔ بسمہ کے ہونے والے سسرالی بھی آئے تھے۔ باقاعدہ کیک کاٹا گیا اور بسمہ کی کامیابی کو سیلیبریٹ کیا گیا۔ بسمہ کے متوقع سسرالیوں سے ابھی تک نور کی باقاعدہ ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ایک انکل نے نور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ بیٹی کون ہے؟''

دادی نے کہا۔ ''چھوٹی پوتی ہے میری۔ پچھلی دفعہ کہیں گئی ہوئی تھی، آپ سے نہیں ملی ہوگی۔''

''اچھا یہ وہی ہیں جو ریس وغیرہ میں بھی حصہ لیتی ہیں۔'' انکل نے اپنی نیم سفید ریش میں انگلیاں چلا کر ذرا چبھتے لہجے میں کہا۔

''ایک مرتبہ..... شاید گر بھی گئی تھیں، تصویریں وغیرہ آئی تھیں۔'' ایک لڑکی بے ساختہ بول اٹھی۔

تایا ابا نے مسکرا کر کہا۔ ''آپ کو بس گرنا یاد رہ گیا، کچھ اور یاد نہیں آیا۔ یہ صوبائی اور قومی سطح کے مقابلوں میں کئی بار وکٹری اسٹینڈ تک پہنچ چکی ہے۔ اس کا کمرا ایوارڈز اور ٹرافیوں سے بھرا ہوا ہے.....''

بسمہ کے ہونے والے دیور نے کہا۔ ''دراصل انکل! کرکٹ کا کھیل باقی سب کھیلوں کو کھا گیا ہے، ان بے چارے ہاکی والوں کو ہی دیکھ لیں۔ قومی ٹیم میں آکر ریٹائرڈ بھی ہوجاتے ہیں لیکن ہم انہیں شکلوں سے نہیں پہچانتے۔ کچھ کے تو نام بھی معلوم نہیں ہوتے اور جب ہاکی جیسے قومی کھیل کا یہ حال ہے تو باقیوں کا کیا پوچھنا۔''

''ایسی بات نہیں ہے۔'' تایا ابا نے دفاع کیا۔ ''بے شک کرکٹ بہت حاوی ہوچکی ہے مگر دیگر کھیلوں کے پرستار بھی موجود ہیں۔''

''چلیں جی۔ آپ کہتے ہیں تو ہم مان لیتے ہیں۔ ویسے بھی لڑکی والوں سے ہمارا بحث کرنا تو بنتا ہی نہیں ہے۔'' بسمہ کے ہونے والے سسر نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ سب ہنسنے لگے۔

نور کو یہاں بہت بے چینی محسوس ہو رہی تھی، وہ اپنا اسکارف درست کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ شاید اس کا اٹھنا ہی بہتر تھا کیونکہ ابا جان کو بھی اس کی موجودگی زیادہ اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اپنے نئے رشتے داروں سے اسے اور اس کے شوق کو چھپانا چاہتے ہیں۔

وہ دیر تک بسمہ کے پاس رہنا چاہتی تھی لیکن پتا نہیں کیوں کھانا کھائے بغیر ہی واپس تایا ابا کے گھر آگئی۔

تایا ابا کو ساری صورتِ حال کا اندازہ ہو رہا تھا۔ بے شک بسمہ نے اہم کامیابی حاصل کی تھی مگر اس کامیابی کو جس طرح سیلیبریٹ کیا گیا تھا، اس میں ایک طرح کی مسابقت بھی شامل تھی۔ تایا ابا کو اس بات پر بھی رنج تھا کہ اشفاق نے اس گیٹ ٹو گیدر کے سلسلے میں کوئی مشورہ نہیں کیا تھا اور ان لوگوں کو بالکل آخر وقت میں اطلاع دی تھی۔ اس کا جواب دینے کا موقع بھی تایا ابا کو جلد ہی مل گیا۔

مہرین فزیوتھراپی کے دوسرے سال میں تھی، اس نے فزیوتھراپی میں نئے رجحانات اور اسپورٹس میں ان کے

اطلاق کے موضوع پر ایک مضمون لکھا تھا۔ یہ مضمون نہ صرف پاکستان میں بلکہ انگلینڈ کے ایک اچھے میڈیکل میگزین میں بھی شائع ہوا اور اسے طبی حلقوں میں پذیرائی ملی۔ انگلش جریدے کی طرف سے مہرین کو معقول معاوضہ اور تعریفی... سرٹیفکیٹ بھی موصول ہوا۔ تایا خلیل نے بھی نامعقول اشفاق کو جواب دینے کے لیے فوراً ایک تقریب کا اہتمام کر ڈالا۔ یہ تقریب بھی گھر میں ہوئی اور اس میں کافی مہمان شریک ہوئے۔ اپنی دونوں بہنوں کی کامیابی پر نور دل کی گہرائی سے خوش تھی لیکن پتا نہیں کیوں یہ دونوں تقاریب اس کے لیے بوجھل ثابت ہوئیں۔ اس نے خود کو بالکل سائڈ لائن پر محسوس کیا۔ اب بھی کبھی اسے محسوس ہونے لگتا تھا کہ شاید اس نے واقعی اپنے لیے ایک غلط لائن منتخب کرلی تھی۔ یہ اس کا میدان ہی نہیں تھا یا پھر میدان تو تھا لیکن وہ درست طور پر اس میں داخل نہیں ہوئی تھی، جب وہ داخل ہوئی تو اس کے ساتھ ایک بددعا تھی اور یہ بددعا کسی اور نے نہیں اس کے والد نے دی تھی۔

دو تین روز بعد جب نور ایف اے ایس میں پریکٹس کے بعد گھر واپس آئی تو اسے ایک اور دھچکا لگا، ایک لیٹر اس کا منتظر تھا۔ اس تحکماتی لیٹر میں بڑے محتاط الفاظ استعمال کرتے ہوئے نور کو نوکری سے جواب دے دیا گیا تھا۔

اسے ہمت نہیں ہوئی کہ تایا ابا کو بتاتی تاہم اس نے مہرین کو بتادیا۔ ''یہ سراسر ناانصافی ہے۔'' مہرین نے تڑخ کر کہا۔ ''مجھے شک ہے کہ اس سلسلے میں بھی نشو بجلی کا گروپ کام کررہا ہے۔''

''نہیں بھئی، ہمیں ہر معاملے میں ان کا ہاتھ نہیں ڈھونڈنا چاہیے۔''

''تو پھر اور کیا وجہ ہوسکتی ہے نور! تم اب فٹ ہو، باقاعدگی سے رننگ بھی کررہی ہو۔ میڈم فرحانہ کہہ رہی تھیں کہ تمہاری یہی روٹین رہے تو تم دو تین ماہ میں پہلے والی فارم حاصل کرسکتی ہو۔''

وہ بے دم سی ہوکر کرسی پر بیٹھ گئی اور جوتے اتار کر دور پھینک دیے۔ بال سمیٹتے ہوئے بولی۔ ''کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ میں کسی اور سے نہیں اپنی قسمت سے لڑرہی ہوں۔''

اس سے پہلے کہ مہرین جواب میں کچھ کہتی تایا ابا کی آواز آئی۔ ''کہاں ہو لڑکیو! میں ڈھونڈ رہا ہوں تمہیں۔''

نور نے جلدی سے کہا۔ ''تایا ابا کو جاب کے بارے میں کچھ نہیں بتانا۔''

مہرین نے اثبات میں سر ہلایا۔

تایا ابا کے ہاتھوں میں کچھ کپڑے تھے جو وہ درزی سے لے کر آئے تھے۔ یہ نور اور مہرین کے دو دو سوٹ تھے جو انہوں نے امنالے کے میلے پر لے کر جانے تھے۔ ایک زرق برق سوٹ تائی امی کا بھی تھا۔ وہ ہمیشہ سے خوش لباس تھیں اور دادی اماں کے طعنے ان کی خوش لباسی پر کبھی کوئی منفی اثر نہیں ڈال سکے تھے۔ دوسروں کی طرح وہ بھی (پڑھی لکھی ہونے کے باوجود) امنالے کے میلے کا شدت سے انتظار کرتی تھیں۔

تایا ابا نے کہا۔ ''پرسوں صبح سویرے روانگی ہے، جو کام نمٹانے ہیں آج نمٹالو۔ میں ذرا گاڑی کا تیل فلٹر بدلوانے جارہا ہوں۔''

وہ چلے گئے۔ نور اسی طرح خاموش بیٹھی رہی۔ مہرین نے بے تکلفی سے اس کی گود میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''باجی جان! موڈ ٹھیک کریں۔ اپنا زندگی میں اونچ نیچ چلتی رہتی ہے کبھی کے دن بڑے کبھی کی راتیں۔ سب اچھا ہوجائے گا، آپ بس تیاری فرمائیں۔''

''پتا نہیں کیوں دل بجھ سا گیا ہے مہرین۔''

''اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ تیاری فرمائیں۔ چند دن کے لیے آب و ہوا تبدیل ہوگی، ماحول تبدیل ہوگا تو جناب کے دماغ میں جھاڑو پھرے گا اور کافی کچرا شچرا نکل جائے گا۔''

وہ دیر تک نور کو قائل کرتی رہی اور آخر کافی حد تک کامیاب ہوگئی، یقیناً ابا جان بھی جارہے تھے اور یہ آس ہمیشہ نور کے دل میں موجود رہتی تھی کہ شاید ابا جان کے قریب رہنے سے کسی وقت کوئی ایسا موقع بھی مل جائے جو ان کی دوریاں ختم کردے۔ انا اور بیگانگی کی وہ بلند دیوار گرجائے جو ان دونوں کے درمیان حائل ہوچکی تھی۔

اگلے روز نور اور مہرین بھی دیگر لڑکیوں کے ساتھ روانگی کی تیاری میں لگ گئیں۔ نور اور مہرین نہیں جانتی تھیں...... بلکہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ اس مرتبہ ان کا یہ سفر کتنا تہلکہ خیز ثابت ہونے والا ہے۔ کچھ حالات ''ماحول کے ہم رنگ سانپوں'' کی طرح ہوتے ہیں، مدتوں گھات لگائے خاموش پڑے رہتے ہیں۔ ان کے اندر زہر پنپتا رہتا ہے۔ وہ اپنے شکار کا انتظار کرتے رہتے ہیں...... اور آخر جھپٹ پڑتے ہیں۔ یہاں بھی کچھ سانپ موجود تھے۔ یہاں بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال تھی۔

☆☆☆

امنالے کا میلا تو خوشی کا باعث ہوتا ہی تھا۔ اس کی

تیاریاں بھی خوشی وشادمانی کے زمرے میں آتی تھیں...... تیاری مکمل تھی اور اب سفر درپیش تھا۔ ایک اسٹیشن وین اور تین گاڑیاں لاہور سے گجرات کی طرف روانہ ہورہی تھیں۔ شرجیل، عثمان، مہرین اور نور اسٹیشن وین میں تھے۔ ابا جان کو یہ بات اچھی تو نہیں لگی تھی مگر مہرین، بسمہ کو کھینچ تان کر اسٹیشن وین میں لے آئی تھی۔ اس نے آپی بتول کو بھی آنے کا کہا تھا مگر وہ ابا جان اور چھوٹی امی زلفت کے ساتھ ٹویوٹا گاڑی میں رہی تھیں۔ خوشی کے موقع پر نور بھی سب میں گھل مل جایا کرتی تھی مگر اس دفعہ ایسا نہیں ہوسکا تھا۔ وہ کوشش کے باوجود خود کو دوسروں میں مکس نہیں کرپارہی تھی۔ پتا نہیں کیوں بار بار اس کا دھیان چار پانچ روز پہلے والے واقعے کی طرف چلا جاتا تھا۔ آخر وہ ذوالقرنین سے بات کیوں نہیں کرپائی تھی؟ کیوں اس کی غلط فہمیاں دور کرنے میں ناکام رہی تھی؟ کیا وہ واقعی غلط فہمیاں ہی تھیں؟ یہ سوال اسے اندر سے لرزا دیتا تھا۔ وہ جس شخص کو پسند ہی نہیں کرتی تھی اس سے دوٹوک بات کرنے میں کیا چیز مانع آگئی تھی؟ اسے جیسے اپنی ہی سمجھ نہیں آرہی تھی۔

اس کی پژمردگی کی دوسری وجہ یقیناً یہ بھی تھی کہ اس کی ڈیپارٹمنٹل جاب ختم ہوگئی تھی اور اپنی پریکٹس وغیرہ جاری رکھنے کے لیے اس پر اضافی بوجھ پڑنے والا تھا۔ کبھی کبھی تو اسے یوں لگتا تھا جیسے شاید وہ مستقبل میں پوری تندہی کے ساتھ رننگ پریکٹس جاری ہی نہ رکھ سکے۔ ان باتوں کے علاوہ ابا جان کا رویہ بھی اسے مسلسل ٹھیس پہنچارہا تھا۔ ان کی آنکھوں میں معافی یا رحم کی کوئی رمق اسے نظر نہیں آتی تھی۔

دادی اماں علیحدہ گاڑی میں پھپو حاجرہ اور خالہ عریفہ کے ساتھ موجود تھیں۔ یہ گاڑی ماموں مراد ڈرائیو کررہے تھے۔ دادی اماں پچھلی نشست پر تکیے کے سہارے نیم دراز تھیں۔ ان کی دواؤں والا شاپر بھی ان کے سرہانے رکھا تھا اور پھپو اس شاپر کی حفاظت پر مامور تھیں۔

سفر ہنسی خوشی کٹا۔ گجرات سے آگے پھالیہ کے نواح میں دوپہر کا کھانا ایک آب جو کے کنارے کھایا گیا۔ سردیوں کی سنہری دھوپ، ہلکی ہوا میں دور تک جھومتی ہوئی فصلیں اور درختوں کے تالیاں بجاتے ہوئے پتے۔ یہ ان لوگوں کا بچھڑا ہوا ماحول تھا اور اس ماحول میں آکر وہ سب عجیب سی آسودگی محسوس کرتے تھے۔

موراں والی گاؤں پہنچتے پہنچتے انہیں شام ہوگئی۔ میلے کے آثار گاؤں کے نواح سے ہی شروع ہوجاتے تھے۔ بہت سے شامیانے لگ چکے تھے۔ کچھ لگائے جارہے تھے۔ جھولوں کی تنصیب ہوچکی تھی۔ سرکس اور تھیٹر کی تزئین وآرائش کا کام تیزی سے جاری تھا۔ مٹھائیوں، سموسوں اور تِکّوں کی جانی پہچانی خوشبو دور ہی سے ان سب کے نتھنوں میں گھسنے لگی۔ گاؤں میں بھی سب کو معلوم ہوگیا کہ مہرا گھرانے کے لوگ بھی پہنچ گئے ہیں۔ اہلِ دیہہ کے جوش وخروش میں اضافہ ہوا۔

گاؤں والی رہائش گاہ تو اب مکمل طور پر فروخت ہوچکی تھی۔ ان لوگوں کا قیام اس پرانی حویلی میں تھا جو گاؤں سے کچھ فاصلے پر بارشی نالے کے کنارے واقع تھی۔ دریا بھی یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ حویلی تک جانے کے لیے ایک نیم پختہ رستہ بنادیا گیا تھا۔ اشفاق مہرا اور خلیل مہرا کی آمد سے پہلے ہی اس حویلی کو بالکل تیار کردیا گیا تھا۔ رنگ وروغن ہوا تھا۔ لان اور درختوں کی تراش خراش کی گئی تھی۔ کچن کا سامان بھرا گیا تھا اور دیگر ضروریات فراہم کی گئی تھیں۔ موراں والی سے آگے ایک زمیندار کے ڈیرے تک ٹیلیفون کی لائن آچکی تھی۔ وہاں سے آگے قریباً ایک کلومیٹر تک خلیل مہرا نے اپنے خرچے پر فون لائن کا انتظام کررکھا تھا۔ اس مرتبہ حویلی میں جنریٹر کی سہولت بھی مہیا تھی۔ مہرا فیملی کے پرانے ملازم اور ملازمائیں بھی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے حویلی میں موجود تھے اور خدمت کے لیے کمربستہ نظر آتے تھے۔

نور کے تایا ابا خلیل مہرا نے پرانے ملازم فدا حسین سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے اس دفعہ چودھری طغرل سے ملاقات نہیں ہوئی۔“

فدا حسین بولا۔ ”شاید آپ کو پتا نہیں چلا، پچھلی جمعرات چودھری صاحب کی والدہ فوت ہوگئی ہے۔“

”انا للہ وانا الیہ راجعون۔“ خلیل مہرا اور اشفاق مہرا نے ایک ساتھ کہا۔ پھر خلیل مہرا ذرا برہمی سے بولے۔ ”فدا حسین! تم لوگوں کو کسی طرح اطلاع تو کرنی چاہیے تھی۔“

”جی میں نے اپنے پتر کو پھالیہ بھیجا تھا تاکہ آپ کو فون کرسکے مگر آپ کا فون ملا ہی نہیں۔ وہ خود لاہور جاکر آپ کو بتادیتا پر ہڑتال تھی۔ پہیا جام تھا...... صبح چار بجے وہ فوت ہوئی۔ پیشی (ظہر) کے بعد جنازہ بھی ہوگیا۔“

”اوہو۔ ہمیں افسوس کے لیے جانا چاہیے۔“ نور کے ابا اشفاق مہرا نے کہا اور تھکاوٹ کے باوجود دونوں بھائی اٹھ کھڑے ہوئے۔

...... کچھ ہی دیر بعد وہ اپنی ٹویوٹا کار پر سوار تین

کلومیٹر دور گاؤں میں داخل ہو رہے تھے۔ وہ سیدھے چودھری طغرل کی حویلی میں پہنچے۔ میلے کے دنوں میں چودھری طغرل کی حویلی میں مسلسل چراغاں کیا جاتا تھا مگر اس بار صورتِ حال مختلف تھی۔

چودھری طغرل کے ملازموں نے خلیل مہرا اور مولوی اشفاق مہرا کو حویلی کی وسیع بیٹھک میں بٹھا دیا۔ تقریباً دس منٹ بعد چودھری طغرل اندر داخل ہوا۔ وہ ہمیشہ کی طرح کلف لگے...... کھڑکھڑاتے ہوئے بادامی رنگ کے شلوار قمیص میں تھا۔ سر پر اسی رنگ کی طرے دار پگڑی تھی۔

خلیل مہرا اور اشفاق مہرا نے گلے مل کر افسوس کا اظہار کیا اور نشستوں پر بیٹھ گئے۔ خلیل مہرا بولے۔ ''اس بات کا بھی بہت افسوس ہے کہ ہمیں بروقت اطلاع نہ مل سکی، ورنہ ہر صورت جنازے میں شریک ہوتے۔''

اشفاق مہرا نے کہا۔ ''آپ ہی ہمیں اطلاع کر دیتے۔ چھ سات گھنٹے کا راستہ تھا، ہم پہنچ ہی جاتے۔ ہمیں یہاں پہنچ کر اطلاع ملی ہے۔ ابھی ہم نے ماں جی کو نہیں بتایا۔ ان کو بھی بڑا دکھ ہونا ہے۔ وہ تو یہاں آتی ہی وڈی اماں جی سے ملنے کے لیے تھیں۔''

''چلو جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب تو دعا ہی کی جا سکتی ہے۔'' چودھری طغرل نے قدرے روکھے لہجے میں کہا۔

مولوی اشفاق مہرا نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ چودھری طغرل اور خلیل مہرا نے بھی اٹھا لیے۔ دعا کے بعد خلیل مہرا نے چودھری طغرل سے اس کے بیٹوں کے بارے میں پوچھا۔ ''ابدال اور وارث کہاں ہیں؟''

''کہیں نکلے ہوئے ہیں۔ شاید ڈیرے پر گئے ہیں۔'' چودھری نے مختصر جواب دیا۔

مولوی اشفاق مہرا نے کہا۔ ''اللہ تعالیٰ وڈی اماں کی بخشش کرے اور ان کے درجے بلند کرے۔ ہماری والدہ سے ان کی دوستی بڑی گہری تھی اور کئی طرح کی اونچ نیچ دیکھنے کے باوجود یہ برقرار رہی۔''

چودھری طغرل نے لمبی سانس لی اور عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''ہاں، وڈی اماں نے کئی دکھ بھی سہے پر یہ دوستی نبھاتی رہیں۔ کافی احسان ہیں ان کے تم لوگوں پر۔''

چودھری طغرل کے آخری الفاظ نے دونوں بھائیوں کو چونکایا پھر خلیل مہرا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''بے شک...... بے شک وہ بڑی مہربان عورت تھیں۔ سب کے لیے مہربان تھیں۔''

چودھری اسی سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''کچھ احسانوں کا تو لوگوں کو پتا ہے اور کچھ کا پتا بھی نہیں۔ بہرحال اب ان باتوں سے کیا فائدہ۔''

اسی دوران میں کسی قریبی کمرے سے کھنکھارنے اور بولنے کی مدھم آواز سنائی دی۔ خلیل مہرا اور اشفاق مہرا نے پہچان لیا۔ یہ چودھری طغرل کے بڑے بیٹے ابدال ہی کی آواز تھی۔ وہ شاید کسی ملازم سے بات کر رہا تھا اور طغرل نے کہا تھا کہ ابدال اور وارث گھر میں نہیں ہیں۔

شاید ابدال وغیرہ ان سے ملنا نہیں چاہتے تھے۔ چودھری طغرل کا رویہ بھی واضح طور پر بدلا ہوا نظر آتا تھا۔ اس رویے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ شاید اس میں والدہ کی موت کا دکھ بھی شامل تھا۔ یا پھر یہ بات کہ وہ لوگ آخری رسومات میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔

حویلی واپس آ کر خلیل مہرا اور اشفاق مہرا نے اپنی بیمار والدہ کو ان کی پرانی سہیلی وڈی اماں کی رحلت کی خبر سنائی۔ وہ کافی دیر گم صم رہیں پھر اپنی اوڑھنی سے نم آنکھیں صاف کرنے لگیں۔ وہ خود ان کے گھر جانا چاہتی تھیں مگر مولوی اشفاق مہرا نے کہا۔ ''ماں جی! آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ سفر کی تھکاوٹ بھی ہے۔ کل یا پرسوں کسی وقت چلے جائیں گے۔''

دو دن بعد وڈی اماں کا دسواں تھا۔ دسویں تک تو میلے کی تیاری کچھ سست رہی مگر پھر وہی ہوا جو ہوا کرتا ہے۔ مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا اور اکثر اوقات سوگ کی کیفیت میں بھی لوگ خوشی کے مواقع مکمل طور پر ضائع نہیں ہونے دیتے اور پھر وڈی اماں تو ویسے بھی پچانوے سال سے اوپر کی ہو کر گزری تھی۔ اس کے جنازے پر خاصا اہتمام کیا گیا تھا۔ پنجابی میں اسے وڈا کرنا کہتے ہیں۔ بعض برادریوں میں تو ایسے موقعوں پر باجے تک بجائے جاتے ہیں اور خیر خیرات کے علاوہ شیرینی وغیرہ بھی بانٹی جاتی ہے۔ خیر یہاں باجے تو نہیں بجائے گئے تھے مگر میٹھے چاول کی دیگیں پکی تھیں اور کچھ دیگر رسومات بھی ادا ہوئی تھیں۔

دسویں کے بعد امناں والے کا میلا پورے جوبن پر آ گیا۔ وہ ساری مصروفیات اور تفریحات شروع ہو گئیں جو اس میلے کا خاصہ تھیں۔ بارشی نالے کے ساتھ ساتھ مویشیوں کی منڈی لگ گئی۔ میلے کی دکانیں سجنے سنورنے لگیں۔ سرکس اور تھیٹر کی رونقوں میں اضافہ ہو گیا۔ جھولوں کی گردش بڑھ گئی...... اور پھر وہ دن آیا جب قدیم رسم کے مطابق علاقے کے لوگ اپنے اپنے ہتھیار رضاکارانہ طور پر مزار کے سامنے جمع کرا دیتے تھے...... اور سات دن کے لیے قرب و جوار

میں مکمل امن و امان کی فضا قائم ہوجاتی تھی۔ گاؤں کی عورتیں اور بچے گھروں کی چھتوں پر چڑھ کر یہ منظر دیکھتے تھے۔ مہرا گھرانے کی عورتیں بھی یہ رسم دیکھنے کے لیے، تین کلومیٹر کا فاصلہ طے کرکے اپنی پرانی حویلی سے گاؤں میں آ گئی تھیں۔ وہ اپنے فروخت شدہ گھر کی چھت پر موجود تھیں اور مزار کے سامنے اہلِ دیہہ کی طویل قطار دیکھ رہی تھیں۔ جہازی سائز کی سات بڑی بڑی چارپائیاں تھیں جن پر ہر طرح کا لائسنسی اسلحہ ڈھیر کیا جارہا تھا۔ باوردی پولیس اہلکار موجود تھے اور اسلحہ جمع کرانے والوں کو رسید نما کوپن دے رہے تھے۔ اسلحے سے بھی کوپن منسلک کیے جارہے تھے۔

قطار میں سے ایک شخص آگے بڑھتا، اپنا ہتھیار جمع کراتا، کوپن حاصل کرتا اور پھر مزار کی طرف رخ کرکے ادب سے سلام کرتا۔ اس کے بعد الٹے قدموں پیچھے پلٹ جاتا۔ اس عمل کے مکمل ہونے تک تقریباً ساتوں چارپائیاں مختلف اقسام کے چھوٹے بڑے آتشیں اسلحے سے لد گئیں۔

دوسرا مرحلہ رات کو تھا۔ اس میں ناجائز اسلحہ بھی اس قدیم کوٹھری میں جمع ہوجاتا تھا جہاں ناتک چندی اینٹوں کی دیواروں میں بے شمار خانے بنے ہوئے تھے اور تالے لگے ہوئے تھے۔

یہ رسم اور اس طرح کی ساری رسمیں اہلِ علاقہ کے دلوں میں گھر کر چکی تھیں۔ مثلاً آج ہی کے روز شام کے بعد گھروں میں ڈھولک بجانے اور گیت گانے کی رسم بھی ادا ہوتا تھی۔ یہ ترنجن سے ملتی جلتی تقریب تھی۔ انگیٹھیاں دہکائی جاتی تھیں، گڑ اور باداموں والا حلوا بنایا جاتا تھا۔ علامتی طور پر ایک آدھ رنگین چرخا بھی پاس رکھ لیا جاتا تھا اور سہاگنیں اور کنواریاں ملن اور جدائی کے گیت گاتی تھیں۔

بتول نے کہا۔ ”نور! آج رات تو یہیں رہیں گے۔ مزہ آئے گا۔“

نور بولی۔ ”آپی...... آپ کو پتا بھی ہے، مجھے یہ ڈھولک شولک اچھی نہیں لگتی۔“

چھوٹی امی زلفت نے کہا۔ ”تو مت ڈھولک بجانا تم۔ سن تو سکتی ہونا۔“

”نہیں چھوٹی امی! میری طبیعت بھی ٹھیک نہیں۔ میں ابا جان کے ساتھ حویلی چلی جاؤں گی۔ صبح پھر آجاؤں گی۔“

ایک عورت نے بسمہ سے مخاطب ہوکر ذرا تیکھے لہجے میں کہا۔ ”بسمہ! تمہاری یہ بہن شروع سے ہی دوکھرے ٹائپ کی ہے۔ اس کو تو اپنے ساتھ شامل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ جس طرح مردوں کی کبڈی ہوتی ہے، اسی طرح ہم عورتوں کی بھی کبڈی رکھ لیں۔“

سب ہنسنے لگیں...... نور کا چہرہ سرخ ہوگیا مگر اپنی ماں کی عمر کی عورت کو جواب دینا اس نے مناسب نہیں سمجھا اور اٹھ کر اور سیڑھیاں اتر کر نیچے چلی گئی...... اور بات صرف اس ایک عورت کی ہی نہیں تھی۔ یہاں بیشتر عورتیں اسے تنقیدی نظر سے ہی دیکھتی تھیں۔ خاص طور سے بڑی عمر کی عورتوں کی نگاہوں میں تو اس کے لیے واضح بیگانگی اور تلخی نظر آتی تھی۔ یہ بات ان کے لیے کسی طور پسندیدہ نہیں ہوسکتی تھی کہ ایک لڑکی مردوں کی طرح بھاگ دوڑ کرے اور مقابلوں میں حصہ لے...... اور لڑکی بھی کوئی عام نہیں، مولوی اشفاق مہرا کی بیٹی...... گھر کے وسیع صحن میں موجودہ مالک مکان حاجی اکرام صاحب کے بچے جھنڈیاں وغیرہ تیار کررہے تھے۔ وہ برآمدے میں سے گزری۔ ایک کمرے سے ابا جان کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ کمرے میں اکرام صاحب کے اہلِ خانہ موجود تھے اور وہ ان میں بیٹھے بسمہ کی باتیں کررہے تھے۔ اس کامیابی کا ذکر ہورہا تھا جو بسمہ کو چند دن پہلے تقریری مقابلوں میں حاصل ہوئی تھی۔ اس بارے میں بات کرتے ہوئے ابا جان کے لب و لہجے میں ایک سرشاری سی بھر جاتی تھی۔

نور ایک طویل سانس لیتی ہوئی صحن کی طرف بڑھی اور اسے عبور کرکے ڈیوڑھی کی طرف آ گئی۔ یہ سب وہی در و دیوار تھے جن میں اس کا بچپن گزرا تھا۔ چپے چپے پر

لوڈشیڈنگ

ایک انگریز نے پاکستان آکر اردو سیکھی۔ جب واپس گیا تو لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے کیا بولنا سیکھا تو اس نے کہا۔ ”لائٹ چلی گئی ہے۔ لائٹ آگئی ہے۔ لائٹ جانے والی ہے۔ لائٹ آنے والی ہے۔ لائٹ نہیں آئی۔ لائٹ نہیں گئی۔ لائٹ جا بھی سکتی ہے۔ لائٹ آ بھی سکتی ہے۔ لائٹ ڈم آرہی ہے۔ لائٹ تیز آرہی ہے۔ لائٹ آ کیوں نہیں رہی۔ لائٹ جا کیوں نہیں رہی۔ لائٹ ابھی تو آئی تھی لو پھر چلی گئی۔“

مرسلہ: کاشف قیوم، کراچی

یادیں نقش تھیں مگر اب یہ سب کچھ کسی اور کی ملکیت تھا۔ مہرا فیملی کی حیثیت یہاں ایک دو دن کے مہمان جیسی تھی۔ اس نے اسکارف درست کیا۔ اوڑھنی اچھی طرح لپیٹی اور باہر آگئی۔ سامنے ہی پرالی کے ڈھیر لگے تھے اور کالی سیاہ بھینسیں کھرلی میں منہ مار رہی تھیں۔ تایا زاد عثمان گاڑی کے پاس کھڑا بچپن کے کسی ہم جولی سے گپ شپ کر رہا تھا۔ نور کو دیکھ کر وہ چونکا اور پاس آگیا۔ ''کیا بات ہے نور؟''

''عثمان بھائی! طبیعت ذرا بوجھل سی ہو رہی ہے۔ پلیز مجھے حویلی چھوڑ آئیں۔''

''لیکن آج تو یہاں ڈھولک کا پروگرام تھا۔''

''نہیں بھائی۔ یہ نہ ہو بیمار پڑ جاؤں۔ آرام کر لوں گی تو کل تک ٹھیک ہو جاؤں گی۔''

''کسی دوا وغیرہ کی ضرورت تو نہیں؟'' عثمان نے اپنایت سے پوچھا۔ نور نے نفی میں جواب دیا۔

وہ عثمان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی اور حویلی چل دی۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی مگر ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ شام کے سائے لمبے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ وہ میلے کی رونق کے درمیان سے ہو کر گزرے۔ شامیانوں اور عارضی دکانوں کے آس پاس لوگوں کا ہجوم تھا۔ جگہ جگہ پنجابی میوزک بھی بلے ہو رہا تھا۔ نوجوانوں کی ٹولیاں ہلا گلا کر رہی تھیں۔ یکایک وہ چونکی۔ اسے ایک جانا پہچانا چہرہ نظر آیا۔ ہاں، یہ وہی تھا...... یہ وہی تھا۔ اس کے سر پر شاید پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس نے کالی گرم چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ وہ گاڑی کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ شاید ایک سیکنڈ کے لیے ان دونوں کی نگاہیں بھی ملی تھیں۔ پھر گاڑی آگے بڑھ گئی اور اس کی شکل اوجھل ہو گئی۔ شبہے کی گنجائش نہیں تھی۔ یہ ذوالقرنین ہی تھا۔ اس کی ایک جھلک کل شام بھی اس نے حاجی اکرام صاحب کے گھر سے باہر دیکھی تھی۔ اس وقت وہ مین دروازے پر کھڑا ابا جان اور تایا جان سے علیک سلیک کر رہا تھا۔ تب نور کی طرف اس کی پشت تھی۔ نور کو بس شک سا ہوا تھا کہ یہ ذوالقرنین ہے لیکن آج تو اس نے اسے صاف دیکھا تھا۔

عثمان پوری توجہ سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ نور کسی کو دیکھ کر بری طرح چونکی ہے۔ نور کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ یہاں کیوں تھا؟ کیا عام لوگوں کی طرح صرف میلا دیکھنے آیا تھا؟ یا پھر عام لوگوں کی طرح نہیں آیا تھا؟

حویلی کے مین گیٹ کے سامنے پہنچ کر عثمان نے نور کو ڈراپ کر دیا۔ وہ بولی۔ ''عثمان بھائی! تائی امی کو بتا دینا کہ میں یہاں آگئی ہوں۔''

''اوکے۔'' اس نے کہا اور واپس چلا گیا۔

ایک کمرے سے دادی اماں کی ہائے ہائے سنائی دے رہی تھی۔ وہ کسی وقت تکلیف میں ہوتی تھیں اور کسی وقت نہیں بھی ہوتی تھیں مگر عادتاً ہائے ہائے کرتی رہتی تھیں۔ اس وقت بھی پھپھو حاجرہ اور ایک ملازمہ ان کے پاس موجود تھیں اور ان کی مٹھی چاپی کر رہی تھیں۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر نور بستر پر گر گئی اور ذوالقرنین کے بارے میں سوچنے لگی۔ کیا وہ اکیلا تھا یا کوئی اور بھی اس کے ساتھ تھا؟ یوں تو شرجیل اور عثمان کے کچھ دوست بھی لاہور سے میلا دیکھنے کے لیے آئے تھے اور ویسے بھی لاہور سے لوگ یہاں پہنچتے تھے مگر ذوالقرنین کا یہاں نظر آنا نور کے لیے اہم اور پریشان کن تھا۔ اس کے ماتھے پر کوئی چوٹ وغیرہ بھی لگی ہوئی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ پھپھو یا شرجیل سے اس بارے میں کچھ پوچھے لیکن ہمت نہیں پڑی۔ خیالوں میں الجھی ہوئی وہ سو گئی۔

یوں تو لاہور میں اچھی سے اچھی چوڑیاں اور مہندی وغیرہ مل جاتی تھی مگر یہ بھی میلے کا ''کریز'' تھا کہ دوسرے دن شام کے وقت عورتیں میلے سے چوڑیاں، مہندی اور خوشبو وغیرہ خریدتی تھیں۔ مہرین اور دو ماموں زاد بہنیں نور کو بھی کھینچ کر اس شاپنگ کے لیے لے گئیں۔

نور نے ابھی تک مہرین کو بھی کل والے واقعے کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ نہ ہی مہرین نے کوئی ایسی بات کی تھی جس سے پتا چلتا کہ وہ یہاں ذوالقرنین کی موجودگی سے آگاہ ہے۔ لڑکیاں ایک ریڑھی والے کے پاس کھڑی گول گپے کھا رہی تھیں جب اچانک مہرین نے اس کے بازو پر چٹکی لی اور سرگوشی میں بولی۔ ''وہ دائیں طرف دیکھو ......کراکری کی دکان کے پاس۔''

نور نے اس رخ پر دیکھا اور اس کے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ وہاں لوگوں کے درمیان ذوالقرنین کی جھلک نظر آئی۔ وہ حسب معمول شلوار قمیص میں تھا اور ایک موٹر سائیکل کو اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''خدیجہ کا بھائی ہے نا یہ؟'' مہرین نے تیز سرگوشی کی۔

نور نے اثبات میں سر ہلایا۔

''یہ ذات شریف یہاں کیسے؟'' مہرین بولی۔

ذوالقرنین کا رخ دوسری طرف تھا۔ اس نے شاید اپنی چوٹ چھپانے کے لیے اور گرد و غبار سے بچنے کے لیے سر پر ڈبی دار رومال لپیٹ رکھا تھا۔ وہ جس موٹر سائیکل کو

ککس مار رہا تھا، وہ ایک عمر رسیدہ شخص کی تھی جو پاس ہی کھڑا تھا۔ چند سیکنڈ بعد موٹر سائیکل اسٹارٹ ہو گئی۔ عمر رسیدہ شخص خوش ہو گیا...... اور ذوالقرنین کے لیے غالباً شکریے کے الفاظ استعمال کیے۔

موٹر سائیکل آگے نکل گئی۔ ذوالقرنین کے دونوں ہاتھ سیاہ ہو رہے تھے۔ شاید کچھ دیر پہلے وہ موٹر سائیکل کے پلگ وغیرہ سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہا تھا۔ ہاتھ دھونے کے لیے اس نے اردگرد دیکھا اور پھر گول گپے والی ریڑھی کی طرف بڑھا، جہاں بالٹی میں پانی نظر آ رہا تھا اور یہی وقت تھا جب اس کی نگاہ نور وغیرہ پر پڑی۔ درمیانی فاصلہ بیس پچیس قدم کے قریب تھا۔ پھر بھی ذوالقرنین نے انہیں پہچان لیا۔ وہ ریڑھی کی طرف آتے آتے ذرا ٹھٹکا اور پھر رخ پھیر کر ایک شامیانے کی طرف بڑھ گیا جہاں چائے خانے کے باہر نلکا نظر آ رہا تھا۔ اس نے وہاں جا کر ہاتھ دھوئے۔ اس عمل کے دوران میں اس نے ایک دو بار اچٹتی نظروں سے نور اور مہرین کی طرف بھی دیکھا۔

مہرین نے کہا۔ ”یہ اصلاح معاشرہ یہاں بھی موجود ہے۔“

”ہاں۔ مجھے بھی کل شک ہوا تھا حویلی جاتے ہوئے۔“ نور نے پوری وضاحت نہیں کی۔

”بھئی! امنالے کی کشش لوگوں کو دور دور سے کھینچ لاتی ہے۔ پر پتا نہیں یہ امنالے کی کشش ہے بھی یا نہیں۔“ مہرین نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

وہ اب ہاتھ دھو کر سیدھا کھڑا ہو گیا تھا اور قدرے دراز قد ہونے کی وجہ سے ہجوم میں نمایاں نظر آ رہا تھا۔ شانے کشادہ اور سر اور ڈاڑھی کے بال ہموار تھے۔ چائے خانے والے لڑکے نے اسے ہاتھ پونچھنے کے لیے ایک تولیا رومال دے دیا۔ وہ شکریہ ادا کرنے کے بعد ہاتھ پونچھنے لگا۔ نگاہیں بدستور جھکی ہوئی تھیں لیکن تاثرات سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ نور اور مہرین کی نظروں کو اپنے چہرے پر محسوس کر رہا ہے۔

نور نے ہاتھ میں پکڑا ہوا گول گپا واپس تھالی میں رکھ دیا تھا۔ چہرے پر اسکارف درست کرتے ہوئے اس نے مہرین سے سرگوشی کی۔ ”چلو چلیں۔“

”بھئی! یہ دو تین گول گپے مجھے بددعائیں دیں گے۔ انہیں تو نگل لو۔“ اس نے پورا گول گپا منہ میں ڈالنے سے پہلے کہا۔

نور تھوڑا سا رخ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔ اسی دوران میں کہیں پاس ہی موجود سرکس کا شیر اپنے پنجرے میں دھاڑنے لگا۔ بہت سے لوگ اس کی دھاڑ دیکھنے اور سننے کے لیے سرکس کے شامیانوں کی طرف بھاگے۔ نور نے دیکھا کہ ایک نوجوان آیا اور ذوالقرنین کو بھی کھینچتا ہوا سرکس کی طرف لے گیا۔ ذوالقرنین جیسے جانا نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے جاتے ہوئے دو تین بار مڑ کر نور اور مہرین کی جانب دیکھا، پھر اسے ہجوم نے چھپالیا۔

گول گپے کھانے کے بعد گروپ کی چند لڑکیاں بھی شیروں کو دیکھنے کے لیے سرکس کے شامیانوں کی طرف چلی گئیں مگر نور دیگر لڑکیوں کے ساتھ میلے کے دوسرے حصے کی طرف روانہ ہو گئی، وہ اپ سیٹ تھی۔

☆☆☆

رات کو مہرین اور نور اپنے اپنے پلنگ پر لحاف اوڑھے لیٹی ہوئی تھیں۔ درمیان میں انگیٹھی دہک رہی تھی۔ لائٹ گئی ہوئی تھی مگر جنریٹر کا انتظام موجود تھا۔ کھڑکیوں سے باہر دسمبر کی یخ بستہ دھند...... جامن، مالٹے اور بیری کے ٹنڈ منڈ درختوں کو ڈھانپے ہوئے تھی۔

مہرین نے کہا۔ ”میں نے پھپو حاجرہ سے تھوڑی سی سن گن لی ہے۔ انہیں بھی پتا نہیں کہ خدیجہ کا بھائی یہاں آیا ہوا ہے۔ ہاں یہ کہہ رہی تھیں کہ لاہور سے اردو بازار کے تین چار دکاندار بھی میلا دیکھنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔“

”وہ کیوں کر رہا ہے ایسا؟“ نور نے کھوئی کھوئی سی آواز میں کہا۔

”ہوسکتا ہے کہ وہ خاص تمہارے لیے نہ آیا ہو۔“

”نہیں مہرین۔“ نور نے اپنی سبز جرسی کی آستینیں اوپر کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو خود کو دھوکے میں رکھنے والی بات ہے۔“

”کیا تم نے ٹھیک سے دیکھا تھا کہ پرسوں وہ ابا جان اور چچا جان سے بات کر رہا تھا؟“

”ہاں بھئی۔ یہی تھا لیکن تب مجھے صرف شک ہوا تھا۔ اگلے روز تصدیق ہو گئی۔“

دونوں خاموش ہو گئیں۔ باہر تاریکی میں کہیں کوئی رات کا پرندہ چہکارا۔ نور کے دل پر ایک بوجھ سا تھا۔ وہ اسے کچھ نہیں دے سکتی تھی، پھر اس کی آنکھوں میں سوال کیوں تھے؟ وہ کیوں ایک سراب کے پیچھے بھاگ رہا تھا؟ ہوسکتا ہے کہ وہ اتنا برا انسان نہ ہو۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اچھا انسان ہو لیکن نور کے ذہن میں جیون ساتھی کا جو تصور تھا، وہ اس سے بہت مختلف تھا۔

خاموشی کے وقفے کے بعد وہ دونوں پھر باتیں کرنے

لگیں۔ اس مرتبہ موضوع ابا جان کی ناراضگی تھی، جن کو لڑکیوں کا ڈھولک بجانا اور حاجی اکرام صاحب کے گھر رہنا بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ اتنے میں دادی جان کی لاٹھی کی ٹک ٹک سنائی دی پھر انہوں نے لاٹھی سے ہی کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ”اولڑکیو! کیا چوں چوں لگا رکھی ہے، آدھی رات ہونے والی ہے، سو جاؤ اب۔“

”اچھا دادی۔“ مہرین نے ناگواری سے کہا اور لحاف میں منہ گھسالیا۔ ”دس بجے کو آدھی رات کہہ رہی ہیں۔“ وہ بڑبڑائی۔

دادی نے کمرے میں جھانکا۔ دروازے کے پاس ہی نور کے جوگر پڑے تھے۔ انہوں نے لاٹھی سے ہی انہیں ایک طرف ہٹایا۔ جیسے وہ جوگر نہ ہوں، کوئی پلید بدبودار شے ہو۔ نور پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی اور بگڑ کر بولیں۔ ”کہا بھی ہے کہ جلدی سو جایا کرو۔ بند کرو لائٹ۔“

”ابھی کر دیتی ہوں۔ واش روم میں جانا ہے۔“ نور نے کہا۔

”بات ماننی ساری زندگی نہیں آئے گی تجھے۔ بات ماننے والی ہوتی تو اس حال کو نہ پہنچتی۔ ساری کی ساری ماں پر ہے۔“ ان کی آواز میں زخمی کرنے والی کاٹ تھی۔ وہ باہر نکل گئیں۔

نور کا دل چاہا کہ وہ چلا کر دادی سے کہے کہ اب تو وہ عرصے سے منوں مٹی کے نیچے سوئی ہوئی ہیں...... وہ اب تو انہیں معاف کر دیں مگر اس نے خود پر ضبط کیا اور ایک نہایت طویل، نہایت تلخ سا گھونٹ بھر کر رہ گئی۔ اس کی آنکھوں کے کنارے بے طرح جلنا شروع ہو گئے تھے۔ چند سیکنڈ بعد وہ دکھ آمیز جھلاہٹ کے ساتھ اٹھی اور لائٹ آف کرنے کے بعد مہرین کی طرح لحاف میں منہ گھسالیا۔

☆☆☆

اگلے روز موسم ابر آلود تھا۔ رات کو تھوڑے سے چھینٹے بھی پڑے تھے۔ بہت ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ خواتین نے حلوا پوری، چنوں اور دودھ پتی کا ناشتا کیا۔ نور چکنائی والی خوراک سے ذرا دور ہی رہتی تھی۔ اس نے دو تین سلائس، انڈے اور اورنج جوس سے کام چلایا۔

ابا جان، تایا جان اور ماموں مراد صبح سویرے ہی گاڑی پر کہیں نکل گئے تھے۔ نور نے محسوس کیا تھا کہ وہ کچھ پریشان بھی ہیں۔ چودھری طغرل کے گھرانے کی عورتیں بھی کہیں دکھائی نہیں دی تھیں۔ کل چوڑیوں کی خریداری کے موقع پر ابدال کی دو بہنیں نظر آئی تھیں مگر انہوں نے آنکھ نہیں ملائی تھی۔ نور اور مہرین نے اندازہ لگایا تھا کہ شاید طغرل گھرانے کے ساتھ کوئی تلخ ترش بات ہوئی ہے۔ تائی امی، چھوٹی امی زلفت اور پھوپھو حاجرہ وغیرہ کا بھی یہی خیال تھا۔

ناشتے کے فوراً بعد مہرین اس کے سر پر سوار ہو گئی۔

”چلو بھئی چلیں۔ اس مرتبہ بڑا زبردست آسمانی جھولا آیا ہے۔ مزہ آ جائے گا۔ دور دور تک سارا علاقہ نظر آئے گا۔“

”مہرین! آج نہیں۔ طبیعت بالکل بھی نہیں چاہ رہی۔“

”یار چھوڑو۔ دادی جان کی باتوں کو دل سے نہ لگایا کرو۔ تمہیں تو پتا ہے وہ جیسی ہیں۔“

وہ چپ رہی۔ وہ اسے کیا بتاتی، بات صرف دادی جان ہی کی نہیں تھی، یہاں کون تھا جو اسے اپنایت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ وہ ہر وقت جیسے بے مہر اجنبیوں کے حصار میں رہتی تھی۔ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے وہ ان گنت سوالیہ نگاہوں کی چبھن اپنے جسم پر محسوس کرتی تھی...... دیکھو اس لڑکی کو...... یہ مولوی اشفاق مہرا کی بیٹی ہے۔ یہ بتول اور بسمہ کی بہن ہے۔ یہ اپنے بڑوں کی نافرمان ہے۔ اسے باپ نے دھتکارا ہوا ہے۔ یہ ایک ایسا کام کرتی ہے جو عورتوں کے لیے باعثِ ننگ ہے۔

مہرین نے اپنی انگلی سے نور کے پہلو میں کچوکا دیا۔

”کیا مایوس صورت بنائی ہوئی ہے۔ بھئی، ہم کسی چہلم میں نہیں، میلے پر آئے ہوئے ہیں۔ دو دن بعد اس میلے سے دور ہوں گے اور ہر طرح کے جھمیلے سے قریب ہوں گے۔ چلو اٹھو، میں آج تمہیں گھر میں نہیں رہنے دوں گی۔“

چھوٹی امی بھی آ گئیں۔ وہ پہلی مرتبہ اس میلے میں آئی تھیں اور بہت انجوائے کر رہی تھیں۔ اس میلے کی انوکھی رسموں ریتوں نے بھی انہیں متاثر کیا تھا۔

چھوٹی امی اور مہرین کے زور دینے پر وہ بادل ناخواستہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ براؤن شلوار قمیص کے اوپر اس نے گہری براؤن جرسی پہنی اور لمبی شال کے ساتھ اسکارف پہن کر تیار ہو گئی۔ میلے کی گہما گہمی میں اضافہ ہو چکا تھا۔ بارش کے اندیشے کے پیشِ نظر خیمہ زن لوگوں نے اپنے خیموں پر بڑے بڑے پلاسٹک منڈھ دیے تھے اور دیگر احتیاطی تدابیر کی تھیں۔ کسی قریبی میدان میں آج کشتیوں کے مقابلے بھی ہو رہے تھے تاہم وہ ایونٹ شام کا تھا۔ ابھی تو لوگ دیگر تفریحات سے لطف لے رہے تھے۔ آپی بتول بسمہ اور ممانیوں سمیت مہرا فیملی کی اکثر عورتیں برقعوں میں تھیں۔ جو نہیں تھیں، انہوں نے بھی چہرے حجاب یا نقاب

میں چھپا رکھے تھے۔

اچانک نور نے محسوس کیا کہ نہ چاہنے کے باوجود اس کی نگاہیں ادھر ادھر بھٹک رہی ہیں ---- ایسا کیوں ہو رہا تھا؟ وہ اسے کیوں دیکھ رہی تھی؟ کیا وہ چاہتی تھی کہ وہ اسے نظر آئے ---- یا وہ یہ چاہتی تھی کہ وہ اسے نظر نہ آئے؟ نہیں نہیں، وہ اسے دیکھنے کے لیے تو نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے کیوں دیکھنا چاہے گی؟ وہ شاید لاشعوری طور پر چاہتی تھی کہ وہ یہاں سے جا چکا ہو۔ اس کا اردگرد نظر نہ آنا ہی نور کے لیے اچھا تھا۔ ہاں اسی لیے وہ اسے دیکھ رہی تھی۔

سب لڑکیاں آسمانی جھولے پر بیٹھیں اور دو تین بار بیٹھیں، جب بلند و بالا جھولا اوپر جاتا تھا تو اردگرد کا علاقہ دور تک دکھائی دیتا تھا۔ پورا موراں والی گاؤں، اس کی گلیاں، اس کے پیچ و خم اور پھر آگے مویشی منڈی، خریداروں کا ہجوم، بائیں طرف ڈھائی تین کلومیٹر کے فاصلے پر بارشی نالے کا مٹیالا پانی اور اس پانی کے کنارے پرکھوں کی پرانی حویلی جہاں وہ قیام پذیر تھے۔ حویلی کے باہر کھڑی ان کی دو گاڑیاں کھلونوں کی طرح نظر آ رہی تھیں۔ اس نالے کے پار آگے تک درختوں، جھاڑیوں اور سرکنڈوں کے سلسلے تھے اور اس کی دوسری جانب پولیس چوکی کی چھت خاکستری دھبے کی طرح دکھائی دیتی تھی...... اس چھت پر شاید پولیس والوں کی وردیاں سوکھ رہی تھیں۔ دائیں کنارے پر ایک چٹیل میدان تھا جہاں سیم تھور کی سفیدی تھی۔ اس میدان کی ایک جانب موراں والی گاؤں کے کھیت شروع ہو جاتے تھے، جن میں سے کچھ پر ٹریکٹر چلائے گئے تھے اور کچھ پر کھاد، مکئی اور سرسوں کے کھیت لہلہا رہے تھے۔ ان کے درمیان پگڈنڈیاں اور گزرگاہیں تھیں۔ دور ایک ڈیرے پر ٹیوب ویل کے پانی کی موٹی دھار چاندی کی طرح چمکتی تھی۔ اس کے اردگرد بچے دوڑتے تھے اور چند عورتیں کپڑے دھوتی تھیں۔

جھولا ابھی رکا ہوا تھا۔ اس کی ڈولی بلندی پر تھی۔ مہرین نے کہا۔ ''اوپر سے چیزوں کو دیکھنا کتنا اچھا لگتا ہے۔''

''ہوں۔'' نور نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

مہرین بولی۔ ''آج تو وہ کہیں نظر نہیں آیا۔''

''اللہ کرے نہ ہی آئے۔''

''سچ کہہ رہی ہو؟'' وہ مسکرائی۔

''جب اس طرح بات کرتی ہو تو زہر لگتی ہو۔'' وہ چڑ کر بولی۔

وہ دونوں اس ڈولی میں اکیلی تھیں۔ اچانک نور کی نگاہ دور نیچے ایک منظر پر پڑی۔ اس نے چودھری طغرل کے چوڑے چکلے بیٹے ابدال کو دیکھا۔ وہ چمکیلے شلوار کرتے اور واسکٹ میں تھا۔ کندھوں پر چودھریوں کے انداز میں تہ شدہ گرم شال ڈال رکھی تھی۔ (یہ وہی تھا جس کے لیے پہلے آپی بتول اور پھر بسمہ کا رشتہ مانگا گیا تھا) ابدال کے پاس ہی ابا جان کا پرانا ملازم خدا بخش تھا۔ کافی فاصلہ تھا، پھر بھی پتا چل رہا تھا کہ ابدال بڑے سخت لہجے میں خدا بخش سے کچھ کہہ رہا ہے۔ کسی طرح کی تلخ کلامی تھی، پھر دو تین بندے آگے آئے اور انہوں نے صلح صفائی کا کردار ادا کیا۔

''یہ کیا چکر ہے؟'' مہرین الجھن سے بولی۔

''لگتا ہے کہ دو تین دن سے کچھ گڑبڑ ہے۔ کل ماموں مراد بھی بڑے غصے میں نظر آ رہے تھے۔''

''کہیں وہ پرانا معاملہ ہی تو پھر اٹھ کھڑا نہیں ہوا۔'' مہرین نے ذرا تشویش سے کہا۔

''یہ تو بڑے ہی بتا سکتے ہیں۔ تم جا کر ابا یا تایا جان سے پوچھنا۔''

اس منظر نے مہرین کا مزہ کرکرا کر دیا تھا۔ اس کا تفریحی موڈ ختم ہوتا نظر آ رہا تھا۔ گرم شال کو مضبوطی سے اپنے گداز شانوں پر لپیٹ کر بولی۔ ''پتا نہیں کب چلے گا جھولا؟''

''تمہیں تو بلندی اچھی لگ رہی تھی؟'' نور نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ (ویسے وہ بھی پریشان تھی)۔

''وہ تو ٹھیک ہے، مگر سردی بھی بڑی ہے۔''

''بلندی اچھی یا بری نہیں ہوتی۔ اردگرد کے منظر اچھے یا برے ہوتے ہیں۔ بلندی صرف اتنا کرتی ہے کہ ہمیں زیادہ کچھ دکھا دیتی ہے اور تفصیل سے۔''

''اچھا زیادہ فلسفہ نہ بگھارو۔ دعا کرو کہ یہ آسمانی چرخا چل پڑے۔ ہمیں اب گھر چلنا چاہیے۔'' مہرین نے اپنے مرمریں ہاتھ اوورکوٹ کی جیبوں میں گھسیڑتے ہوئے کہا۔

اسی دوران میں جنریٹر کی آواز بلند ہوئی اور جھولا حرکت میں آ گیا۔

☆☆☆

شام ہوتے ہی گہرا اندھیرا چھا گیا اور مینہ تواتر سے برسنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی لائٹ بھی چلی گئی۔ جنریٹر کل سے کام نہیں کر رہا تھا۔ حویلی میں لالٹین اور گیس کیمپس روشن کر دیے گئے۔ حویلی سے تقریباً تین کلومیٹر دور موراں والی میں بھی یقیناً میلے کی سرگرمیاں ماند پڑ چکی تھیں۔ حویلی سے باہر چاروں طرف وہی خاموشی اور یکسانیت تھی جو

متواتر برستی بارش میں ماحول کا حصہ ہوتی ہے۔ سردیوں کی طویل رات سر پر تھی اور صبح بہت دور تھی۔

نور، مہرین، بسمہ اور بتول ایک ہی کمرے میں بیٹھی انگیٹھی پر ہاتھ تاپ رہی تھیں۔ رشتے میں ان کے ایک چچا تھے جو انگلینڈ سے آئے ہوئے تھے۔ وہ ملتان میں رہتے تھے۔ ملتان سے میلا دیکھنے یہاں پہنچے تھے اور اچھی کوالٹی کا ملتانی سوہن حلوا بھی اپنے ساتھ لائے تھے۔ سوہن حلوا سامنے پڑا تھا مگر لڑکیوں نے بس چکھنے پر اکتفا کیا تھا۔ گیس لیمپ کی روشنی نے ماحول کو غنودہ سا کر رکھا تھا۔ کچن میں ملازمائیں کھانا تیار کر رہی تھیں اور پلاؤ اور پالک گوشت کی خوشبو اونچی چھتوں والے کمروں میں چکرا رہی تھی۔

نور نے چھوٹے شیشوں والی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ احاطے سے آگے حویلی کے چوبی گیٹ کے پاس دو پہریدار حسب معمول ایک شیڈ کے نیچے لکڑی کے اسٹولوں پر بیٹھے مونگ پھلی کھا رہے تھے۔ ان کے ہتھیار تو میلے کے آغاز میں ہی جمع ہو چکے تھے، اب وہ بس لاٹھیوں سے مسلح تھے۔

نور نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ابا جان اور تایا ابا ابھی تک نہیں آئے۔ اللہ خیر کرے۔''

''بارش کی وجہ سے رک گئے ہوں گے۔'' بسمہ خود کو تسلی دینے والے انداز میں بولی۔

''انہوں نے کون سا پیدل آنا تھا۔'' بتول نے اپنی شیرخوار بچی کو چھاتی سے لگا کر اس پر اپنی گرم شال پھیلاتے ہوئے کہا۔

''تائی امی نے کچھ نہیں بتایا؟'' نور نے مہرین سے پوچھا۔

''انہیں بھی کچھ زیادہ پتا نہیں۔ بس یہی کہہ رہی تھیں، شاید کوئی لین دین کا جھگڑا ہے۔''

''مگر ماموں مراد تو بڑے غصے میں لگ رہے تھے اور وہ چھوٹی موٹی بات پر غصے میں نہیں آتے۔''

اسی دوران میں گاڑی کی آواز سنائی دی۔ ''شاید ابا جان آگئے ہیں۔'' بسمہ بولی اور جلدی سے دروازے کی طرف بڑھی۔

اندازہ درست ہی تھا۔ آنے والے ابا جان اور تایا ابا ہی تھے۔ دو ملازم چھتریاں تان کر ان کو برآمدے تک لے آئے۔ ان کی شیروانیوں پر بارش کے چھینٹے تھے۔ دونوں کو دیکھ کر ہی پتا چل جاتا تھا کہ ان کے موڈ سخت خراب ہیں۔ لڑکیوں میں سے کسی کو ہمت نہیں ہوئی کہ ان سے کوئی سوال کرتی۔ رات کا کھانا بھی بے دلی سے کھایا گیا۔ خلاف معمول نور کے ابا جان اور تایا ابا سمیت سب مردوں کا کھانا مردانے میں ہی بھیج دیا گیا۔

نور کافی تھکی ہوئی تھی۔ دادی اماں کی بات کی وجہ سے کل رات اسے بارہ ایک بجے تک نیند نہیں آئی تھی۔ صبح سویرے مہرین نے جگا کر بٹھا دیا تھا۔ اب وہ جلدی سونا چاہتی تھی۔ عشا کی نماز پڑھ کر وہ صوفے پر نیم دراز ہوئی اور وہیں آڑی ترچھی پڑی سو گئی۔

وہ کھانسی کی وجہ سے جاگی تھی، وہ خوش خوراک ضرور تھی لیکن پرہیزی کھانا کھاتی تھی۔ کل دوسری لڑکیوں کے ساتھ چند گول گپے کھا کر اس کا گلا خراب ہو گیا تھا۔ اس نے دیکھا، مہرین اور بسمہ بھی ایک ہی پلنگ پر ڈبل لحاف کے نیچے سوئی پڑی تھیں۔ گیس لیمپ کی روشنی کچھ مدھم ہو گئی تھی اور انگیٹھی تقریباً بجھ چکی تھی۔ باہر بادل گرج رہے تھے اور بارش بھی آہستہ کبھی تیز ہو جاتی تھی۔ اس نے الماری سے کھانسی کا سیرپ نکالا اور ڈیڑھ ڈھکن پیا۔ بکھرے بالوں کو جوڑے کی شکل میں باندھتے ہوئے اور ہیئر پن اپنے ہونٹوں میں دبائے ہوئے اس نے وال کلاک پر نگاہ ڈالی۔ ابھی صرف ساڑھے نو ہی بجے تھے مگر لگتا تھا کہ آدھی رات ہو چکی ہے۔ لحاف میں گھسنے سے پہلے وہ دروازے کو بولٹ کرنے کے لیے آگے بڑھی تو اسے مدھم آوازیں سنائی دیں۔ یوں لگا جیسے ابا جان، تایا خلیل اور ماموں مراد کسی بات پر جھگڑ رہے ہیں۔ وہ مردانے حصے میں تھے اس لیے آواز نہ ہونے کے برابر تھی۔ بس گونج سی اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

نور میں تجسس تو پہلے سے ہی جاگا ہوا تھا۔ اس نے شال اوڑھی، یخ بستہ چپل پہنی اور باہر نکل آئی۔ ساتھ والے کمرے میں، چھوٹی امی زلفت، آپی بتول کی بڑی بیٹی حنا کو اپنے ساتھ لگائے لحاف کے نیچے اونگھ رہی تھیں۔ باقی لوگ بھی سو چکے تھے۔ فقط کامن روم میں سے دادی جان کے کھانسنے اور بڑبڑانے کی صدا آ رہی تھی۔

نور دبے پاؤں چلتی نیم روشن راہداریوں سے گزری اور ایک بند دروازے کی چٹخنی بہت آہستہ سے اتار کر مردانے حصے میں آ گئی۔ آوازیں اب واضح سنائی دینے لگی تھیں مگر الفاظ اب بھی پوری طرح سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ وہ بڑی بیٹھک کے سامنے پہنچ کر رک گئی اور سننے لگی۔ ابا جان کی سخت آواز ابھری...... ''میں پھر کہتا ہوں۔ مجھے ان کی نیت ٹھیک نہیں لگتی۔ میرا تو مشورہ ہے کہ سویرا ہوتے ہی نکل جائیں۔''

''ایسی بھی لٹ نہیں پڑی ہوئی بھائی جان! ان کی

اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتے ہیں ہم۔ مگر اندر کی بات کا تو پتا چلے کہ اچانک یہ کایا پلٹ ہوئی کیوں ہے؟'' یہ چھوٹے چچا احسان کی آواز تھی جو ایک ماہ پہلے انگلینڈ سے پاکستان آئے تھے۔

''میں تمہیں بتاتا ہوں احسان۔'' تایا خلیل کی پاٹ دار آواز نور کے کانوں تک پہنچی۔ خاموشی کے ایک وقفے کے بعد وہ ٹھہرے لہجے میں بولے۔'' سارا معاملہ چودھری طغرل کی ماں کے مرنے کے بعد خراب ہوا ہے اور اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ دراصل چودھری طغرل اور اس کا گھرانا اپنی ضد سے کبھی بھی پیچھے نہیں ہٹا تھا۔ میں ان لوگوں کی تین نسلوں کو جانتا ہوں۔ ان کی طبیعت کتے کی اس دم جیسی ہے جو سو سال حقے کی نال میں رہ کر بھی ٹیڑھی کی ٹیڑھی رہتی ہے۔''

''تو پھر وہ صلح صفائی کیا تھی۔ ان لوگوں نے تیسری پنچایت میں خود کہا تھا کہ معاملہ ختم ہو گیا ہے۔''

''نہیں احسان! معاملہ ختم نہیں ہوا تھا۔ یہ کبھی بھی ختم نہیں ہوا۔ زہر ان کے اندر پلتا رہا ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے بتول کا رشتہ مانگا۔ پنچایت کا فیصلہ ہمارے حق میں آیا اور ہم نے فوراً بتول کی شادی کر دی۔ اسی دوران میں ابدال کا چچا سکندر ایم پی اے بن گیا۔ اس نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ اپنی ضد کی باسی کڑی میں ابالا دیا۔ اسی کے کہنے پر ان لوگوں نے بتول کے بعد بسمہ کا رشتہ مانگنا شروع کر دیا۔ تم سب کو یاد ہوگا اس مرتبہ پنچایت نے بھی ان کا ساتھ دیا تھا۔ ان دنوں حالات بڑے خراب ہو گئے تھے۔ کسی وقت تو لگتا تھا کہ شاید بسمہ کو زبردستی ہم سے چھین لیا جائے گا۔ بہرحال اللہ نے کرم کیا۔ ایک روز ماں جی (نور کی دادی) خاموشی کے ساتھ اپنی سہیلی وڈی اماں (طغرل کی ماں) کے پاس گئیں۔ کسی زمانے میں یہ دونوں عورتیں دوپٹا بدل بہنیں بھی بنی تھیں۔ دوپٹا بدلی کی یہ رسم اماناں والے کے مزار پر ہوئی تھی۔ ماں جی نے اس روز وہی تیس سال پرانا دوپٹا طغرل کی ماں کے قدموں میں رکھ دیا اور اس سے کہا کہ وہ اس دوپٹے کے صدقے اس کی پوتی بسمہ کو معاف کر دے۔ وڈی اماں بھی اپنے زمانے کی مانی ہوئی ہٹ دھرم تھی۔ پر کچھ ویلے ایسے ہوتے ہیں جب بندہ نرم پڑ جاتا ہے۔ پتا نہیں اس دن دونوں عورتوں میں کیا کیا باتیں ہوئیں اور کس طرح ہوئیں۔ آخر وڈی اماں نے وہ دوپٹا دوبارہ ہماری ماں کے سر پر رکھ دیا...... اور اس سے کہا کہ وہ اپنے بیٹوں کو سمجھانے کی پوری کوشش کرے گی...... ساتھ ہی اس نے ماں جی سے یہ بھی کہا کہ معاملہ ذرا ٹھنڈا ہو جائے تو وہ اپنے بیٹوں اور پوتریوں کو لے کر یہاں سے چلی جائے......''

تایا ابا کے اگلے ایک دو جملے نور کی سمجھ میں نہیں آئے کیونکہ بادل زور سے گرجے تھے اور در و دیوار جیسے لرز گئے تھے۔

تب تایا ابا کی آواز دوبارہ نور کے کانوں تک پہنچی...... ''خدا جانے اس عورت نے اپنے بیٹے طغرل اور پوتروں ابدال وغیرہ کو کس طرح ان کے منحوس ارادوں سے باز رکھا اور وہ کس طرح باز آئے۔ بہرحال یہ کام ہو گیا......''

اس موقع پر چھوٹے ماموں مراد نے کچھ کہا۔ چونکہ وہ دور بیٹھے تھے اس لیے الفاظ نور کی سمجھ میں نہیں آئے۔ بس اندازہ ہوا کہ انہوں نے کھا پریوں کی کیننگ کے بارے میں کوئی بات کی ہے۔

نور کو ہر گھڑی یہ دھڑکا بھی لگا ہوا تھا کہ کہیں کوئی اسے یہاں دروازے سے لگا دیکھ نہ لے۔ اندر ہونے والی گفتگو کے اثرات سے اس کا دل بے طرح دھڑکنا شروع ہو گیا تھا۔

اچانک احاطے کی طرف سے ایک بلند آواز نور کی سماعت تک پہنچی۔ پہلے تو وہ اسے چوکیدار کا آوازہ سمجھی لیکن پھر پتا چلا کہ یہ آواز حویلی کے باہر سے آئی ہے۔ بیٹھک کے اندر سے کسی نے کھڑکی کھولی۔ شاید آواز کا ماخذ جاننے کی کوشش کی تھی۔

نور کا پول کھل سکتا تھا۔ وہ الٹے قدموں واپس مڑی اور اسی طرح بلی کی چال چلتی ہوئی واپس کوریڈور میں اور پھر اپنے کمرے میں پہنچ گئی۔ رکھوالی کے کتے مسلسل شور مچا رہے تھے۔

جب وہ کمرے میں پہنچی تو اسے یوں لگا، جیسے حویلی کے پھاٹک سے باہر کئی افراد موجود ہیں اور بلند آواز میں بول رہے ہیں۔ اس نے کھڑکی تھوڑی سی کھولی۔ سرد ہوا سوئیوں کی طرح چہرے سے ٹکرائی۔ اس کے ساتھ ہی نور پر انکشاف ہوا کہ حویلی سے باہر کافی زیادہ لوگ جمع ہیں اور غالباً ان کی ٹارچوں اور لالٹینوں وغیرہ کی روشنی بھی جو بلند چار دیواری کے پار دکھائی دے رہی تھی۔

ہوا کی کاٹ سے بچنے کے لیے اس نے جلدی سے کھڑکی کا پٹ بند کر دیا۔

یہ کون لوگ تھے؟

اس وقت اس خراب موسم میں یہاں کیوں آئے تھے؟

کہیں یہ؟...... کہیں یہ......؟

وہ اس سے آگے سوچ ہی نہیں سکی۔ اس نے بے تاب ہوکر دوبارہ کھڑکی کھولی۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ شور بڑھتا جارہا تھا۔ یہ دس بیس یا چالیس پچاس لوگ نہیں تھے۔ یہ بہت زیادہ تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ حویلی کی چاروں طرف موجود ہیں اور قہرناک آوازوں میں للکار رہے ہیں۔ چند لمحوں کے لیے گہرے بادلوں میں سے چاند نے ایک جھلک دکھائی اور دوبارہ اوجھل ہوگیا۔ ہوا کے یخ بستہ تھپیڑوں نے کمرے کی رہی سہی حرارت بھی ختم کردی۔

بسمہ کسمسا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کے دراز ریشمی بال بکھرے ہوئے تھے اور جسم پر ویلوٹ کی گلابی قمیص بے ترتیب تھی۔ ''کیا ہوا نور؟'' اس نے ہراساں آواز میں کہا۔

''کچھ نہیں۔ شاید کچھ لوگ ہیں باہر۔'' نور نے دوبارہ کھڑکی بند کردی۔ اس کا منہ خشک ہونا شروع ہوگیا تھا۔

☆☆☆

یہ سب کیا ہو رہا تھا؟ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ دیگر خواتین بھی جاگ گئی تھیں اور بدحواسی کے عالم میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ برآمدے میں گیس لیمپس کی روشنیاں دکھائی دیں۔ نور نے دیکھا، تایا ابا احاطہ پار کرکے مین گیٹ کی طرف جارہے تھے۔ ملازم خدا بخش نے ان پر چھتری کا سایہ کررکھا تھا۔ ماموں مراد، احسان اور دیگر افراد برآمدے میں ہی کھڑے تھے۔ نور نے ایک بار پھر کمرے کی کھڑکی تھوڑی سی کھول دی تاکہ باہر کی آوازیں سنی جاسکیں۔ چھوٹی امی، پھپھو حاجرہ، تائی راحت اور دیگر خواتین بھی اس ادھ کھلی کھڑکی کے پاس آگئیں۔ لوہے اور لکڑی کے اس مضبوط گیٹ میں ایک چھوٹا دروازہ بھی تھا۔ نور کے تایا ابا نے شاید یہی دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا مگر اسی دوران میں حویلی کا پرانا ملازم فدا حسین لپک کر ان کے پاس پہنچ گیا۔ ''نہیں مالک!'' وہ ہراساں آواز میں بولا۔ ''دروازہ نہ کھولیں۔ مجھے ان کے ارادے اچھے نہیں لگتے۔''

''تو پھر؟'' تایا ابا کی آواز نور وغیرہ کے کانوں تک پہنچی۔

فدا حسین آگے بڑھا اور اس نے گیٹ میں ایک جانب موجود وہ چھوٹا سا روزن کھول دیا جس میں سے باہر جھانکا جاسکتا تھا۔

تایا ابا اس روزن کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ انہوں نے باہر کسی سے مخاطب ہوکر کہا۔ جواب میں چودھری طغرل کی بلند آواز سنائی دی۔ ''دروازہ کھولو خلیل! ہم تم سے بات کرنے آئے ہیں۔''

''بات کرنے کا یہ کون سا وقت اور طریقہ ہے۔'' تایا خلیل نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

''یہی طریقہ ہے...... یہی طریقہ ہے۔'' ایک اور گرجدار آواز سنائی دی۔ یہ یقیناً طغرل کے بڑے بیٹے ابدال کی تھی۔

پھر نجانے کیا ہوا، کوئی چیز گیٹ سے ٹکرائی اور ملازم فدا حسین نے لپک کر روزن کو بند کردیا۔ جونہی روزن بند ہوا گیٹ کو دھکیلا جانے لگا اور اس پر ہتھوڑے سے پڑنے لگے۔ چودھری طغرل کی للکار سنائی دی۔ ''دروازہ کھولو خلیل! نہیں تو توڑ دیں گے ہم۔''

اب نور کے ابا جان، ماموں مراد اور تایا زاد بھائی شرجیل اور عثمان وغیرہ بھی بارش کی پروا کیے بغیر احاطے میں نکل آئے تھے۔ رکھوالی کے کتوں نے جیسے شدید خطرے کی بو سونگھ لی تھی اور مسلسل شور مچا رہے تھے۔ حویلی کی چودہ فٹ بلند باؤنڈری وال کی دوسری جانب بیسیوں افراد کے للکارے سنائی دے رہے تھے۔

نور کے ابا جان نے ماموں مراد کو مخاطب کرکے بلند آواز میں کہا۔ ''مراد! ٹیلی فون کرو...... پولیس چوکی میں فون کرو۔''

ان کی آواز یقیناً باہر بھی سنی گئی تھی۔ باہر سے چودھری طغرل کی دہاڑ سنائی دی۔

''مولوی مہرا! خیریت چاہتا ہے تو دروازہ کھلوادے۔ ورنہ آج سارے اگلے پچھلے حساب برابر ہوجائیں گے۔ ابھی اسی وقت۔''

یہی وقت تھا جب نور نے دیکھا کہ ماموں مراد کامن روم کی طرف سے گھبرائے ہوئے نکلے۔ پھپھو حاجرہ نے کھڑکی میں سے پوچھا۔ ''کیا ہوا مراد؟''

وہ دانت پیس کر بولے۔ ''حرامزادوں نے فون کے تار کاٹ دیے ہیں۔''

''ہائے اللہ! اب کیا ہوگا؟'' پھپھو نے سینے پر ہاتھ رکھا۔

ماموں مراد جواب دیے بغیر احاطے کی طرف چلے گئے۔

اسی دوران میں حویلی کی بالائی چھت پر سے چوکیدار گل محمد پکارا۔ ''مہرا صاحب! یہ لوگ سیڑھی لگا کر دیوار پر چڑھنے کی کوشش کررہے ہیں۔''

تب نور اور دیگر عورتوں نے خوفزدہ نظروں سے دیکھا...... گیٹ کے دونوں چوکیدار لاٹھیاں سونت کر باؤنڈری وال کی طرف لپکے۔ باؤنڈری وال کے بالائی

سرے پر دو انسانی سر دکھائی دے رہے تھے۔ یقیناً یہ وہی افراد تھے جو اندر گھسنے کی کوشش میں تھے۔ چوکیدار نے بے دریغ ان پر لاٹھیاں برسائیں ...... دونوں ہیولے اوجھل ہو گئے۔ اب صاف پتا چل رہا تھا کہ یہ کھلی لڑائی کی شکل بن گئی ہے۔ عین ممکن تھا کہ اس صورتِ حال میں فائرنگ یا ہوائی فائرنگ بھی شروع ...... ہو جاتی مگر حویلی میں اسلحہ کسی کے پاس نہیں تھا اور شاید باہر والوں کے پاس بھی نہیں تھا۔

ماموں مراد، شرجیل اور عثمان وغیرہ سرتاپا آتش بن گئے تھے۔ ماموں مراد نے ملازموں کو بھی ساتھ لیا اور حویلی کی "لوروف" پر چلے گئے۔ یہاں سے وہ کسی بھی ایسے شخص کو روک سکتے تھے جو سامنے سے بیرونی دیوار پر سے اوپر چڑھنے کی کوشش کرتا۔ باہر سے سنائی دینے والا شور وغل بڑھتا جا رہا تھا اور پتا چلتا تھا کہ یہ لوگ حویلی کی چاروں طرف موجود ہیں۔ حویلی میں مہرا فیملی کے تقریباً پندرہ مرد اور بیس عورتیں تھیں۔ لاہور سے آنے والے سات آٹھ مہمان حویلی کے مہمان خانے میں بھی موجود تھے۔ اس کے علاوہ حویلی کے ملازم تھے جن میں ایک مالی، اس کے دو جوان بیٹے، خانساماں اور چوکیدار وغیرہ شامل تھے۔

تین چار منٹ کے اندر اندر سب لوگوں کو صورتِ حال کی شدید سنگینی کا احساس ہو گیا۔ شرجیل کو جب پتا چلا کہ کچھ افراد دو بانسی سیڑھیاں لے کر حویلی کی عقبی دیوار کی طرف گئے ہیں تو وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اوپر والی چھت پر چلا گیا اور وہاں سے ان لوگوں پر اینٹیں وغیرہ برسائیں اور انہیں اوپر نہیں چڑھنے دیا۔

عورتوں کے رنگ فق ہو رہے تھے۔ دادی اماں بھی آ گئی تھیں اور انہیں دیکھ کر تو یہی لگ رہا تھا کہ انہیں دل کا دورہ پڑ جائے گا۔ وہ سرتاپا لرزنے لگی تھیں۔ باہر بارش ہلکی ہو گئی تھی، تاہم گاہے بگاہے بجلی چمکتی تھی اور احاطے کے مناظر روشن ہو جاتے تھے۔ مہرین، نور اور بسمہ زینے چڑھ کر دوسری منزل پر آ گئیں۔ یہاں سے منظر زیادہ وضاحت سے دکھائی دے رہا تھا۔ یہ دیکھ کر نور کا دل بیٹھ گیا کہ اس تاریک سنسان رات میں ان کی حویلی سے باہر بپھرے ہوئے دیہاتیوں کی ایک کثیر تعداد موجود تھی۔ ان کے ہاتھوں میں کلہاڑیاں اور چمکیلے کوکوں والی لاٹھیاں چمک رہی تھیں۔ کچھ کے ہاتھوں میں پرانی طرز کی برچھیاں بھی دکھائی دیتی تھیں۔ اسلحہ تھانے میں جمع ہو چکا تھا ورنہ یقیناً وہ بھی موجود ہوتا۔ ان لوگوں کی بھڑکوں اور للکاروں سے پتا چلتا تھا کہ ان میں سے کئی نشے میں ہیں۔ شاید خشت باری سے ان کے کچھ ساتھی زخمی بھی ہو گئے تھے۔ وہ گندی گالیاں بک رہے تھے اور خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے رہے تھے۔

نور حوصلہ مند لڑکی تھی، سکہ بند نسوانیت سے اسے زیادہ تعلق نہیں تھا مگر اس موقع پر اس کا دل بھی خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزنے لگا۔

دوسری منزل سے وہ گفتگو واضح سنائی دینے لگی جو تایا ابا اور چودھری طغرل وغیرہ کے درمیان ہو رہی تھی۔ یہ گفتگو بڑی بلند آواز میں ہو رہی تھی، وجہ یہی تھی کہ چودھری طغرل گیٹ کی دوسری طرف تھا۔ چودھری طغرل دھاڑ رہا تھا۔

"اوئے مہرا! دعائیں دو اس عورت کو جس کی وجہ سے اب تک بچے ہوئے تھے تم۔ اس کے پاؤں دھو دھو کر پیتے تو بھی کم تھا۔" (وہ اپنی ماں کا ذکر کر رہا تھا)

نور کے تایا ابا نے کہا۔ "تو پھر اب کیا ہو گیا ہے چودھری؟ اب کیوں کر رہے ہو یہ سب کچھ؟ کیوں طوفان کھڑا کر رہے ہو؟"

"اب وہ نہیں رہی۔ وہ چلی گئی ہے۔ مر گئی ہے، صبر کا گھونٹ پی کر اور اس کے ساتھ ہی وہ بات بھی ختم ہو گئی ہے۔ اب ہمیں اپنی منگ چاہیے۔ تمہیں پتا ہے ہم کھاپری ہیں اور کھاپری اپنی بات دیا ہنے کے لیے سو سال تک بھی انتظار کرتے ہیں۔"

"غلط بات نہ کرو چودھری! تم چنگی طرح جانتے ہو، کوئی منگنی نہیں ہوئی تھی۔ بس ایک اڑتی اڑتی بات تھی جس کو تم نے جھگڑا بنایا اور اب تو وہ بات بھی ختم ہو چکی تھی...... سب کو پتا ہے کہ......"

"نہیں ہوئی تھی بات ختم...... نہیں ہوئی تھی۔" طغرل خلیل مہرا کی بات کاٹ کر دہاڑا۔ "تم مولویوں کو کیا پتا کہ ہم نے کیا کیا باتیں سنی ہیں لوگوں کی۔ کہاں کہاں ہماری پگ گری ہے اس رشتے کی وجہ سے۔ بزدلی، بے غیرتی کے طعنے سنے ہیں ہم نے۔ بس اس ماں کی وجہ سے چپ تھے......"

طغرل کے بعد اس کا چھوٹا بھائی سابق ایم پی اے سکندر بولا۔ "مولوی اشفاق! اب بھی ہم تیری بیٹی کو اٹھانے کے لیے نہیں دیا ہنے کے لیے آئے ہیں۔ شرع کے مطابق اسے ڈولی میں بٹھا کر لے جائیں گے۔ اسے نوں (بہو) بنانا ہے ہم نے۔ اپنے ان غنڈوں کو باز کر جو اینٹیں چلا رہے ہیں۔ ورنہ پھر فساد ہو گا اور وہ سب کچھ ہو گا جو ہم نہیں چاہتے۔"

زور سے بجلی چمکی اور چند سیکنڈ کے لیے قرب و جوار دور تک روشن ہو گئے۔ نور کی نگاہوں نے ایک حیران کن منظر کی جھلک دیکھی۔ ایک سفید گھوڑی پر ایک شخص سہرا

باندھے بیٹھا تھا۔ اس کے اردگرد چمکیلے کپڑوں والے کچھ لوگ براتیوں کی طرح موجود تھے۔ سہرے والا شخص یقیناً ابدال ہی تھا۔ نور کے سینے میں دل جیسے ٹھہر گیا۔ سخت سردی کے باوجود اس کے جسم کے ہر مسام سے پسینا بہہ نکلا۔ اس نے کن انکھیوں سے بسمہ کی طرف دیکھا، وہ شاید یہ منظر نہیں دیکھ پائی تھی مگر مہرین کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس نے وہ جھلک دیکھی ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ صورت حال اس سے کہیں زیادہ سنگین ہے جتنی وہ سمجھ رہے ہیں۔

''یا اللہ رحم کر۔'' نور کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

اشفاق مہرا نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''کچھ شرم کرو چودھری۔ کیا یہ طریقہ ہوتا ہے بیٹیوں کو بیاہنے کا۔ تمہاری دھی کی برات اس طرح آئے تو کیا تمہیں قبول ہوگی؟''

''میری دھی کی برات اس طرح نہیں آئے گی مولوی اشفاق، کیونکہ میرے منہ میں زبان ہے...... کسی پلید جانور کا چمڑا نہیں۔ ہم نے کل بھی تمہیں سمجھایا تھا۔ اب یہ کام ہونا ہی ہے، تم چاہو تب بھی، نہ چاہو تب بھی۔ چنگا یہی ہے کہ دروازہ کھول دو اور کڑی کو تیار کرو۔ نکاح خواں ساتھ ہے۔ ابھی سب کچھ ہوگا، ابھی اسی وقت۔''

یہی وقت تھا جب دائیں طرف سے پھر کچھ افراد نے دیوار پر چڑھنے کی کوشش کی۔ لٹھ بردار تیار تھے، وہ لپکے اور اندھا دھند لاٹھیاں برسا کر انہیں نیچے گرا دیا۔ اس واقعے کے فوراً بعد گھیراؤ کرنے والوں کے غیظ وغضب میں اضافہ ہوگیا۔ انہوں نے جیسے گیٹ پر ہلا ہی بول دیا تھا۔ انگریزوں کے دور کا یہ قدیم گیٹ کسی قلعے کے دروازے جیسا تھا۔ باؤنڈری وال کی طرح اس کے اوپر بھی نوکدار آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ یہ اوپر سے بند تھا اور اسے پھاندا نہیں جاسکتا تھا۔ درجنوں افراد ایک ساتھ مل کر اسے دھکیلنے لگے اور وزنی چیزوں سے ضربیں لگانے لگے۔ یہ دہشت ناک مناظر تھے۔

ماموں مراد بھاگتے ہوئے ان کے پاس آئے۔ ان کا چہرہ آگ کی طرح سرخ تھا۔ وہ نور سمیت تینوں لڑکیوں سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''یہاں کیا کر رہی ہو تم؟ چلو نیچے چلو۔ جب تک ہم نہ کہیں کوئی کمرے سے باہر نہ نکلے۔''

وہ انہیں لے کر نیچے آگئے۔ نیچے بھی کہرام سا مچا ہوا تھا۔ آپی بتول بے ہوش ہوگئی تھیں۔ چھوٹی امی ان کی ہتھیلیوں کی مالش کر رہی تھیں اور ساتھ ساتھ پانی پلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ''آنکھیں کھولو، بتول! ہوش کرو۔'' پھپھو حاجرہ نے بے تاب ہو کر اسے جھنجوڑا۔

اس کی آنکھیں بند رہیں، تاہم وہ ہولے ہولے کراہنے لگی۔

''اب کیا ہوگا مراد۔'' تائی راحت نے دہشت زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''کیا...... یہ لوگ...... بسمہ کی بات کر رہے ہیں...... بسمہ کے رشتے کی......؟''

''میں دوں گا ان کو رشتہ، بڑی اچھی طرح دوں گا۔'' مراد پھنکارا اور پھر کچن کے اندر سے ایک بڑی چھری نکال لایا۔ ''میں آنتیں نکال دوں گا اس کنجر ابدال کی اور اس کے باپ کی۔ مار ڈالوں گا سب کو۔''

وہ جیسے غصے سے دیوانہ ہو کر احاطے کی طرف بڑھا۔ عورتیں ایک ساتھ چلائیں۔ ان کی پکار سن کر چوکیدار اور دیگر افراد مراد کی طرف متوجہ ہوئے۔ مراد کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھول کر باہر نکلنا چاہتا ہے اور باہر نکلتے ہی ابدال کا پیٹ پھاڑ دے گا۔ شرجیل بھی اس کے عقب میں تھا۔

تین چار افراد نے مراد سے لپٹ کر اسے روک لیا اور کھینچ کر واپس برآمدے میں لے گئے۔ تایا خلیل نے مراد کو بری طرح ڈانٹا۔ پھر انہوں نے نور کے ابا جان سے کہا۔ ''اشفاق! تم ان لڑکوں کو لے کر اندر چلے جاؤ۔ ہم بات کر رہے ہیں۔ اس طرح کام اور خراب ہوجائے گا۔''

چھت پر سے ہونے والی خشت باری اب رک گئی تھی اور اس کی وجہ یہی تھی کہ فی الحال باہر سے دیوار پر چڑھنے کی کوشش بھی نہیں ہو رہی تھی۔

نور نے دیکھا، تایا ابا اور مہمان خانے سے نکلنے والے دو بارعب افراد گیٹ کے پاس کھڑے تھے۔ گیٹ کا چھوٹا روزن کھلا ہوا تھا اور کچھ بات چیت ہو رہی تھی۔ یہ بات چیت یقیناً تکرار کی شکل میں تھی لیکن آوازیں بلند نہیں تھیں۔ حویلی کے زیادہ تر مرد اور لڑکے چھت پر تھے۔ اگر باہر موجود مشتعل لوگوں میں سے کوئی باؤنڈری وال کی نوکدار سلاخیں پھلانگنے کی کوشش کرتا تو وہ اسے روکنے کے لیے تیار تھے۔

چند منٹ بعد تایا جان اور ابا جان ستے ہوئے منہ سے حویلی کے اندرونی حصے میں واپس پہنچ گئے۔ ملازم خدا بخش کے ہاتھ میں ایک گول طشتری تھی۔ تانبے کی اس منقش طشتری میں قریباً ایک درجن دیے پڑے تھے۔ مٹی کے ان دیوں میں سے کچھ الٹے تھے اور کچھ سیدھے۔ خدا بخش نے دل گرفتہ انداز میں یہ طشتری میز پر رکھ دی اور بیزار سا ایک طرف کھڑا ہوگیا۔ ''یہ کیا ہے تایا ابا؟'' بتول نے سراسیمہ

لہجے میں پوچھا۔

تایا ابا گم صم رہے پھر خدا بخش سے بولے۔ ''تم ہی بتاؤ چاچا۔''

خدا بخش گمبھیر آواز میں بولا۔ ''اس کو 'نیاں' کی رسم کہتے ہیں جی۔ پرانے وقتوں سے چلی آرہی ہے۔ کچھ لوگ مانتے ہیں کچھ نہیں بھی مانتے۔''

''یہ ہے کیا؟'' چھوٹی امی زلفت نے استفسار کیا۔

خدا بخش نے پریشان نظروں سے نور کی دادی اماں اور پھوپھو حاجرہ کی طرف دیکھا۔ دادی اماں کا رنگ مٹی ہو رہا تھا اور ہاتھ پاؤں کی کپکپاہٹ بڑھ گئی تھی۔ وہ تانبے کی طشتری اور دیوں کی طرف ہی دیکھ رہی تھیں۔

خدا بخش نے اٹکتے لہجے میں کہا۔ ''رشتے ناتے یا پھر لین دین کے معاملے میں جب کوئی بڑا جھگڑا ہوتا ہے تو حضرت استاں والے کی رائے جاننے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تھالی میں بارہ دیے رکھے جاتے ہیں اور رکھنے والا یہ کہتا ہے کہ اگر وہ حق پر ہے تو پھر دیے اس پر گواہی دیں۔ یہ دیے مزار کی ایک محراب میں رکھ دیے جاتے ہیں۔ یہ وہی سرخ محراب ہے جو مزار کی دائیں جانب پتھر کی جالی کے پاس نظر آتی ہے۔''

''محراب میں رکھنے سے کیا ہوتا ہے؟'' انگلینڈ پلٹ احسان نے پوچھا۔

''یہ محراب دراصل ایک چھوٹی سی کھڑکی ہے جس میں ہر وقت ہوا آتی رہتی ہے۔ شام کے بعد چلنے والی ہوا اس میں سے کچھ دیے بجھا دیتی ہے اور کچھ جلتے رہتے ہیں۔ اگر زیادہ دیے جلتے رہتے ہیں تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ نیاں لینے والا حق پر ہے...... یہاں بھی چودھری طغرل نے نیاں لیا ہے اور کہتا ہے کہ میں حق پر ہوں۔''

''یہ دیے جو اوندھے پڑے ہیں ان کا کیا مطلب ہے؟'' بیگم زلفت نے پوچھا۔

''یہ وہ ہیں جو بجھ گئے تھے۔'' خدا بخش نے جواب دیا۔

نور نے اوندھے پڑے دیے گنے، وہ چار تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ چار دیے بجھے تھے اور آٹھ جلتے رہے تھے۔ یہ فال ہی کی کوئی قسم تھی۔ اس کے بارے میں اور اس طرح کی کئی رسموں کے بارے میں نور نے پہلے بھی سن رکھا تھا۔

شرجیل بولا۔ ''یہ تھالی بھی تو یہ خبیث ہی لے کر آئے ہیں۔ ہمیں کیا پتا کہ کتنے جلے اور کتنے بجھے اور آپ خود ہی تو یہ کہہ رہے ہیں کہ بہت سے لوگ اس نیاں شیاں کو مانتے ہی نہیں۔''

فدا حسین نے مدھم آواز میں کہا۔ ''نکاح خواں مولوی شمس بھی ساتھ ہیں۔ وہ گواہی دے رہے ہیں کہ نیاں ہوا ہے۔''

''یہ سب کیا بے ہودگی ہے۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا۔'' شرجیل ترخ کر بولا۔ ''ایک طرف یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ امن والے کا میلا ہے اور اپنے ہتھیار جمع کراتے ہیں، لڑائی جھگڑے کو بڑا گناہ سمجھنے لگتے ہیں۔ دوسری طرف یہ سب کچھ ہو رہا ہے ہمارے ساتھ؟''

خدا بخش مری مری آواز میں بولا۔ ''اسی لیے تو یہ نیاں وغیرہ کیا ہے ان لوگوں نے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس رسم کے بعد انہیں یہ سب کچھ کرنے کی اجازت مل گئی ہے۔''

مراد نے نفرت سے ایک طرف تھوک دیا۔

شرجیل نے کہا۔ ''پرسوں ایک متولی کہہ رہا تھا، میلے پر کبھی بارش نہیں ہوتی۔ یہ مزار والے کی کرامت ہے اور شام کو جب بارش شروع ہوئی تو وہی متولی اسے رحمت کہہ رہا تھا اور خیال ظاہر کر رہا تھا کہ اس مرتبہ اوپر والے نے زائروں کے گناہ دھونے کا فیصلہ کیا ہے۔''

''بس یہ وہم اور بے کار عقیدے ایسے ہی لمبی لمبی جڑوں والے ہوتے ہیں۔'' تایا ابا نے کہا۔ ''بے شک یہ ایک اللہ والے کا مزار ہے اور وہ بلند پایہ ہستی تھے مگر ایسی پاک جگہوں پر اپنے کاروبار چمکانے والے لوگ نت نئی حکایتیں گھڑتے ہیں اور لوگوں کو بے وقوف بناتے ہیں۔''

مراد نے غصے میں طشتری کو ہاتھ مار کر دور ہٹا دیا۔

''میں نہیں مانتا ان فالوں شالوں کو۔ یہ لوگ بس بدمعاشی کر رہے ہیں۔ زور دکھا کر اپنی بات منوانا چاہتے ہیں۔ ہماری بیٹی کوئی گاجر مولی نہیں جو یہ اکھاڑ کر لے جائیں گے۔ ان کو ہماری لاشوں پر سے گزرنا ہوگا۔'' وہ ہمیشہ سے غصے والا تھا اور اس وقت اس کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا۔

مولوی اشفاق مہرا بھی بلڈ پریشر کے مریض تھے۔ ان کا چہرہ سرخ انگارہ ہو رہا تھا اور سانس پھولی ہوئی تھی۔ شاید اسی لیے تھوڑی دیر پہلے بڑے بھائی خلیل مہرا نے انہیں بہانے سے کمرے میں بھیج دیا تھا۔

خلیل مہرا نے مراد کو ایک بار پھر ڈانٹا۔ ''یہ جوش کا نہیں ہوش کا وقت ہے۔ انہوں نے حویلی کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا ہے۔ رات کا وقت ہے، بارش ہو رہی ہے۔ نہ اس طرف کسی نے آنا ہے نہ جانا ہے۔ ہم کو یہ لوگ باہر نہیں نکلنے دیں گے۔ ہمیں ٹھنڈے دل سے کچھ سوچنا ہوگا۔''

مراد نے ایک بار پھر طیش بھری نظروں سے تانبے کی طشتری اور اس میں سیدھے اور اوندھے پڑے مٹی کے دیوں کو دیکھا اور بولا۔ ''لیکن میں ان بے کار رسموں کو نہیں مانتا۔ یہ لوگ بس اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے ان رسموں کا سہارا لیتے ہیں۔ یہ رسم نہ ہوتی تو کوئی اور ہوتی...... کوئی اور فال ہوتی۔ ان لوگوں نے ہم پر چڑھائی کرنا ہی تھی۔''

عمر رسیدہ ملازم خدا بخش نے کہا۔ ''بیٹا! تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ان رسموں کے بہت سے نقصان ہیں پر کچھ فائدے بھی تو ہوتے ہیں۔ اب یہی دیکھو کہ اگر اسلحہ جمع کرانے کا رواج نہ ہوتا اور لوگ اس پر پورا یقین نہ رکھتے تو ...... اب تک شاید یہاں بہت نقصان ہوگیا ہوتا......''

'' نقصان کیا، دونوں طرف سے کئی لاشیں گر گئی ہوتیں۔'' خلیل مہرا صاحب نے تائید کی۔

یہی وقت تھا جب احاطے کی طرف سے کچھ ٹوٹنے اور گرنے کی آواز آئی۔ رکھوالی کے کتوں نے شور مچایا اور مختلف آوازیں بھی سنائی دیں۔ چند سیکنڈ بعد بوڑھا ملازم فدا حسین ہانپتا ہوا اندر آیا۔ خلیل مہرا سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''مالک! انہوں نے رسے ڈال کر ایک طرف سے دیوار کا جنگلا گرا دیا ہے...... لگتا ہے کہ وہ اوپر چڑھنے کی کوشش کریں گے۔''

خلیل مہرا، اشفاق مہرا، مراد اور دیگر افراد احاطے کی طرف لپکے۔ نور، مہرین اور دیگر لڑکیوں نے کھڑکی سے جھانکا، صاف طور پر تو دکھائی نہیں دیا مگر اندازہ ہوا کہ بلند باؤنڈری وال کے بالائی حصے پر لگی نوکدار سلاخوں والی باڑ کا کچھ حصہ دکھائی نہیں دے رہا۔ وہاں سے باڑ اکھاڑ دی گئی تھی۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا کہ موٹے آہنی تار کی مدد سے اس باڑ پر کنڈا ڈالی گئی تھی اور اس کنڈ کو جھٹکے دے دے کر قریباً پندرہ بیس فٹ چوڑائی کا ایک ٹکڑا نیچے گرا دیا گیا تھا۔ اب اس حصے سے باؤنڈری وال پر چڑھنا آسان ہوگیا تھا۔ بہرحال ابھی یہاں سے چڑھنے کی کوئی کوشش نہیں ہو رہی تھی۔ شاید یہ کارروائی صرف دباؤ ڈالنے کے لیے کی گئی تھی کہ اگر ان کی بات نہیں مانی گئی تو وہ ہر حد تک جائیں گے۔

گیٹ کے مختصر روزن میں سے ایک بار پھر دو طرفہ گفتگو شروع ہوگئی۔ یہ مستطیل روزن چوڑائی میں دو فٹ کے قریب اور اونچائی میں صرف سات آٹھ انچ تھا۔ تانبے کی طشتری بھی اسی خلا سے اندر بھیجی گئی تھی۔

گیٹ پر ہونے والی گفتگو قریباً دس منٹ جاری رہی۔ بارش کی بوچھاڑوں ہی کی طرح کبھی لہجے مدھم اور کبھی تند و تیز ہو جاتے تھے۔ شرجیل اندر آیا تو سب عورتیں اس کے گرد اکٹھی ہوگئیں۔ ''کیا بات ہوئی شرجیل؟'' تائی راحت نے بیٹے سے پوچھا۔

''بس ہو رہی ہے۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔ لہجے میں مایوسی تھی۔

''کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ...... شاید...... کوئی اچھا مشورہ ہی دے دیں۔'' بیگم زلفت نے استفسار کیا۔ خالہ عریفہ نے بھی ساتھ دیا۔ سب کے رنگ زرد تھے۔

''وہ خبیث اپنی بات پر اڑے ہوئے ہیں......'' شاید وہ کچھ اور بھی کہتا مگر بسمہ کی طرف دیکھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ بے چاری پہلے ہی ہلدی ہو رہی تھی۔

خالہ عریفہ، بسمہ کو اپنے ساتھ لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد شرجیل نے جو کچھ بتایا اس سے پتا چلا کہ چودھری طغرل اور اس کے ہمنوا بسمہ کے حوالے سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹ رہے۔ وہ اسی وقت نکاح اور رخصتی چاہ رہے ہیں۔ ابا جان، چچا جان اور دیگر اس کوشش میں ہیں کہ کم از کم آج رات کے لیے اس معاملے کو ٹال دیا جائے اور کل پنچایت میں اس کا حل نکالا جائے لیکن یہ ہوتا نظر نہیں آتا۔

باہر سے ایک دم شور بلند ہوا اور مار دھاڑ کی آوازیں آئیں۔ لڑکیاں چلا اٹھیں۔ شرجیل بھی احاطے کی طرف دوڑا۔ وہاں باقاعدہ لڑائی کا منظر تھا، باہر کے لوگوں نے جس جگہ سے باؤنڈری وال کی نوکدار گرل اکھاڑی تھی، اب وہاں سے کچھ افراد اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ حویلی کے مرد لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے ان پر حملہ آور ہوئے تھے۔ بجلی چمکی اور چند ساعتوں کے لیے قرب و جوار روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئے۔ نور نے دیوار کا منظر دیکھا۔ یہ ایک جنگی منظر جیسا تھا، کم از کم چار پانچ افراد تھے جنہوں نے چوٹ سے بچنے کے لیے سروں پر بھاری پگڑیاں کس رکھی تھیں اور دیوار پھاندنے کی کوشش میں تھے۔ ان پر چھت پر سے اینٹیں برس رہی تھیں اور احاطے میں موجود افراد لمبی لاٹھیوں سے انہیں نیچے گرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ مطلب یہی تھا کہ بات چیت ناکام ہوگئی ہے اور اب وہ لوگ ہر صورت اندر گھسنا چاہتے ہیں۔

ان کے للکارے خوفناک تھے۔ وہ گندی گالیاں دے رہے تھے اور اندر موجود عورتوں کے لیے غلیظ الفاظ استعمال کر رہے تھے۔

اسمہ، بتول اور ماموں کی لڑکیوں نے رونا شروع کر دیا۔ تائی راحت سجدے میں گر گئیں اور جان آبرو کی سلامتی کے لیے گڑگڑانے لگیں۔ دادی اماں کا برا حال تھا اور ان کو سنبھالتے سنبھالتے پھپو ماجرہ خود بھی نیم جان ہو رہی تھیں۔

حویلی کے مردوں نے، جن میں باہمت ملازم بھی شامل تھے، جان پر کھیل کر اندر گھسنے والوں کی کوشش ناکام بنا دی۔ اس کوشش میں چار پانچ افراد کو شدید زخم آئے لیکن جس کو شدید ترین چوٹ لگی وہ نور کے ماموں مراد تھے۔ باہر سے جوابی خشت باری بھی ہوئی تھی۔ ایک اینٹ لگنے سے ان کے سر پر گہرا زخم آیا تھا..... اور بالائی ہونٹ بھی پھٹ گیا تھا۔ وہ نیم بے ہوش تھے۔

انہیں اندر لایا گیا۔ ان کی حالت دیکھ کر عورتوں نے رونا شروع کر دیا۔ بہرحال نور اور مہرین کسی حد تک حوصلے میں رہیں۔ ایک فزیوتھراپسٹ کی حیثیت سے مہرین میڈیکل کی سوجھ بوجھ رکھتی تھی۔ حویلی میں فرسٹ ایڈ کا سامان موجود تھا۔ مہرین نے سب سے پہلے مراد کے سر سے بہنے والا خون بند کیا اور پھر عارضی بینڈیج کر دی۔ اس نے لرزاں آواز میں کہا۔ ''فوری خطرے کی تو کوئی بات نہیں..... مگر ماموں کو اسپتال لے جانے کی ضرورت ہوگی۔''

حویلی کے سامنے ''لوروف'' پر حویلی کے آٹھ دس افراد موجود تھے۔ اگر باؤنڈری وال کے شکستہ حصے سے کوئی اوپر چڑھنے کی کوشش کرتا تو اسے موثر طریقے سے روکا جاسکتا تھا مگر یہ دفاع کتنی دیر تک چل سکے گا، اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

نور نے دیکھا، اسمہ سکڑی سمٹی ہوئی ایک سہمی چڑیا کی طرح کونے میں گھسی ہوئی تھی۔ گاہے بگاہے دہشت زدہ نظروں سے اپنے بڑوں کے چہرے دیکھتی تھی۔ اسی اثنا میں چھوٹی امی زلفت اور پھپو ماجرہ نے اس کے ابا جان کو اپنے ساتھ لیا اور ساتھ والے کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ وہ کوئی خاص قسم کی گفت گو کر رہی تھیں۔

دس پندرہ منٹ بعد تینوں باہر آگئے۔ ابا جان کا چہرہ بدستور کرب کی آماجگاہ تھا۔ یہی وقت تھا جب ملازم خدا بخش اندر داخل ہوا تھا اور اس نے پلاسٹک کا ایک بڑا لفافہ ابا جان کی طرف بڑھایا تھا۔ اس لفافے میں سرخ رنگ کا کوئی کامدار کپڑا جھلک دکھا رہا تھا۔ خدا بخش نے نور کے ابا جان سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''مولوی جی! ان بدبختوں نے یہ لال جوڑا دیوار کے اوپر سے اندر پھینکا ہے۔''

یہ اسمہ کے لیے شادی کا جوڑا بھیجا گیا تھا۔ نور کے ابا جان نے لفافہ گھما کر دیوار پر دے مارا تھا اور بے دم سے ہو کر اسمہ کے پاس قالین پر بیٹھ گئے تھے اور پھر کچھ دیر بعد وہ منظر نور کی نگاہوں کے سامنے آیا تھا جب اس نے چھوٹی امی زلفت کو سوجی سوجی آنکھوں کے ساتھ ابا جان کے پاس بیٹھے اور انہیں سمجھاتے دیکھا تھا۔ ابا جان جھلا کر بولے تھے۔ ''تو کیا کروں میں؟ اپنی بچی کو اپنے ہاتھوں سے تیار کر کے..... ان ڈاکوؤں کے حوالے کر دوں۔ انہیں کہوں، لے جاؤ اسے، اپنے کلیجے ٹھنڈے کر لو۔''

''نہیں جی..... لیکن..... جو کچھ بھی ہو رہا ہے..... اور جو کچھ ہونے والا ہے..... اسے دیکھ کر ہمیں کوئی درمیانی راہ تو نکالنا ہی پڑے گی۔''

''اور وہ درمیانی راہ کیا ہے؟'' اشفاق مہرانے بیوی کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

''..... جو کچھ بھی ہے، وہ لوگ..... اپنی اسمہ کو بہو بنانا چاہتے ہیں۔ اسے ابدال کے نکاح میں لانا چاہتے ہیں۔ اب بھی بات چیت کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے۔ ہم ان سے کچھ شرطیں بھی منوا سکتے ہیں..... لیکن..... اگر خدانخواستہ..... یہ لوگ اندر گھس آئے اور..... دو چار موتیں ہو گئیں..... تو پھر سارا معاملہ اور طرح کا ہو جائے گا۔ ہم سب کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

اسی دوران میں دومنزلہ حویلی کی چھت پر ایک زوردار دھماکا ہوا تھا۔ حویلی کی سہمی ہوئی عورتیں بے طرح چلا اٹھی تھیں اور مرد سیڑھیوں کی طرف لپک گئے تھے۔ بعدازاں پتا چلا تھا کہ شرجیل، عثمان اور غیاث وغیرہ نے ملازموں کے ساتھ مل کر حویلی کی خستہ برساتی کی ایک دیوار گرا دی تھی۔ مقصد یہی تھا کہ اگر دوبارہ مارا ماری کی نوبت آئے تو چھت سے خشت باری کرنے کے لیے اینٹیں اور روڑے مہیا ہو سکیں۔

اگلے ایک گھنٹے میں چھوٹی امی زلفت اور پھپو ماجرہ وغیرہ نے ابا جان اور تایا ابا کو نیم رضامند کر لیا تھا۔ کوئی دوسری راہ سجھائی ہی نہیں دے رہی تھی۔ مراد شدید زخمی تھا اور حالات اتنے سنگین تھے کہ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ یہ حکم حاکم مرگ مفاجات والی صورتِ حال تھی اور پھر نور نے وہ منظر بھی دیکھا جب اشک بار چھوٹی امی اور خالہ عریفہ نے، باہر سے بلند ہونے والے پرغضب للکاروں کی گونج میں پیلا دوپٹا روتی سسکتی اسمہ کے سر پر ڈالا اور اس کے لرزاں ہاتھوں پر مہندی لگانا شروع کی۔

آہ...... یہ کیسی شادی تھی...... یہ کیسا نکاح تھا؟ پنچایتوں، بیٹھکوں اور جرگوں کے حکم پر یہ زنا بالجبر کے کیسے تماشے لگائے جاتے ہیں۔ جاہلیت اور انا پرستی کے حصار میں آبرو ریزی کے یہ کیسے کھیل، کھیلے جاتے ہیں؟

نور نے سوچا اور اس کے سر کی نسیں پھٹنے لگیں۔ وہ فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے سر کا عقبی حصہ دیوار سے لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔

☆☆☆

ہاں...... اس نے سر کا عقبی حصہ دیوار سے لگا کر آنکھیں بند کرلی تھیں...... اس کی آنکھوں کے سامنے ماضی کی طویل فلم چلی تھی جو بچپن اور لڑکپن سے شروع ہوئی۔ موراں والی گاؤں کے گلی کوچوں سے ہو کر نکلی اور لاہور پہنچی...... وہاں کی شاہراہوں، درس گاہوں اور کھیل کے میدانوں سے ہوتی ہوئی، سویمٹر کے ہیجان خیز ٹریک تک آئی۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے ماضی کی کھڑکی سے یادوں کا کتنا بڑا ہجوم دیکھا تھا...... اور اب ایک بار پھر وہ تصور کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں موجود تھی۔ حقیقت جو دسمبر کی اس خوفناک رات میں بے حد بے رحم اور لرزہ خیز تھی۔ حویلی چاروں طرف سے گھری ہوئی تھی۔ اردگرد دور تک کوئی مددگار نہیں تھا اور نہ کسی کو خبر تھی کہ اس برسات کی رات میں یہاں بارشی نالے کے کنارے اس تنہا حویلی پر کیا گزر رہی ہے۔ بچاؤ کی بس ایک ہی شکل رہ گئی تھی۔ بسمہ کو سرخ جوڑا پہنایا جاتا اور اسے ان زبردستوں کے حوالے کردیا جاتا جو باقاعدہ برات کے ساتھ یہاں موجود تھے۔ وہ اسے لے جاتے۔ بدمست چودھری زادہ آج رات ہی شادی کے نام پر اسے روند ڈالتا۔

ساتھ والے کمرے سے بسمہ کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں اور ساتھ ساتھ چھوٹی امی، پھپھو حاجرہ اور تائی وغیرہ کی سرگوشیاں بھی جو اسے حوصلہ دینے میں مصروف تھیں۔ نور نے وال کلاک کی طرف دیکھا...... آہ، ابھی صرف دو بجے تھے۔ صبح بڑی دور تھی۔ قرب و جوار میں بھیگی ہوئی سنسان رات نے اپنے بے مہر پنجے گاڑ رکھے تھے۔ لق و دق، سنسان اور پھنکاتی ہوئی رات۔

یکایک دوبارہ زبردست شور سنائی دیا۔ نور کے ابا جان، تایا ابا اور ملازمین احاطے کی طرف لپکے۔ نور کی رگوں میں خون منجمد ہونے لگا۔ عورتیں سسکنے لگیں۔ شور حویلی کے دائیں پہلو میں مہمان خانے کی جانب تھا۔ یہ مہمان خانہ (جو پندرہ بیس سال پہلے تعمیر کیا گیا تھا) حویلی کی بیرونی چار دیواری سے ملا ہوا تھا۔ کھاریوں کے للکارے، گالیاں، دھاڑیں، ہر آواز ان کی سماعتوں کا عذاب تھی۔ صورتِ حال واضح ہونے میں قریباً پانچ منٹ لگے۔

☆☆☆

برآمدے میں گیس لیمپس کی روشنی تھی۔ نور نے دیکھا کہ ملازمین نے کسی کا خونچکاں جسم اٹھا رکھا ہے اور اسے مردانے کی طرف لے جارہے ہیں۔ وہ دیکھ کر کانپ گئی۔ یہ حویلی کے سب سے پرانے ملازم فدا حسین کا بیٹا رشید تھا۔ ہاں نور کی نگاہیں دھوکا نہیں کھارہی تھیں، وہ رشید ہی تھا۔ غالباً اس کے سینے پر کوئی بہت بڑا گھاؤ تھا جس نے اس کے پورے بدن کو لہو رنگ کررکھا تھا۔ یہ محسوس کرکے نور کے رونگٹے کھڑے ہوگئے کہ رشید شاید زندہ نہیں ہے۔

خواتین کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا جارہا تھا لیکن نور نے اپنے تایازاد عثمان کو سیڑھیوں کے نیچے گھیرلیا۔ ''آخر کیا چھپا رہے ہو تم؟'' وہ اس کے بازو میں اپنے ناخن گھساتے ہوئے بولی۔

اس نے گول مول بات کرنے کی کوشش کی مگر نور نے اس کی ایک نہیں چلنے دی۔ آخر وہ روہانسی آواز میں بولا۔ ''ان حرامزادوں نے مار ڈالا ہے اس کو...... جان لے لی ہے اس کی۔''

نور چند سیکنڈ کے لیے سکتہ زدہ رہ گئی پھر ہمت کرکے بولی۔ ''مگر ہوا کیا ہے؟''

جواب میں تایازاد عثمان نے دلدوز لہجے میں جو کچھ بتایا، اس کا خلاصہ کچھ یوں تھا...... مہمان خانے کے عقبی کمرے باؤنڈری وال سے ملے ہوئے تھے۔ فدا حسین کے بیٹے رشید نے یہاں سے نکلنے اور پولیس چوکی تک پہنچنے کا ارادہ کیا۔ وہ دلیری کے ساتھ مہمان خانے کی چھت پر چلا گیا اور وہاں سے باہر چھلانگ لگا کر اندھا دھند بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کی قسمت اچھی ہوتی تو شاید وہ نکل جاتا مگر ٹارچ کی روشنی میں اسے دیکھ لیا گیا۔ وہ تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ پکڑا گیا۔ اس کے پاس وہی مراد والی چھری تھی، اس نے چھری چلا کر خود کو چھڑانا چاہا مگر...... بپھرے ہوئے شرابیوں نے اسے کلہاڑیوں اور خنجروں سے کاٹ ڈالا۔ پھر اس کی لاش دیوار کے اوپر سے اندر پھینک دی گئی۔ اب وہ دھمکیاں دے رہے تھے کہ دوسروں کا حشر بھی یہی ہوگا۔ اندر گھس آئے تو ایک ایک کو مار ڈالیں گے۔

نور نے سنا، باہر سے بلند ہونے والی آوازوں میں وحشت نمایاں تر ہوتی جارہی تھی۔

☆☆☆

مولوی اشفاق مہرا اور خلیل مہرا نے مشورہ کیا۔ انہیں اب بالائی منزل، نچلی منزل سے زیادہ محفوظ لگ رہی تھی۔ لڑکوں نے بھی یہی مشورہ دیا۔ مولوی اشفاق عورتوں کو لے کر دوسری منزل پر آ گئے۔ ان کی ہدایت پر نور کی دادی اماں کو ایک کرسی پر بٹھایا گیا اور شرجیل، عثمان، غیاث وغیرہ کرسی اٹھا کر دوسری منزل پر لے گئے۔ سیڑھیاں چڑھتے وقت دادی اماں کو رونے کی آوازیں آئیں۔ انہوں نے اس بارے میں پوچھا تو مولوی اشفاق نے انہیں گول مول سا جواب دیا۔

یہ آوازیں دراصل فدا حسین اور اس کی بیوی کی تھیں۔ اپنے بچے کی دردناک موت نے انہیں نوحہ کناں کر رکھا تھا۔

اشفاق صاحب بالائی منزل پر پہنچ گئے۔ وہ دکھ اور تشویش کی انتہا پر تھے۔ ایک طرف بے گناہ بیٹی اور اس پر ہونے والے ظلم وستم کا تصور تھا، دوسری طرف اپنے پورے خانوادے کی جان اور آبرو تھی۔ وہ کچھ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے۔ بسمہ کو اس کی پھپھو حاجرہ اور چھوٹی امی نے سرخ جوڑا تک پہنا دیا تھا مگر حتمی فیصلے کی ہمت ابھی تک کوئی نہیں کر پا رہا تھا۔

اشفاق صاحب صوفے پر بیٹھ گئے۔ لرزتی کانپتی بسمہ ان کی بائیں جانب اور بتول دائیں جانب تھی۔ مہرین اور ماموں زاد سلیمہ ان کے قدموں میں قالین پر بیٹھی تھیں۔ اشفاق صاحب نے بسمہ اور بتول کو اپنے ساتھ لگا رکھا تھا۔

"ارے نور کہاں ہے؟" پھپھو حاجرہ نے کہا اور کمرے کے دروازے کی طرف بڑھیں۔ "نور......نورا!" انہوں نے آوازیں دیں۔

اشفاق صاحب کی بیگم زلفت بھی اٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں۔

"کہاں گئی وہ؟" بتول نے بھی بے قراری سے کہا۔

اشفاق صاحب کچھ بڑبڑائے اور اٹھ کر برآمدے میں آ گئے۔ بارش کچھ دیر کے لیے رک گئی تھی۔ بادل پھٹے تھے اور پوری رات کا چاند جھانکنے لگا تھا۔ اشفاق صاحب نور کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھے، مہرین بھی ان کے ساتھ تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر مہمان خانے کا سنگل اسٹوری پورشن دکھائی دے رہا تھا۔ چھت پر لگا ہوا ٹی وی انٹینا چاندنی میں چمک رہا تھا۔ اچانک ایک منظر نے اشفاق صاحب کو جکڑ لیا۔ ان کی ساری حسیات جیسے سمٹ کر ان کی آنکھوں میں آ گئیں۔ انہوں نے ایک ایسا منظر دیکھا جس پر ان کی اپنی ہی نگاہوں کو بھروسا نہیں ہوا۔ کیا وہ جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہے تھے؟ وہ مہمان خانے کی چھت سے نیچے پرالی کے ایک ڈھیر پر چھلانگ لگا رہی تھی...... ہاں، یہ وہی تھی...... یہ وہی نافرمان تھی، وہی سرکش تھی......

مہرین نے بھی بے پناہ حیرت سے دیکھا۔ اگر یہ کوئی فلم ہوتی اور یہ منظر سلوموشن میں دیکھا جاتا تو بے حد سنسنی خیز ہوتا۔ دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے کر دیتا۔ وہ جیسے ہوا میں اڑتی ہوئی پرالی کے ڈھیر پر گری۔ وہاں سے اٹھی...... سنبھلی...... اور بھاگی۔ ہاں...... وہ بھاگی، اس کے سامنے تھور زدہ طویل میدان تھا۔ وہ اس کے آس پاس موجود تھے۔ انہوں نے للکارے بلند کیے اور اس کے پیچھے لپکے ...... ابھی کچھ دیر پہلے وہ فدا حسین کے لڑکے رشید کے پیچھے بھاگے تھے اور اسے پکڑ لیا تھا...... لیکن ...... یہ رشید نہیں تھا۔ یہ نور تھی۔ یہ پاکستان کی مانی ہوئی اسپرنٹرز میں سے ایک تھی اور وہ بھاگ رہی تھی۔ اپنی پوری رفتار کے ساتھ۔ وہ جیسے ہوا میں اڑ رہی تھی۔ اس نے دوپٹا کس کر کمر سے باندھ رکھا تھا۔ اس کے پاؤں میں جوگرز تھے۔ آج اس کا اسکارف پھسل گیا تھا اور اس کے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔

"پکڑو...... جانے نہ پائے۔" ایک للکارا بلند ہوا۔

لاٹھیاں اور کلہاڑیاں چمکیں۔ تعاقب کرنے والوں کے قدم برق رفتار ہوئے، وہ اسے دبوچنے کے لیے پوری طاقت سے بڑھے مگر ان کے آگے نور تھی...... اور نور کی رفتار...... بہت ہوتی ہے......

مولوی اشفاق منڈیر کے آخر تک آئے اور سینے کی پوری قوت سے چلائے۔ "بھاگو عین النور...... بھاگو...... ان کے ہاتھ نہیں آنا عین النور...... بھاگو۔" ان کی آواز گونجتی اور پھیلتی چلی گئی۔

کسی نے عین النور کا جواب نہیں سنا...... مگر مولوی اشفاق نے سنا۔ اس نے جیسے خاموشی کی زبان میں کہا تھا...... میں آپ کی بیٹی ہوں ابا جان! آپ کی ناکارہ ترین بیٹی۔ آپ کو بہت دکھ دینے والی، مایوس کرنے والی لیکن آج میں آپ کو مایوس نہیں کروں گی...... ہاں، میں نہیں کروں گی کیونکہ یہ میرا میدان ہے، یہ میرا راستہ ہے۔

"بھاگو عین النور...... بھاگو۔" مولوی اشفاق پھر پوری طاقت سے پکارے اور یہ وہی مولوی اشفاق تھے، جنہوں نے ہمیشہ کہا تھا...... مت بھاگو عین النور۔

"رن فاسٹ...... نورا رن فاسٹ۔" مہرین بھی چلائی۔

اور وہ بھاگ رہی تھی۔ یہ ایک ناقابلِ فراموش منظر تھا۔ چھریرے بدن کی ایک لڑکی اور...... اس کے تعاقب میں موت کے ہرکارے، درمیانی فاصلہ پندرہ بیس قدم کے قریب۔ تعاقب کرنے والوں میں بڑی عمر کے لوگ بھی تھے، کڑیل جوان بھی اور بالکل نوجوان چودھری زادے بھی۔ انہیں یقین تھا، وہ حصار توڑنے والی اس لڑکی کو بارشی نالے تک نہیں پہنچنے دیں گے کیونکہ بارشی نالے کے پار جھاڑیوں اور سرکنڈوں کا گھنا سلسلہ تھا اور پھر اس سے آگے وہ راستہ تھا جو سیدھا پولیس چوکی تک پہنچتا تھا اور وہ شاید اسی رخ پر جارہی تھی۔ وہ اس لڑکی سے اپنا درمیانی فاصلہ کم کرنے میں ناکام ہوئے تو بھاگتے بھاگتے اس کی طرف چھوٹے دستے کی کلہاڑیاں اور لاٹھیاں وغیرہ پھینکنے لگے۔ ساتھ ساتھ وہ گالیاں بھی بک رہے تھے۔ ان کی جھلاہٹ دیدنی تھی۔ ایک لڑکی، ایک کمزور لڑکی...... ان کے ہاتھ نہیں آرہی تھی۔

ہاں، قدرت ایسے ہی ہار کو جیت میں بدلا کرتی ہے۔ ایسے ہی جاں گسل مشقتوں کا صلہ دیا کرتی ہے۔ ایک طرح سے نہ سہی دوسری طرح سے...... دوسری طرح سے نہ سہی، تیسری طرح سے۔ بے شک محنتیں رائگاں نہیں جاتیں۔ جاں سوزیاں ضائع نہیں ہوتیں۔ آخر صلے مل کر رہتے ہیں۔

مولوی اشفاق اپنی بیٹی کی جیت دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ منڈیر کے آخری سرے تک پہنچ چکے تھے...... ”بھاگ جاؤ نور...... پولیس تک پہنچ جاؤ۔“ وہ بار بار کہتے تھے۔ انہوں نے مٹھیاں بھینچ رکھی تھیں، ان کی آواز بیٹھ رہی تھی۔

اب بسمہ، بتول، سلیمہ، چھوٹی امی، پھپھو حاجرہ اور بہت سے دیگر لوگ اس جگہ جمع ہو چکے تھے اور روشن چاندنی میں، سکتہ زدہ کرنے والی یہ انوکھی دوڑ دیکھ رہے تھے۔ پھر ایک ٹویوٹا گاڑی بھی نور کے پیچھے لپکی۔ یہ پھولوں سے سجی ہوئی تھی۔ شاید یہ وہی گاڑی تھی جس پر بسمہ کو لے جایا جانا تھا...... زندہ یا مردہ...... (چودھری طغرل نے یہی کہا تھا) گاڑی برق رفتاری سے نور کے تعاقب میں پہنچی تو وہ دائیں جانب کے ان تھور زدہ کھیتوں میں گھس گئی جن میں کچی منڈیریں بنا کر، انہیں آباد کرنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ یہاں پہنچ کر گاڑی بری طرح پھدکنے اور ڈگمگانے لگی۔ نور اور تعاقب کرنے والوں کا فاصلہ بڑھتا جارہا تھا۔ اس کے قدم برق کی طرح حرکت کررہے تھے...... بال لہرا رہے تھے۔ وہ ایک ایتھلیٹ کی تمام تر مہارت کے ساتھ فنش لائن کی طرف بڑھ رہی تھی اور آج اس کی فنش لائن یقیناً وہ بارشی نالا تھا جس کی دوسری جانب جھاڑیوں اور سرکنڈوں کا گھنا سلسلہ تھا۔

ٹویوٹا گاڑی کسی گڑھے میں پھنس کر گھوم گئی اور ڈھیروں مٹی اڑانے لگی۔ دوڑنے والوں میں بہت سے لوگ ہمت ہار کر سست پڑ چکے تھے مگر کھاپری برادری کے چند تیز طرار لڑکے اب بھی بھیڑیوں کی طرح اس کے تعاقب میں تھے...... اس تک پہنچنے کی سعی کر رہے تھے...... انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ اس دوڑ کے لیے ایک نہایت غلط حریف چن بیٹھے ہیں۔ بے شک کمزور، بے شک لڑکی...... لیکن بے شمار ایونٹس کی فاتح، پروفیشنل رنر۔ اس نے ایک بار پھر اپنا رخ تھوڑا سا پھیرا اور بھاگتی ہوئی اس بارشی نالے میں اتر گئی جہاں پانی اس کی کمر سے اوپر آرہا تھا۔ وہ جس رفتار سے دوڑی تھی، اسی ہمت سے اس نے نالے کو پار کیا اور دوسرے کنارے سے نکل آئی۔ اس کے پیچھے نالے میں کودنے والے نوجوان کھاپریوں کو ابھی کنارے تک پہنچنے میں کم از کم ایک منٹ درکار تھا۔ یہ ایک منٹ نور کے لیے بہت زیادہ تھا۔

☆☆☆

نور نے نالے کے مٹیالے سرد پانی میں سے نکل کر کنارے پر چڑھنے میں دیر نہیں لگائی۔ اس نے مڑ کر دیکھا، چاندنی میں ان کھاپریوں کے ہیولے صاف نظر آرہے تھے جنہوں نے اس کے پیچھے برساتی نالے میں چھلانگیں لگائی تھیں۔ وہ ابھی نصف پاٹ تک بھی نہیں پہنچے تھے۔ انہیں نور تک پہنچنے کے لیے کم و بیش ایک منٹ درکار تھا...... اور ایک منٹ میں ساٹھ سیکنڈ ہوتے ہیں۔ وہ جب بے دلی کے ساتھ بھی بھاگتی تھی تو بارہ اعشاریہ پندرہ سیکنڈ میں سو میٹر طے کر لیتی تھی۔

اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر پھر دوڑنا شروع کردیا۔ اب وہ اندھادھند تو نہیں بھاگ رہی تھی مگر پھر بھی رفتار خاصی تیز تھی۔ اس کے اردگرد اب خودرو جھاڑیاں تھیں اور دس بارہ فٹ بلند سرکنڈے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اسے پکڑ نہیں سکیں گے۔ شاید آج اسے کوئی بھی نہیں پکڑ سکتا تھا۔ آج اس کے کانوں میں اس کے ابا جان کی آواز پڑی تھی۔ یقیناً وہ اس کے ابا جان کی آواز ہی تھی۔ جب اس نے چاول کی چھال کے ڈھیر پر چھلانگ لگائی اور اپنے پاؤں کو پوری رفتار سے حرکت دی تھی، اس نے مہمان خانے کی چھت سے یہ آواز سنی تھی۔ انہوں نے پکار کر اسے

بھاگنے کا اور کھاپریوں کے ہاتھ نہ آنے کا کہا تھا...... وہی تو تھے جو اسے عین النور کے نام سے پکارتے تھے۔ بے شک یہ وہی تھے۔ اس آواز نے نور کے حوصلوں کو پہاڑ کر دیا تھا۔ اسے لگا تھا کہ آج اسے کوئی نہیں چھو سکے گا اور کوئی نہیں چھو سکا تھا۔

اب بھی وہ پوری ہمت کے ساتھ بھاگ رہی تھی۔ اس کے کپڑے سخت سردی میں نالے کے پانی سے بھیگ کر اس کے جسم سے چپک گئے تھے مگر شدید جسمانی مشقت کے سبب اس کے زیریں جسم کو بالکل سردی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ فقط شانوں اور چہرے کو ہوا کے تھپیڑے لگ رہے تھے۔ اسے ڈر صرف ایک ہی بات کا تھا، کہیں عقب سے بپھرے ہوئے کھاپری اس پر کوئی فائر نہ کر دیں۔ ابھی تک تو خیریت گزری تھی اور اسے لگتا تھا کہ خیریت ہی رہے گی۔

یہ امنالے کے میلے کے دن تھے۔ علاقے کے بدترین افراد بھی نسلوں سے چلے آنے والے رواج کے مطابق فائر ہونے والے ہتھیاروں کو چھونا گناہ سمجھتے تھے۔

وہ جانتی تھی کہ وہ سیدھی پولیس چوکی کی طرف جا رہی ہے۔ کل دوپہر اس نے آسمانی جھولے کی بلندی سے جو فضائی منظر دیکھا تھا، وہ اس کی مدد کر رہا تھا۔ پھر بھاگتے بھاگتے ایک دم ایک اور خیال اس کے ذہن میں آیا اور وہ ڈر گئی۔ میلے کے دنوں میں علاقے میں آتشیں ہتھیار ممنوع ہو جاتے تھے۔ کیا پولیس والوں کے پاس بھی ہتھیار نہیں ہوتے تھے؟ اس بارے میں اسے ٹھیک سے کچھ پتا نہیں تھا لیکن اگر پولیس والوں کے پاس بھی ہتھیار نہیں تھے تو پھر ...... وہ بپھرے ہوئے ہجوم کو اور جنونی کھاپریوں کو کیسے روک سکتے تھے؟

اس نے اپنی شلوار کے پائنچوں کو جرابوں میں گھسا کر ٹراؤزر کی شکل دے رکھی تھی۔ جوگرز کے تسمے بھی کس کر باندھ رکھے تھے، پھر بھی ایک جگہ اس کا پاؤں کسی چیز سے الجھا اور وہ گرتے گرتے بچی۔ چاندنی پھر ایک دم اوجھل ہو گئی تھی اور اسے تیز بھاگنے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ وہ پروفیشنل اسٹیمنا کی مالک ہونے کے باوجود ہانپ رہی تھی مگر اسے پتا تھا کہ اب چوکی زیادہ دور نہیں ہے۔ شاید ایک دو منٹ کا فاصلہ تھا...... یہی وقت تھا جب اسے عقب سے ایک فائر سنائی دیا۔

☆☆☆

ذوالقرنین کا دل شام سے ہی کچھ اکھڑا ہوا سا تھا۔ ایک بے نام سی اداسی اس پر حاوی ہو رہی تھی۔ رات گہری ہونے کے ساتھ ساتھ گرج چمک اور بارش کا سلسلہ بھی بڑھتا چلا گیا۔ ذوالقرنین کو کسی کروٹ چین نہیں آ رہا تھا۔ وہ یہاں سے چلے جانا چاہتا تھا، ابھی، اسی وقت۔ نور کی مسلسل سرد مہری نے ذوالقرنین کو جیسے اس کی اپنی نظروں سے ہی گرا دیا تھا۔ کسی وقت تو اسے یوں لگتا تھا کہ وہ گرے پڑے لڑکوں کی طرح وہ کام کر رہا ہے جسے عرفِ عام میں ''بھونڈی'' کہا جاتا ہے۔ وہ اصلاحِ معاشرہ کا ٹھیکیدار بنتا تھا اور اپنے دل کے ہاتھوں اتنا مجبور تھا کہ کسی موہوم امید کے سہارے نور کے پیچھے یہاں موراں والی تک چلا آیا تھا۔ بے شک میلا دیکھنے کی دعوت اسے پچھلے سال اشفاق مہرا صاحب نے بھی دی تھی اور یہ ایک معقول بہانہ تھا مگر جو کچھ اس کے دل میں تھا، وہ تو ذوالقرنین اچھی طرح جانتا تھا۔

اردو بازار کے تین اور دوست بھی اس کے ساتھ تھے۔ وہ خوب انجوائے کر رہے تھے۔ وہ سب ایک مقامی کے گھر کرائے پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ میلے کے دنوں میں اپنے گھر کرائے پر دینے کا رواج موراں والی میں بھی پایا جاتا تھا۔ رات گیارہ بارہ بجے تک ذوالقرنین کی طبیعت اتنی بیزار ہو گئی کہ اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ابھی موراں والی سے نکل جائے گا...... (دوستوں کو بتائے بغیر) وہ لوگ علیحدہ گاڑی پر آئے تھے اور جب چاہے جا بھی سکتے تھے۔

بارہ بجے کے لگ بھگ وہ خاموشی سے اٹھا۔ وضو کر کے نمازِ حاجات ادا کی۔ سفر کے نفل پڑھے۔ صرف ایک دوست رمیز کو اٹھایا جس سے وہ اپنی کیفیت شیئر کر سکتا تھا۔ اسے اپنی روانگی کا بتا کر اور قائل کر کے وہ چپ چاپ اپنی قیام گاہ سے نکل آیا۔ بارش ہلکی ہو چکی تھی اور کسی وقت بند بھی ہو جاتی تھی۔ سردی سے بچنے کے لیے اس نے اپنی اونی کوہاٹی چادر اچھی طرح بالائی جسم پر لپیٹ لی۔ نیلی ایف ایکس گاڑی کھلے میں کھڑی تھی اور برف ہو رہی تھی۔ فوری طور پر تو گاڑی کا ہیٹر بھی کام نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور موراں والی سے اور موراں والی کے میلے سے نکل آیا۔ پتا نہیں کیوں وہاں سے نکلتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نمی سی آ گئی۔ اس کی نگاہوں میں بار بار وہ منظر آ جاتا تھا جب وہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ ٹھیلے والے کے پاس کھڑی تھی اور پھر اسے دیکھ کر بالکل منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی تھی۔ کتنی بے اعتنائی، بیگانگی اور بیزاری جھلکتی تھی اس کے انداز سے۔

اس نے گاڑی کو دوسرے گیئر میں ڈالا اور کچے پکے راستے پر ہچکولے کھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ پختہ سڑک تک پہنچنے کے لیے اسے تقریباً دو کلومیٹر تک اسی نیم پختہ راستے پر جانا تھا اور پھر برساتی نالے کا تنگ پل بھی پار کرنا تھا۔

اس کے دائیں بائیں جھاڑیاں اور سرکنڈے تھے۔

چاند نے تھوڑی دیر کے لیے گہرے بادلوں کی اوٹ سے جھلک دکھائی تھی اور پھر اوجھل ہو گیا تھا۔ اچانک ذوالقرنین بری طرح ٹھٹک گیا۔ اسے بائیں جانب سے کچھ فاصلے پر فائر کی آواز سنائی دی...... ابھی وہ اسی پر غور کر رہا تھا کہ بائیں جانب کے سرکنڈوں میں عجیب سی حرکت ہوئی اور کوئی تیزی سے بھاگ کر سامنے سے گزرا۔ وہ ایک لمحے کے لیے ایف ایکس کی ہیڈ لائٹس کے سامنے آیا تھا۔ ذوالقرنین سکتے میں رہ گیا۔ اسے اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہوا۔ بھیگے لباس اور بھیگے بالوں والی وہ دراز قد لڑکی جو لڑکھڑاتی ہوئی سی بھاگ رہی تھی...... نور کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی......

حیرت کے شدید دھچکے سے سنبھلنے کے بعد اس نے گاڑی کے بریک دبائے اور کھڑکی کھول کر اپنے پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے پکارا۔ ''نور...... نور۔''

وہ رک گئی۔ درمیانی فاصلہ دس پندرہ قدم سے زیادہ نہیں تھا۔ ''یہ میں ہوں نور۔'' وہ پھر چلایا۔

تب تک شاید وہ بھی ذوالقرنین کی نیلی ایف ایکس پہچان چکی تھی۔ وہ چند لمحے ساکت رہنے کے بعد گاڑی کی طرف جھپٹی اور دروازہ کھول کر اگلی نشست پر بیٹھ گئی۔

''جلدی کرو...... پولیس چوکی چلو۔ انہوں نے حویلی کو گھیر لیا ہے...... وہ...... میرے پیچھے بھی آ رہے ہیں۔'' اس کی آواز دہشت کے سبب ناقابلِ شناخت ہو رہی تھی۔

ذوالقرنین بھی حیرت اور سنسنی کے شدید گھیرے میں آ گیا لیکن کوئی سوال پوچھنے کے بجائے اس نے گاڑی کو تیزی سے آگے بڑھانا مناسب سمجھا۔ گاڑی غیر ہموار راستے پر اچھلتی کودتی آگے بڑھی...... اور پھر اس نے ایک جگہ سے نالے کا پل پار کر لیا۔

''آپ زخمی تو نہیں ہیں؟'' ذوالقرنین نے اس پر ایک نگاہ ڈالی اور ہیجانی لہجے میں پوچھا۔

''نہیں، میں ٹھیک ہوں۔'' وہ مضطرب آواز میں بولی۔

ایک آدھ منٹ کے اندر ہی وہ پولیس چوکی کے سامنے تھے۔ پولیس چوکی کے مختصر صحن میں تاریکی تھی۔ ایک دو کمروں کے روشن دانوں میں لالٹین وغیرہ کی روشنی دکھائی دیتی تھی۔ ہلکی بارش پھر شروع ہو گئی تھی۔ نور اور ذوالقرنین ایک ساتھ گاڑی سے نکلے اور چوکی کا بیرونی دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ بیرونی دیوار کی اونچائی دس فٹ کے قریب تھی۔

''دروازہ کھولیں، جلدی کریں۔'' نور چلانے والے انداز میں بولی۔

اس سے ملتا جلتا فقرہ ذوالقرنین نے بھی دہرایا۔ ساتھ ساتھ وہ دونوں دروازہ بھی پیٹ رہے تھے۔ پھر ذوالقرنین کے ذہن میں آیا اور اس نے گاڑی کی کھلی کھڑکی میں سے اپنا ہاتھ گزار کر ہارن پر رکھ دیا۔

اس کا بھی کچھ اثر نہیں ہوا۔ ''پتا نہیں بھنگ پی کر سو گئے ہیں سارے۔'' ذوالقرنین جھلا کر بولا۔

نور سخت پریشانی میں مڑ مڑ کر دیکھ رہی تھی۔ اس کی سانس چڑھی ہوئی تھی اور سینے کا زیر و بم واضح تھا۔

اچانک ذوالقرنین کے ذہن میں نیا خیال آیا۔ گاڑی ابھی تک اسٹارٹ تھی۔ وہ اسے چلا کر دیوار کے بالکل قریب لے آیا۔ پھر اس کی چھت پر پاؤں رکھ کر دیوار پر چڑھا اور اندر کود گیا۔ چند ہی سیکنڈ بعد اس نے بیرونی دروازہ اندر سے کھول دیا۔ نور اسی لمحے کی منتظر تھی۔ وہ جلدی سے اندر گھس گئی۔ ''کنڈی چڑھا دیں۔'' ذوالقرنین نے کہا اور صحن پار کر کے اندرونی کمروں کی طرف لپکا۔

اس نے ایک کمرے کا دروازہ بری طرح پیٹ دیا۔

اس مرتبہ یہ کوشش رائگاں نہیں گئی۔ دروازہ کھلا اور سادہ کپڑوں میں ایک بھاری بھرکم شخص نظر آیا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہ چوکی انچارج سب انسپکٹر جان محمد تھا اور خاصا دبنگ شخص تصور کیا جاتا تھا۔

ذوالقرنین نے جھلا کر کہا۔ ''آپ لوگ کس طرح کی ڈیوٹی دے رہے ہیں۔ باہر غدر مچا ہوا ہے اور آپ نے دروازے بند کر رکھے ہیں۔''

سب انسپکٹر نے اپنی سرخ آنکھوں سے ذوالقرنین کو گھورا، ہو سکتا تھا کہ وہ جواب میں کوئی سخت بات کہتا لیکن اس کی نگاہ خستہ حال نور پر پڑ گئی۔ ''کیا ہوا ہے؟'' اس نے پاٹ دار آواز میں پوچھا۔

نور اپنا سر ڈھانپتی ہوئی آگے آئی اور بولی۔ ''آپ یہ پوچھیں کہ کیا نہیں ہوا۔ کھاپریوں نے ہمارے گھر کو گھیر لیا ہے۔ ایک بندے کو سخت زخمی اور دوسرے کو قتل کر دیا ہے۔ وہ...... میرے پیچھے...... بھی لگے ہوئے ہیں۔'' اس کا گلا رندھ گیا۔

دو تین اور کمروں کے دروازے اب کھل گئے تھے۔ کچھ باوردی اور کچھ سادہ لباس والے اہلکار باہر نکل آئے

تھے۔ نور مسلسل بولتی چلی گئی اور ایک منٹ کے اندر اندر اس نے تقریباً ساری صورتِ حال پولیس والوں کے گوش گزار کردی۔ یہ انکشاف ذوالقرنین کے لیے بھی تہلکہ خیز تھا کہ حویلی کے اردگرد بہت سے لوگ جمع ہیں اور نور کی بہن بسمہ کو ایک طرح سے اغوا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

ایک ہیڈ کانسٹیبل نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”تھوڑی پہلے مجھے بھی شک ہوا تھا کہ نالے کی طرف کوئی فائر کیا گیا ہے بلکہ شاید یہ دو فائر تھے۔ فائر اور وہ بھی میلے کے دنوں میں۔ گڑبڑ تو ضرور ہورہی ہے جی۔“

دو تین منٹ کے اندر اندر پولیس اہلکار چوکی سے باہر نکل آئے۔ ان کی تعداد پندرہ کے لگ بھگ تھی۔ کچھ وردی میں اور کچھ سادہ لباس میں تھے۔ دو چار کو چھوڑ کر سب کے پاس اسلحہ موجود تھا۔ اندازہ ہورہا تھا کہ سب انسپکٹر جان محمد خود بھی کھاپری برادری سے زیادہ خوش نہیں ہے۔ اس نے فوراً بذریعہ فون قریبی تھانے تک بھی اطلاع پہنچادی تھی۔ جھاڑیوں اور سرکنڈوں کے پار حویلی کی جانب روشنی سی دکھائی دے رہی تھی۔ شاید کہیں تھوڑی بہت آگ بھی لگی ہوئی تھی۔

سب انسپکٹر جان محمد اپنی نفری کے ساتھ پولیس موبائل میں بیٹھ گیا۔ کچھ اہلکار موٹر سائیکلوں پر تھے، تین چار ذوالقرنین کی ایف ایکس میں لد گئے۔ تھوڑا آگے جاکر سب انسپکٹر نے گاڑی رکوالی۔ یہاں بہت بڑی ایک جھونپڑا بستی تھی۔ بارش کی وجہ سے ان میں سے کئی لوگ جاگ رہے تھے۔ سب انسپکٹر نے بلند آواز میں انہیں پکارا۔ پکی رنگتوں والے پانچ چھ افراد لپک کر اس کی طرف آئے۔ اس نے ان سے کچھ کھسر پسر کی۔ ایک دو منٹ کے اندر ہی اس جھونپڑا بستی میں ہلچل نظر آئی اور درجنوں افراد کلہاڑیوں اور لاٹھیوں سے مسلح ہوکر نکل آئے۔ ان میں سے کچھ گھوڑا ریڑھیوں پر اور کچھ گدھا گاڑیوں پر سوار ہوگئے۔ اس سارے قافلے نے پل پار کیا اور تیزی سے وقوعہ کی طرف بڑھا۔

نور، ذوالقرنین کے ساتھ ایف ایکس میں اگلی نشست پر بیٹھی تھی۔ اس کا لباس نم تھا اور اب وہ سردی سے کانپ رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ پولیس اہلکاروں کو حویلی کی تشویشناک صورتِ حال سے بھی آگاہ کررہی تھی اور بتارہی تھی کہ وہ کس طرح بچ کر یہاں پہنچ پائی ہے۔

ذوالقرنین نے اسے کانپتے دیکھا تو اپنی گرم کوہاٹی شال اتار کر نور کے کندھوں پر ڈال دی۔ وہ پہلے تو جھجکی اور یوں لگا کہ وہ شال لینے سے انکار کردے گی مگر پھر خاموش رہی۔ ”اس کو اچھی طرح لپیٹ لیں۔“ ذوالقرنین نے اس کی حالت دیکھتے ہوئے کہا۔

کچے پکے راستے پر گاڑی اچھلتی کودتی آگے بڑھ رہی تھی۔ پولیس موبائل کی عقبی سرخ بتیاں ذوالقرنین کی راہنمائی کررہی تھیں۔ ان کے عقب میں خانہ بدوشوں کے ریڑھے اور گدھا ریڑھیاں تھیں۔ غالباً ان کے دو چار کتے بھی شور مچاتے ساتھ آرہے تھے......

تھور زدہ طویل میدان میں پہنچتے ہی حویلی کے آثار نظر آنے لگے۔ شاید حویلی کے کسی کونے میں آگ بھی سلگ رہی تھی۔ سب انسپکٹر نے عقلمندی کا مظاہرہ کیا اور ایک جگہ گاڑی روک کر آٹومیٹک رائفلوں سے کئی برسٹ چلوائے۔ یہ ہوائی فائرنگ تھی اور بلوائیوں کے لیے پیغام تھا کہ پولیس آگئی ہے، وہ نکر نہ لیں۔

......کچھ دیر بعد جب وہ لوگ حویلی کے سامنے پہنچے تو گھیراؤ کرنے والے بکھر چکے تھے۔ ذوالقرنین اور نور نے کچھ ٹولیوں کو دریا کی جانب بھاگتے دیکھا۔ کچھ ٹارچوں اور لالٹینوں کی دور ہوتی ہوئی روشنیاں سرکنڈوں کی جانب نظر آرہی تھیں۔

نور نے دیکھا مشتعل کھاپریوں نے حویلی کے قدیم چوبی دروازے کو آگ لگانے کی کوشش کی تھی۔ یہ کوشش یقیناً نور کے فرار ہونے کے بعد ہی ہوئی تھی۔ مگر لکڑی اور لوہے سے تیار ہونے والے اس دروازے کا کچھ خاص نہیں بگڑ سکا تھا۔ اب خانہ بدوش بھی پہنچ گئے تھے اور پولیس کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوگئے تھے۔ زبردست ہوائی فائرنگ اور پولیس گاڑی کا مسلسل ہوٹر سن کر حویلی والوں کو یقین ہوگیا کہ پانسا پلٹ چکا ہے۔ حویلی کا جہازی سائز دروازہ کھول دیا گیا۔ نور کی نگاہ سب سے پہلے شرجیل، چچا احسان اور اپنے ابا جان پر پڑی وہ لپک کر ان کی طرف گئی۔ ابا جان کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ ٹھٹک گئی، جیسے سمجھ نہ پارہی ہو کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ ابا جان کے سامنے پہنچ کر وہ ایسے ہی منتشر سی ہوجایا کرتی تھی لیکن اس بار صورتِ حال مختلف رہی۔ ابا جان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ انہوں نے عجیب کیفیت میں اپنے دونوں بازو نور کے لیے کھول دیے۔ وہ لپک کر گئی اور ان کی بانہوں میں سماگئی۔

”میری بچی...... میری عین النور۔“ وہ پکارتے چلے گئے۔ ”آج تم نے وہ کیا جو کوئی اور نہ کرسکتا تھا۔ آج تم میرا بیٹا بنی ہو۔ آج تم نے ہم سب کو ایک بہت بڑی مصیبت اور

خواری سے بچایا ہے......'' انہوں نے اسے بانہوں میں بھینچ لیا اور اس کا سر اور ماتھا چومتے چلے گئے۔

وہ سسک رہے تھے اور وہ بھی رو رہی تھی۔ وہ جب روتی تھی تو بس اس کی آنکھوں کے کنارے جلا کرتے تھے لیکن آج اس کے آنسو بھی نکل رہے تھے۔

اس کے ابا جان اشک بار آواز میں بولے۔ ''میری بہادر بیٹی...... میری دلیر بیٹی...... شیر بیٹی......''

سب انسپکٹر جان محمد اور اس کے ماتحت تعجب سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ساری بات ان کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ نور کے ابا جان نے خود کو نور سے علیحدہ کرتے ہوئے فخریہ لہجے میں کہا۔ ''یہ میری بیٹی ہے...... یہ...... بہت بڑی رنر ہے...... بڑے میڈل جیت چکی ہے۔ اسی نے آج ان بدبخت کھاپریوں کا گھیرا توڑا ہے اور آپ تک پہنچی ہے۔ اللہ سوہنے نے اسے ہم سب کی جان آبرو کی حفاظت کا ذریعہ بنایا ہے۔''

انہوں نے ایک بار پھر نور کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ نور بولی ''ماموں مراد کہاں ہیں۔ انہیں اسپتال پہنچانے کی ضرورت ہے۔''

'' تمہارے تایا اور عثمان وغیرہ اسے لے کر جا رہے ہیں۔ وہ دیکھو گاڑی آرہی ہے۔'' انہوں نے ہیڈ لائٹس کی طرف اشارہ کیا۔ تاریکی کو چیرتی ہوئی ہیڈ لائٹس گیٹ تک آگئیں۔

گاڑی قریب پہنچی تو تایا ابا نے کھڑکی سے چہرہ نکال کر نور کی گردن کی پشت پر ہاتھ رکھا اور اسے اپنی طرف جھکا کر اس کی پیشانی کا بوسہ لیا۔ اشک بار آنکھوں کے ساتھ لیے جانے والے اس بوسے میں انہوں نے وہ سب کچھ کہہ دیا جو وہ کہنا چاہتے تھے۔ نور نے پچھلی نشست پر دراز ماموں مراد کو دیکھا۔ ان کے سر کی بینڈیج خون سے تر تھی۔ آنکھیں بند تھیں، عثمان نے کہا۔ ''گھبرانے کی بات نہیں نورا! ٹرنکولائزر کے اثر میں ہیں۔ انشاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گے۔''

گاڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ یہی وقت تھا جب ایک چنگھاڑ سی نور کے کانوں میں پڑی۔ وہ گھبرا کر پلٹی۔ گیٹ کے بالکل پاس گل عباسی کے پودوں کے پیچھے سے ایک پرچھائیں سی جھپٹتی ہوئی نظر آئی۔ تاریکی میں نور کو بس یہی نظر آیا کہ حویلی کے چوکیدار گل محمد کی ٹوپی اچھل کر دور جا گری ہے۔ پھر ایک دوسرا شخص پرچھائیں سے لپٹ گیا...... ورنہ یہی لگ رہا تھا کہ وہ پرچھائیں سیدھی نور کی طرف آئے گی۔

ایک دم کہرام سا مچ گیا تھا۔ کوئی جنونی انداز میں چلا رہا تھا۔ ''ماردوں گا...... کاٹ ڈالوں گا...... ٹوٹے کردوں گا۔''

نور کئی قدم پیچھے ہٹ گئی تھی اور ابا جان نے اسے اپنی اوٹ میں لے لیا تھا۔ نور کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ٹارچوں کی روشنی تصادم والی جگہ پر پہنچی تو نور نے دیکھا کہ چوڑا چکلا ابدال کسی سے لپٹا ہوا ہے۔ وہ جس سے لپٹا ہوا تھا، وہ ذوالقرنین کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ابدال کے ہاتھ میں چھوٹے دستے والی چمک دار کلہاڑی تھی اور اس کے چہرے پر غیظ و غضب کے شعلے تھے۔ صاف طور پر پتا چلتا تھا کہ وہ شراب کے نشے میں دھت ہے...... اور کسی بھیڑیے سے بڑھ کر خون آشام ہو رہا ہے۔ اس کی کلہاڑی پر ذوالقرنین نے بھی گرفت بنا رکھی تھی اور دونوں تقریباً گتھم گتھا تھے۔ پھر وہ دونوں گر گئے لیکن ذوالقرنین نے کلہاڑی کے دستے پر اپنی گرفت ختم نہیں ہونے دی۔ اس کی مزاحمت زبردست تھی۔

پھر پولیس والے اور دیگر افراد بھی ابدال پر جھپٹے اور اس خون آشام کو دبوچ لیا گیا۔ وہ دیوانگی کے عالم میں دہاڑ رہا تھا اور پتا نہیں کیا کیا بک رہا تھا۔ بس ایک فقرہ ہی نور کی سمجھ میں آیا۔ ''اپنی ووہٹی لے کر جاؤں گا، چھوڑوں گا نہیں اسے......''

نور یہ سوچ کر لرز گئی کہ یہی وہ شخص تھا کہ آج رات بسمہ کو جس کے حوالے کیا جانا تھا۔ پولیس والوں نے وہیں گیٹ کے قریب اسے بے دریغ پیٹا اور نیم بے ہوش کر ڈالا۔ لرزتی کانپتی نور کو اس کے ابا جان نے اپنے ساتھ لگایا ہوا تھا۔ نور نے ذوالقرنین کی طرف دیکھا۔ اس کا گریبان چاک ہو گیا تھا۔ ہونٹوں سے خون رس رہا تھا لیکن ویسے وہ بالکل ٹھیک تھا۔

چوکیدار گل محمد کے چہرے پر کلہاڑی کا سخت وار لگا تھا۔ اس کے کئی دانت ٹوٹ گئے تھے اور ایک طرف کا گال قریباً کان تک چر کر رہ گیا تھا۔ ایک دوسری گاڑی میں اسے بھی فوراً اسپتال روانہ کر دیا گیا۔

صورت حال سے صاف پتا چل رہا تھا کہ پولیس پارٹی کی آمد پر باقی لوگ تو یہاں سے تتر بتر ہو گئے تھے مگر یہ شرابی ابدال کہیں آس پاس چھپ گیا تھا اور کسی موقع کا منتظر تھا۔ گیٹ کھلنے کے بعد یہ موقع اسے نور پر حملے کی صورت میں ملا جو چوکیدار گل محمد اور ذوالقرنین نے ناکام بنا دیا۔

سب کے سامنے ہی بری طرح مدہوش ابدال کو الٹی ہتھکڑی لگا کر پولیس کی گاڑی میں پھینک دیا گیا۔ وہ لہولہان

تھا اور ایک ٹوٹا ہوا چمکیلا ہار اب بھی اس کے گلے سے لٹک رہا تھا۔ سب انسپکٹر جان محمد کی ہدایت پر پولیس اہلکاروں نے حویلی کے اردگرد سرچ آپریشن شروع کر دیا کہ کوئی اور کھاپری بھی کہیں گھات لگائے نہ بیٹھا ہو۔ حویلی کا گیٹ بھی بند کر دیا گیا تھا۔

ماموں اور چچا وغیرہ اب ذوالقرنین سے باتیں کر رہے تھے۔ اس کی خیریت پوچھ رہے تھے۔ پھر سب انسپکٹر جان محمد نے ماموں اور چچا کو اپنے پاس بلا لیا اور ان کو ضروری ہدایات دینے لگا۔ اسی دوران میں نور نے دیکھا کہ ذوالقرنین آگے آیا۔ نور کے اباجی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''انکل! زخمیوں کو اس طرح اکیلے نہیں بھیجنا چاہیے، کوئی ساتھ ہو۔ یہ لوگ یہاں سے تو بھاگ گئے ہیں لیکن ادھر ادھر بکھرے ہوئے ہیں۔''

ذوالقرنین کی بات کا وزن سب نے محسوس کیا۔ افراتفری میں اس طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا۔

ذوالقرنین نے اپنی گاڑی کے دروازے کھول دیے۔ تین مسلح پولیس اہلکار اس کے ساتھ بیٹھ گئے اور گاڑی زخمی چوکیدار والی گاڑی کے پیچھے روانہ ہو گئی...... حویلی میں اب حالات مکمل کنٹرول میں تھے۔ معلوم ہوا کہ جب نور چھت سے چھلانگ لگا کر بھاگی اور کھاپریوں کی زد سے نکل کر سرکنڈوں میں اوجھل ہو گئی تو مایوس ہو کر اور جھنجلا کر کھاپریوں نے حویلی کے گیٹ کو آگ لگانے کی کوشش کی۔ انہوں نے دیوار کے اوپر سے صحن میں کچھ پیٹرول بم بھی پھینکے۔ جواب میں ان پر چھت سے سخت خشت باری کی گئی...... پیٹرول بموں سے دو تین افراد کو معمولی زخم آئے۔ کسی بڑے نقصان سے بچت ہو گئی۔

......خطرہ ٹل چکا تھا پھر بھی سب انسپکٹر جان محمد نے چند اہلکار گیٹ پر متعین کر دیے اور باقیوں کو ساتھ لے کر لاش کے معائنے کے لیے چلا گیا۔ نور کے ابا جان، چچا جان اور دیگر مرد بھی ساتھ گئے۔ نور، پھپھو حاجرہ اور تائی راحت کے ساتھ خواتین والے حصے میں آ گئی۔ آپی بتول، بسمہ، مہرین، سلیمہ سب اس کے گرد اکٹھی ہو گئیں۔ ان میں سے بیشتر ابھی تک لرزاں تھیں۔ وہ ان سب جیسی تھی لیکن سب جیسی نہیں بھی تھی۔ وہ مختلف تھی اور آج ایک بڑے واقعے نے یہ ثابت بھی کر دیا تھا۔ سب کی آنکھوں میں ستائش تھی اور محبت آمیز نمی تھی۔ مہندی لگے ہاتھوں والی بسمہ نے اسے ایک بار پھر اپنی بانہوں میں بھینچ لیا اور سسکنے لگی۔ جب وہ دونوں جدا ہوئیں تو سب اردگرد بیٹھ گئیں اور نور پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ حویلی سے باہر اب پولیس کی مزید گاڑیوں کے ہوٹر سنائی دینے لگے تھے۔

☆☆☆

......اور یہ منظر تھا لاہور میں مولوی اشفاق مہرا کی رہائش گاہ کا۔ نور اب اپنے گھر میں تھی۔ کچھ لمحے عجیب کایا پلٹ ہوتے ہیں۔ مشکلیں آسان کر دیتے ہیں۔ بلند و بالا دیواریں جن کے گرنے کا کوئی امکان نہیں ہوتا، ریت بن کر مسمار ہو جاتی ہیں۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا جب ابا جان نے اسے حویلی کے دروازے پر سینے سے لگایا تھا اور اس کا ماتھا چوما تھا اور اسے بہادر بیٹی کہہ کر اس کی پیٹھ تھپکی تھی...... انہی لمحوں میں...... ہاں، انہی لمحوں میں نور نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس کے ابا جان جو بھی کہیں گے وہ سر تسلیم خم کر دے گی۔ اب وہ ساری زندگی ان کی کسی بات کو رد نہیں کرے گی۔ شاید اس کے ابا جان کو خود بھی معلوم نہیں تھا کہ ان کی ایک تھپکی کی قیمت کتنی زیادہ ہے۔ وہ اس ایک تھپکی پر اپنی زندگی نثار کر سکتی تھی۔

اپنے والد کی مرضی و منشا کے لیے جو یہ خدا داد آمادگی اس کے اندر پیدا ہوئی تھی، وہ اسے اب ضائع کرنا نہیں چاہتی تھی۔ جلد از جلد اسے استعمال میں لے آنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے اسی کمرے میں بیٹھی تھی جہاں سے اٹھ کر وہ ایک دن تایا ابا کے گھر میں جا بسی تھی۔ دل فگار اور پارہ پارہ۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ جنوری کی شفق رنگ شام لاہور کے آسمان کو چھو رہی تھی۔ رنگ برنگی پتنگیں فراٹے بھرتی ہوئی فضا میں تیر رہی تھیں اور ساتھ ساتھ اپنے ٹھکانوں کی طرف سمٹ رہی تھیں۔ ایسی مختصر اور سرد شامیں اسے اکثر اداس کر دیتی تھیں۔ اس نے براؤن رنگ کی وہ گرم کوہاٹی چادر دیکھی جسے اس نے استری کر کے تہ کر دیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ خدیجہ سے ملاقات ہو تو وہ اس کے بھائی کی چادر اسے واپس کر دے۔ اس نے بے خیالی میں چادر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ منظر اس کی نگاہوں میں بھر گیا جب اس تہلکہ خیز رات میں حویلی کی طرف جاتے ہوئے اس نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ تھاما تھا اور دوسرے ہاتھ سے اپنی چادر کندھوں سے اتار کر نور کے شانوں پر پھیلا دی تھی۔ ان لمحوں میں وہی تڑپ، وہی لگن اور لازوال انتظار دکھائی دیا تھا جس کا مشاہدہ اس نے ایک دو بار پہلے بھی کیا تھا اور جس نے اسے سرتاپا لرزا دیا تھا۔ وہ شروع میں اسے بہت برا شخص سمجھتی تھی پھر وہ اسے صرف برا سمجھنے لگی لیکن اب وہ اس کے لیے ایک اچھا شخص بن چکا تھا۔ سچا، کھرا اور شاید انسانیت سے محبت کرنے والا بھی لیکن

وہ کیا کرتی؟ وہ اچھا ہونے کے باوجود بلکہ بہت اچھا ہونے کے باوجود اس کے لیے پسندیدہ نہیں تھا۔ وہ اس کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتی تھی۔ وہ مجبور سی ہو جاتی تھی۔ کیوں مجبور ہو جاتی تھی؟ شاید..... کوئی آئیڈیل اس کی راہ میں حائل ہو جاتا تھا۔ کلین شیوڈ، ماڈرن لباس، چلبلا۔ یا پھر کوئی انجانا خوف تھا جو اس کا راستہ روکتا تھا۔ یہ کیا کیفیت تھی؟ وہ خود بھی سمجھ نہ پائی تھی۔

مہرین کبھی کبھی زیادہ بے تکلف ہو جاتی تھی۔ اس نے ایک دو بار اس تہلکہ خیز رات کے حوالے سے اسے چھیڑا بھی تھا۔

ایک دن کہنے لگی تھی۔ ''سمجھ میں نہیں آتا کہ جب تم چوکی کی طرف جا رہی تھیں، خدیجہ کا بھائی اتفاقاً ہی تمہیں آملا تھا؟''

''کیا مطلب؟''

''کہیں کوئی رابطہ وغیرہ تو نہیں ہوا تھا پہلے سے؟''

''تمہاری عقل گھاس چرنے گئی ہوئی ہے اور میرا دل چاہ رہا ہے کہ گلاس مار کر تمہارا سر توڑ دوں۔''

''مگر اس سے مجھے جواب تو نہیں مل جائے گا نا۔ اچھا چلو چھوڑو اس بات کو..... جب تم دونوں اکٹھے گاڑی میں حویلی جا رہے تھے کیسا محسوس ہوا تمہیں؟ میرا مطلب ہے کہ کوئی بات تو کی ہوگی اس نے یا تسلی کے لیے تمہارا ہاتھ تھاما ہوگا.....''

''اس وقت تین پولیس والے بیٹھے ہوئے تھے گاڑی میں..... اور کلیجا منہ کو آرہا تھا۔'' نور نے بیزار لہجے میں کہا تھا اور اٹھ کر کچن کی طرف چلی گئی تھی۔

حویلی والے واقعات کو اب قریباً دس روز ہو چکے تھے۔ دو تین اخبارات میں حویلی والے واقعے کی تفصیلی خبر بھی چھپ چکی تھی..... اس میں جانی پہچانی ایتھلیٹ نور کی کارکردگی کو بھی سراہا گیا اور بتایا گیا کہ اس نے کس طرح ایک نہایت سنگین صورتِ حال میں اپنی فیملی کی مدد کی اور بھاگ کر ایک قریبی پولیس اسٹیشن تک پہنچی۔ جو بھی نور سے ملتا تھا، پہلے اس حیرت انگیز واقعے کے بارے میں ہی پوچھتا تھا۔

اتوار کا دن تھا۔ ابا جان گھر میں ہی تھے۔ آپی بتول، آپی کے شوہر غیاث اور بسمہ ماموں مراد کی خبر گیری کے لیے اسپتال گئے ہوئے تھے۔ ان کے سر کا باقاعدہ آپریشن ہوا تھا اور اب وہ روبہ صحت تھے۔ چوکیدار گل محمد کے چار دانت ٹوٹ گئے تھے اور جبڑے کی ہڈی بھی فریکچر ہوگئی تھی۔ وہ زیر علاج تھا۔ مہرا فیملی اس کی پوری نگہداشت کر رہی تھی۔

نور، ابا جان کے سر کے بالوں میں تیل ڈال کر مالش کرنے میں مصروف تھی۔ وہ ان کے عقب میں تھی۔ اپنی بات کہنے کے لیے یہ بڑا اچھا موقع تھا۔ ابا جان نور کو حویلی کے حالات کے بارے میں بتا رہے تھے۔ ان کے مطابق فدا حسین کے بیٹے رشید کے قتل کا مقدمہ چودھری طغرل اور اس کے بڑے بیٹے ابدال کے خلاف ہی درج ہوا تھا۔ آٹھ دس اور افراد بھی نامزد تھے مگر بڑے مجرم یہی دونوں تھے۔

ابا جان نے کہا۔ ''یہ بھی پتا چلا ہے کہ پرسوں طغرل کو پولیس اسٹیشن میں دل کا دورہ پڑا ہے اور اسے جہلم کے اسپتال میں داخل کرایا گیا ہے۔ اس کی حالت ڈانواں ڈول ہے۔ دراصل سب انسپکٹر جان محمد نے دونوں باپ بیٹے پر بڑی ٹائٹ ایف آئی آر کاٹی ہے۔ دو تین اور کیس بھی کھل گئے ہیں ان کے خلاف۔ پھانسی سے بچ بھی گئے تو آٹھ دس سال تو باہر نہیں آئیں گے انشاء اللہ۔''

''ابو! اس فائر کی سمجھ نہیں آئی جو نالے کے پار کیا گیا۔ پتا نہیں کہ مجھے نشانہ بنایا گیا تھا یا پھر وہ ہوائی فائر تھے؟''

''اس کا بھی پتا چل گیا ہے۔'' ابا جان نے اپنے ہاتھ میں موجود ننھی سی تسبیح کو حرکت دیتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے نکل جانے کے بعد یہ لوگ تاچ کر رہ گئے تھے۔ مایوسی میں ہی انہوں نے گیٹ پر پٹرول ڈال کر آگ لگانے کی کوشش کی اور اسی مایوسی اور بدحواسی میں ایک کھاپری نے یہ دو فائر بھی کیے۔ یہ فائر نالے کے پار کے ایک ڈیرے سے کیے گئے۔ وہاں ایک چرسی ٹریکٹر ڈرائیور نے بھوسے کے ڈھیر میں ایک پستول چھپا رکھا تھا۔ اس نے ہوا میں دو گولیاں چلائیں اور سمجھا کہ شاید تم اس طرح ڈر جاؤ گی مگر تب تک تم چوکی کے سامنے پہنچ چکی تھیں.....''

تھوڑی دیر اس بارے میں بات ہوئی پھر چند لمحے کے توقف کے بعد وہ ہولے سے بولی۔ ''ابو! ایک بات کہوں؟''

''ہاں ہاں، بولو عین النور۔''

''میں نے آپ کا بہت دل دکھایا۔ آپ مجھے دل کی گہرائی سے معاف کر دیں..... میں وعدہ کرتی ہوں، کبھی آپ کی کسی بات پر اعتراض نہیں کروں گی۔ آئندہ زندگی کے بارے میں آپ میرے متعلق جو فیصلہ بھی کریں گے، مجھے قبول ہوگا۔''

انہوں نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں پھر آنسو چمک گئے تھے۔ اسے بازو سے پکڑ کر انہوں نے اپنے سامنے کرسی پر بٹھا لیا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ جو کچھ کہہ

رہی تھی وہ اس کا مطلب بڑی اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔

”میری بچی!“ انہوں نے بڑے جذبے سے کہا اور اسے کھینچ کر اپنے ساتھ لگالیا۔ ”تم..... بھی مجھے معاف کردو۔ میں نے بھی تمہیں ہمیشہ غلط سمجھا ہے۔ تمہیں دکھ دیا ہے۔“

نور کا سر ان کے سینے پر تھا۔ وہ اپنے سر کو نفی میں ہلانے لگی۔ آنکھوں کے کنارے جل ہی نہیں رہے تھے، بھیگ بھی رہے تھے۔

وہ گلوگیر لہجے میں بولے۔ ”دیکھو، قدرت بھی کیا کیا منظر دکھاتی ہے۔ میں نے تمہارے شوق کو ہمیشہ برا کہا..... اس وجہ سے ہمیشہ تم سے خفا رہا مگر...... تمہارے اسی شوق کی وجہ سے اس رات ہم سب نے نئی زندگی پائی۔ جو کام کوئی اور نہ کرسکا، وہ تم نے کیا۔ میں ان لمحوں کو کبھی بھول نہیں سکتا نور۔ اگر تم ان کے ہاتھ آجاتیں تو...... تو......“ وہ اس سے آگے کچھ بول نہ سکے اور چند لمحے کے لیے رقت آمیز کیفیت میں رہے۔

تب سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے انہوں نے کہا۔

”انسان خود کو عقلِ کل سمجھتا ہے اور قدرت اسے بتاتی ہے کہ اس کی فہم و دانش کی کیا حقیقت ہے...... پتا نہیں کیوں آج مجھے لگتا ہے کہ تم اس رویے کی حقدار نہیں تھیں جو میں نے اب تک تم سے اپنائے رکھا......“

”ابو جی! اب چھوڑیے ان باتوں کو۔ یہ سب ماضی کا حصہ ہے۔ میں آپ کی بیٹی ہوں۔ بس آپ کی بیٹی ہوں۔“ اس نے اپنے گرم آنسو اپنے ابو کے سینے کو سونپ دیے۔ وہ حیران تھی کہ یہ آنسو کئی برسوں تک کیوں اس کی آنکھوں میں آزادانہ راہ نہیں پاسکے...... کیا پہلے...... وہ اپنی شناخت چاہتی تھی، اپنی ذات کو منوانا چاہتی تھی، اس کے بعد ان آنسوؤں کو راستہ ملنا تھا؟

☆☆☆

یہ دو ماہ بعد کی بات ہے۔ مارچ کا پہلا ہفتہ تھا۔ یہ بہار کے آغاز کی ایک سہانی رات تھی۔ سارے میں موتیے اور گلاب کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ گھر میں ڈھولک بج رہی تھی۔ پرسوں نور کی سگائی تھی۔ اباجان کی دیرینہ آرزو کے مطابق اس کی منگنی مولانا حبیب اللہ مرحوم کے فرزند ذوالقرنین سے ہی ہونے والی تھی۔ اپنے عزم کے مطابق اس نے اباجان اور تایا جان کی خواہش کے سامنے سر جھکا دیا تھا۔ تائی راحت نے اپنے دلنشیں انداز میں اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔ ”نور...... عورت کے لیے بہت بہتر ہوتا ہے کہ وہ اس سے شادی کرے جو اسے چاہتا ہے۔ نہ کہ اس سے جسے وہ چاہتی ہے۔“

اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ذوالقرنین دل کی گہرائیوں سے نور پر فدا ہے۔ اس کے کئی ثبوت تھے جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ وہ اماں والے کے میلے میں بھی موجود تھا اور اس موقع پر بھی موجود تھا جب طوفانی شب میں نور اس ویران پولیس چوکی کے دروازے پر دستکیں دے رہی تھی...... اور اس وقت بھی جب چوکیدار گل محمد حملہ آور ابدال کو روکنے کی کوشش میں گر چکا تھا...... وہ خاموش محبت اپنے سینے میں لیے برسوں سے اس کا سایہ بنا ہوا تھا۔

اور نور بھی یہی سوچ رہی تھی۔ انسان کو وہ سب کچھ تو نہیں ملتا جس کی وہ تمنا کرتا ہے اور ایک دن شادی کہیں نہ کہیں تو کرنا ہی تھی...... تو پھر کیوں نا اس میں بڑوں کی خوشنودی شامل ہو جاتی۔

اگلے روز نور ایک اور امتحان سے دوچار ہوگئی۔ یہ بھی کڑا امتحان تھا۔ وہ تایا زاد مہرین سے مل کر واپس اپنے گھر آئے تو ملازمہ نے ایک لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔ ”یہ شاید آپ کا ہے چھوٹی بی بی۔“

نور نے لفافہ دیکھا اور اس کے پورے جسم میں سنسنی پھیل گئی۔ یہ محکماتی لیٹر تھا۔ اسی مہرباں نامہرباں ادارے کی طرف سے جس نے جاب فراہم کی تھی اور جس کی نمائندگی وہ قومی کھیلوں میں کرچکی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے ہونے والے ٹرائلز کی بنیاد پر نہ صرف اس کی ملازمت بحال کردی گئی تھی بلکہ یہ ارادہ بھی ظاہر کیا گیا تھا کہ وہ دو دوسری ایتھلیٹس کے ساتھ نیشنل اسپورٹس میں محکمے کی نمائندگی بھی کرے گی۔

یہ ایک بڑی خوشخبری تھی لیکن ایک ایسے موقع پر آئی تھی جب اس کی شادی کی تیاری ہو رہی تھی۔ اس نے خود کو زندگی کے ایک مشکل ترین دوراہے پر محسوس کیا۔ خط اس کے ہاتھ میں لرزنے لگا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ شادی اور اسپورٹس دونوں کام ایک ساتھ کبھی نہیں چل سکتے۔ وہ اپنے ہونے والے سسرالیوں کے خیالات اچھی طرح جانتی تھی اور اپنے اباجان کے مزاج کو بھی۔ وہ ان دونوں راستوں میں سے بس ایک ہی راستہ چن سکتی تھی۔ ایک جاں گسل کشمکش کے بعد اس نے وہی راستہ چنا جو اسے چننا چاہیے تھا۔ اس نے نہ صرف وہ خط پھاڑ دیا بلکہ گھر کے عقبی کمرے میں پہنچی۔ یہاں وہ سارے ایوارڈز اور ٹرافیاں وغیرہ موجود تھیں جو تایا ابا کے گھر سے واپس اس کے گھر میں آئی تھیں۔ چھوٹی امی زلفت نے یہ ٹرافیاں اس کمرے میں سجادی تھیں۔ اس نے ان ساری ٹرافیوں اور ایوارڈز کو ایک ڈبل بیڈ شیٹ میں گٹھڑی کی طرح باندھا اور تہ خانے میں

جا کر اس پرانی جستی پیٹی میں پھینک دیا جو شاید اسی کام کے لیے خالی پڑی تھی۔ اس پر عجیب سی کیفیت طاری تھی، سینے میں جیسے دھواں سا پھیلا ہوا تھا۔ وہ اپنے شوق سے یوں بچھڑ رہی تھی جیسے کوئی دیرینہ محبوب ساتھی سے بچھڑتا ہے۔

ملازمہ سودا سلف لینے قریبی مارکیٹ جا چکی تھی۔ اس وقت نور گھر میں اکیلی تھی۔ وہ ایک الماری تک پہنچی۔ وہاں وہ امپورٹڈ اتھلیٹکس ٹرینرز رکھے تھے جو کچھ عرصہ پہلے تایا ابا نے اسے یو ایس اے سے منگوا کر دیے تھے۔ یہ اس کے سب سے محبوب شوز تھے۔ وہ انہیں لے کر چھت پر چلی گئی۔ ان پر مٹی کا تیل چھڑکا اور آگ دکھا دی۔ وہ جل گئے تو ان کی راکھ ایک شاپر میں ڈال کر ڈسٹ بن میں پھینک دی۔ اس کے بعد کمرے میں بند ہو کر اس نے دیر تک آنسو بہائے اور ہلکی پھلکی ہو گئی۔ اسے نیند آ گئی۔ وہ تب جاگی جب شام گہری ہو گئی اور ڈرائنگ روم میں پھر سے ڈھولک بجنا شروع ہو گئی...... اس کی منگنی میں اب بس چوبیس گھنٹے باقی رہ گئے تھے اور شادی میں بھی زیادہ دن نہیں تھے۔

☆☆☆

کبھی کبھی وقت پر لگا کر اڑنے لگتا ہے۔ شاید ان دنوں بھی ایسا ہی تھا۔ دن مختصر تھے اور شادی کی تیاری میں صبح سے شام اور پھر رات ہونے کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ شاپنگ ہو رہی تھی۔ دو تین بار خدیجہ بھی نور کے ساتھ گئی تھی۔ وہ بہت خوش تھی۔ اس کے بھائی کی دلی مراد پوری ہو رہی تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ وہ جیسے ہواؤں میں اڑتی پھر رہی تھی۔

ایک دن وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''شادی سے پہلے اپنے ہونے والے میاں سے نہیں ملو گی؟''

''وہ کیوں؟''

''بھئی، تمہاری ہچکچاہٹ اور خوف میں کمی واقع ہو جائے گی۔''

''کیا آپ یہ کہنا چاہ رہی ہیں کہ آپ کے بھائی خوفناک ہیں؟''

''اگر خوفناک نہیں تو پھر تم نے سگائی کے بعد ایک بار بھی میل ملاقات کی خواہش کیوں ظاہر نہیں کی؟''

''اب ایک ہی بار مل لیں گے...... اور بھگت بھی لیں گے۔'' وہ ہولے سے مسکرائی۔

''بہت برا لفظ استعمال کیا ہے تم نے...... بھگت لیں گے۔'' خدیجہ نے اس کے سر پر ہولے سے چپت لگائی پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''نورا تم سے کہا تھا نا کہ وہ سخت ضرور ہے، کئی معاملوں میں دوٹوک رائے رکھتا ہے لیکن یہ سختی ویسی ہی ہے جیسے...... اخروٹ کی ہوتی ہے۔ اندر سے کتنا نرم اور مزیدار ہوتا ہے۔''

نور بولی۔ ''لیکن اخروٹ کی ''نرمی'' تک پہنچنے کے لیے کافی مشکل پیش آیا کرتی ہے جناب...... کچھ کی ''نرمی'' تو اپنے سخت خول سے نکلنے کا نام ہی نہیں لیتی۔''

''وہ ایسا نہیں ہے نورا تم بے فکر رہو۔ بس تھوڑا سا...... ٹائم دینا اسے۔''

اور یہ نور کی شادی کی رات تھی۔ اپریل کی درمیانی تاریخیں تھیں۔ بہار کا شباب تھا...... اور شباب پر بہار تھی۔ پوری راتوں کا چاند دمک رہا تھا۔ بہار اور چاندنی کا ملاپ دلوں میں جادو جگا دیا کرتا ہے۔ وہ اپنے حجلۂ عروسی میں پھولوں کی لڑیوں کے درمیان گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اسے میک اپ اور بھاری گہنے وغیرہ کبھی پسند نہیں رہے تھے مگر کچھ معاملات وقت کی مجبوری ہوتے ہیں۔ اسے اپنا یہ روپ بالکل بھلا نہیں لگ رہا تھا مگر وہ اسے دل وجان سے نبھانا چاہتی تھی اور پھر وہ گھڑیاں آئیں جب اس کا شریک حیات، اس کا شوہر کمرے میں داخل ہوا۔ نور کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ سانسوں کی آمدورفت تیز ہو گئی۔ گلاب، گیندے اور نرگس کے پھولوں کی مہک اس کے حواس کو ڈھانپ رہی تھی۔ سرخ جوڑے کے اندر اس کا سیمیں بدن تھا اور اس بدن کے اندر اس کا دل تھا اور اس دل میں امید کی کرنیں روشن تھیں۔ کچھ خوشگوار سی دھڑکنیں ان نیلی سفید کرنوں کو دھڑکانے لگی تھیں۔ کرنیں متحرک تھیں اور جھلملا رہی تھیں۔

اس نے گھونگٹ اٹھایا۔ چند رسمی فقرے ادا کیے اور پھر اس کے پاؤں کی طرف دیکھنے لگا۔ پاؤں پر مہندی تھی اور نقرئی پازیبوں کی جھلملاہٹ تھی۔ اس نے نور سے تمام تر توجہ ہٹا کر اس کے پاؤں پر نگاہ جمالی، پھر عجیب انداز سے ان پر ہاتھ پھیرا۔

یکایک نور کے ذہن میں ایک سیاہ جھکڑ چلا اور اس کے پورے بدن میں پھیل گیا۔

اسے لگا...... اسے لگا اس کے ہر مسام سے پسینا بہہ نکلا ہے۔ وہی مناظر اس کے ذہن پر جھپٹے جو ایک مرتبہ غنودگی کے عالم میں اس کے پردۂ تصور پر ابھرے تھے۔ اس نے کہا تھا، میں تم سے بہت زیادہ محبت کرتا ہوں۔ اتنی کہ تمہیں پانے کے بعد کھونے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ لہٰذا مجھے ایسا کچھ کرنا ہوگا کہ ہماری جدائی کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں...... اور پھر......

...خون کی پچکاریاں اور نور کی اپنی ہی آہ و بکا اس کے کانوں میں گونجنے لگی تھی۔ اس کے پاؤں ٹخنے کے اوپر سے کاٹ ڈالے گئے تھے۔ نہ رہیں گے پاؤں، نہ بھاگے گی تو...... نہ بھاگے گی تو۔

تو کیا آج وہی تصور حقیقت کا روپ دھارنے والا تھا...... یا اس تصور جیسا کوئی اور بے رحم منظر سامنے آنے والا تھا؟ پھولوں کی لڑیوں کے درمیان سے نور کو ذوالقرنین کی پشت نظر آرہی تھی۔ اس کی کریم کلر شیروانی، اس کی ہموار ڈاڑھی کی ایک سائڈ اور اس کا ایک ہاتھ جس میں ایک چابی تھی۔ اس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا اور نہ ان کے تاثرات۔ اس نے چابی سے الماری کھولی اور اس میں سے کچھ نکال لیا۔ وہ دیکھ نہیں سکی۔ اس کی نگاہیں دھندلا رہی تھیں۔ وہ بزدل نہیں تھی لیکن ان لمحوں میں اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ اس نے کیا نکالا تھا؟ کیا ایک تیز دھار چاپر...... یا اس جیسی کوئی اور چیز؟ نہیں، وہ چاپر نہیں تھا۔ وہ ایک ڈبا تھا جو خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ ویسا ہی گہرا سرخ خون جو اس کے عروسی لباس کا تھا...... مگر نہیں، وہ سرخ خون نہیں تھا۔ وہ تو سرخ رنگ کا ڈبا تھا جس کے نیچے کی طرف سفید دھاریاں تھیں۔ وہ ڈبا لے کر اس کے قریب آیا۔ اسے کھولا...... اس میں ایتھلیٹک شوز تھے۔ امپورٹڈ، سفید رنگ کے یو ایس اے کے بنے ہوئے، اسپرنٹرز کے لیے مخصوص۔ وہ جاگتی آنکھوں سے خواب تو نہیں دیکھ رہی تھی۔ نہیں، یہ حقیقت تھی۔ ذوالقرنین نے شوز نکالے۔ عجیب نظروں سے نور کی طرف دیکھا۔ محبت سے مسکرایا اور بولا۔ ''پاؤں آگے کرو نور۔''

وہ ششدر تھی۔ کانوں میں ایک آواز گونج رہی تھی۔

کون کہتا ہے محبت لوگوں کو نہیں بدلتی؟
محبت لوگوں کو بدلتی ہے۔
ان کی سوچوں کو بدلتی ہے۔

ان کے خیالات کی سب سے گہری پرتوں میں بھی اتر جاتی ہے اور وہاں نئے معیار ایجاد کرتی ہے۔ یہی محبت کا معجزہ ہے۔

☆☆☆

شادی کے بعد چند روز کے اندر ہی وہ ایک دوسرے کے اتنا قریب آگئے تھے کہ نور سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ ایک دوسرے کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ شریک حیات کے لیے جو ایک موہوم سا آئیڈیا نور کے دل و دماغ میں ابھرا کرتا تھا، نجانے کہاں کھو گیا تھا۔ اس آئیڈیل کی جگہ حقیقت نے لے لی تھی اور حقیقت خوبصورت تھی۔ اس شخص سے کہیں زیادہ خوبصورت اور دلنواز تھی جو کبھی ایک میگزین کے اسپورٹس انچارج کے طور پر اس کے سامنے آیا تھا۔۔۔ اب وہ اس کا نام بھی ذہن میں لانا نہیں چاہتی تھی۔

''ماشاءاللہ۔'' ذوالقرنین نے اس کے عقب میں آکر کہا اور وہ اپنے خیالوں سے بری طرح چونک گئی۔ ڈریسنگ میز کے اسٹول سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ کھانے کی ایک دعوت پر جارہے تھے۔ نور نے ہمیشہ کی طرح بہت ہلکا میک اپ کیا تھا۔ چوڑیاں اور جھمکے پہننا اس کی مجبوری تھی ورنہ وہ یہ بھی نہ پہنتی۔ اس معمولی تیاری کے ساتھ بھی وہ بڑی دلکش لگ رہی تھی۔ ذوالقرنین نے کندھوں سے تھام کر اسے اور اس کے سنگھار کو سونگھا پھر ایک فرحت بخش سانس لے کر بولا۔ ''اللہ آپ کو نظر بد سے بچائے۔ میں اپنی قسمت پر ناز کرسکتا ہوں۔''

''کیا اب مجھے شکریہ ادا کرنا ہوگا؟'' وہ مسکرائی۔

''نہیں۔ صرف، میری شیروانی کا اوپر والا بٹن بند کرنا ہوگا۔'' وہ بھی ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔

نور نے اس کی خوبصورت تراش کی براؤن شیروانی پر نگاہ دوڑائی۔ وہ جچ رہا تھا۔ نور نے شیروانی کا بالائی بٹن ذرا زور لگا کر بند کیا۔ کالر تھوڑا سا ٹائٹ تھا۔ وہ مصنوعی انداز میں کراہنے لگا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ اتنے تنگ گلے والی شیروانی میرے سسرالیوں نے سازش کے تحت سلوائی ہے...... جب مجھ سے پیچھا چھڑانے کو دل چاہے گا، آپ مجھے یہ شیروانی پہننے کے لیے دے دیں گی۔''

''آپ زیادہ ڈراما نہ کریں۔ ہاں، یہ ہے کہ دو ماہ پہلے کے حساب سے تھوڑا سا وزن بڑھ گیا ہے آپ کا۔''

''آپ اتنا اچھا پکاتی ہیں تو پھر یہی کچھ ہوگا۔'' اس نے اسے بانہوں میں لیتے ہوئے کہا۔

''چلیں، اب دیر ہورہی ہے۔ خدیجہ اور خالہ نیچے انتظار کررہی ہوں گی۔'' وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولی اور آئینے کے سامنے دوبارہ لپ اسٹک درست کرنے لگی۔

وہ بولا۔ ''ارے ہاں یاد آیا۔ صبح آپ نے ایف اے ایس بھی جانا ہے، کتنے بجے اٹھنا ہوگا؟''

''چھ بجے سے پہلے۔'' وہ مسکرائی۔ ''کل رننگ سیشن بھی ہونا ہے۔''

''یا خدا...... یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں؟'' ذوالقرنین نے کہا اور ٹھنڈی سانس بھری۔ وہ کتنا Cool لگ رہا تھا۔

وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اسے بار بار

تایا ابا کی بات یاد آتی تھی۔ ایک مرتبہ انہوں نے کہا تھا۔ ”صورتیں دھوکا دیتی ہیں نور۔ جب تک کسی بندے کے ساتھ رہا نہ جائے اسے پرکھا نہ جائے، کوئی حتمی نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا۔“ بے شک وہ درست کہا کرتے تھے۔

”چھ بجے تو اندھیرا ہوتا ہے ترو جہ محترمہ۔“ وہ بولا۔

”امید ہے کہ جلد ہی آپ کی شکایات دور ہوجائیں گی۔ جب میں گیم چھوڑ دوں گی، پھر ٹائمنگ کی یہ سختیاں نہیں رہیں گی۔“

”لیکن گیم سے آپ نے مکمل ناتا تو نہیں توڑنا نا۔ جب آپ کوچنگ وغیرہ کی طرف آئیں گی تب بھی وقت تو دینا ہی پڑے گا۔ صبح چھ بجے نہ سہی، سات بجے سہی۔ سات بجے نہ سہی، آٹھ بجے سہی...... نو بجے سہی۔“

”نو بجے سے جناب کو کیا پریشانی ہوگی؟“ وہ بولی۔

”پریشانی تو مجھے دس اور گیارہ بجے سے بھی ہوسکتی ہے لیکن ہوسکتا ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ، آہستہ آہستہ کچھ کرم فرمادے۔ دل کی بے قراریوں کو ذرا قرار آجائے۔“ وہ کسی چنچل لڑکے کی طرح بولا۔

ذوالقرنین کے مزاج کا یہ رخ نور کے لیے بڑا دل آویز تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ کم ہمتیاں کتنی مفید ثابت ہوتی ہیں۔ اگر کچھ عرصہ پہلے پی سی او کے بوتھ سے ذوالقرنین کو ایک سخت فون کرتے کرتے وہ رک نہ جاتی اور ارادہ بدل نہ دیتی تو نجانے ان کے درمیان کتنی بڑی خلیج حائل ہوجاتی۔ قدرت کے کام قدرت ہی جانتی ہے۔ نور اور ذوالقرنین کے درمیان اس کال والا معاملہ بھی صاف ہوچکا تھا۔ ایک دن رومانی موڈ میں ذوالقرنین نے اس سے پوچھا تھا کہ میلے پر جانے سے پہلے ایک دن سہ پہر کو نور نے اسے کال کی تھی؟ نور مان گئی تھی مگر یہ وضاحت نہیں کی تھی کہ وہ کال اس نے اچھے نہیں برے موڈ میں کی تھی۔ بس اتنا کہا کہ آپ کو سمجھانا بجھانا چاہتی تھی۔ اس کے بعد ذوالقرنین نے بھی اسے بتادیا تھا کہ میلے کے دوران میں اس کے سر پر پٹی کیوں نظر آئی تھی۔ فون بیل سن کر سیڑھیوں سے اس کا لڑھک جانا ایک دلچسپ واقعہ تھا۔ نور اور ذوالقرنین دونوں ہنستے ہوئے سرخ ہوگئے تھے۔

☆☆☆

......اور پھر آخر وہ دن آن پہنچا جس کا انتظار مدت سے تھا۔ آج نور ایک بار پھر سو میٹر دوڑ کے میدان میں تھی۔ یہ میگا ایونٹ تھا۔ قومی کھیل تھے اور اس کے سامنے وہی ٹریک تھا جس پر وہ کئی بار ہاری تھی اور ایک بار بری طرح گری بھی تھی لیکن آج وہ ہارنا نہیں چاہتی تھی۔ کم از کم وکٹری اسٹینڈ کو تو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے اندر ایک عجیب سی ترنگ تھی اور اس ترنگ کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ پرانی حریف نشو بجلی بھی پوری تیاری کے ساتھ ایونٹ میں حصہ لے رہی تھی۔ اس کے بارے میں اڑتی اڑتی خبر یہ تھی کہ اس نے کسی فٹنس پرابلم کا شکار ہوکر اپنا تقریباً ایک چوتھائی سیکنڈ کھودیا ہے۔

بظاہر سنجیدہ لیکن اندر سے متبسم ذوالقرنین حوصلہ افزا انداز میں نور کے اردگرد موجود تھا۔ اس کی حوصلہ افزائی نور کے لیے بے حد اہم تھی۔ نور کی پرفارمنس اب تک بہت بہتر تھی۔ اس نے جاں گسل کوشش کے ساتھ اپنی پرانی فارم تقریباً تقریباً حاصل کرلی تھی۔ ابتدائی ہیٹس میں ایک مرتبہ اس کی ٹائمنگ 12.05 بھی رہی تھی۔

اسٹیڈیم کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کیمرے حرکت کررہے تھے۔ اس کی محترم کوچز نبیلہ وجدان اور میڈم فرحانہ بھی موجود تھیں۔ اپنے مختلف لباس اور اسکارف کی وجہ سے نور ہمیشہ علیحدہ سے نظر آتی تھی۔ کچھ لوگ اس حلیے کو بہت پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے اور کچھ ہوٹنگ بھی کرتے تھے۔ نشو بجلی اس کے پاس سے گزری اور حسب معمول ایک فقرہ اچھال گئی۔ ”سونے پر سہاگا ہے یار! ایک تو پینڈو، اوپر سے شادی شدہ۔“

نور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا نظریہ ہمیشہ سے یہی تھا کہ اصل جواب میدان میں ہوتا ہے۔

فائنل ریس شروع ہونے سے چند منٹ پہلے اس کے پیارے تایا ابا اس کے پاس آئے، اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اسے اپنے ساتھ لگایا اور بولے۔ ”بیٹا! ہار جیت کھیل کا حصہ ہوتی ہے۔ کوئی ہارتا ہے تو ہی کوئی جیتتا ہے نا۔ اصل چیز تو مستقل مزاجی ہے اور اپنی کوشش سے جڑے رہنا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ غیر مستقل مزاج فاتح سے ایک ایسا ہارنے والا کہیں بہتر ہے جو مستقل مزاجی سے کوشش جاری رکھتا ہے اور نتیجے کو خندہ پیشانی سے قبول کرتا ہے...... تم جیت سکتی ہو اور ہار بھی سکتی ہو۔ دونوں صورتوں میں تم ہماری جان ہو...... کیونکہ تم...... موراں والی میں وہ جیت اپنے نام کرچکی ہو جو کبھی ہار میں نہیں بدل سکتی......“

نور کو تایا ابا کا جملہ بہت اچھا لگا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن پھر ایک سایہ سا اس کے چہرے پر لہرایا۔ وہ بولی۔ ”ابا جان نہیں آئے نا؟“

”نہیں...... لیکن انہوں نے تمہاری کامیابی کی دعا کی ہے۔ ان کی ساری گڈ وشز تمہارے ساتھ ہیں۔“

"پر انہوں نے وعدہ کیا تھا۔"

"اس کا جواب تو وہی دے سکتا ہے...... مگر نور! وہ تم سے خوش ہے۔ تمہیں کامیاب دیکھنا چاہتا ہے۔"

اناؤنسمنٹ ہوگئی کہ فائنل ریس میں حصہ لینے والی اسپرنٹرز ٹریک پر آجائیں۔

دیگر لڑکیوں کی طرح نور بھی پہنچ گئی۔ اس کی خواہش تھی کہ ابو جان یہاں آئیں۔ انہوں نے اسے نیک دعاؤں سے رخصت کیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ اپنے کام سے جلدی واپس آ گئے تو اسٹیڈیم پہنچیں گے۔

نور نے ان کی دی ہوئی دعاؤں کو یاد کیا اور ان کی کمی کو دور کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ دعا اور بد دعا میں بہت فاصلہ ہوتا ہے۔ اس سے پہلے ابو جان کی دعائیں اس کے ساتھ نہیں تھیں...... نہ صرف وہ دعاؤں سے محروم تھی بلکہ بقول پھپو حاجرہ ایک بددعا بھی اس کے ساتھ تھی۔ آج صورتِ حال بالکل مختلف تھی۔

اسپرنٹرز ٹریک پر پہنچ چکی تھیں۔ اب کسی بھی وقت پوزیشن ہونے کا اعلان ہو سکتا تھا۔ اچانک نور نے دیکھا کہ اس کے تایا انتظامیہ کے ایک شخص سے آرگومنٹ کر رہے ہیں۔ وہ شاید نور سے کوئی بات کرنا چاہتے تھے۔ آخر وہ کامیاب ہوئے اور اپنی پی کیپ درست کرتے ہوئے سیدھا نور کی طرف آئے۔

"کیا ہوا تایا ابا؟" وہ جیسے اندر سے کانپ گئی۔

انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اپنی انگلی سے تماشائیوں کے اسٹینڈ کی طرف اشارہ کیا۔ وی آئی پی کی تیسری یا چوتھی رو میں اسے ایک چہرہ نظر آیا۔ یہ اس کے ابا جان کا چہرہ تھا۔ وہ آ گئے تھے...... وہ پہنچ گئے تھے، وہ مسکرا رہے تھے...... نور کے اندر ایک ترنگ پیدا ہوئی۔ یہ ترنگ توانائی کی ایک شعاع بن کر اس کے پاؤں کے ناخنوں سے اٹھی اور سر کے بالوں تک چلی گئی۔

لاہور کی اس چمکیلی سہ پہر میں آسمان پر سفید بادلوں کے ٹکڑے تھے۔ پوزیشن لینے کا اعلان ہوا۔ اسپرنٹرز نے اپنے پاؤں فٹ بلاکس پر جمائے، آگے کو جھکیں، اسٹارٹنگ لائن کو چھوا۔ سیکنڈ پوزیشن لی اور ان کی سماعتیں فائر کی آواز سننے کے لیے تیار ہوئیں۔ یہ سب کچھ وہی تھا۔ وہی پوزیشن، وہی ٹریک، وہی تماشائی، وہی دور سے نظر آتی ہوئی فنش لائن کی جھلک لیکن آج ایک چیز نور کے لیے مختلف تھی۔ آج ایک شخص یہاں موجود تھا...... اور آج ایک تھپکی یہاں موجود تھی۔ اور یہ اس محترم شخص کی تھپکی تھی جس نے اسے جنم دیا تھا۔ جس کی توجہ حاصل کرنے کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہی تھی۔ جس کو وہ کچھ بن کر دکھانا چاہتی تھی، جس کی نگاہوں میں وہ اپنی ستائش دیکھنے کے لیے ہمیشہ ترسی تھی۔ کبھی بچپن میں بے تکی شرارتیں کی تھیں، کبھی بندر کی طرح اچھلی کودی تھی۔ کبھی نیک پروین بن گئی تھی، کبھی جھگڑے کیے تھے اور بے ڈھنگے لباس پہنے تھے، کبھی کوئی انوکھا ہنر سیکھنا شروع کر دیا تھا...... ابو! میں بھی آپ کی بیٹی ہوں، ابو میری طرف بھی دیکھیں...... ابو، میں تیسری ہوں لیکن آپ کی ہوں......

اس نے زندگی کے مختلف مرحلوں میں جو کچھ بھی کیا تھا، ان کی نگاہوں میں آنے کے لیے ہی تو کیا تھا۔ اپنی اس کوشش میں وہ ان سے دور سے دور ہوتی چلی گئی تھی اور پھر میلے والا واقعہ ہوا تھا جس نے اس کی برسوں پرانی آرزوئیں پوری کر دی تھیں۔ اس کے ابو نے اس کا ماتھا چوما تھا۔ آج اسے ایک اور موقع ملا تھا اپنے ابو کی نگاہوں میں اپنا مقام مستحکم کرنے کا۔ اور اس کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ آج کچھ کر گزرے گی......

آج سب کچھ وہی تھا جو پہلے ایونٹس میں ہوا کرتا تھا لیکن آج ایک شخص یہاں موجود تھا اور آج ایک تھپکی اسے مل رہی تھی۔

پھر وہ بھاگی...... اس کا دل کہہ رہا تھا، کوئی انہونی نہ ہو جائے ورنہ آج اسے کوئی ہرا نہیں سکے گا۔ اس نے اپنی سخت ترین حریف نشو بجلی کو دیکھا۔ وہ اس سے دو قدم پیچھے تھی۔ بڑی تیزی سے پاس آ رہی تھی۔ وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتی تھی۔ نصف فاصلے کے بعد اپنا مومنٹم بڑھاتی تھی اور مارجن Cover کر لیتی تھی۔ آج وہ پھر وہی کر رہی تھی۔ اسپرنٹرز کے لیے بھاگنے کے دوران میں بولنا آسان نہیں ہوتا لیکن نور نے نشو کو کن انکھیوں سے دیکھا اور گرجی...... میں پینڈو ہوں...... شادی شدہ بھی ہوں لیکن آج ہراؤ مجھے...... ماں کا دودھ پیا ہے تو ہراؤ مجھے۔ وہ ایک جنونی کیفیت میں جیسے ہوا میں اڑ رہی تھی...... اور پھر فنش لائن کا فیتا نور کے سینے سے ٹکرایا تھا......

یہ وہی ساعتیں تھیں جن میں صدیوں پرانے سپنے پورے ہوتے ہیں، یہ وہی لمحے تھے جن میں شکستوں کا تسلسل ٹوٹتا ہے اور فتح مستقل مزاجوں کے قدم چومتی ہے اور یہ وہی وقت تھا جب سر بے ساختہ سجدۂ شکر کے لیے جھک جاتے ہیں۔

نور نے بھی اپنا سر جھکا دیا۔ وہ جیت چکی تھی۔ اس کے کانوں میں اپنے سپورٹرز کے وہ پُرجوش نعرے گونج رہے تھے جن کے لیے آج تک اس کی سماعت ترسی تھی۔ سفید بادلوں کے پیچھے سے بہار کا مہربان سورج نکلا اور لاہور کے آسمان پر مسکرانے لگا۔

ختم شد